جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
نو روپے

قیمت فی پرچہ
پچھتر پیسے

شمارہ ۱	بابت ماہ جنوری ۱۹۸۱ء	جلد ۷۸

فہرست مضامین

مدیر:

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون:

عبد اللطیف اعظمی

خط وکتابت کا پتہ:

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع وناشر: عبد اللطیف اعظمی • مطبوعہ: جمال پریس دہلی ۶ • ٹائٹل: فائن پریس دہلی ۶

شذرات

۲ر۳ر اور ۴ جنوری ۱۹۸۱ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اسلامک وعرب ایرانین اسٹڈیز کے زیر اہتمام ہندوستان میں اسلامی تہذیب وتمدن کے ارتقاء کے موضوع پر ایک نہایت ہی کامیاب سیمنار منعقد ہوا۔ اس کی ایک مختصر رپورٹ اسی شمارے میں شائع ہو رہی ہے۔ ہندوستان میں جو مسلمان شمال مغرب کی طرف سے آئے وہ اپنے ساتھ اسلامی تہذیب وتمدن کی وہ روایات وخصوصیات لے کر آئے جو دنیائے اسلام کے مشرقی حصے، یعنی ایران، خراسان اور وسط ایشیا میں ایرانیوں، ترکوں اور عربوں کے معاشرتی اختلاط اور مناقشات واختلافات کے عمل اور رد عمل کے ساتھ ایک طویل عرصہ میں وجود میں آئی تھیں۔ ہم انھیں عرب ایرانی تمدن کا نام دیتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے عجمی تمدن کہتے ہیں۔ اس تمدن کی ساخت وپرداخت میں مدارس کا ہی حصہ نہیں تھا، بلکہ خانقاہوں نے بھی اس میں نمایاں حصہ لیا تھا اور ان علماء اور دانشمندوں کے نجی حلقۂ درس نے بھی جو اپنے گھروں میں علم وتمدن کی شمعیں روشن رکھتے تھے اور دور دور سے شمع علم کے پروانے کھینچ کھینچ کر ان کے درس کے حلقوں میں پہونچتے تھے۔ دینی علوم، نبوتی علوم، اسلامی تصوف، شاعری، موسیقی، مصوری اور فن تعمیر وغیرہ اس عجمی یا عرب ایرانی تمدن کے خصوصی مشمولات تھے۔ یہ تمدن پورے کا پورا تیرھویں صدی کے شروع میں ترکوں کے ساتھ ہندوستان آیا۔ کتابیں اور اساتذہ اور ان کے علمی مناقشے۔ یہ سب جوں کا توں ہندوستان میں منتقل ہوا۔ ہندوستان پہونچنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد یہ اسلامی تمدن منگولوں کے بے پناہ حملوں سے اپنے وطن میں تباہ وبرباد ہو گیا۔ منگولوں کے حملوں اور عہد تیموری کے درمیانی وقفہ میں صرف ہندوستان ہی ایک ایسا ملک تھا جہاں یہ تمدن زندہ رہ کر برگ وبار لا سکتا تھا۔ ——————

ہندوستانی مسلمانوں نے ہندوستان کے نئے ماحول میں اسی عرب ایرانی تمدن کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اپنی تہذیبی و معاشرتی زندگی کا آغاز کیا۔ اس زندگی کی کہانی بڑی دلچسپ، حسین، رنگارنگ اور عبرت آموز ہے۔ دلچسپ، حسین اور رنگارنگ اس لئے کہ ہندوستان کے قدیم تمدن کی خوبیوں اور خامیوں سے ساتھ رفتہ رفتہ عرب ایرانی تمدن کے نباہ کے امکانات روشن ہونے اور تہذیبی و معاشرتی سطح پر دونوں تمدنوں میں افکار و خیالات اور تمدنی روایات خصوصیات کا جو لین دین ہوا، وہ تاریخ اسلام میں ایک بالکل نیا تجربہ تھا اور تاریخی عمل کے ہاتھوں عرب ایرانی ہندی تمدن یعنی ایک بالکل نئے تمدن کی تشکیل ایسے طرز پر ہو رہی تھی جس کے نمونے دنیائے اسلام میں کہیں موجود نہ تھے۔ عبرت آموز اس لئے کہ تاریخ و سیاست نے ایک طرف عرب ایرانی تمدن کو اور دوسری طرف قدیم ہندی تمدن کو جس جمود و تعطل میں مبتلا کر رکھا تھا اور جس کے نتیجے میں دونوں تمدنوں کی داخلی حرکیت جس طرح مجبور و مقید ہو کر رہ گئی تھی، اس کی وجہ سے ایک خاص سطح پر دونوں تمدن ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہے۔ بنیادی افکار و عقائد کے مابین تناؤ کی فضا میں، زندگی کی ضرورتوں نے ہندوستان کے باشندوں کے مختلف طبقوں میں تہذیبی لین دین کے عمل کو بہر حال جاری رکھا اور اس سے اس ملک میں جو گنگا جمنی تہذیب وجود میں آئی وہ تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا اور جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے ایک نئے ہندوستان کو ڈھالنے کا کام شروع کر دیا ـــــ اس موقع پر ہمیں مولانا ابوالکلام آزاد کے اُس یادگار صدارتی خطبے کا مندرجہ ذیل ٹکڑا خاص طور پر یاد آرہا ہے جسے انھوں نے مارچ ۱۹۴۰ء میں رام گڑھ کے انڈین نیشنل کانگرس کے تاریخی اجلاس میں پڑھا تھا۔ انھوں نے اپنے مخصوص اسلوب بیان میں کہا تھا:

"ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روز آنہ زندگی کی بیشمار حقیقتیں، کوئی بھی ایسا گوشہ نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ چکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں، مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے

سے بیگانہ تھے، مگر انھوں نے بل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے، مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔"

سمینار میں کئی مقالے ایسے پڑھے گئے جن سے، معاشرتی و تہذیبی سطح پر لین دین سے جو تاریخی حقیقتیں سامنے آئیں اور جن کی طرف مولانا آزاد کے خطبے سے اقتباس میں واضح اشارے موجود ہیں، ان کی بھرپور تائید ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمان ویسے نہیں رہے جیسے کہ وہ صدیوں پہلے قافلہ در قافلہ یہاں آئے تھے لیکن یہ تاریخی حقیقت بھی اپنی جگہ موجود رہی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا تمدن دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے تمدن سے بے شمار تفصیلات میں مختلف ہونے کے باجود، اپنی مذہبی اساس کے لحاظ سے منفرد رہا۔ مسلمانوں کے بنیادی عقائد اور مذہبی علوم تاریخ کے کسی مرحلے میں کمزور نہیں ہوئے اور اسی سے بحیثیت ایک تہذیبی گروہ اُن کا تشخص بھی باقی رہا۔ جامعہ کے اس سمینار میں متعدد مقالے ایسے موضوعات پر بھی تھے جن سے قرآنی علوم، علم حدیث، فقہی علوم، تصوف اور عربی زبان و ادب سے متعلق ہندوستان کے مسلمانوں کی خدمات آشکار ہیں۔ کتاب و سنت سے مسلمانوں کو جو تعلق عقیدے کی سطح پر ہے، وہ تو اپنی جگہ پر ہے ہی، انھیں اِن دونوں چیزوں سے ایک طرح کا جذباتی تعلق بھی ہے۔ ہندوستان میں مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہے اور اس صورتِ حال سے اُن میں دفاعی نفسیات پیدا ہوئی، تہذیبی و تمدنی سطح پر یہ اُس وقت بھی تھی جب وہ اس ملک میں حکمراں تھے، لیکن وہ بہت دبی دبی سی تھی، بعد میں جب اُن کی حکومت کمزور ہوئی اور پھر ان کے ہاتھ سے نکل گئی تو اس دفاعی نفسیات نے پوری قوت کے ساتھ سر اُبھارا، سیاستدانوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اس کے جو نتائج برآمد ہوئے، وہ خود مسلمانوں کے حق میں مہلک اور مضر ثابت ہوئے۔ لیکن یہ داستان آج کے شذرات کا موضوع نہیں۔

پاکستان کے پروفیسر عبدالسلام جنھیں ۱۹۷۹ میں فزکس کا نوبل انعام ملا تھا، ۱۵ر جنوری کو جامعہ تشریف لائے، شیخ الجامعہ اور جامعہ کے اساتذہ و طلبہ نے ان کا شاندار خیر مقدم کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے مزار پر فاتحہ پڑھی، سابق شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب سے

ان کے گھر جاکر ملاقات کی اور پھر سائنسدانوں جن میں خاصی بڑی تعداد دہلی کی دونوں بڑی یونیورسٹیوں اور آئی۔آئی۔ٹی کے لوگوں کی تھی اور جامعہ کے اساتذہ وطلبہ کی ایک بڑی جماعت کو خطاب کیا۔اپنے لکچر میں انھوں نے اپنے کام اور آئندہ پروگرام سے متعلق وضاحت سے روشنی ڈالی۔ جامعہ سے وہ دوپہر کا کھانا کھاکر رخصت ہوئے۔پروفیسر عبدالسلام اپنی شکل وصورت اور رکھ رکھاؤ سے خالص مشرقی اور مسلمان ہیں۔طبیعت میں انکسار اور تواضع ہے۔مغرب میں ایک طویل عرصہ گذارنے اور اپنے شعبۂ علم میں ممتاز حیثیت اور بین الاقوامی شہرت کے حامل ہونے کے باوجود شخصیت اور مزاج پر فخر ومباہات کے احساس کا سایہ بھی نہیں پڑا ہے۔ اسی دن رات میں ایک ڈنر میں ملاقات ہوئی۔دوران گفتگو انھوں نے فرمایا کہ تلاوت کلام پاک میرے معمولات میں سے ہے۔اس کے علاوہ کوئی لیکچر دینے یا کوئی نیا کام شروع کرنے سے پہلے میں قرآن شریف ضرور سنتا ہوں، سبھی اچھے قاریوں کے کیسیٹ میرے پاس ہیں، اچھی آواز میں قرآن سننے سے مجھ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔میں نے ان سے عرض کیا کہ میرا خیال ہے کہ آپ کو طبیعات میں اپنی تحقیقات کے دوران بلند ترین سطحوں پر اُسی 'حیرت' کا تجربہ ہوا ہوگا جو حضرات صوفیاء کو اپنے روحانی تجربوں کے ایک خاص مقام پر ہوتا ہے۔انھوں نے کہا کہ آپ کا خیال صحیح ہے۔اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میں حیرت واستعجاب کی کیفیت میں ڈوب کر کہہ اٹھتا ہوں: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ انھوں نے یہ بھی کہا کہ غالباً یہی وجہ ہے کہ آج کے بڑے سائنسداں پہلوں کے برخلاف عقل محض کی گرفت سے آزاد ہیں۔

پروفیسر مشیر الحق

برصغیر میں فقہ اسلامی کے ارتقاء کا ایک جائزہ

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ تو اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ تجارت پیشہ جنوب کے راستے سے آئے تو مجاہدین محمد بن قاسم کی سرکردگی میں مغرب کی طرف سے داخل ہوئے۔ کچھ دنوں کی آمدورفت کے بعد ۵۹۵ھ (۱۱۹۸ء) میں دہلی پر شہاب الدین غوری کا قبضہ ہوا۔ غوریوں کی آمد کو ہم برصغیر کی تاریخ میں ایک اہم موڑ اس وجہ سے قرار دے سکتے ہیں کہ اسی کے ساتھ ساتھ باہر کے مسلمانوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ اب خواہ وہ غوری رہے ہوں یا خلجی، لودی رہے ہوں یا مغل۔ سب نے برصغیر کو اپنا وطن سمجھا اور یہ سوچ کر یہاں بسے کہ یہی ان کا وطن ہے اور یہیں انھیں جینا اور مرنا ہے۔ یہ درست ہے کہ عالمی اسلامی برادری کے ممبر ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اپنا رشتہ آفاقی اسلامی دنیا سے کبھی بھی نہیں توڑا لیکن اس بات کے بھی پورے شواہد موجود ہیں کہ انھوں نے ہر میدان میں اپنی انفرادیت کو باقی رکھنے اور اسے دوسروں سے منوانے کی پوری پوری کوشش کی، خواہ وہ میدان تعمیر کا رہا ہو یا تہذیب کا، تعلیم کا رہا ہو یا تبلیغ کا۔

شہاب الدین غوری کی تخت نشینی سے ہندوستان میں "دورِ سلطنت" کی ابتدا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے بغیر کسی قانون کے کوئی بھی سلطنت بہت دنوں تک نہیں چل سکتی۔ ۱۱۹۸ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک، جب انگریزوں نے آخری مسلمان بادشاہ کو تخت سے بے دخل کیا، ہندوستانی حکومت خواہ وہ سلاطین کی رہی ہو خواہ مغلوں کی، اسلامی شریعت کو سرکاری قانون کے طور پر نافذ کئے رہی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فقہ اسلامی کا دور دورہ اگر ایک طرف قاضیوں اور شیوخ الاسلام کی عدالتوں میں رہا تو دوسری طرف اس کی گونج مدارس و مکاتب میں بھی سنائی دیتی رہی۔

ڈاکٹر مشیر الحق، پروفیسر و صدر شعبۂ مطالعاتِ علومِ اسلامی و عرب و ایرانی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

شمال و مغرب کی راہ سے آنے والے مسلمان وسط ایشیا کی طرف سے آتے تھے جہاں حنفی فقہ کو بالادستی حاصل تھی۔ اس لئے ہندوستان کی تقریباً ہر مسلم ریاست، نیز یہاں کی بھاری اکثریت حنفی فقہ کی پیروی رہی۔ قاضیوں کی عدالت میں فیصلے بالعموم حنفی فقہ کے مطابق کئے جاتے تھے اور حنفی فقہ کی متداول کتابیں قاضیوں کے سامنے رہتی تھیں اور مدارس میں طلبا بھی انھیں کو پڑھتے تھے۔

برصغیر میں جتنے فقہا گزرے ہیں اور فقہ و اصول فقہ پر انھوں نے جو کچھ بھی کام کیا ہے صرف اس کی سرسری فہرست بھی اگر کوئی گنوانے بیٹھے تو اس کے لئے ایک مجلس کافی نہ ہوگی۔ بہرحال اس موضوع پر جو تحقیقات سامنے آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع کی دو تین صدیوں میں جب کہ مسلمان کے قدم یہاں پورے طرح سے جمے بھی نہ تھے ہندوستان میں تقریباً تین سو فقہا اس حیثیت کے پیدا ہو چکے تھے جن کے نام تذکروں میں محفوظ رہ گئے ہیں، اس کے بعد کی تو کوئی گنتی ہی نہیں ہے۔

جہاں تک تصنیفات کا تعلق ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میدان میں "فتاوی تاتارخانیہ" کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ تاتارخاں سلطان غیاث الدین تغلق (تاج پوشی ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء) کے دربار کا ایک عالم و فاضل امیر تھا۔ اس کے ایک اہم عصر عالم، عالم بن علاء دہلوی نے اس کے فیصلوں اور فتووں کو کتابی شکل میں "فتاوی تاتارخانیہ" کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کیا جو مطبوعہ صورت میں دستیاب ہے۔ یہ کتاب بہت دنوں تک عمال حکومت کے لئے ایک "راہ نما کتاب" کا کام دیتی رہی۔ انفرادی تصنیفات سے قطع نظر ریاست کے اہتمام میں فقہ کے جو مجموعے مرتب ہوئے ان میں اہم ترین کتاب "فتاویٰ عالمگیری" ہے جسے "فتاویٰ ہندیہ" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب سلطان اورنگ زیب عالمگیر (تاج پوشی ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء) کے عہد حکومت میں فرمان سلطانی کے تحت علماء کے ایک بورڈ کی نگرانی میں مرتب کی گئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب تقریباً پورا ہندوستان اسلامی حکومت کے زیر نگیں تھا اور شہر و قصبات ہر جگہ قاضیوں کی عدالتیں قائم تھیں۔ ان کی سہولت کے لئے اورنگ زیب نے یہ کتاب خاص طور سے مرتب کروائی تھی۔ ہندوستان کے "فقہی ادب" کے ذخیرہ میں فتاوی عالمگیری کو ہمیشہ نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔

"فتاویٰ تاتارخانیہ" اور "فتاویٰ عالمگیری" فقہی ادب کے دو ایسے مجموعے ہیں جن کی تالیف کا سہرا کسی نہ کسی طور حکومت کے سر بندھتا ہے، لیکن جہاں تک انفرادی تصنیفات کا تعلق ہے ان کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی ہند کی تاریخ میں کوئی صدی ایسی نہیں گزری ہے جب

فقہ کی کسی نہ کسی صنف پر کام نہ کیا گیا ہو۔ اس سلسلے میں اتنی بات ضرور یاد رکھنی چاہئے کہ مسلم دورِ حکومت میں بہت سارے ایسے مسلمان بادشاہ گزرے ہیں جو خود تو صاحب قلم نہ تھے لیکن وہ علماء اور فقہا کی اس درجہ خدمت اور عزت کرتے تھے کہ بعض لوگ عقیدتاً و محبتاً اپنی کتابوں کو ان کے نام سے منسوب کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ہم فیروز شاہ تغلق کے نام سے منسوب "فوائد فیروز شاہی" کا ذکر کرسکتے ہیں جس میں اس کے دربار کے ایک عالم ملا محمد نے فارسی زبان میں فقہ حنفی کے فتاویٰ کو مرتب کیا تھا۔ اسی قسم کی ایک دوسری اہم کتاب "فتاویٰ ابراہیم شاہیہ" ہے جسے جون پور کے بادشاہ ابراہیم شرقی (وفات ۱۴۳۸ء) کے نام پر وہیں کے ایک مشہور عالم قاضی شہاب الدین ملقب بہ نظام الدین کیکلانی (وفات ۸۷۵ھ/۱۴۷۰ء) نے مرتب کیا تھا۔ کتاب کا پہلا حصہ جو عبادات پر مشتمل ہے فارسی میں ہے اور دوسرا حصہ عربی میں ہے جس میں معاملات سے متعلق فقہی احکام درج کئے گئے ہیں۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ "فتاویٰ قاضی خاں" کے ٹکر کی کتاب ہے اور مصنف نے اسے تقریباً ۱۶۰ کتابوں کی مدد سے مرتب کیا ہے۔ یہ دونوں حصے ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔

لگ بھگ اسی زمانہ میں ہندوستان کے ایک دوسرے گوشے گجرات سے "فتاویٰ حمادیہ" سامنے آئی اس کے مصنف ابو الفتح مفتی رکن الدین ناگوری تھے اور وہ حکومت کی طرف سے منصب افتاء پر فائز تھے۔ انھوں نے اپنے علاقہ کے قاضی القضاۃ قاضی حماد الدین بن محمد اکرم کی خواہش پر اپنے بیٹے مفتی محمد داؤد کی اعانت سے فتاویٰ کا ایک مجموعہ دو جلدوں میں مرتب کیا جو قاضی حماد الدین کے نام پر "فتاویٰ حمادیہ" کہلایا۔ اس کتاب کو مکمل کرنے کے لیے مفتی رکن الدین اور مفتی داؤد نے تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ کی تقریباً ۲۱۶ کتابوں سے استفادہ کیا تھا جن کے نام کتاب کے مقدمہ میں درج ہیں۔ یہ کتاب ان فقہی مسائل پر مشتمل ہے جن پر جمہور فقہا کا اجماع ہے اور وہ عقل و درایت کی میزان پر بھی پورے اترتے ہیں۔ "فتاویٰ ابراہیم شاہیہ" کی طرح یہ کتاب بھی معاملات و عبادات پر مشتمل ہے۔

یہ کتابیں اس دور کی پیداوار ہیں جب عدالتوں میں اسلامی شریعت کا سکہ چلتا تھا اس لئے قضاۃ اہم فقہا کی رایوں کو مجموعوں کی شکل میں اپنی سہولت کی خاطر خود یا دوسرے علماء سے مرتب کروالیا کرتے تھے۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب عدالتوں کے علاوہ مدارس میں بھی فقہ کا بول بالا ہوا

کیونکہ یہیں سے حکومت کو قضاۃ مل سکتے تھے۔ مدرسوں میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ عام طور سے طلبا کی ضرورتوں کو پورا کرتی تھیں۔ یہ کتابیں عموماً متداول کتابوں کی یا تو شرح ہوتی تھیں یا حاشئے۔ اس قسم کے حاشیوں اور شرحوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم صرف دو مشہور فقہی کتابوں ھدایہ اور شرح وقایہ کو لے لیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ ہدایہ پر تقریباً ۱۵ ہندوستانی علماء نے اپنے حاشئے چڑھائے ہیں اور شرح وقایہ کو ۱۸ علماء نے اپنے حاشیوں سے مزین کیا ہے۔ درسی کتابوں کے علاوہ متعین موضوعات مثلاً رویتہ ہلال، اصول سماع، حرمت غناء و مزامیر، صلوۃ جمعہ، حلال و حرام جانوروں کی فہرست، مہر و جہیز، وغیرہ پر بھی علماء نے بے شمار فقہی مجموعے مرتب کئے ہیں جن کی فہرست دینا ممکن نہیں ہے (تفصیلات کے لئے مولانا عبدالحیؒ حسنیؒ کی عربی کتاب الثقافۃ الاسلامیہ فی الھندیا مولانا ابوالعرفان ندوی کے قلم سے اس کا اردو ترجمہ" اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" ملاحظہ ہو)۔

اصول فقہ میں ہندوستان کی قدیم ترین کتاب "شرح البزودی" ہے جسے نویں صدی ہجری (۱۵ ویں صدی عیسوی) کے مشہور عالم ملک العلماء قاضی شہاب الدین جون پوری (وفات ۸۷۵ھ ۱۴۷۰ء) نے مرتب کیا تھا۔ قاضی شہاب الدین کے علاوہ شیخ الہ داد جون پوری (وفات ۹۲۳ھ ۱۵۱۷ء)، شیخ سعد الدین خیرآبادی اور شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی نے بھی" البزودی" کی شرحیں لکھی ہیں۔

گیارھویں صدی ہجری (۱۷ ویں صدی عیسوی) میں ہندوستان کے مشہور عالم مُلّا محب اللہ بہاری (وفات ۱۶۳۶ء) نے اصول فقہ میں ایک درسی کتاب "مسلم الثبوت" لکھی جو اپنے مطالب کے لحاظ سے خاصی مشکل کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ مولانا عبدالحئی نے ۸ شرحوں کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے جن میں اولیت کا سہرا ملا نظام الدین فرنگی محلی کے سر ہے جنھوں نے "شرح مسلم الثبوت" کے نام سے دو شرحیں لکھی تھیں ایک طویل تھی اور دوسری بہت طویل۔ آخر الذکر کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے لیکن طویل شرح کے کئی مخطوطے مختلف لائبریریوں میں ملتے ہیں۔ "مسلم الثبوت" کی آخری شرح مصنف کے تقریباً دو سو برس بعد مولانا عبدالحئی خیرآبادی ابن مولانا فضل حق خیرآبادی نے لکھی جو اتنی مقبول ہوئی کہ درس نظامیہ میں آج تک رائج ہے۔

نویں صدی ہجری (۱۵ ویں صدی عیسوی) کے ابوالبرکات حافظ الدین نسفی کی اصول فقہ میں مشہور کتاب "المنار" کی بھی کم از کم ۹ ہندوستانی عالموں نے شرحیں لکھی ہیں۔ شیخ احمد امیٹھوی معروف بہ مُلّا جیون (وفات ۱۱۳۰ھ) نے اس کی شرح "نورالانوار" کے نام سے لکھی جو آج بھی مدارس میں رائج ہے۔ اس کے علاوہ ملّا نظام الدین نے "الصبح الصادق" کے نام سے المنار کی شرح لکھی۔ ملّا صاحب نے علامہ ابن ہمام کی "تحریر الاصول" کی بھی شرح لکھی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کثیر التصانیف عالم تھے۔ حدیث، تفسیر، فقہ، کلام غرضیکہ علم کا کوئی بھی ایسا میدان نہیں ہے جس میں ان کے قلم نے جوہر نہ دکھائے ہوں۔ انھوں نے اجتہاد و تقلید کے موضوع پر بھی ایک معرکتہ الآرا کتاب "عقد الجید فی احکام الاجتہاد و التقلید" کے نام سے لکھی ہے۔ ویسے تو صرف اجتہاد و تقلید کے موضوع پر حکیم عبدالحئی صاحب کی مذکورہ بالا کتاب میں ۲۷ کتابوں کے نام دیکھے جا سکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اصول اجتہاد سے دلچسپی رکھنے والا کوئی عالم شاہ صاحب کی "عقد الجید" سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔

علم الفرائض یا علم تقسیم وراثت پر لکھی جانے والی کتابیں عام مطالعہ کے لئے نہیں ہوتیں۔ یہ خاصا پیچیدہ علم ہے جس میں علم شریعت کے ساتھ ساتھ علم ریاضی کی بھی پوری واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ عام لوگوں کو علم الفرائض پر کتابیں پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی اس کے باوجود ہندوستانی علماء نے اس صنف میں بھی خاصا وقیع ذخیرہ چھوڑا ہے۔ اس موضوع پر عربی، فارسی اور اُردو کے منثور اور منظوم کتابوں اور رسالوں کی تعداد مولانا عبدالحئی کی فہرست کے مطابق ایک کم چالیس ہے۔

(۲)

اب ہم برصغیر کے مسلمانوں کی فقہی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ۱۹ ویں صدی میں داخل ہوتے ہیں۔ جس وقت ہندوستان سے مسلم حکومت ختم ہو چکی ہے تو ہمیں ایک نئی صورت نظر آتی ہے۔ یہ دور وہ ہے جب عدالتوں سے اسلامی شریعت کو بہت حد تک دیس نکالا مل چکا ہے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کے گھروں میں فقہ اور شریعت کا رواج باقی ہے۔ اسلامی دور میں شرعی رہنمائی کے لئے حکومت کے شعبے موجود تھے لیکن انگریزی دور میں یہ ذمہ داری انفرادی طور سے علماء نے سنبھال لی۔ اب ضرورت مند حکومت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے علماء کے در پر آواز لگاتے تھے۔ وہ اپنی

ضرورت کو استفتا کی شکل میں کسی مشہور عالم کے پاس بھیجتے اور وہ متداول فقہ کی روشنی میں شافی وکافی جوابات دیتے۔ بعض لوگوں نے اس قسم کے فتاویٰ کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ پھر یہ بات اتنی عام ہوئی کہ تقریباً ہر مشہور عالم کے فتاویٰ جمع کئے جانے لگے۔ اس سلسلے میں غالباً سب سے پہلا مجموعہ ۱۹ویں صدی کے مشہور عالم، شاہ عبدالعزیزؒ کا "مجموعہ فتاویٰ عزیزی" ہے جو دو جلدوں میں پہلی بار ۱۳۱۱ھ اور ۱۳۱۴ھ (۱۸۹۴ء۔ ۱۸۹۶ء) میں فارسی زبان میں شائع ہوا تھا۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے علاوہ ختم ۱۹ ویں صدی کے ایک دوسرے مشہور عالم مولانا عبدالحئیؒ فرنگی محلی کے فتاویٰ بھی تین جلدوں میں "مجموعۃ الفتاویٰ" کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ بیسویں صدی میں اس قسم کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ مثلاً فتاویٰ نذیریہ از مولانا نذیر حسین محدث دہلوی۔ فتاویٰ رشیدیہ از مولانا رشید احمد گنگوہی، فتاویٰ امدایہ از مولانا اشرف علی تھانوی۔ اور بالکل اپنے زمانہ میں فتاویٰ رحیمیہ از مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری۔ اس سلسلے میں ہم فتاویٰ دیوبند کو کسی طور نظر انداز نہیں کر سکتے جو کئی جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں اور اپنے وقت کے اہم مفتیوں کے فتاویٰ کا مجموعہ ہیں۔

فتاویٰ کے مجموعوں کے علاوہ اردو زبان میں فقہ کے مختلف موضوعات پر وقیع کتابیں لکھی گئیں اور اہم پرانی کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔ مثلاً امیر علی نے فتاویٰ عالمگیری اور ہدایہ کا ترجمہ کیا۔ درسی کتابوں میں شرح وقایہ کا ترجمہ نور الہدایہ کے نام سے مولوی وحید الزماں لکھنوی نے چار جلدوں میں شائع کیا۔ دُرّ المختار کا ترجمہ مولوی خرم علی نے غایۃ الاوطار کے نام سے کیا۔ عقد الجید کا ترجمہ مولانا محمد احسن صدیقی نانوتوی نے سلک مراورید کے عنوان سے شائع کیا۔ قُدوری کا اردو ترجمہ "ضروری" کے نام سے مولوی محمد عبدالعزیز نے کیا۔ منیۃ المصلّی کا ترجمہ عبدالرحمان حسام الدین نے صلوٰۃ الرحمٰن کے نام سے کیا۔ غرضیکہ فقہ کی کوئی بھی ایسی اہم کتاب نہ تھی جس کا اردو ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔ اس طرح ہندوستانی مسلمانوں کا واسطہ عربی اور فارسی سے ختم ہو جانے کے باوجود فقہی ادب سے ختم نہ ہو سکا۔

اردو زبان میں فقہی ادب کا جائزہ لیتے وقت ہم مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بہشتی زیور کو کسی طور نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مولانا تھانوی نے دراصل اس کتاب کے ذریعہ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک پیش آنے والے تمام ضروری مسائل کا جواب

حنفی فقہ کی رو سے اس کتاب میں باب وار حل جائے گا۔ اس کتاب کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ کچھ دنوں پہلے تک لوگ اپنی بیٹیوں کے جہیز میں قرآن شریف کے ساتھ ساتھ بہشتی زیور بھی دیتے تھے۔

طالب علم بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے مفتی کفایت اللہ مرحوم نے سوال وجواب کے انداز میں ضروری شرعی مسائل کو تعلیم الاسلام میں مرتب فرمایا۔ اسی قسم کا سلسلہ مولانا مجیب اللہ ندوی نے بھی "اسلامی فقہ" میں شائع کیا ہے۔

اس صدی میں متعین فقہی موضوعات پر بھی علمانے اردو میں یا تو اپنی کتابیں شائع کیں یا کسی دوسری زبان سے ترجمے کئے مثلاً مولانا محمد حبیب الرحمان خاں شیروانی نے "فقہ حنفی کی تاریخی حیثیت" پر ایک رسالہ لکھا۔ سلامت علی خان صاحب نے کتاب الاختیار کا ترجمہ "اسلامی قانون فوجداری" کے عنوان سے شائع کیا۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے القضاء فی الاسلام کا ترجمہ "طریقہ شہادت اور فصل مقدمات کے اسلامی اصول وقوانین کی تشریح" کے نام سے شائع کیا۔ بیسویں صدی کے شروع میں جب مسلم پرسنل لا کا مسئلہ سامنے آیا اور عورتوں کے حق خلع کے سلسلے میں بحثیں شروع ہوئیں تو مولانا تھانوی نے الحیلۃ الناجزہ لکھی جو اس زمانے کے قانون سازوں کے لئے ایک رہنما کتاب قرار پائی۔

بہرحال اس مختصر سے مقالے میں فقہ کے میدان میں ہندوستانی مسلمانوں کی خدمات کا کماحقہ جائزہ لینا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس سرسری جائزہ سے کم از کم اتنا تو معلوم ہو جاتا ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے بعد کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب یہاں کے مسلمانوں نے فقہ و اصول فقہ سے بے اعتنائی برتی ہو۔ ایک زمانہ وہ تھا جب حکومتوں کی سرپرستی میں فتاویٰ کے مجموعے مرتب کئے گئے۔ پھر درسی کتابوں اور شروح وحواشی کا دور آیا۔ آخر میں حکومت نہ رہی تو علماء اور مدارس نے یہ ذمہ داری سنبھال لی اور فقہ کے میدان میں انھوں نے جو کچھ کیا اسے عالم اسلام کے فقہی ادب کے مقابلہ میں پورے اطمینان کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔

(یہ مقالہ پندرھویں صدی ہجری تقریبات کے سلسلے میں شعبۂ مطالعاتِ علومِ اسلامی وعرب ایرانی کے سیمینار میں پیش کیا گیا۔)

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

غالب کی شعوری انفرادیت کا ایک پہلو

دسمبر کا مہینہ غالب کی پیدائش کا ہے اور فروری ان کی وفات کا۔ اسی مناسبت سے ذیل کا مضمون شائع کیا جا رہا ہے۔

غالب اپنے عہد کی ایک منفرد شخصیت ہیں۔ اُن کی یہ منفرد حیثیت اس شخصی انا اور شعوری انفرادیت کی تخلیق ہے جو شخص کو جمہور سے ممتاز کرتی ہے اور جس کی بدولت انسانی شعور زمان و مکان کا پابند ہوتے ہوئے بھی اپنے فکر و فن میں حلقۂ شام و سحر سے آزاد ہوتا ہے۔

ہر انسان ایک الگ وجود رکھتے ہوئے بھی ایک انفرادی شخصیت نہیں رکھتا، یہ انفرادی شعور فطرت کی ودیعت خاص ہے جس کو بھی قدرت اپنی اس خاص بخشش میں شریک کرلے لیکن اس کی تربیت اس نفسی تجربے اور ذہنی تجربے کے ذریعہ ہوتی ہے جس کے ساتھ ایک انسان اپنے ماحول اور حالات کے ہفت خواں سے گزرتا ہے۔

جس طرح ایک شے اپنے وجود کے لئے کسی دوسری شے کی محتاج ہوتی ہے اسی طرح ایک خیال دوسرے خیال سے پیدا ہوتا ہے، حال و خیال کا یہ سلسلہ اور ماضی و موجود کا اٹوٹ رشتہ روایت سے درایت اور درایت سے روایت کو جنم دیتا ہے، اس کا دائرۂ عمل انسانی زندگی کی شخصی حدود کا پابند نہیں ہوتا۔ غالب کی شاعری کی روایتی فضا اور اس کی شعوری وسعتوں کے تنوع کا بھی یہی حال ہے۔

غالب اپنے غیر معمولی عہد کے ایک غیر معمولی انسان تھے۔ وہ ایک ایسے دور میں پیدا ہوتے جب ایک بڑی تمدنی روایت کا سورج ڈوب رہا تھا اور مغرب سے آتی ہوئی ایک نئی تہذیبی روایت کا چاند افق کے دھندلے کناروں سے اُبھر رہا تھا، آگرہ اور دہلی اس قدیم مشرقی تمدن کے بڑے مرکز تھے، بالخصوص دہلی میں ایسے اکابر علما اور اہل فن موجود تھے جن کے جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی یاد دلاتے تھے،

• ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ریڈر شعبۂ اردو دلّی یونیورسٹی۔ دہلی۔ ۷

مگر دہلی کی عظیم مغل سلطنت کے آخری نشانات بھی اب گویا معدوم ہوتے جارہے تھے، اس کے مقابلے میں دیارِ مشرق کا نیا شہر کلکتہ ایک نئی مغربی سلطنت کا تجارتی و سیاسی مرکز بن چکا تھا جس کے اقتدار کے سایے اب دور دور تک پھیلتے جارہے تھے۔ اس نئے طلسمی شہر کلکتہ کے بارے میں غالب نے صرف سُنا ہی نہیں تھا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی تھا اور اس کے ارباب اختیار کے طور طریق سے بھی انھوں نے فی الجملہ واقفیت بہم پہنچائی تھی۔ غالب کے یہاں غیر معمولی سطح پر شعوری اکتساب اور انجذاب کی کیفیت موجود تھی اور اس سے بھی کچھ زیادہ ان کی شخصی انا اور انفرادی شعور نے ان کو اپنے اوپر اعتماد کرنا سکھلادیا تھا۔ یہی خود اعتمادی اُن کو درایت کی طرف لے گئی اور انھوں نے اپنے انداز نظر روایت کے بندھے ٹکے معیاروں سے کہیں شعوری اور کہیں نیم شعوری طور پر خود کو الگ کرلیا۔

غالب نے اردو زبان و ادب کو اپنے شعور و شعر کی شکل میں جو کچھ دیا ہے وہ ان کی ذہنی افق کی طرح بہت رنگا رنگ ہے لیکن دھنک کے سے ان دائروں میں جو دائرہ بہت دل آویز اور ان کے کلام کا مطالعہ کرنے والے کے لیے بہت فکر انگیز ہے وہ ان کا شعورِ حیات ہے جس کے پس منظر میں ان کے تہذیبی افکار اور ذہنی پیکر ایک فانوس خیال کی طرح گردش کرتے نظر آتے ہیں۔

غالب کے شعورِ حیات کا سب سے نمایاں پہلو اس مادی، شخصی اور آنی و فانی زندگی سے اُن کی محبت ہے، ایسی محبت جسے ایک والہانہ عشق سے تعبیر کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ عشق ان کو مظاہرِ حیات اور مناظرِ فطرت سے گہری دلچسپی لینے پر آمادہ کرتا ہے۔

مشرق نے ہمیشہ زندگی سے محبت کی مگر اس زندگی سے جو اس حیاتِ چند روزہ کے سوا کچھ اور شے ہے، یہ زندگی تو مشرق کے اہل روحانیت کی نگاہ میں ایک حباب بلکہ موجِ سراب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اور یہاں جو کچھ ہے وہ ایک جواب ہے۔ غالب کے یہاں بھی فلسفۂ وحدت الوجود کے زیر اثر اس خیال کی پہنائیاں اور گہرائیاں ملتی ہیں مگر ان کا ذہن کبھی اس پر مطمئن نہ ہوسکا کہ یہ تمام کائنات مادی یہ عالم رنگ و بو محض ایک حلقۂ دام خیال ہے اور یہ ہستی فریب ہستی سے زیادہ کچھ نہیں۔

غالب زندگی کے آنی اور فانی ہونے کا انکار تو نہیں کرتے کہ فرد کی زندگی میں وہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے مگر ایک خاص معنی میں اس کے آنی اور فانی ہونے کو بھی وہ اس کا سب سے حسین پہلو تصور کرتے ہیں۔ یہی حقیقت تو ہے جس نے زندگی کو سحر و جاذبیت کے پُرکشش عناصر سے سنوارا ہے اور اس

کشش کو لازوال ہونے کی بے کیفی سے بچا لیا ہے۔

ان کے خیال سے اگر یہ زندگی بقائے دوام کی مظہر ہو تو اس کائنات ارضی کے "رنگ منچ" پر کوئی ہنگامہ نہ ہو ہر شے سکوت مطلق اور سکون ابدی میں بدل جائے:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

اس موقع پر نشاط کار کی لفظی ترکیب خود اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتی ہے۔ اس پر ہوس یعنی خواہش فراواں کے لفظ نے اس نشاط کار کو شیریں دیوانگی عطا کر دی ہے۔

اس طرح جینے کے مزے کو، الفتِ حیات و انبساط زیست کو ذائقۂ موت سے ہم آہنگ کر دینا ایک نئے شعور کی علامت ہے۔ ہر ذی حیات کے لیے موت مقدر ہے لیکن زندگی کا تمام حسن اس کا تمام ذوق و شوق اسی موت کی پرچھائیں کا پیدا کردہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ موت ہی وہ حقیقت ہے جو زندگی کو معنی پہناتی ہے، حیات دوام کا شعور ایک صورت ناتمام ہے جسے ہم زندگی نہیں کہہ سکتے، ایک سانس لیتی ہوئی سچائی نہیں قرار دے سکتے۔

غالب کے نزدیک زندگی کا ہر لمحہ اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے بے نظیر و عدیل ہے، وہ عبادت میں بھی اگر صرف ہوتا ہے تو بھی اس کے فوت ہونے کا غم ضرور ہو گا اس لیے کہ اس لمحے کی کوئی اور قیمت ہو ہی نہیں سکتی:

مٹتا ہے فوت فرصتِ ہستی کا غم کہیں
عمر عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

عشق کا ایک تصور زندگی سے گریز اور اس کے مادی علائق سے انکار بھی ہے اور اسی ڈگر پر چل کر حقیقت کی تلخ کامیوں سے نجات پانے اور خوبصورت خوابوں میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کرنا ہے لیکن غالب کے لیے زندگی کے اپنے تقاضے اور ان سے الفت ناگزیر ہے۔

یہاں برق کی حاصل سوزیاں بھی زندگی سے محبت کرنے والے کے لیے وجہ کشش ہیں اور حاصل کے سوختہ ہو جانے کا غم بھی۔ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ایک زندہ انسان انکار نہیں کر سکتا۔ ان سچائیوں کو یکجا کرتے ہوئے یہ شعر غالب ہی کہہ سکتے ہیں:

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

زندگی کی سچائیوں سے اسی لگاؤ اور لاگ نے غالب کو ذہنی طور پر ایک مادی حقائق کا پرستار بنا دیا۔ وہ سچائیوں سے انکار نہیں کرتے ان سے آنکھیں چار کرنا چاہتے ہیں۔ اس جہان رنگ و بو سے گزر کر دوسری دنیا کی تلاش میں نکل جانا بھی خوب سے خوب تر کی جستجو کا ایک انداز ہو سکتا ہے اور صدیوں تک اسے اہل مشرق نے اپنی میزان قدر میں سب سے اونچا درجہ دیا ہے لیکن اس کے رنگا رنگ جلووں سے محبت کرنا اور اس پردۂ رنگ و بو میں بہار کو جلوہ گر دیکھنا بھی زندگی کا فطری تقاضہ ہے، غالب کے یہاں بہار کا اثبات زندگی کے جلوۂ صد رنگ کو دیکھنے اور اس کے فطری حق کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے:

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

یہ ذوق تماشا غالب کے لیے مذاق زندگی کا درجہ رکھتا ہے اور ہر رنگ میں ان کی چشم بصیرت کو وا ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ زندگی کو غم اور خوشیوں کا اسی طرح ایک ہنگامہ تصور کرتے ہیں جس طرح حلقۂ شام و سحر دن کے اجالوں اور رات کی تاریکیوں سے عبارت ہے:

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

زندگی کے زیر و بم میں نوحۂ غم اور نغمۂ شادی کو اس طرح شامل کرنا غالب کی شعوری انفرادیت ہے، کون ہے جو اس طرح غموں سے محبت کر سکتا ہے جس طرح غالب کے یہاں ان کی پزیرائی کا نہیں ایک طرح پرستش کا جذبہ موجود ہے:

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیئے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

یہ بات میرے ناقص علم کے مطابق اردو یا فارسی کے کسی دوسرے شاعر نے اس طرح نہیں کہی ہے۔ زندگی بہرحال زندگی ہے اس کی خوشیوں کے ساتھ اس کے غم بھی بہرحال باعث رونق حیات ہیں۔ ساز ہستی کے تاروں کا یہ ترنم اس صورت میں بھی پرسوز و نشاط انگیز ہے کہ اس پر نوحۂ غم کا اطلاق ہو سکے، زندگی سے محبت کا یہی تصور اس کی الم ناکیوں اور اذیتوں کو گوارا بلکہ انبساط آفریں بنا دیتا ہے:

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

غالب کے نزدیک زندگی ہے تو اس کے ساتھ غموں کا بھی ناقابلِ شکست رشتہ ہے:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

سچ پوچھئے تو شمع کا جلنا ہی اس کی زندگی ہے، اس شعلۂ جاں سوز سے اس کی محرومی خود زندگی سے محرومی ہے۔ فرصتِ ہستی ایک نفس سے زیادہ نہ سہی مگر یہ ایک نفس بھی رقصِ شرر کم دل آویز و فکر انگیز نہیں۔ یہ شعر آپ کو یاد آ گیا ہوگا:

یک نفس بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

انسانی وجود کا ایک حصہ اس کا دل ہے جو دراصل مرکزِ وجود ہے اور اپنی ہزار رنگ خواہشوں اور کاوشوں کے اعتبار سے ایک نگار خانۂ نما اور ایک شہرِ آرزو ہے، یہ دل ہی ہے جو ایک نقطۂ موہوم سے لے کر تکمیلِ وجود تک اور سفرِ وجود سے لے کر منزلِ عدم تک ایک لمحہ بھی چین نہیں پاتا۔ بے قراریاں اس کا مقسوم ہیں اور اسی نسبت سے زندگی کا مقدر، یہ دل ہی ہے جو ہزار خوشیوں کے ساتھ ہزار غموں کا بھی طلب گار رہتا ہے۔ غمِ عشق بھی ہے اور غمِ روزگار بھی۔

آدمی تو بہرحال آدمی ہے کائناتِ ارضی و سماوی ایک سب سے زیادہ متحرک ذرہ جس کی فطرت میں سفر ہے وہ کسی ایک مرحلہ کا ایک منزل پر قناعت کر نہیں سکتا۔ پھر خواہشوں اور کاوشوں سے نجات کی صورت بھی کیا ہے، جس کی وجہ سے داستانِ بے ستون و کوہ کن کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ انہیں ہاتھوں سے بت گری ہوتی ہے اور وہی ہاتھ بت شکن بن جاتے ہیں فطرتِ انسانی کی یہ تیشہ کاری اس کے ہنگامہ ہائے شوق کی دلیل ہے آپ کے کانوں میں غالب کا یہ شعر گونج رہا ہوگا:

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور

اب اگر غالب کے تصور زندگی میں ارضیت کی روح کارفرمائی سرتاسر تخیلی اور خیالی نہیں ہے تو گردش مدام سے گھبرا جانا بھی ایک زندہ انسان کے لیے فطری ہے :

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انساں ہوں میں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

زندگی کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے اور اس کی معنویت کو پرکھنے کے ساتھ غالب کائنات ہستی کی سب نے بڑی قدر عشق کو بھی ایک نئی معنویت سے آشنا کیا ہے :

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

بات یہیں ختم نہیں ہوتی، اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ عشق کا ایک ایسا جاوداں تصور ہے جو زندگی کو ایک بھرپور معنویت عطا کرتا ہے :

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے اگر برق خرمن میں نہیں

ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے کسی ارضی محبوب سے عشق نہ کیا ہو مگر ان کا عشق ارضی ہوتے ہوئے بھی جسم کی بے محابا پرستش اور جنس کی بے روائی سے مبرا ہے ان کا محبوب برق کی طرح شوخ چشم اور نگار حیات کی طرح کافر ادا ہے :

دیکھو تو دل فریبی انداز نقش پا — موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی
بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات — عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ غالب نے اپنے محبوب کے حسن و ادا میں خود اپنی رعنائی خیال کو دیکھا ہے، وہ اپنے محبوب سے قریب آنا چاہتے ہیں اور اس سحر آفریں انداز سے :

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

یہ جذبات اس شخص کے ہو سکتے ہیں جو زندگی میں کشش حسن اور خلش عشق کا قائل ہو اور جو اپنی اسی چند روزہ زندگی کو ایک مہذب مگر بھرپور زندگی کی طرح گزارنا چاہتا ہو:

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن　　خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

ان کے دل پر آرزو کا یہ والہانہ پن ان کے یہاں ارضیت اور اس کی لطافتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے غالبؔ حسن پرستی کو شیوہ اہل نظر کہتے ہیں جو کسی بل ہوس کا شعار نہیں ہو سکتا اسی لیے اس میں کامیابی کی وہ منزل بھی نظر نہیں آتی جس میں مرحلہ ہائے شوق طے ہو جائیں ان کا عشق ان کے تصور حیات کا ایک حصہ ہے۔ غالبؔ کو مابعد الطبیعاتی افکار سے کوئی خاص دلچسپی نہیں بہشت ہزار حسین ہو مگر کسی ارضی محبوب کی جلوہ گاہ سے بڑھ کر کہاں ہوگی اور حوران خلد میں انسانی حسن کی خوش ادائی و دل آویزی کہاں:

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
حوران خلد میں تری صورت مگر ملے

بہشت اور حور دقصور کا تصور انھیں اس لیے پر کشش نہیں معلوم ہوتا کہ وہاں لطف دیدار کہاں اور روزن دیوار کہاں۔

ان کے یہاں زندگی اور عشق کے ماورائی تصورات بھی ہیں اور متصوفانہ افکار و احوال کا عکس بھی موجود ہے مگر یہ ان کے مزاج زندگی اور مذاق عشق سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں۔ غالبؔ کی ارضیت پسندی اور زندگی کے لطافت و لذائذ سے اُن کی دلچسپی نے ان کے تصور حیات و کائنات کو گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ کائنات کو وہ ایک عالم رنگ و بو اور نگارخانہ حسن و جمال تصور کرتے ہیں جس میں زندگی کا مرقع سجایا گیا ہے، وہ انسان کو انسان سمجھتے ہیں تو اس کے گناہ پر بھی تقدیس کا ایک پردہ پڑا ہوا ہے، وہ زندگی کے حسن سے لطف اندوز ہونے اور خوشیوں کے پھول چننے کی تمنا کو گناہ کہتے ہوئے بھی گناہ نہیں مانتے۔

غالبؔ کبھی زندگی کی حقیقت سے منکر نہ ہوتے، ان کے مادیت پسند ذہن کی سطح پر تشکیک کے روشن نقطے ابھرتے رہے، ان کے یہ شعر ان کے شہود پرست اور تشکیک پسند ذہن کی بہترین نمایندگی کرتے ہیں:

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں   ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں   غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے   نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے

وہ زندگی سے محبت کرتے ہیں، اسی بے وفا پہ مرتے ہیں جس نے کسی سے وفا نہیں کی عجیب بات ہے کہ ان سے انتہائی غم انگیز خیالات بھی وہ ہیں جنھیں ہم اپنے سب سے زیادہ شیریں نغمے کہہ سکتے ہیں:

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل   زنہار اگر تمھیں ہوس نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو   میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط   دامان باغبان و کف گل فروش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی   مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے
لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ   یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں   نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

مگر اسی لئے یہ زندگی حسین ہے کہ اس کی حقیقت کو زوال ہے۔

---

۱ غالب کی شوخی چونکہ ذات سے کائنات تک پھیلی ہوئی ہے، اس لیے ایک سماجی اور تہذیبی قد غالب کی شخصیت کے اثر سے ان کا فن، زندگی کا عرفان اور آنے والے تغیرات و انقلابات کی پہچان سکھاتا ہے اور اس طرح قدیم سے جدید تک پہنچنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔

(پروفیسر آل احمد سرور

ڈاکٹر ہریش نارائن

غالب — قنوطی یا رجائی ؟

غالب کے کلام میں قنوطیت اور رجائیت دونوں کے عناصر اس قدر رچے بسے ملتے ہیں کہ اس کا فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے کہ انھیں قنوطی سمجھا جائے یا رجائی۔ انھیں شاعرِ غم کہا جاتا ہے۔ حیوانِ ظریف کا لقب دیا گیا ہے، ان کی شوخی اور بذلہ سنجی کو ان کا امتیازی وصف مانا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر غالب یہ سب کچھ ہیں اور اس کے علاوہ بہت کچھ اور بھی۔

علی العموم قنوطی اسے کہتے ہیں جو حال اور مستقبل سے غیر مطمئن اور ناآسودہ ہو، ناامید اور بیزار ہو۔ اس کے برعکس رجائی حال اور مستقبل سے مطمئن، آسودہ، اور پُر امید ہوتا ہے۔ قنوطیت اور رجائیت انفرادی سطح پر بھی ممکن ہیں اور سماجی سطح پر بھی۔ غمِ نان و غمِ آن، غمِ جاں و غمِ جاناں کا حامل بھی قنوطی کہا جاتا ہے، اور غمِ دوراں اور غمِ اُمّت کا حامل بھی۔ قنوطیت کی ایک تیسری قسم بھی ہے، جسے کائناتی، مابعد الطبیعاتی یا وجودیاتی جیسے الفاظ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

قنوطیت کی تیسری قسم کی تین شکلیں ہیں۔ پہلی شکل مادّیاتی یا لاالیعنیاتی کہی جا سکتی ہے، جو مادہ پرستوں کو لاحق ہو سکتی ہے اور گاہے گاہے ہوتی ہے۔ اس کی ایک صورت وہ ہے جسے ہم غمِ حیات و کائنات سے تعبیر کرتے ہیں۔ حیات و کائنات کا کسی دم خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ایٹم بم کے دھماکوں کے خطرے لاحق ہیں ہی، کہکشاں اور کہکشاں میں تصادم کا خطرہ بھی بعید از قیاس نہیں ہے۔ اس کے علاوہ سورج کے سرد ہو جانے کے بعد نظامِ شمسی درہم برہم ہو سکتا ہے۔ یہ صورتِ حال ایک فلسفی کو قنوطی بنانے کے لیے کافی ہے۔ فی الواقع برٹینڈرسل اپنے مضمون بعنوان FREE MAN'S WORSHIP میں

ڈاکٹر ہریش نارائن، ریڈر شعبۂ فلسفہ، نارتھ ایسٹرن ہل یونیورسٹی، شیلانگ - ۷۹۳۰۱۴

اسی صورتِ حال پر غور و خوض کرتے ہوئے ایک قنوطی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ مادیاتی قنوطیت کی دوسری شکل یہ ہے کہ، جب حقیقتِ مطلق فقط مادہ ہے، ہماری زیست و ذات سے بے نیاز، بے مقصد اور لایعنی، جب ہم خاک کے پتلے خاک ہو کر رہیں گے، جب کائنات کی کوئی علت غائی نہیں ہے، جب ہم عدم سے آتے اور سوئے عدم رواں دواں ہیں، تب سب کچھ واہیات اور لایعنی ہے، اور لایعنی کو جھیلنا لایعنی تر۔ یہی صورتِ حال وُجُودیت کی ایک خاص قسم کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ ژیاں پال سارتر کا قول ہے کہ وجودیت مادیت کے سارے نتائج اخذ کرنے کی سعی کا نام ہے۔

وجودیاتی قنوطیت کی دوسری شکل غمیاتی قنوطیت کہی جا سکتی ہے۔ گوتم بدھ کا قول ہے، کہ کائنات ایک خالص غم کدہ ہے، لہٰذا اس میں ہماری خیر نہیں۔ یہ احساس ہمیں قنوطی بنانے کے لیے کافی ہے۔ وجودیاتی قنوطیت کی ایک تیسری شکل بھی ہے، جو حقیقت اور مجاز کی تفریق پر مبنی ہے۔ اور کائنات کو حقیقتاً موہوم و معدوم تصور کرتے ہوئے حقیقت کو ہماری دسترس سے باہر گردانتی ہے۔ اگر سب کچھ دھوکا ہے، چھلاوہ ہے، فریبِ نظر ہے، تو ہماری ساری مساعی، ساری زندگی بے سود، بے مقصد اور لایعنی ہے۔ اگر اس فریب سے کبھی نجات ہو بھی جائے تو اس بلا میں پھر گرفتار ہو جانے کا خطرہ بعید از قیاس نہیں۔ بقول صوفیائے کرام ذاتِ انسانی، روحِ انسانی، طائرِ غنچۂ قدس ہے، جو کسی لامعلوم سبب سے اس "دامگہِ حادثہ" میں گرفتار ہو گئی ہے:

طائرِ غنچۂ قدسم چہ دہم شرحِ فراق
کہ دریں دامگہِ حادثہ چوں اُفتادم (حافظ)

اگر مسلسل جد و جہد کے بعد غنچۂ قدس کی بازیافت ہوئی بھی، تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس سے دوبارہ فراق نہیں ہوگا؟ اسے وہمیاتی اور عدمیاتی ILLUSIONISTIC AND NIHILISTIC قنوطیت سے تعبیر کر سکتے ہیں، جس کی رو سے کائنات یکسر موہوم اور معدوم ہے۔

اُردو کے قنوطی شعرا میں میر تقی میرؔ غم عشق یعنی غم جاناں اور غم ہجراں کے شاعر ہیں۔ ان کی قنوطیت کا محرک نفسیاتی اور انفرادی ہے۔ حالیؔ اور اقبالؔ میں بھی غم کے عناصر کی کمی نہیں، مگر ان کا غم اُمت ہے، سماجی غم ہے؛ تاہم ان کا غم قنوطیت کی سرحدوں کو نہیں چھوتا۔ اگر مسدس حالی میں غم و یاس کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہے تو اس کے ضمیمہ میں امید و بیم کا سفینہ بھی اس سے

مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ اگر اقبال نے غم امت کے اظہار کے لیے شکوہ لکھا تو جواب شکوہ میں پیغام بیداری دے کر امید کی کرن بھی پیدا کر دی۔ فی الحقیقت اردو میں غم امت قنوطیت کی حد میں شاید ہی کبھی داخل ہوا ہو۔ اُردو کے شہر آشوب غم پیدا کرتے ہیں، قنوطیت نہیں۔ ادھر کچھ نئی آوازیں بیشک ابھری ہیں، مگر ان کے متعلق فی الحال کچھ کہنا مناسب نہیں۔ پورے سماج یا نوع انسانی کے ناگفتہ بہ حال اور مستقبل کے احساس سے پھوٹنے والی قنوطیت مغرب میں بھی خال خال نظر آتی ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ کی مشہور طویل نظم WASTE LAND اور آلڈس ہکسلے کے ناول THE BRAVE NEW WORLD کو نمونتاً پیش کیا جا سکتا ہے۔

ابوطالب کلیم کا شعر ہے:

طبعے بہم رساں کہ بسازی بہ عالمے
یا ہمتے کہ از سرِ عالم تواں گذشت

یعنی ایسی طبیعت پیدا کر کہ دنیا سے تیرا سمجھوتہ ہو جائے یا ایسی ہمت پیدا کر کہ تو دنیا کے سر سے گذر جائے۔ اُردو کے شعرائے امت نے اکثر و بیشتر یہ دوسری وضع پسند کر لی۔

قنوطیتِ مادیاتی کی مثالیں عمر خیام کے یہاں کافی مل جاتی ہیں۔ حافظ کی شاعری میں بھی اس کا رنگ کافی گہرا ہے۔ اُردو شعرا میں میر، فانی، اور غالب اس میدان میں پیش پیش ہیں۔ قنوطیت لایعنیاتی وجودی ادب کا طرۂ امتیاز ہے۔ مثلاً ہرمن کیسک کے ناول THE CITY BEYOND THE RIVER میں دو کارخانوں کا ذکر آتا ہے۔ ایک کارخانہ چٹانیں پیس کر سفوف بنا دیتا ہے، تو دوسرا کارخانہ اس سفوف کو پکا کر پھر چٹان کی صورت میں ڈھال دیتا ہے اور پہلے کارخانہ میں دوبارہ پسنے کے لیے روانہ کر دیتا ہے۔ یہ سلسلہ لامتناہی ہے، اور اُتنا ہی لایعنی۔ اسی طرح کاموں کا ایک کردار ایک گول چٹان ڈھکیل کر پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا دیتا ہے اور اسے لڑھکا کر نیچے گرا دیتا ہے، اس کے بعد وہ اسے پھر چوٹی پر لے جاتا ہے اور پھر نیچے گرا دیتا ہے۔ علیٰ ھٰذا القیاس یہ سلسلہ بھی پہلے ہی جیسا لایعنی ہے اسی پر کائنات کی لایعنیت کو قیاس کر لیجئے۔ اسی طرح ذاتِ انسانی کا ماویٰ و ملجیٰ عدم ہے، اس خیال کی ترجمانی حسب ذیل اشعار میں ملاحظہ ہو:

شورے شد و از خوابِ عدم دیدہ کشودیم
دیدیم کہ باقی است شبِ فتنہ غنودیم (عراقی)

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے؟ خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا (چکبست)

عینیاتی قنوطیت فانیؔ میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ اُن کے تین شعر ملاحظہ ہوں:

ہر نفَس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

ہم کو مرنا بھی میسّر نہیں جینے کے بغیر
موت نے عمرِ دو روزہ کا بہانا چاہا

ہر نفس آہ اور انفاس پر جینے کا مدار
زندگی آہِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

وہمیاتی قنوطیت اُردو شاعری میں خال خال پائی جاتی ہے۔ اصغرؔ کا ایک شعر نمونتاً پیش ہے:

اے کاش میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا
اب لطفِ خواب بھی نہیں احساسِ خواب میں

عدمیاتی قنوطیت کی مثالیں عام طور پر نہیں ملتیں۔ فانی کے ایک شعر میں کسی حد تک اس کی کیفیت محسوس ہوتی ہے، ملاحظہ ہو:

فانیؔ وہ ہوں میں نقطۂ موہومِ اتصال
جس میں عدم کی دونوں حدیں ہوں ملی ہوئی

قنوطیت کی مختلف قسموں کا ایک خاکہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

- قنوطیت
  - قنوطیتِ کائناتی، مابعد الطبیعاتی، یا وجودی
    - قنوطیتِ وہمیاتی و عدمیاتی
    - قنوطیتِ عینیاتی
    - قنوطیتِ مادیاتی، لا عینیاتی
      - قنوطیتِ کائناتی
      - قنوطیتِ حیاتی
  - قنوطیتِ سماجی
  - قنوطیتِ انفرادی

غالب میں اکثر و بیشتر قنوطیتِ انفرادی اور ایک حد تک قنوطیتِ کائناتی کی مختلف شکلوں کے رنگ نمایاں ہیں وہ مردم آگاہ تھے، شاداں کیونکر رہتے :

چگونہ مردم آگاہ شادماں باشد
کہ شادمانیٔ ہر کس بقدرِ غفلت اوست (امیری فیروز کوہی)

جو شخص جتنا ہی بے خبر ہوتا ہے وہ اُتنا ہی شادماں ہوتا ہے، بھلا مردم آگاہ کیونکر شادماں رہ سکتا ہے ؟

یوں تو ہر شاعر میں اَنا نمایاں ہوتی ہے، مگر غالب کی اَنا اپنی آپ مثال ہے۔ وہ کہتے ہیں :

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر بہ موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

یعنی اگر دریا کی موج دیکھ کر غالب کو یہ گمان گذرے کہ دریا اُن سے چین بہ جبیں ہے، کہ اس کی تیوری چڑھی ہوئی ہے، تو وہ اس کے کنارے پیاس سے مرجانا قبول کریں گے، اس کا پانی ہرگز نہیں پئیں گے۔ فی الحقیقت یہ وہی غالب ہیں جنھوں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لیے کسرِ شان سمجھا تھا اور اُن کی نزاکتِ طبع نے انھیں بلا کا حساس بنا دیا تھا۔ اُن پر حقیر سے حقیر واقعہ بڑی طرح اثرانداز ہوتا ہے۔ وہ کالج کی ملازمت کے امیدوار کی حیثیت سے انٹرویو کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ کوئی اُن کا خیر مقدم کرنے کے لیے نہیں آیا، لہٰذا وہ ملازمت کو ٹھوکر مار کر اُلٹے پاؤں واپس آگئے۔ ذرا اُن کی بندگی کے تیور تو ملاحظہ کیجیے :

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

ان میں جذبات کی تندی اور احساس کی شدت بے پناہ ہے :

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

ایک شعر میں تو وہ بادہ کی تمام تلخی یکلخت حاصل کر لینے کے لیے آبگینہ ہی پگھلا کر پیالے میں انڈیل لینے پر کمربستہ نظر آتے ہیں :

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

اپر اُن کی افزونیٔ خواہش اور غضب ڈھاتی ہے:

نامُرادم دارد ایں افزونیٔ خواہش بہ دہر
آب بر من بستہ اند آرے بہ استسقائے من

افزونیٔ خواہش کے سبب نامراد ہیں۔ گویا انھیں جلودر کا عارضہ ہے، جس میں پیاس کی شدّت ہوتی ہے مگر پانی پینے کی ممانعت رہتی ہے۔ اُن کی کبھی نہ پوری ہو سکنے والی آرزوئیں ملاحظہ ہوں:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

دیتے ہیں جنّت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

قصر اِک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ چپ رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

رِگوید کے ایک منتر کا مفہوم یہ ہے کہ وِشنو نے تین قدم میں کُل کائنات کو ناپ لیا، جب کہ غالب کی تمنا کا ایک ہی قدم، اور اس کا بھی ایک ہی نقشِ پا، سارے عالمِ امکاں پر تمام و کمال محیط ہو جاتا ہے:

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب!
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

غالب کی ان حسرتوں، ارمانوں، آرزوؤں میں ایک حسرتِ گناہ بھی ہے، جس کی تندی کا عالم یہ ہے:

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب! اگر اُن کردہ گناہوں کی سزا ہے

بقدرِ حسرتِ دل چاہئے ذوقِ معاصی بھی
بھر دوں اِک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

غالب ایک ایسا نازک طبع، تیز طبع، حسرت مآب شاعر ہے جو غم اور سرخوشی دونوں کو بدرجۂ اتم محسوس کر لیتا ہے۔ یہی سبب ہے، جیسا آگے ظاہر ہوگا کہ غالب انتہائی درجے کا قنوطی اور انتہائی درجے کا رجائی ہے، پھر بھی اُن میں رجائیت کے مقابلے میں قنوطیت کی شدت نسبتاً کم ہے۔ قنوطیت کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

غم اگرچہ جانگسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

غالب انسان سے کس قدر خوفزدہ ہیں اس کا حال انھیں کی زبانی سنئے:

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثل جوہرِ تیغ آبدار تھا
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں

انھیں اس کا بڑا غم ہے کہ قیامت کے روز انھیں دوبارہ دنیا والوں سے واسطہ پڑے گا:

مرا کہ روزِ قیامت غمے کہ ہست اینست   کہ روئے مردمِ دنیا دوبارہ باید دید

اگر انھیں دوزخ میں بھی ڈال دیں تو غم نہیں، انھیں غم اس بات کا ہے کہ کہیں اُن کا آج اُن کا کل بھی نہ بن جائے:

زاں ہمی ترسم کہ گردد قعرِ دوزخ جائے من

وائے گر باشد ہمیں امروزِ من فردائے من

وہ دنیا سے اس قدر نالاں ہیں کہ اُسے خواب میں بھی دیکھنے سے گریز کرتے ہیں:

یارب! ہمیں تو خواب میں مت دکھائیو

یہ محشرِ خیال کہ دنیا کہیں جسے

حسب ذیل اشعار میں غالبؔ کی قنوطیتِ انفرادی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی نظر آتی ہے:

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا

دل بھی یارب! کئی دیے ہوتے

ہو چکیں غالبؔ! بلائیں سب تمام

ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

خوشی کیا کھیت میں میرے اگر سو بار ابر آئے

سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

آئے ہے بیکسیٔ موت پہ رونا غالبؔ!

کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

لوں وام بختِ خفتہ سے اک خوابِ خوش ولے

غالبؔ! یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گذری غالبؔ!

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

گفتی نیست کہ بر غالبؔ ناکام چہ رفت

می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نہ داشت

عمریست کہ می میرم و مُردن نہ توانم
در کشورِ بیدادِ تو فرمانِ قضا نیست
چرخ ہر روزم غم فردا بخوردن می دہد
تا قیامت فارغ از فکرِ معاشم کردہ اند

قنوطیتِ مابعد الطبیعاتی یا وجودیاتی کی ایک شکل قنوطیت عمیاتی بھی غالب کی قنوطیتِ انفرادی سے منسلک نظر آتی ہے۔ اُن کی نظر میں زمانے کی آرائش ظلم و ستم سے کی گئی ہے، اور گرنے والا ہر قطرۂ خوں زمین کا غازہ ہے:

آرائش زمانہ ز بیداد کردہ اند
ہر خوں کہ ریخت غازۂ روئے زمیں شناس

انسان کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ:

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

غالب حیات اور غم کو مترادف قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

بہرکیف انسان طبعًا رجائیت پسند ہے، اگر اُمید و رجا کا دامن دستِ ہستی سے چھوٹ جائے تو یہ زندگی عذاب ہو جائے۔ اُمید اور رجائیت ہی ایک ایسی توانائی ہے جو زیست کو متحرک رکھتی ہے:

یہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انسان سہتا ہے
نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مرجانا

ہندی کے شاعر راما ونار تیاگی کو اسی بات کا غم ہے کہ انھیں غم بدلنے کا موقع بھی نہیں ملا:

کیسی ممتا؟ پیار کہاں کا؟ سُکھ کس ڈالی پر پھلتا ہے؟
مجھ کو درد بدلنے کی بھی سُوْ دِھا نہیں ملی جیون میں

یہی احساس غالبؔ سے کہلاتا ہے:

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

کسی نے سچ کہا ہے: وفورِ غم کے ریلے میں شعورِ غم نہیں ہوتا

فی الحقیقت، غالبؔ کے خیال میں عالم کے اجزائے پریشاں کی شیرازہ بندی فنا کے دھاگے سے کی گئی ہے اور ہماری تعمیر ہی میں ہماری تخریب پنہاں ہے:

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے وہ یہاں آکے دم ہوئے

غالبؔ میں کہیں کہیں ہستی کی لایعنیت کا احساس نہایت مؤثر پیرائے میں ظاہر ہوا ہے۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ "تم مشقِ سخن کر رہے ہو اور میں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم کو اور نظیریؔ کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا، اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا؟ دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گمنام جیئے تو کیا؟ . . . جس سنّاٹے میں ہوں وہاں تمام عالم، بلکہ دونوں عالم، کا پتہ نہیں"۔

یہ قنوطیتِ لایعنیاتی کی بہترین مثال ہے، ہستی کو بے کار محض سمجھ کر ہی غالبؔ فرماتے ہیں:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

رازدانِ خودئے دہرم کردہ اند
خندیدہ بردانا و ناداں می زنم

احساس لایعنیت غالب میں گاہے گاہے ایک شانِ بے نیازی پیدا کر دیتا ہے، جو حسب ذیل اشعار میں نمایاں ہے:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اِک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اِک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ ایک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

مگر غالب اس ساری یاسیت اور قنوطیت کے باوصف اپنے دور سے نااُمید نہیں۔ وہ اُردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے سائنسی دور کا بڑے جوش و خروش سے خیر مقدم کیا تھا جو ان کی تقریظ آئینِ اکبری کا طرۂ امتیاز رہے۔ اُن کا ولولۂ حیات ان کی قنوطیت کی نفی کرتا ہوا اِن اشعار میں ڈھل جاتا ہے:

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

جا دادِ بادہ نوشیِ رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

جہاں تک گردشِ فلک اور اس سے حاصل ہونے والے غم کا سوال ہے، غالب یہ سوچ کر آسودہ ہو جاتے ہیں کہ چونکہ گردشِ فلک خدا کے حکم سے ہے، لہٰذا فلک سے ہمیں جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ ظلم نہیں کہا جا سکتا :

چوں جنبشِ سپہر بفرمانِ داور است
بیداد نبود آنچہ بما آسماں دہد

اسی طرح اُن کا خیال ہے کہ ناخوشی کے پردے میں خوشی پوشیدہ ہے۔ دھوبی کپڑے کو پتھر پر پٹکتا ضرور ہے، مگر اس لیے کہ وہ اس کا حسن نکھارنا چاہتا ہے، نہ کہ اس لیے کہ وہ اس پر ستم ڈھانا چاہتا ہے

در پردۂ ناخوشی خوشی پنہان است
گاز نہ زخشم جامہ بر سنگ زند

غالب ایک شعر میں اُس مکتبِ فکر کی سرزنش کرتے ہیں جو ہستی کو گناہ یا شرِ محض سے تعبیر کرتا ہے:

دَم از وُجُود کُ ذَنبٌ زنند بیخبر ال
چساں عطیۂ حق را گناہ می نامند

یعنی جس کے نزدیک وجود ایک گناہ ہے وہ حقیقت سے بےخبر ہیں۔ بھلا عطیۂ حق کہیں گناہ ہو سکتا ہے ؟

"آرزومندی اور حسرت پرستی کا کھیل غالب نے جس زندہ دلی اور مردانگی سے کھیلا ہے، وہ انھیں جدید نسل کے ذہنی اور جذباتی آہنگ سے بہت قریب کرتا ہے۔ وہ تمناؤں کے رنگ محل سجاتے ہیں، لیکن ان کے ٹوٹ جانے پر زندگی کے ولولے، امنگ اور آرزومندی کے جذبے سے دامن کش نہیں ہوتے۔"

(پروفیسر محمد حسن)

افضل مرتضیٰ عرفی

غزل

جو چاہیں وہ دے ڈالیں، وہ صاحب زر ٹھہرے
ہم کو جو ملے لے لیں، ہم دست نگر ٹھہرے

کیوں اہل گلستاں پر ہم بارِ نظر ٹھہرے؟
اپنا ہی تو گلشن ہے، گلشن میں اگر ٹھہرے

اُس محفل خوباں میں، اُن شوخ نگاہوں سے
جو پھول سے ٹپکے تھے وہ زخم جگر ٹھہرے

باقی نہیں گلشن میں اب خاکِ نشیمن بھی
اب برقِ بلا دیکھیں گلشن میں کدھر ٹھہرے

وہ قافلہ اب جس کا رہبر نہ رہا کوئی
جاتے تو کدھر جاتے، ٹھہرے تو کدھر ٹھہرے

کانٹوں سے گلستاں تک تو راہ نمائی کی
منزل پہ پہونچتے ہی ہم گردِ سفر ٹھہرے

صیاد نے ٹوکا ہے، کانٹوں نے بھی چھیڑا ہے
ہم اہلِ وفا عرفیؔ گلشن میں جدھر ٹھہرے

منوہر لال ہادی

سانیٹ

ازل نے تو بنائی تھیں ہمیں بے نام زنجیریں
مگر کچھ نام ان سایوں پہ ہم نے کر دیئے تحریر
یہ زنجیر وراثت ہے، وہ ہے ماحول کی زنجیر
انھیں کے حکم سے گردش کیا کرتی ہیں تقدیریں

کتابِ اہلِ علم و آگہی میں یہ حکایت ہے
یہ دونوں مل ملا کے ہم کو دیتی ہیں مسرت بھی
اذیت بھی، صعوبت بھی، بصارت بھی، بصیرت بھی
تمھیں ان سے محبت ہے، مجھے ان سے شکایت ہے

عجب آئین ہے ان کا، عجب دستور ہے ان کا
کسی کو بادۂ عصیاں پلا کر کر دیا گمراہ
کسی کو بخش کر پاکیزگی کے جام، خود آگاہ
یہ ہیں پردہ نشیں شاید کہ رخ مستور ہے ان کا

مگر فیضِ خدا سے زیست یہ قدرت بھی رکھتی ہے
کسی حد تک، یہ ان کی برتری کم کر بھی سکتی ہے

کوائف جامعہ

"ہندوستان میں تہذیب اسلامی کا ارتقاء"

ایک سیمینار

۲، ۳، ۴ رجنوری ۱۹۸۱ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اسلامک وعرب۔ ایرانین اسٹڈیز کے زیر اہتمام پندرھویں صدی ہجری کے استقبال کے سلسلے میں "ہندوستان میں تہذیب اسلامی کا ارتقاء" کے موضوع پر ایک سہ روزہ سیمینار منعقد ہوا۔

شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی نے اس سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ:
یہ حسن اتفاق ہے کہ آج جب ہم پندرھویں صدی ہجری کی تقریبات کے سلسلے میں اس سیمینار میں جمع ہوتے ہیں تو عیسوی کلنڈر کا بھی نیا سال شروع ہوا ہے۔ یہ دونوں کلنڈر ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ دونوں ہمیں دنیا کے دو ایسے بڑے پیغمبروں کی یاد دلاتے ہیں جنھوں نے انسانیت کو صحیح راہ پر لگانے کی خاطر بڑی عظیم اور لازوال خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے مندوبین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ: مجھے امید ہے کہ ہندوستان میں تہذیب اسلامی کے ارتقا کا جائزہ لیتے وقت آپ ہمیں بتلائیں گے کہ مسلمانوں نے ہندوستانی تہذیب کو کیا دیا اور خود اس سے کیا لیا۔ اپنے خطبے کے آخر میں فرمایا کہ: اس میں عام رواج کے برخلاف صرف یونیورسٹیوں کے دانشور حضرات شریک نہیں ہیں بلکہ ان کے دوش بدوش ہندوستان کے اہم مذہبی درس گاہوں کے نمائندے بھی یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ اس سیمینار میں جدید و قدیم کا یہ سنگم جو پندرھویں صدی ہجری کے استقبال کے موقع پر دیکھنے میں آیا بلاشبہ ایک فال نیک ہے۔ ایک بہت بڑا اور ضروری تجربہ ہے۔ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا کہ:

نئے عہد کی پیچیدگیوں کو سامنے رکھتے ہوئے مستقبل میں بھی تہذیب و تمدن کو آگے بڑھانے کے لیے انھیں گہرائی سے اس سمت میں فکری و عملی سفر کرنا ہے اور زندگی کی ترتیب اور اس کی رونق بڑھانے میں حصّہ لینا اور اس کے ساتھ ہی اپنی ملی شناخت اور مذہبی تشخص کو برقرار رکھنا ہے، تو قدامت و جدیدیت کے گھروندوں سے باہر نکل کر ان علماء و دانشوروں کو یکجا اور متحد کرنا ہوگا۔

سیمنار کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے شعبہ کے صدر پروفیسر ڈاکٹر مشیر الحق نے جو اس سیمنار کے ڈائرکٹر بھی تھے فرمایا کہ: اسلامی تہذیب اپنی گوناگونیت کے اعتبار سے دوسری ہندوستانی تہذیبوں سے مختلف ہے، اس لئے ہم نے چودھویں صدی ہجری کے اختتام اور پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کے موقع پر اس کا بھرپور جائزہ ضروری سمجھا۔ اس سیمنار میں" تہذیب کے وسیع تر مفہوم کو پیش نظر رکھا گیا اور جہاں ایک طرف مذہبی علوم، سیاسی اور سماجی تحریکوں پر مقالے پڑھے گئے وہیں دوسری طرف فنونِ لطیفہ، مثلاً مصوری، موسیقی اور فن تعمیر میں بھی مسلمانوں کی ہندستان میں آمد کے بعد کے حالات، مسلم ماہرین کے کام اور ہندوستانی معاشرہ پر ان کے اثرات کا جائزہ لیا گیا۔ اس سیمنار کے موضوعات میں تفاسیر و تراجم قرآن، احادیث نبویؐ، فقہ اسلامی اور ان سے متعلق دیگر علوم کی عربی، فارسی اور اردو میں ترویج و اشاعت کے سلسلے میں ہندوستانی مسلمانوں بالخصوص ہندوستان کے علمائے اسلام نے جو قابل فخر خدمات انجام دی ہیں، ان کا معروضی انداز میں جائزہ لیا گیا۔ ڈاکٹر سالم قدوائی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے اپنے مقالے میں فرمایا کہ: اردو زبان میں جو دنیا کی علمی زبانوں میں سب سے کم سن ہے، تقریباً ساڑھے چار سو کتابیں صرف قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر سے متعلق لکھی جا چکی ہیں۔" پروفیسر مشیر الحق کا کہنا تھا کہ" شروع کی دو تین صدیوں میں جب کہ مسلمان کے قدم یہاں پوری طرح سے جمے بھی نہیں تھے، ہندوستان میں تقریباً تین سو فقہاء اس حیثیت کے پیدا ہو چکے تھے، جن کے نام تذکروں میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد کی تو کوئی گنتی ہی نہیں ہے۔" "علوم قرآنیہ اور ہندوستانی مسلمان" کے موضوع پر اپنے مقالہ میں ڈاکٹر ماجد علی خاں نے اصولِ تفسیر، ابجدی فہرستوں اور اشاریوں، لغاتِ قرآن اور متعلقات قرآن پر تحریر کردہ تصانیف سے بحث کی۔ مولانا جمال الدین اعظمی نے "عربی و فارسی تفسیر نویسی میں ہندوستانی مسلمانوں کا حق" پر اپنے

مضمون میں کہا کہ "دیگر علوم کی طرح تفسیر کے میدان میں بھی 'ہندوستان' دوسرے ملکوں سے کچھ کم نہیں رہا"۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں انھوں نے ہندوستانی علماء کی ۲۱ عربی اور ۱۳ فارسی تفاسیر پر مختصر روشنی ڈالی۔ جامعۃ الرشاد (اعظم گڑھ) کے ناظم مولانا مجیب اللہ ندوی نے اپنے مقالہ میں جو حدیث نبوی کی ہندوستان میں ترویج و اشاعت کا احاطہ کئے ہوئے تھا بتایا کہ "ہندوستان میں علم حدیث کا عام رواج حقیقت میں نویں اور دسویں صدی سے شروع ہوا"۔ انھوں نے کہا "علم حدیث پر جو کام ہوا ہے اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے"۔ بنارس ہندو یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے صدر پروفیسر بدرالحسن عابدی نے "علوم اسلامیہ کی نشو و نما میں ہندوستان کے شیعی علماء کی خدمات" پر اپنے مقالہ میں کہا "بجز موسیقی کے مذہب شیعہ میں جس کی تحصیل کو ممنوع و حرام قرار دیا گیا ہے کوئی ایسی فرع علم نہیں جس پر علمائے شیعیان ہند نے بصورت رسالہ یا شرح اپنی تصنیفات نہ پیش کی ہوں۔" ندوۃ العلماء کے استاد اور سابق مہتمم مولانا ابوالعرفان ندوی کا خیال تھا کہ ہندوستان کو اسلامی علوم و فنون میں مرکزی مقام حاصل ہونے کا سبب وسط ایشیا میں تاتاری فتنہ تھا، جس کے سبب اس علاقہ کے علماء، اہل دانش مصنفین اور مفکرین نے ہندوستان کو اپنی پناہ گاہ سمجھا اور ان کے شاگردوں میں ایسے باکمال فضلاء پیدا ہوئے جو اپنے عہد کے ابن سینا اور فارابی تھے"۔ ہندوستان میں تصوف کی اہمیت کو بھی سمینار میں نظر انداز نہیں کیا گیا اور "وحدت الوجود اور وحدت الشہود" پر ایک پُر مغز مقالہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے پڑھا تو "جدید ہندوستان میں تصوف میں اصلاحی کوششوں" کا اجمالی جائزہ ڈاکٹر رشید الوحیدی نے لیا۔

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اسلامی تہذیب کی جو خدمات انجام دی گئی ہیں، ان کا جائزہ لیتے وقت ڈاکٹر محمد صابر خاں (کلکتہ) نے بنگال کی، ڈاکٹر انور معظم (حیدرآباد) نے آندھرا پردیش کی، اور ڈاکٹر عبدالقیوم رفیقی (سرینگر) نے کشمیر کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ "ہندی اسلامی تہذیب میں ایرانی اور زرتشتی عناصر" کی نشاندہی اگر ایک طرف ڈاکٹر کبیر جائسی (کشمیر یونیورسٹی) نے کی تو "ہندوستانی مذاہب" کے مطالعہ سے "ہندی مسلمانوں کو جو دلچسپی رہی ہے اس کی تفصیل ڈاکٹر آزاد فاروقی نے اپنے مقالہ میں بتاتے ہوئے اکبر کے عہد، دارا شکوہ کی ذاتی

کوششوں اور مشہور زمانہ تصنیف "دابستانِ مذاہب" کا تذکرہ کیا۔

ہندی، فارسی، عربی اور اردو ادبیات کے اساتذہ، جناب مجیب رضوی، ڈاکٹر شعیب اعظمی، جناب محمد اسلم اصلاحی اور ڈاکٹر شمیم حنفی نے اپنے اپنے مقالوں میں جن خیالات کا اظہار کیا ان سے سیمینار کے زیر بحث موضوع پر مفید روشنی پڑی۔ جناب عتیق صدیقی صاحب نے اسلامی لٹریچر کی ترویج و اشاعت میں "لکھنؤ کے مطابع" کے رول کا تذکرہ کیا اور اپنے مقالہ میں اس رائے کی تائید کی کہ لکھنؤ ہندوستان میں "بغداد و قرطبہ" اور "نیشاپور و بخارا" کے مثل تھا۔

فنونِ لطیفہ میں "اسلامی ہند میں مصوری کی روایت" پر نیشنل گیلری آف ماڈرن آرٹ (نئی دہلی) کے ڈاکٹر انیس فاروقی، "خطاطی کی روایت" پر عربک و پرشین ریسرچ ڈائرکٹوریٹ (ٹونک، راجستھان) کے شوکت علی خاں، "کلاسیکی اور عوامی موسیقی کی ترقی و تزئین میں ہندی مسلمانوں کا حصہ" پر انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ کے فیلو شہاب سرمدی اور "ہندی مسلم فنِ تعمیر کے مقصد، تکنیک اور جمالیات" پر سید جمال الدین نے اپنے مقالے پیش کئے۔ ان چاروں مقالوں میں جو تاثر سامنے آیا وہ یہ تھا کہ ان تمام فنونِ لطیفہ کی مسلمانوں نے جو پرستی کی اس میں اسی وسعتِ قلب کی آئینہ داری اور بلندی و کشادگی ہے جس کی جھلکیاں ان کے ادب میں ملتی ہیں۔

ہند کی عہد وسطیٰ کی تاریخ پر مقالے پڑھے گئے ایک پروفیسر اطہر انصاری نے "ہندوستانی مسلمانوں کا نظم سلطنت و حکمرانی" پر پڑھا، جس میں تحقیقی نقطۂ نظر سے یہ بتایا گیا تھا کہ مملوک، سلجوق، عثمانی اور اس دور کے دنیا میں دیگر مسلمان حکمراں گروہوں کے یہاں وہ خصوصیات نہیں ہیں جن کی امتیازی جھلک ہندوستانی مسلمانوں کی حکمراں کی تاریخ میں ملتی ہے۔ دوسرا مقالہ "دہلی سلطنت کے نظم و نسق میں ہندوؤں کا حصہ" میں ڈاکٹر مظہر یٰسین صدیقی نے تاریخی شواہد پیش کرکے اس تصور کو "خیال خام" قرار دیا کہ "دہلی سلطنت کے قیام کے بعد ہندوستان کے اصل باشندوں کو ترک حکمرانوں نے اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر حکومت کے کاروبار سے دور رکھا" اگر ایک طرف پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے مجدد الف ثانی سے ولی اللہی تک تاریخ کی روشنی میں مسلمانوں کے رویوں اور رجحانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے "ہندوستانی مسلمانوں میں راسخ العقیدگی کی روایت" کا جائزہ لیا تو دوسری طرف پروفیسر آل احمد سرور نے سرسید سے مولانا آزاد تک ہونے والی "مسلمانوں میں

تجدد و اصلاح کی کوششوں" پر مربوط تبصرہ کیا۔ "جدید ہندوستان میں مسلم تعلیمی تحریکات" پر راقم الحروف اختر الواسع نے مقالہ پیش کیا، جس میں قدیم و جدید دونوں طرز کی تعلیمی کوششوں کا جو "تحریک" کا درجہ اختیار کر گئیں ایک مختصر مگر اہم تجزیاتی مطالعہ تھا۔

اس سہ روزہ سمینار میں ۲۰ مقالے پیش کیے گئے اور اُردو کو "ذریعۂ اظہار" رکھا گیا جس کی وجہ سے اس کی دلکشی اور عوامی سطح تک اس کی فیض رسانی عام ہو گئی۔ اس سمینار میں مختلف مسلک وعقیدہ کے لوگوں نے شرکت کی جن میں جامعہ کے خازن جناب رضی الحسن چشتی اور اساتذہ، طلبہ اور کارکنان کے علاوہ ہندوستان میں پاکستان کے سفیر جناب عبدالستار صاحب، پاکستان نژاد امریکی پروفیسر مسعود غزنوی، قرآن فہمی کے ذوق کو عام کرنے کے لیے کوشاں پاکستان سول سروس کے سابق رکن جناب محمد اویس، اسلام آباد کے ڈاکٹر نظیر صدیقی، ہندی میں قرآن کے مترجم محمد فاروق خاں، جامعہ کے سابق استاد اور ناظم دینیات مولانا قاضی زین العابدین، جناب غلام ربانی تاباں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے صدر ڈاکٹر محمد اقبال انصاری، صدر شعبۂ اُردو دلّی یونیورسٹی ڈاکٹر قمر رئیس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور جامعہ کے سابق خازن کرنل بشیر حسین زیدی، محترمہ بیگم صالحہ عابد حسین، بمبئی سے تشریف لانے والے اصغر علی انجینئر، منادی کے ایڈیٹر خواجہ حسن ثانی نظامی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر اجمل اجملی، پروفیسر نظام الدین گوریکر (بمبئی یونیورسٹی) ڈاکٹر یعقوب عمر (عثمانیہ) اور ڈاکٹر محمود صدیقی (بڑودہ یونیورسٹی) شامل تھے۔

اس سمینار کے مختلف جلسوں کی صدارت کرنے والوں میں مشہور مسیحی عالم اور مستشرق ڈاکٹر کرسچین ڈبلیو۔ ٹرال (ودیا جیوتی انسٹی ٹیوٹ) دہلی) پروفیسر علی اشرف (صدر شعبۂ سیاسیات، جامعہ ملیہ)، پروفیسر آل احمد سرور (ڈائریکٹر، اقبال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی)، (مولانا) پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی (سابق ڈین، فیکلٹی آف تھیالوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) ڈاکٹر انور معظم (صدر، شعبۂ اسلامیات، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد)، مولانا ابوالعرفان ندوی (استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) اور پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی (ڈین، فیکلٹی آف ہیومنٹیز اینڈ سائنسز جامعہ ملیہ) شامل تھے۔

سمینار کے اختتام پر مندوبین کی طرف مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور ڈاکٹر محمد صابر خان نے جامعہ کے

ارباب حل وعقد اور منتظمین سیمینار کاشکریہ ادا کیا اور پروفیسر مشیر الحق نے مندوبین اور سامعین کاشکریہ ادا کیا

(احتر الواسع)

سیرت پر ایک جلسہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک پر، طلبائے کالج کی یونین کے اہتمام میں ۱۲ رجنوری کو ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت جامعہ کے سابق خازن کرنل بشیر حسین زیدی صاحب نے فرمائی۔ اس جلسے کے خصوصی مہمان جماعت اسلامی کے مشہور مقرر مولانا سید حامد علی صاحب تھے معزز مہمان کے علاوہ حسب ذیل حضرات نے تقریریں کیں :

۱۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، پروفیسر وصدر شعبۂ اردو اور ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز

۲۔ جناب انوار علی خاں سوز، لکچرر شعبۂ انگریزی جامعہ کالج۔

۳۔ جناب محمد عبد الحیٔ، متعلم ایم اے (سوشل ورک)

خصوصی مہمان مولانا حامد صاحب اور دوسرے فاضل مقررین نے، حسب ترتیب، حسب ذیل عنوانات پر اظہار خیال فرمایا:

۱۔ آنحضرت صلعم بنی نوع انسان کے رہنما کی حیثیت سے ؛

۲۔ حضور پاک بحیثیت ایک سوشل ریفارمر ؛

۳۔ آنحضرت کی زندگی کے عملی پہلو ؛

۴۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انقلاب۔

ان تقریروں کے علاوہ جامعہ کی ایک طالبہ، صفیہ بیگم نے علامہ اقبال کی مشہور نظم : "خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ" بڑے دلکش ترنم میں پڑھ کر سنایا۔ جلسے کے آخر میں جناب زیدی صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں پہلے طلبائے جامعہ کو اس جلسے کے انعقاد پر مبارکباد دی، اس کے بعد فرمایا کہ: ہم مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی محبت اور عقیدت کا تو دم بھرتے ہیں، مگر افسوس کہ ان کی تعلیمات پر اس طرح عمل نہیں کرتے جس طرح کرنا چاہیے۔ اسلام میں پڑوسی کے حقوق کی ادائیگی اور تعلیم کے حصول پر جو زور دیا گیا ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے موصوف

نے فرمایا کہ ہم ان کی طرف مناسب توجہ دینی چاہئے۔
جلسے کا آغاز جناب قاری محمد سلیمان صاحب کی تلاوت قرآن حکیم سے ہوا تھا۔ ناظم کے فرائض اسٹوڈنٹس یونین کے سکریٹری جناب زبیر خاں صاحب نے انجام دیئے۔
جناب رضی الحسن چشتی صاحب، خازن جامعہ اور پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، اعزازی ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے علاوہ، اساتذہ، طلباء، اور کارکنوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

ڈاکٹر انصاری کی یاد میں ڈاک ٹکٹ کا اجرا

۲۵ر دسمبر کو، جو ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کی تاریخ پیدائش ہے، امیر جامعہ و نائب صدر جمہوریہ، جناب جسٹس ایم ہدایت اللہ صاحب کی صدارت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک خصوصی جلسہ منعقد ہوا، جس میں مرحوم کی قومی خدمات کے اعتراف میں ۲۵ پیسے کا ایک خصوصی ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا۔ اس جلسے میں وزیر مواصلات، جناب سی۔ ایم۔ اسٹیفن بھی تشریف لائے تھے۔ شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب مہمانوں اور حاضرین جلسہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے، بڑے دن کی مناسبت سے وزیر موصوف کو کرسمس کی مبارکباد دی۔ اس کے بعد مختصر تقریر کے بعد جناب اسٹیفن نے امیر جامعہ کی خدمت میں یادگار ٹکٹ کا ایک سٹ پیش کیا، اس کے بعد امیر جامعہ نے ڈاکٹر انصاری کی قومی خدمات پر روشنی ڈالی۔

اس موقع پر خصوصی ڈاک ٹکٹ کے ساتھ ساتھ محکمۂ ڈاک کی طرف سے ہندی اور انگریزی میں ایک " انفرمیشن شیٹ " بھی جاری کی گئی تھی، جس میں مختصراً ڈاکٹر انصاری مرحوم کے حالات زندگی درج تھے۔ ذیل میں اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

" ڈاکٹر مختار احمد انصاری ۲۵ر دسمبر ۱۸۸۰ء کو ضلع غازی پور (یوپی) کے ایک قصبہ یوسف پور میں پیدا ہوئے۔ مدراس میڈیکل کالج سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد، مزید تعلیم کے لیے ۱۹۰۰ء میں انگلستان تشریف لے گئے اور ایم۔ ڈی اور ایم۔ ایس کے امتحانات میں

اوّل آئے۔ اس امتیازی کامیابی کی وجہ سے یہی ایک ہندوستانی ہیں جن کا لندن کے لوک ہسپتال میں رجسٹرار کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا، بعد میں ان کی خدمات چیرنگ کراس ہسپتال ہیں منتقل کردی گئیں، جہاں سرجری کے میدان میں ان کی خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر انصاری کے نام سے ایک وارڈ موسوم کیا گیا، نیز انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن کے سکریٹری منتخب ہوئے اور اس کے بعد اس کے صدر۔

لندن کے دوران قیام ہی میں، ہندوستان کے قومی رہنماؤں سے ڈاکٹر انصاری مرحوم کے گہرے تعلقات قائم ہوگئے تھے اور موتی لال نہرو، حکیم اجمل خاں اور جواہر لال نہرو سے دوستی کا وہ رشتہ استوار ہوا وہ تا قیامت باقی رہا۔ بالآخر ۱۹۱۰ء میں ہندوستان واپس آئے اور دہلی میں اپنا مطب شروع کیا اور بہت جلد سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لینے لگے۔

وہ سب سے پہلے بلقان جنگ کے زمانے میں، دسمبر ۱۹۱۲ء میں ایک طبی وفد کے ساتھ ترکی گئے اور ان کی رہنمائی میں اس وفد نے ترکی کے زخمی مجاہدین کی جو عظیم الشان خدمات انجام دیں، اس کی وجہ سے دنیا کی نظروں میں ہندوستان کا سر اونچا ہوگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس اور مسلم لیگ کا موقف اور مطمح نظر قریب قریب ایک تھا، ڈاکٹر انصاری کو دونوں پارٹیوں کا اعتماد حاصل تھا اور دونوں انھیں عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۰ء میں انھوں نے لیگ کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت کی اور ۱۹۲۷ء میں مدراس میں کانگریس اجلاس کی۔ انھوں نے پوری جرأت اور بے خوفی کے ساتھ تحریک خلافت کی حمایت کی اور غیر مشروط طور پر مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ دہلی میں ان کا مکان، دار السّلام کانگریس کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ مہاتما گاندھی، ڈاکٹر انصاری کی زندگی میں جب بھی دہلی آتے تو اسی مکان میں ٹھہرتے تھے۔

اپنی وسیع سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ انھیں تعلیم کی ترویج و اشاعت سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے دہلی میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی اور بنارس میں کاشی ودّیا پیٹھ کی مدد کی اور جامعہ کے پہلے چانسلر حکیم اجمل خاں (۱۹۲۰[له] - ۱۹۲۷) کی وفات کے بعد ڈاکٹر انصاری جامعہ ملّیہ

له غلطی سے ۱۹۰۰ء چھپا ہے۔

کے چانسلر منتخب ہوتے (۹۲۸ - ۱۹۳۶) وہ مختلف رسالوں کے لیے مضامین بھی (میڈیکل مسائل پر) لکھا کرتے تھے، ان کی ایک کتاب : THE REGENERATION OF MAN (تجدید شباب) بھی ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود علاج معالجے کا کام جاری رہتا اور امیر و غریب ہر ایک کا یکساں توجہ اور خلوص کے ساتھ علاج کرتے۔ ۱۰ مئی ۱۹۳۶ء کو ان کا انتقال ہوا۔"

ایک استاد کی تازہ کتاب ـــــ بے چہرہ لوگ

ڈاکٹر اوصاف احمد، ریڈر شعبۂ معاشیات کے افسانوں کا ایک مجموعہ: "بے چہرہ لوگ" ابھی حال (۱۹۸۰ء) میں شائع ہوا ہے فاضل مصنف کا خصوصی مضمون معاشیات ہے اور وہ زیادہ تر اپنے اسی مضمون کے مختلف پہلوؤں پر اردو اور انگریزی میں لکھتے ہیں۔ چنانچہ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے اردو سہ ماہی رسالہ: "اسلام اور عصر جدید" میں ان کا ایک طویل اور مبسوط مضمون: "اسلامی معیشت میں مالیاتی پالیسی کے چند بنیادی مسائل" کے عنوان سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا، مگر موصوف کبھی کبھی افسانے بھی لکھتے ہیں، چنانچہ گذشتہ بیس سال کے عرصے میں جو وقتاً فوقتاً کہانیاں لکھی ہیں، ان کا انتخاب، جن کی تعداد ۲۰ ہے، اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے۔

ان کہانیوں کے بارے میں خود فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ: "... ان کہانیوں میں روش عام کی پیروی ہرگز نہیں کی گئی ہے، لکھنے کے لیے قلم اسی وقت ہاتھ میں لیا گیا جب کہنے کے لیے کچھ تھا۔ اگر کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا تو کچھ کہنے پر خاموشی کو ترجیح دی گئی۔" انھوں نے مزید لکھا ہے کہ: "اس مجموعے میں جو کہانیاں پیش کی جا رہی ہیں، ان میں سے بعض میں ہئیت سے متعلق کچھ تجربے بھی کیے گئے ہیں۔ ایک دو علامتی کہانیاں بھی شامل ہیں۔ علامتی کہانیوں کے سلسلے میں کوشش اس بات کی گئی ہے کہ ذہن آسانی سے اُن چیزوں کی طرف منتقل ہو جائے جن کے لیے علامتوں کا استعمال کیا گیا ہے، تاکہ ابلاغ میں کوئی رکاوٹ نہ کھڑی ہو اور کہانی چیستاں نہ بننے پائے، کہانی ہی رہے۔"

جہاں تک "کوائف نگار" سمجھ سکا ہے، ان کہانیوں کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ موجودہ صنعتی اور خلائی دور میں، نوجوان زندگی کے اعلیٰ قدروں سے محروم ہوتے جارہے ہیں، غالباً اسی لحاظ سے کتاب کا نام: "بے چہرہ لوگ" رکھا گیا ہے۔

مجموعے کی قیمت پندرہ روپے ہے اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ اور اس کی دوسری شاخوں سے مل سکتا ہے۔ مجلد مع گرد پوش، کتابت وطباعت اچھی، سائز ۲۲×۱۸/۸، صفحات ۱۶۰۔

ایک کارکن کی تازہ کتاب ـــــ مولانا محمد علی، ایک مطالعہ

گذشتہ سال (۱۹۸۰ء) کے اواخر میں عبداللطیف اعظمی، مدیر معاون ماہنامہ "جامعہ" کی ایک کتاب: "مولانا محمد علی ـــ ایک مطالعہ" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ جامعہ کے مولانا محمد علی نمبر حصہ دوم کے جملہ مضامین اس میں شامل ہیں اور حصہ اوّل کے دو مضمون: "ہفتہ وار کامریڈ" (از سید غلام ربانی مرحوم) اور "روزنامہ ہمدرد" (از مولانا عبدالماجد دریاآبادی مرحوم، تلخیص : عبداللطیف اعظمی) اس میں نقل کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ تین مضمون نئے ہیں، ایک مولانا محمد علی مرحوم کا: "میرے مذہبی استاد ـــ مولانا ابوالکلام آزاد" اور باقی دو مرتب کے قلم سے ہیں: "(۱) مولانا محمد علی اور مولانا آزاد" (۲) "غلطی ہائے مضامین" دوسرے مضمون میں ان غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے، جو اُن کتابوں اور مضامین میں بالعموم موجود ہیں جو مولانا محمد علی پر لکھے گئے ہیں۔ آخر میں اس کتاب کے مضمون نگاروں کا مختصراً تعارف کرایا گیا ہے۔

اس کتاب کی قیمت بیس روپے ہے اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ اور اس کی شاخوں سے مل سکتی ہے۔ کتاب بڑے سائز پر ۱۸۶ صفحات کی اور مجلد ہے۔

(کوائف نگار)

تعارف وتبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجے جائیں)

یادگار عرش ملسیانی

مرتبہ: مالک رام

سائز $\frac{22 \times 18}{8}$، حجم ۱۵۰ صفحات، طباعت وکتابت عمدہ، غیر مجلد، تاریخ اشاعت: جنوری ۱۹۸۱ء۔ قیمت: ساڑھے بارہ روپے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

پنڈت بالمکند عرشؔ ملسیانی کی پہلی برسی کے موقع پر ماہنامہ کتاب نما نے مرحوم کی یاد میں ایک خصوصی شمارہ شائع کیا ہے جس میں ان کی شاعری، نثر، ترجمے اور دوسرے علمی وادبی کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ شروع میں شیخ محمد عبداللہ (وزیر اعلیٰ ریاست جموں وکشمیر)، کرنل بشیر حسین زیدی اور متعدد ادیبوں اور شاعروں کے پیغامات ہیں، اس کے بعد ۱۸ مضامین، ۱۴ منظوم خراج عقیدت اور متعدد قطعات تاریخ وفات ہیں اور آخر میں ۳۱ صفحات میں (۱۲۰ تا ۱۵۰) مرحوم کے کلام کا انتخاب ہے۔

پہلا مضمون: "میرا جیون ساتھی" شریمتی راج عرش کا ہے۔ انھوں نے گھریلو حالات، مزاجی کیفیت اور روزمرہ کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ: "بچپن گانوؔں میں عام بچوّں کی طرح عام ماحول میں گزرا۔ ماں باپ کے اکلوتے بیٹے اور چار بہنوں کے لاڈلے بھائی تھے۔ اسی لیے جہاں زندگی بھر کے لیے طبیعت کی سادگی پائی، وہیں کسی حد تک ضدی بھی ہوگئے، لیکن سادگی ان کا گہنا تھی، مزاج کے خوش باش، لباس میں سادہ، کسی لگی لپٹی کے بغیر سچی کھری بات کہنے والے، انھوں نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا لیکن اپنے اصولوں کے پکےّ اور نڈر، دنیاداری کو سمجھنے والے، ہمیشہ خود بھی خوش رہتے اور ماحول کو بھی خوبصورت بنا دیتے تھے، قدرت نے مزاج شاعرانہ دیا تھا،

ایسے میں بھلا محکمۂ نہر کی ادورسیری کیسے راس آسکتی تھی! گھر کی مالی دشواریوں اور پتاجی کے منع کرنے کے باوجود وہاں سے استعفیٰ دے کر چلے آئے۔"

مرحوم کو شطرنج اور تاش کھیلنے کا کس قدر شوق تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے، ان کی اہلیہ نے لکھا ہے کہ: "رمی اور شطرنج اور برج کھیلنے کے بڑے شوقین تھے۔ نیارپور میں رہتے تھے تو شطرنج کھیلنے کے لیے منٹو روڈ جاتے تھے (دونوں جگہوں میں تقریباً پانچ چھ میل کا فاصلہ ہوگا)، ماڈل ٹاؤن آگئے تو نیارپور جانے لگے۔ (یہاں بھی ڈھائی تین میل کا فاصلہ ہوگا) شطرنج کا شوق تو جنون کی حد تک جا پہنچا تھا۔ اتوار کو جو اخبار ملتا تھا اس میں شطرنج کے معمّے لے کر سوچتے رہتے۔ کبھی کبھار گھر پر شطرنج کی بیٹھک جمتی تو ۴۸-۴۸ اور ۷۲-۷۲ گھنٹے تک چلتی۔ مقابل کے کھلاڑی بدل جاتے لیکن یہ نہیں اٹھتے، ہر کھلاڑی کو مات دینے کی دھن میں اٹھنے کا نام نہ لیتے، بیٹھے بیٹھے ٹانگیں جکڑ جاتیں، اٹھتے تو چکّر کھا کر گر جاتے لیکن کھیلنے سے نہ ٹلتے ـــــ رمی کا معمولی کھیل بھی ان کی پھلجھڑیوں سے مزیدار بن جاتا تھا، قوت حافظہ اتنی تیز تھی کہ پہلے راؤنڈ میں کس ساتھی کے پاس کون کون سے پتے تھے، سب یاد رہتے۔ اسی سے نئی بازی میں کس کے پاس کون سے پتے ہیں، اس کا بہ آسانی اندازہ لگالیتے اور اپنا راؤنڈ جلدی سے بنا لیتے۔ ریٹائر ہونے کے بعد شطرنج اور رمی کا شوق اور بھی زیادہ ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ زندگی کے آخری دور میں بیہوشی کے عالم میں کہتے، راج! میرے پتے ڈھونڈ دو، ملتے نہیں۔"

مرحوم کی آخری بیماری اور وفات کے بارے میں موصوفہ نے لکھا ہے کہ: "۱۹۷۶ء سے تو جیسے بیماریوں نے ان سے دوستی کرلی تھی۔ پہلے بھگندر کی وجہ سے تقریباً دو مہینے تک بخار میں پڑے رہے، کچھ ٹھیک ہوئے تھے کہ ماڈل ٹاؤن ہی میں ایک حادثے کی لپیٹ میں آگئے، تین مہینے الٹی ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا رہا۔ شالیمار باغ سادہ کو نا سونا ہوگیا، جہاں ہر شام قہقہے گونجا کرتے تھے۔ سب سے بڑھ کر ۱۹۷۶ء میں باپ کی شفقت سے محروم ہوگئے۔ پریشانیاں اور بڑھ گئیں، مقدر کا ستارہ گردش میں آچکا تھا، والد کی جدائی کا صدمہ برداشت نہ ہوسکا، تن اور من کو ایسا گھن لگ گیا کہ آخر ۲ ستمبر ۱۹۷۹ء صبح سویرے انھوں نے اپنے لیے بھی وہی آرام گاہ تلاش کرلی اور اسی راہ پر چل دئے جس سے والد بزرگوار راہی ملک عدم ہوئے تھے۔ زندہ دلی کا درس دینے والا، زندگی کو امنگ اور جوش بھر دینے والا، خود لوگوں کی زندگی سے اُٹھ گیا۔"

مالک رام، دوارکاداس شعلہ، ڈاکٹر خلیق احمد نقوی اور جگن ناتھ آزاد اور دوسرے ادیبوں نے مرحوم کے حالاتِ زندگی پر اور ڈاکٹر محمد حسن نے ان کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ محمد حسن صاحب نے مرحوم کی نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "ان سب نظموں سے صاف ظاہر ہے کہ عرشؔ انسانی زندگی میں توازن کے شیدائی ہیں اور بہیمیت اور درندگی کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔" مرحوم کی رباعیوں اور گیتوں کے بارے میں لکھا ہے: "ہفت رنگ میں رباعیات اور گیت بھی شامل ہیں۔ گیت ہلکے پھلکے اور رواں ہیں مگر کوئی خاص بات پیدا نہیں ہوئی ہے، البتہ رباعیوں میں بڑا کساؤ اور ڈرامائی حسن کاری ہے۔" مزید لکھتے ہیں: "رباعیاں تعداد میں کم، مگر فن کاری اور کیفیت میں اعلا ہیں۔" ان کی غزلوں کے بارے میں فرمایا ہے: "عرشؔ کی غزلوں میں اردو کی شعری روایت کا احترام ہی نہیں، اس کا استحکام اور استعمال دونوں ہیں، انھوں نے اسے محض پوجا نہیں، برتا بھی ہے اور سلیقے سے برتا ہے۔ اس مضمون کا اختتام ان لفظوں پر ہوا ہے: "غرض عرشؔ کی شاعری، اردو شاعری کی نئی جہت اور اُردو کی شعری روایات کی نئی معنویت کا سنگ میل ہے۔"

جو لوگ عرشؔ ملسیانی مرحوم کے حالاتِ زندگی، ان کی شاعری اور دوسری ادبی خدمات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے یہ مختصر کتاب بہت مفید ہے۔ اس کے فاضل مرتب، جناب مالک رام اور "کتاب نما" کے مینجنگ اڈیٹر شاہد علی خاں صاحب اور اڈیٹر ولی شاہجہاں پوری، ہمارے شکریے کے مستحق ہیں، جن کی کوششوں سے یہ مفید کتاب مرتب اور شائع ہوئی، امید کہ اُردو کے تمام حلقوں میں یہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

حرفِ شوق

از شارقؔ میرٹھی

سائز $\frac{18\times22}{8}$، حجم ۹۶ صفحات، مجلد مع گرد پوش، سنہ اشاعت: ۱۹۸۰ء
قیمت: نو روپے۔ فاضل مصنف سے ۵۶۔ کوٹلہ۔ میرٹھ (یوپی) ۲۵۰۰۰۲

جناب محمد مشتاق صاحب شارقؔ، جو ابھی حال ہی میں ایک کالج کے پرنسپل سے ریٹائر ہوئے ہیں، ایک اچھے شاعر بھی ہیں اور اچھے نثر نگار بھی۔ "جامعہ" کے پچھلے شمارے میں آپ کا ایک تنقیدی مضمون: "ندرتؔ میرٹھی" شائع ہوا ہے اور اس سے قبل، بہت پہلے، مئی ۱۹۷۸ء میں بابائے اُردو

مولوی عبدالحق صاحب کی حیات اور ادبی کارنامے پر شائع ہوا تھا۔ جن لوگوں نے ان کے یہ مضامین یا ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ: "اردو شاعری کی روایات" پڑھا ہے، وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ موصوف کی اردو ادب کے مختلف موضوعات اور مسائل پر کتنی گہری اور وسیع نظر ہے۔ آپ کی شاعری کے بارے میں نیاز فتح پوری جیسے بالغ نظر ادیب کی رائے ہے کہ: "شارق میرٹھی اپنے عہد کے بدلتے ہوئے تہذیبی عناصر اور سماجی عوامل سے عام انسانوں کی طرح متاثر ہیں، اس لیے ان کے یہاں دورِ حاضر کی ترجمانی کا احساس بھی ملتا ہے لیکن دوسرے شعراء کی طرح جدید کی دھن میں انھوں نے قدیم کو یکسر نظر انداز کر دینے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے اسلوب جدید کا دامن قدیم اسلوب سے ملا ہوا ہے اور فن شعر کے سلسلے میں روایت و درایت کا یہی امتزاج ان کے کلام میں وہ حسن اور زور پیدا کر دیتا ہے جس سے بعض معاصرین محروم ہیں۔" (نگار۔ کراچی۔ بابت مارچ ۱۹۶۴ء)

کسی کے کلام کا نمونہ دینا ہو تو عام طور پر اچھے اشعار کا انتخاب دے دیا جاتا ہے، راقم الحروف کو یہ طریقہ کچھ زیادہ پسند نہیں ہے، میرا خیال ہے کہ کوئی ایک غزل یا نظم مکمل طور پر دے دینی چاہیئے، اس سے پڑھنے میں لطف بھی آتا ہے اور اگر اس میں کوئی کمزور شعر ہو تو قارئین کو اس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے، اس لیے اس مجموعے کی پہلی غزل، جو تسلسل خیال اور بیان کے لحاظ سے نظم کہی جا سکتی ہے۔ ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

جہانِ شوق کے ہر رخ کا آئینا ہے غزل
کہیں لہو ہے، کہیں سرخیِ حنا ہے غزل

ہر ایک شعر ہے قرنوں کی زندگی کا عکس
جنم جنم کے خیالوں کا ارتقا ہے غزل

بنی ہے لفظ و معانی کی ایک قوسِ قزح
کہیں ہے دھوپ کا پیکر، کہیں گھٹا ہے غزل

تمام شبنم دانش، تمام شعلۂ شوق
کہ فکر و جذبہ کا رنگین ماجرا ہے غزل

نظر میں صرف لب و لہجہ ہی اگر رکھئے
تو آبرو ہی نہیں، فن کی انتہا ہے غزل

خوشی کا عکس بھی ہے، غم کا عکس بھی اس میں
ہر ایک جذبۂ ہستی کا آئینا ہے غزل

ہر اک علامتی پیکر ہے جس کا نقشِ بقا
کتابِ شعر کا وہ بابِ دلکشا ہے غزل

جو سوچئے تو نہاں اس میں نورِ وحدت ہے
جو دیکھئے تو فروغِ صنم کدہ ہے غزل

رسائی عام نگاہوں کی کیا ہو، اے شارق
بہت لطیف حقائق کا سلسلا ہے غزل

غزل کے بارے میں بہت سے شاعروں نے شعر کہے ہیں، یہ اشعار سب سے اچھے نہیں تو بہترین اشعار میں ان کا شمار ضرور کیا جائے گا۔ امید کہ یہ مختصر مجموعۂ کلام قدر و عزت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ اور قبول عام حاصل کرے گا۔

نقوش ــــ میر تقی میر نمبر (حصہ اوّل)   مدیر: محمد طفیل

سائز ۲۰×۳۰/۸، حجم ۶۳۱ صفحات۔ کتابت و طباعت عمدہ، شمارہ: ۱۲۵، اکتوبر ۱۹۸۰ء
قیمت: ۳۰ روپے، لائبریری ایڈیشن: ۵۰ روپے۔ ملنے کا پتہ: ادارۂ فروغ اردو۔ لاہور (پاکستان)

محمد طفیل صاحب خاص نمبر نکالنے میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ نقوش کے عام شمارے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں، مگر اس کے خصوصی شماروں کا کہنا ہی کیا۔ ان کی نظیر شاید ہی ملے۔

میر کو خدائے سخن کہا جاتا ہے، غالب جیسے عظیم شاعر نے ان کی استادی کا اعتراف کیا ہے، مگر پھر بھی انھیں یکسر نظر انداز کیا گیا ہے۔ محمد طفیل صاحب کو اللہ سلامت رکھے کہ انھوں نے "نقوش" کے دو ضخیم نمبر نکال کر اس شکایت کو دور کر دیا۔ پہلا نمبر حسب ذیل چیزوں پر مشتمل ہے:

۱۔ دیوان میر ــــ نسخۂ محمود آباد، مخطوطہ ۱۲۰۳ھ بہ حیات میر۔ ترتیب و تدوین: ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری۔ صفحات: ۹ تا ۴۶۵

۲۔ انتخاب غزلیات میر۔ از ادارۂ نقوش، صفحات: ۴۶۷ تا ۶۱۰

۳۔ فرہنگ کلیات میر۔ مرتبہ: عبدالباری آسی، مطبوعہ: نول کشور، ۱۹۴۸ء۔ صفحات: ۶۱۱ تا ۶۳۱

"بہ حیات میر" میں، جو ۱۲۰۳ ہجری مطابق ۸۹-۱۷۸۸ء کا مخطوطہ ہے، غیر مطبوعہ کلام بھی ہے۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ غزلیں	۱۵	اشعار	۵۷
۲۔ مثنوی	۱	"	۲۸

۳۔ قصائد	۲	اشعار	۷۶
۴۔ رباعیات	۸	"	۱۶
۵۔ مختلف تذکروں میں		"	۱۴
۶۔ نسخۂ آصفیہ (مخطوطہ)		"	۲۵۹
۷۔ مختلف مخطوطات سے		"	۲۴

کل غیر مطبوعہ اشعار کی تعداد: ۴۷۴

اس دیوان کے بارے میں فاضل مرتب، حیدری صاحب نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ: "راجہ صاحب محمود آباد کے نادر الوجود کتب خانے میں دیوان میر کے متعدد نسخے موجود ہیں۔ ان میں سب سے قدیم نسخہ ۱۲۰۳ھ [۸۸-۱۷۸۹ء] کا مکتوبہ ہے۔ یہ میر کی حیات میں موتی لال تخلص خفیف، شاگرد میر سوز کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس زمانے میں میر لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ بہادر کی سرکار سے وابستہ تھے، اور خفیف نواب موصوف کے دیوان بھوانی پرشاد کے ملازم تھے۔ اس طرح دونوں بزرگوار یعنی میر اور خفیف لکھنؤ میں نواب وزیر کے زیر عاطفت رہتے تھے۔ یہ بات قرین ہے کہ [یہ] دیوان خود میر کی نظر سے گزرا ہو۔ اس کی کتابت کے بعد میر ۲۳ سال تک زندہ رہے اور جس کے بارے میں پیشگوئی کی تھی کہ:

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں میرا دیوان رہے گا (صفحہ ۳۴)

اس نسخے کی اہمیت کے بارے میں فاضل مرتب نے دیباچے میں مزید لکھا ہے: "دیوان کے جتنے بھی مخطوطات بڑے بڑے کتب خانوں میں محفوظ ہیں، اس کو تمام مطبوعہ و قلمی نسخوں پر فوقیت حاصل ہے، کیونکہ یہ میر کا قدیم ترین اور مستند دیوان ہے۔ اس میں ۵۲-۱۷۵۱ء/۱۱۶۵ھ سے پہلے کا کلام شامل ہے۔ میر نے تذکرہ نکات الشعراء ۱۱۶۵ھ (۵۱-۱۷۵۲ء) میں تالیف کیا تھا۔ دیوان مذکور میں وہ تمام اشعار درج ہیں جو انھوں نے اپنے تذکرے میں بطور انتخاب پیش کیے۔ میری دریافت کے مطابق روانگی لکھنؤ سے قبل دلی میں میر کا یہی دیوان تھا۔۔۔" (صفحہ ۱۶۶)

حصہ دوم (خدائے سخن میر تقی میر کی شخصیت اور فن پر منتخب مضامین)

شمارہ ۱۲۶، نومبر ۱۹۸۰ء۔ حجم: ۶۴۰ صفحات۔ قیمت وہی ہے جو حصۂ اول کی ہے۔

اس نمبر کے بارے میں فاضل مدیر، محمد طفیل صاحب نے لکھا ہے کہ: "میں نے بہت کم نمبروں کو اس طرح مدّون و مرتب کیا جیسا کہ اس نمبر کو، مثلاً غالب پر جو نمبر پیش کیے، ان کے لیے نئے مضامین لکھوائے، اقبال پر جو نمبر پیش کیے، وہ بھی سب کے سب نئے مضامین تھے، مگر اس نمبر کے لیے دل نہ مانا کہ نئے مضامین لکھوائے جائیں ـــــ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ میں نے محسوس کیا کہ میر کے عشق میں اہل قلم نے از خود اتنے اچھے مضامین لکھ رکھے ہیں کہ ان کی موجودگی میں کسی نئی سعی کی ضرورت نہیں۔ اس کے باوجود، جن عنوانات کے تحت، نئے مضامین لکھوانے کی ضرورت تھی، وہاں لکھوائے بھی گئے۔ چند مضامین میں حک و اضافے کی ضرورت تھی، وہاں یہ کچھ بھی ہوا۔" (صفحہ ۶)

یہ نمبر دراصل چار حصوں یا چار ابواب پر مشتمل ہے، پہلے میں کلیات میر، انتخاب میر، مزامیر، مثنویات میر اور نکات الشعراء پر بحث و گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے میں سوانح حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے، تیسرے میں شاعری پر اور چوتھے میں عہدِ میر کی زبان، میر کی فارسی شاعری، میر کے سبک فارسی اور میر کے فارسی کلام پر۔

اس نمبر میں قریب قریب سبھی اہم اور مشہور ادیبوں اور نقادوں کے مضامین شامل ہیں، مثلاً مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی، عبدالباری آسی، مولوی عبدالحق، اثر لکھنوی، قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی، سید محی الدین زور، سید احتشام حسین رضوی، آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر سید عبداللہ، کلیم الدین احمد، مرزا یگانہ چنگیزی وغیرہ۔ آخر میں "مطالعۂ میر" کے عنوان سے جمیل جالبی صاحب کا ایک طویل اور مبسوط مضمون ہے۔ جو اسی شمارے کے لیے لکھا گیا اور جس میں میر کی حیات، سیرت، تصانیف اور شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ان دونوں خصوصی اشاعتوں کے لیے جناب محمد طفیل صاحب اردو کے تمام ادیبوں، نقادوں، ریسرچ اسکالروں اور تمام قاریوں کی طرف سے شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے میر تقی میر پر اتنا کامیاب اور بیش قیمت نمبر پیش کیا ہے۔

تخلیقی ادب — دو حصے

مرتبہ: پاشا رحمان۔ مشفق خواجہ۔ آمنہ مشفق

سائز ۲۲×۱۸/۸، حجم حصہ اول: ۶۵۸۔ حصہ دوم: ۵۲۸۔ سنہ اشاعت: ۱۹۸۰ء
قیمت: پچاس روپے فی حصہ۔ ناشر: عصری مطبوعات۔ اے۔ ۳۲۲۔ بلاک ڈی۔ نارتھ ناظم آباد۔ کراچی ۳۳ (پاکستان)

زیر تبصرہ کتاب کے دونوں حصوں میں پاکستان کے ممتاز اہل قلم کے غیر مطبوعہ مضامین شامل ہیں، جن میں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۹ء تک، وہاں کے دس سالہ تخلیقی ادب کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ مگر اس کے لیے کوئی وقت یا مدت مقرر نہیں ہے۔ فاضل مرتبین نے لکھا ہے کہ: "ہمارا منصوبہ صرف یہ ہے کہ جب اچھی اور معیاری غیر مطبوعہ تحریریں اتنی تعداد میں جمع ہو جائیں کہ وہ ایک کتاب کی صورت اختیار کر سکیں تو انھیں شائع کر دیا جائے۔ اس کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں رکھی گئی، لیکن یہ طے کیا گیا ہے کہ سال میں کم از کم دو کتابیں ضرور شائع کی جائیں گی، ان کا درمیانی وقفہ کچھ بھی ہو سکتا ہے یا بالکل بھی نہیں ہو سکتا، جیسے سال رواں کی دو کتابیں ایک ساتھ شائع کی جارہی ہیں۔" (حصہ اول صفحہ ۱۸)

ان دونوں حصوں میں صرف پاکستان کے دس سالہ تخلیقی ادب کا جائزہ لیا گیا ہے، ہندوستان کا ادب اس میں شامل نہیں ہے، اس کی وجہ فاضل مرتبین نے یہ بتلائی ہے کہ: "ہندوستان کا اردو ادب ایک علاحدہ اور وسیع موضوع ہے اور موضوع کے تقاضوں سے ہندوستانی اہل قلم ہی خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔" (حصہ دوم صفحہ ۶)، مگر پھر بھی دوسرے حصے کا ایک حصہ ہندوستان کے ایک ممتاز شاعر، میرزا یگانہ چنگیزی کے فن اور شخصیت کے بارے میں ہے۔ اس سلسلے میں فاضل مرتبین نے لکھا ہے کہ: "میرزا یگانہ بلاشبہ موجودہ صدی کے اہم شعرا میں سے ہیں لیکن ان کی ادبی اور غیر ادبی رزم آرائیوں کی وجہ سے عام طور پر ان کے شاعرانہ کمالات کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں تفصیلی جائزوں کا کیا ذکر، مختصر تنقیدی مضامین بھی دو چار سے زیادہ نہیں لکھے گئے۔ ہم نے یگانہ کے فکر و فن اور شخصیت کے چند مطالعے پیش کیے ہیں اور ساتھ ہی ان کی بہت سی غیر مطبوعہ تحریریں (نظم و نثر دونوں) بھی شائع کی جارہی ہیں۔ یگانہ کے مطالعہ کے سلسلے میں یہ

تحریریں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔'' یہ خوش خبری بھی درج ہے کہ: ''فن اور شخصیت کے اس نوعیت کے مطالعے آئندہ بھی پیش کیے جائیں گے۔ حفیظ ہوشیارپوری کے بارے میں 'تخلیقی ادب' کا ایک حصہ زیرترتیب ہے۔'' (حصہ دوم، صفحہ ۶) یہ وعدہ بھی کیا گیا ہے کہ: ''تیسری کتاب میں ہندوستان کے اُردو ادیبوں کی غیر مطبوعہ تحریروں کے لیے بھی ایک حصہ مخصوص کیا جارہا ہے۔'' (حصہ اوّل صفحہ ۱۹)

مشفق خواجہ صاحب اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے یہ بہت مفید سلسلہ شروع کیا ہے، اس سے اردو ادب کو بیش از بیش فائدہ پہنچے گا۔ اے کاش اسی طرح کا کوئی سلسلہ ہندوستان میں بھی شروع کیا جاتا، مگر اس کی امید بہت کم ہے۔ بہرحال ہم ''تخلیقی ادب'' کے فاضل مرتبین کی خدمت میں اس کامیاب اور مفید کوشش پر مخلصانہ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

ماہنامہ روشن —— فانی بدایونی نمبر   مرتبہ: شمس بدایونی

سائز ۲۲×۱۸/۸ ، حجم ۴۴ صفحات، تاریخ اشاعت: جنوری ۱۹۸۱ء، قیمت: آٹھ روپے

ناشر: روشن محل۔ سوتھ۔ بدایوں۔ ۲۴۳۶۰۱

فانی بدایونی کی پیدائش کو ستمبر ۱۹۷۹ء میں سو سال ہو گئے تھے، آج کل صد سالہ تقریبات کا جو رواج چل پڑا ہے، اس کے مطابق ان کا صد سالہ یوم پیدائش بھی پورے اہتمام سے منایا جانا چاہئے تھا مگر پروفیسر آل احمد سرور کی کوششوں سے کچھ جلسے ہو گئے اور بس۔ اب کم و بیش سوا سال کے بعد، فانی مرحوم کے وطن سے فانی نمبر شائع ہوا ہے، وہ بھی، ان جلسوں کی طرح جو فانی کی یاد میں پچھلے سال منائے گئے، ان کی حیثیت اور معیار کے مطابق نہیں ہے۔ بدایوں اہل علم کا مرکز رہا ہے، اب بھی وہاں کے ایسے اصحاب قلم اور دانشوروں کی تعداد اس برصغیر میں اچھی خاصی ہے جو علم و ادب کے میدان میں بڑی شہرت رکھتے ہیں، اگر اس ماہنامے کو ان کا مکمل تعاون حاصل ہوتا تو یہ خصوصی شمارہ اپنے مضامین اور شکل و صورت کے لحاظ سے کہیں بہتر ہوتا، لیکن موجودہ حالات میں یہ شمارہ بھی غنیمت ہے اور اس کے ایڈیٹر خالد بدایونی، جوائنٹ ایڈیٹر شمس بدایونی اور شاکر نقوی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مرحوم کی یاد میں ایک خصوصی شمارہ شائع کیا، جس میں بہرحال بہت سی مفید معلومات جمع ہو گئی ہیں، خاص طور پر ''منتخب کتابیات''

(صفحات ۱۳۹ - ۱۴۴) بہت مفید ہے۔

فانی کی صحیح تاریخ پیدائش ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء اور تاریخ وفات ۲۷ اگست ۱۹۴۱ء ہے اور یہ تاریخیں اس شمارے میں بھی درج ہیں، مگر تاریخی اختلافات، شاید اردو ادب کا مقدر بن چکے ہیں، فانی کی سرزمین سے نکلنے والے اس شمارے میں بھی اختلافات موجود ہیں، چنانچہ صفحہ ۵۶ پر سنہ وفات ۱۹۴۰ء درج ہے۔ صفحہ ۵۱ پر لکھا ہے: "آگرے میں کچھ قیام کرنے کے بعد وہ حیدر آباد پہنچے (۱۹۲۶ء)، مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کی ملاقات سے شاد کام ہوئے، مگر جلد ہی واپس آ گئے، دوسرے سال ۱۹۲۷ء میں فانی مہاراجہ کی دعوت پر دوبارہ حیدر آباد دکن پہنچے۔" اسی طرح صفحہ ۵۶ پر بھی ہے: "فانی ۱۹۲۶ء میں حیدر آباد پہنچے۔" مگر اسی شمارے کے صفحہ ۶۳ پر یہ بھی درج ہے: "۱۹۳۲ء میں حضرت فانی بدایونی مہاراجہ کشن پرشاد کے بلانے پر حیدر آباد آئے۔"

"فانی پر تصانیف" میں (صفحہ ۱۴۱) ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کی کتاب: "فانی اور ان کی شاعری،" (مختلف ادیبوں کے مضامین کا مجموعہ)، مطبوعہ: مکتبۂ ماحول۔ کراچی، جون ۱۹۶۴ء کا ذکر نہیں ہے، ممکن ہے اسی طرح کچھ اور کتابیں بھی درج ہونے سے رہ گئی ہوں۔

بہرحال ان خامیوں کے باوجود، ادارۂ ماہنامہ روشن اس لیے ہماری مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے یہ خصوصی شمارہ نکال کر حضرت فانی کی یاد کو تازہ کیا۔

"بیسویں صدی کے غزل گو شعرا میں فانی ایک ممتاز اور منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ حسرت کے ساتھ انھوں نے بھی غزل کے احیا میں نمایاں خدمت انجام دی ہے۔ ان کا اسلوب شعر میر و غالب کے طرز تحریر دو رنگ سے ترکیب پاتا ہے، لیکن ان کی شاعرانہ انفرادیت ان دونوں سے مختلف ہے۔ فانی یقیناً اس شاعرانہ عظمت کے حامل تھے کہ ان کے کلام کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے۔"

(پروفیسر مسعود حسین)

پرانے خریداروں سے ضروری گزارش

ہمارے پچھلے اعلان کے مطابق جنوری ۱۹۸۱ سے ماہنامہ جامعہ کی قیمت میں اضافہ ہوگیا ہے اور اب سالانہ قیمت چھ روپے کے بجائے نو روپے اور ایک پرچے کی قیمت پچاس پیسے کے بجائے پچھتر پیسے ہے، اس لیے جن خریداروں کی مدت خریداری مارچ میں یا مارچ کے بعد ختم ہورہی ہے، ان کی مدت خریداری میں اس اضافہ شدہ قیمت کے مطابق کمی کردی جائے گی۔ مثلاً جن کی مدت خریداری مارچ میں ختم ہوگی، وہ اب جنوری کے شمارے کے ساتھ ختم ہوجائے گی اور فروری سے انھیں نئی شرح کے مطابق رقم بھیجنی ہوگی۔

امید ہے کہ پرانے خریدار اسے نوٹ فرمالیں گے اور حسب معمول اپنا تعاون اور سرپرستی جاری رکھیں گے۔

ادارہ

جامعہ

سالانہ قیمت ۹ روپے | ایک پرچے کی قیمت ۷۵ پیسے

جلد ۷۸ | بابت ماہ فروری ۱۹۸۱ء | شمارہ ۲

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبد اللطیف اعظمی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی ● مطبوعہ: جمال پریس دہلی ۶ ● ٹائٹل: فائن آرٹ پریس دہلی ۶

شذرات

علمی حلقوں میں یہ خبر انتہائی رنج و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ پچھلے ماہ ۲۷ر جنوری کو سید نذیر نیازی صاحب کا تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں لاہور میں انتقال ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔

مرحوم جامعہ کے قدیم طالب علم اور سابق استاد تھے اور ان کا شمار اقبالیات کے ممتاز ماہروں میں ہوتا تھا۔ انھیں اپنی مادر علمی اور اقبال دونوں سے بڑی محبت وعقیدت تھی۔ انھوں نے تقریباً ۱۵ سال استاد کی حیثیت سے جامعہ کی پرخلوص خدمت کی۔ جامعہ سے الگ ہونے کے بعد بھی، جب کہ ان کے خیالات میں بہت کچھ تبدیلی آچکی تھی، جامعہ سے ان کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ انھوں نے اپنی مختلف کتابوں میں ارباب جامعہ کا بار بار ذکر کیا ہے اور بڑی عقیدت سے کیا ہے۔

جب ملک میں عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی تو اس وقت وہ اسلامیہ کالج لاہور میں زیر تعلیم تھے۔ اس تحریک سے متاثر ہوکر اور قومیت کے جذبے سے سرشار ہوکر اپنی تعلیم چھوڑ دی اور جب جامعہ قائم ہوئی تو علی گڑھ چلے آئے اور جامعہ میں اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ ۱۹۲۱ء میں جامعہ سے فارغ ہونے کے بعد اساتذۂ کالج میں شامل ہوگئے۔ جامعہ میں اُس وقت تصنیف و تالیف اور ترجمے کا معیار بڑا اونچا تھا اور مصنفین و مترجمین کی ایک منتخب جماعت جامعہ میں موجود تھی۔ نیازی صاحب کی تعلیم و تربیت پر اس کا بڑا خوشگوار اثر پڑا۔ اسی زمانے میں، جرمنی کے مشہور مستشرق ڈاکٹر جوزف ہیل کی کتاب کا ترجمہ کیا جو جامعہ کی اردو اکادمی سے "عربوں کا تمدن" کے نام سے شائع ہوا، ترجمے میں ایسی سلاست اور روانی ہے کہ تصنیف کا دھوکہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ ایسے مفید حواشی ہیں جن سے

ان کے وسیع مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے۔ قیامِ جامعہ کے آخری زمانے میں اکتوبر ۱۹۲۵ء میں ایک ماہنامہ "طلوعِ اسلام" کے نام سے نکالا تھا جس کا معیار ہر لحاظ سے بہت بلند تھا۔ اس کے تین شمارے دلی سے اور تین ہی شمارے لاہور سے نکلے، اس کے بعد یہ مفید رسالہ زمانے کی ناقدری کا شکار ہوگیا۔

مرحوم کا تعلق جامعہ کے ابتدائی دور کے طالب علموں اور استادوں سے تھا، ان کے دل و دماغ پر جامعہ کے بنیادی مقاصد کا بہت گہرا اثر تھا، وہ جامعہ کے بارے میں جو کچھ سوچتے اسی انداز سے سوچتے اور خطوط میں اس کا ذکر کرتے۔ ایک مرتبہ میری درخواست پر انھوں نے جامعہ کے یومِ تاسیس کے لیے پیغام بھیجا تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا: "ہمیں ہر سال یومِ تاسیس کے اس موقع پر چند مخلص محبِ وطن اور قوم و ملت کے ہمدرد افراد کا وہ جذبہ یاد آتا ہے، جنھوں نے کچھ سیاسی، کچھ قومی، کچھ تعلیمی تقاضوں اور بہت کچھ اپنی ہڈیوں کو پگھلا دینے والے جذبے سے مجبور ہوکر جامعہ ملیہ اسلامیہ کا پودا لگایا تھا۔ جس وقت علم کے چمن میں یہ نیا پودا لگایا جا رہا تھا اس وقت اسلامی درسگاہوں، دار العلوموں کی روش میں کوئی جگہ خالی نہیں تھی جس کو پُر کرنا تھا۔ نہ کالج یونیورسٹی کی صفوں میں ایسا کوئی خلا تھا جس کو بھرنا ضروری تھا، پھر بھی چند دردمند حساس دل رکھنے والے باہمت ایک نیا دانشکدہ تعمیر کر رہے تھے۔"

اس طویل پیغام کے آخر میں انھوں نے فرمایا تھا: "نئے وسائل اور جدید ذرائع بھی اپنائے جائیں مگر پرانے پاکیزہ مقاصد، ماضی کی مقدس روایت اور تابناک اصول ہاتھ سے نہ جانے پائیں۔ اگر باہمت بانیانِ جامعہ کی جامعہ آپ کے اندر زندہ ہے تو وسائل کی کمی یا فقدان کوئی نقصان کی بات نہیں اور پھر اس کا احساس ہی کہاں ہوگا۔

بر خود نظر کشا ز تہی دامنی مرنج
در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

علامہ اقبال سے مرحوم کو جو دلی لگاؤ اور عقیدت تھی، اس کو زندگی بھر دل سے لگائے

رکھا، تصنیف و تالیف ہو یا کوئی اور کام، ہمیشہ علامہ کے مشوروں کو سامنے رکھتے، ان کے ارشادات کی تعمیل اور ان کی ادنیٰ سے ادنیٰ خدمت اپنے لیے قابل فخر اور وجہ سعادت سمجھتے۔ دلی سے لاہور کی منتقلی میں بھی علامہ کا اشارہ شامل تھا، لاہور پہنچکر میکلوڈ روڈ پر قیام کیا تو اس میں بھی یہ جذبہ کارفرما تھا کہ علامہ کا قرب حاصل رہے گا۔ اسی قرب اور عقیدت کا نتیجہ ہے کہ انھیں اقبال شناسوں میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

مرحوم نے اقبال پر جو کچھ لکھا ہے وہ چاہے کمیت کے لحاظ سے زیادہ نہ ہو مگر کیفیت کے لحاظ سے ان کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کی ایک کتاب "مطالعۂ اقبال" ہے جو بعض خصوصیات کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کی دوسری کتاب "اقبال کے حضور نشستیں اور باتیں" ہے اور سب سے اہم اقبال کے خطبات کا ترجمہ ہے جو "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ ترجمہ مرحوم نے اقبال کے ارشاد پر کیا تھا۔ اقبال کی پہلی خواہش تو یہ تھی کہ اس کا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کریں اور یہ خواہش بھی مرحوم کی تجویز پر تھی، مگر جب عابد صاحب نے اپنی مصروفیت کی وجہ سے معذرت کرلی تو قرعۂ فال مرحوم کے نام پڑا۔ ان خطبات کا مضمون بڑا دقیق اور فلسفیانہ ہے اور ان کا ترجمہ بڑا مشکل تھا، مگر مرحوم جس کامیابی کے ساتھ اس سے عہدہ برا ہوئے ہیں اس کی مثال جامعہ کے ترجموں کے علاوہ کسی اور جگہ مشکل سے ملے گی۔ ۳۲ صفحات کا وہ مبسوط مقدمہ بھی بہت اہم ہے جو اس کتاب میں شامل ہے، جس سے فاضل مترجم کے علم وفضل اور وسیع مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

عمر کے آخری حصے میں مرحوم کو علامہ اقبال کی مبسوط اور مکمل سوانح عمری لکھنے کا کام سپرد کیا گیا تھا، انھوں نے اس کا بہت ہی جامع منصوبہ بنایا تھا اور وہ اسے کئی جلدوں میں لکھنا چاہتے تھے، مگر افسوس کہ موت نے اس کو مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا، اس کا ایک جزو ابھی حال میں شائع ہوا ہے، جو صرف ۱۹۰۵ء تک کے حالات اور واقعات پر مشتمل ہے۔

غرض نیازی صاحب کی وفات ایک فرد کی نہیں جامعہ کے ایک سپوت فرزند اور جلیل القدر استاد اور اقبالیات کے ایک ماہر کی وفات ہے، جس سے اردو ادب بالخصوص اقبالیات

کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کا نعم البدل عطا کرے۔ آمین!

دیا نرائن نگم اردو کے مخلص خدمت گذار اور بالغ نظر صحافی تھے۔ انھوں نے اپنے ماہنامہ "زمانہ" کے ذریعہ نہ صرف اردو ادب کی بلکہ وسیع تر مفہوم میں ملک و قوم اور تہذیب و تمدن کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ انھوں نے اپنے ایک رفیق کار سے کہا تھا کہ: "میں "زمانہ" میں سیاست، آرٹ، موسیقی، رقص، مذہب، تاریخ اور سب ہی موضوعات پر مضمون چھاپنا چاہتا ہوں۔ آپ دیکھ لیجئے گا کہ آیندہ ادبی پرچے ایسے ہی ہوں گے اور پھر لوگ کہیں گے: اس رنگ کی ابتدا "زمانہ" سے ہوئی تھی۔"

مرحوم کو جامعہ ملیہ سے بھی دلچسپی تھی، چنانچہ "زمانہ" کے قومی نمبر میں، جو دسمبر ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا تھا، ایک مضمون "سرسید اور جامعہ ملیہ" کے عنوان سے بھی شامل ہے۔ اسی طرح ان کے دل میں اس وقت کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی بھی بڑی عزت تھی۔ ایک مرتبہ ذاکر صاحب کانپور گئے تو ان سے ملاقات کے لیے حضرت ثاقب کانپوری نے معززین شہر کو چائے پر مدعو کیا، اتفاق سے انھیں نگم صاحب کو بلانا یاد نہیں رہا، جب نگم صاحب کو ذاکر صاحب کی آمد اور ثاقب صاحب کی اس تقریب کی اطلاع ملی تو اس فرو گذاشت پر شکایت کی، مگر اس شکایت میں شکایت کم اور خلوص و محبت زیادہ ہے۔

اگلے سال ۱۹۸۲ء میں ۲۲ مارچ کو نگم صاحب کی پیدائش کو سو سال ہو جائیں گے۔ ان کے لائق صاحبزادے جناب برج نرائن نگم صاحب اپنے والد محترم کا صد سالہ یوم پیدائش منانا چاہتے ہیں اور مرحوم کی یاد میں ایک خصوصی کتاب اور ان کے خطوط شائع کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں موصوف نے مدیر جامعہ کو خط لکھا ہے اور خواہش ظاہر کی ہے کہ مرحوم کی یاد میں جامعہ کا ایک خصوصی نمبر شائع کیا جائے اور صدی کو کامیاب بنانے کے لیے ہر طرح تعاون کیا جائے۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے انھیں اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا ہے اور لکھا ہے کہ اس موقع پر جامعہ کا خصوصی شمارہ نکالنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ ہمیں امید ہے کہ دوسرے اخبارات و رسائل بھی برج نرائن نگم صاحب کے اس نیک اور مفید کام میں ہر طرح مدد کریں گے۔

ڈاکٹر محمد عمر

ہندی اسلامی سماج — تہذیبی لین دین

(ا)

تیرھویں صدی ابھی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ سارے شمالی ہندوستان پر ترکوں کا مکمل قبضہ ہوگیا۔ ایک چوتھائی صدی کے عرصے میں ترکی سپاہیوں نے پنجاب سے آسام تک اور کشمیر سے وندھیا پہاڑوں تک سارے علاقے پر طوفانی رفتار سے قبضہ کرلیا تھا ہندوستانی تہذیب کے ارتقا میں مسلمانوں کی اس فتح کا گہرا اثر پڑا۔ شروع میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس فتح نے ہندوستان کی ہر چیز کو تہس نہس کر دیا ہے اور ہندوستانی مذہب پر اری ضرب لگی ہے، کیونکہ پجاری اور پنڈت سرکاری سرپرستی سے محروم ہوگئے، مقامی ادب و سرکاری حوصلہ افزائی ملنی بند ہوگئی اور اس کی ترقی کی رفتار سست پڑگئی اور بظاہر ایسا علوم ہوتا تھا کہ یہ سیاسی شکست تہذیبی زوال کے مترادف ہے لیکن بنیادی طور پر اس یاسی شکست کے دور رس نتائج برآمد ہوئے جن کا جائزہ اس مقالے میں لینے کی کوشش ی گئی ہے۔

سیاسی اور انتظامی مصلحتوں کی بنا پر مسلمان حکمرانوں کو غیر مسلم رعایا سے رابطہ قائم کرنے مجبور ہونا پڑا۔ حکومت کے نظام کو چلانے کے لئے ہندوؤں کو ملازم رکھنا ناگزیر تھا۔ طب الدین ایبک کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ہندو سرکاری ملازمین برطرف نہ کرے کیونکہ وہ لوگ اس ملک کے سول نظام حکومت سے واقفیت رکھتے

اکٹر محمد عمر، ریڈر شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۱

تھے اور مالگذاری کی وصولیابی کے کام میں ان کی مدد کے بغیر کامیابی مشکل تھی۔ مسلم حکمراں اپنے ساتھ نہ معمار، نہ اہل کار اور نہ ہی محاسب لائے تھے۔ ان کی عمارتیں ہندو معماروں نے تعمیر کیں جنھوں نے قدیم ہندوستانی فن تعمیر میں نئے تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں کیں، نئی حکومت کے سکے ڈھالنے کا کام ہندو سناروں نے کیا اور ان کے حساب کتاب کا کام ہندو عہدہ داروں نے انجام دیا اور قانون داں ہندوؤں نے حکمرانوں کو ہندو قوانین کے نفاذ کے بارے میں صلاح و مشورہ دیا اور ہندو منجموں نے حکومت کے عام کاموں میں ان کے ساتھ تعاون کیا۔ ہندوستان آنے والے مسلمانوں نے اس ملک میں سکونت اختیار کرلی اور اس کو اپنا وطن بنالیا۔ چونکہ ہندوستان میں مسلمان تعداد میں بہت کم تھے اور چاروں طرف سے ہندو انھیں گھیرے ہوئے تھے، اس لئے ان حالات میں ان سے دائمی عناد رکھنا ناممکن تھا۔ آپسی میل جول اور وقت کی ضرورت نے ان کے باہمی تعلقات کو مستحکم بنایا۔ بہت سے ایسے لوگ تھے جنھوں نے اپنا مذہب چھوڑ دیا تھا، ان کی حالت ان لوگوں سے زیادہ مختلف نہ تھی جن کا انھوں نے ساتھ چھوڑا تھا۔ لہذا ابتدائی فتوحات کے طوفانی حالات کے ختم ہو جانے کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک ایسی درمیانی صورت تلاش کرنے کی کوشش کی جس میں وہ دونوں ایک پڑوسی کی طرح ساتھ ساتھ رہ کر زندگی بسر کرسکیں۔ ایک نئی زندگی کی تلاش شروع ہوئی اور اس تلاش اور کوشش نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا جو نہ تو بالکل ہندو تھی اور نہ ہی خالص اسلامی بلکہ فی الواقع یہ تہذیب ایک ہندو مسلم تہذیب تھی جو آپسی لین دین سے وجود میں آئی تھی۔ نہ صرف ہندو مذہب، فنون لطیفہ، علم و ادب اور ہندو سائنس نے اسلامی عناصر کو اپنے اندر جذب کرلیا، بلکہ ہندو تہذیب کی روح اور انداز فکر میں ایک تبدیلی آئی، دوسری طرف مسلمانوں نے بھی اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اسی مناسبت سے تبدیلی قبول کر کے اس کا جواب دیا، کیوں کہ جب دو تہذیبوں کو ایک دوسرے سے واسطہ پڑتا ہے تو ان میں تبادلۂ خیال ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ ایک تہذیب اگر دوسری تہذیب کو اپنے بعض عناصر دیتی ہے تو دوسری تہذیب کے بعض عناصر اخذ بھی کرتی ہے۔

اس طرح شمالی اور جنوبی ہندوستان میں اسلام نے ہندوؤں کے مذہبی فرقوں کو

متاثر کیا اور یہاں کے مذہب اور تہذیب نے اسلامی عناصر قبول کئے۔ لہذا مہاراشٹر، گجرات، پنجاب اور ہندوستان اور بنگال کے مذہبی پیشواؤں نے قصداً قدیم ہندو مذہب کے بعض عناصر ترک کر کے دوسرے عناصر پر زور دیا جو خالصتاً اسلامی تھے، اور اس طرح انھوں نے اسلامی اور ہندو عقائد میں مماثلت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی ساتھ مسلمان صوفیوں، مصنفوں اور شاعروں میں بھی ہندو رسم و رواج اور عقائد کو اپنے میں جذب کرنے کا ایک قومی رجحان پایا جاتا ہے، اور بعض علاقوں میں اس لین دین کا یہ نتیجہ بر آمد ہوا کہ بعض طبقے کے مسلمان ہندو دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا بھی کرنے لگے۔

اس عہد کے ہندوستانی فن تعمیر میں بھی امتزاجی SYNTHETIC رجحان پایا جاتا ہے۔ ہندو محلات، مندر اور دوسری مذہبی عمارتیں اب گزشتہ زمانے کی طرح خالص ہندو فن تعمیر کے طرز کی نہیں تھیں۔ انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کے فن تعمیر کے عناصر کا استعمال کیا بلکہ ان عمارتوں میں ایک نئی روح کارفرما تھی جن کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم اقدار میں کسی حد تک تبدیلی و تنوع پذیر ہو رہی تھی۔ یہ اثر سارے ہندوستان میں کارفرما تھا مثلاً راجپوتانہ، مقدس مقامات میں بھی جیسے متھرا، بندرابن اور بنارس۔ اس عہد کی تعمیر شدہ مسجدیں مقبرے اور محلات اس لحاظ سے ہندوستانی ہیں۔ یہاں کے مسلمانوں نے ہندوستان کے فن تعمیر سے متاثر ہو کر بعض نئے طرزوں کو جنم دیا جن میں ہندو فن تعمیر کے طرز بھی شامل تھے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ قرون وسطی کا فن تعمیر چاہے ہندو ہو یا اسلامی فی الواقع ایک درخت کی دو شاخوں کے مانند تھا اور دونوں کا مآخذ ایک ہی تھا۔ ان کا مقصد تو مختلف تھا لیکن طرز کی اہمیت یکساں تھی۔

اسی طرح ہندوستانی فن مصوری میں بھی تبدیلی آئی۔ فن تعمیر کے مقابلے میں فن مصوری میں ایک سے زائد طریقے اور طرزیں پائی جاتی ہیں۔ دہلی اور جے پور کی تصویروں کو دیکھ کر اس تبدیلی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان نمونوں میں اس حد تک یکسانیت پائی جاتی تھی کہ دونوں کی مصوری کا طرز ایک سا تھا اور اگر فرق تھا تو صرف اتنا کہ دو مصوروں نے یہ تصویریں بنائی تھیں۔

ہندوستانی ادب میں بھی ایک نمایاں تبدیلی و تنوع پذیر ہوئی اور سنسکرت کو ادبی ز
کی حیثیت حاصل نہ رہی۔ چوں کہ اندازِ فکر اپنے اظہار کے لئے نئے ذرائع تلاش کرتا ہے ا
لئے شمالی ہندوستان میں ہندی، جنوبی مغربی علاقوں میں مراٹھی، اور مشرقی ہند میں بنگا
زبانوں نے ادبی حیثیت اختیار کرلی۔ ہندو اور مسلمان دونوں نے ان علاقائی زبانوں ک
ترقی دی۔ اس طرح ایک نئی مشترکہ زبان وجود میں آگئی۔ مسلمانوں نے ترکی اور فارس
زبانوں کو روزمرہ کے استعمال کے لئے ترک کر کے ہندوستان کی بول چال کی زبان اختی
کی اور اس لین دین سے جو ادبی زبان وجود میں آئی اٹھارویں صدی میں اسے اردو کا
دیا گیا۔ ہندو اور مسلمان دونوں نے اس زبان کو اپنی زبان کی طرح اختیار کیا۔ اسی کے سا
ساتھ مسلمانوں نے مقامی زبانوں اور سنسکرت میں بھی مہارت پیدا کی۔ شعراء کے فارسی تذ
کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے بہت سے ہندو تھے جو اردو اور فارسی میں اور بہ
سے مسلمان ہندی میں شاعری کرتے تھے۔ غلام علی آزاد بلگرامی نے بلگرام کے آٹھ ایسے مسلما
شاعروں کا ذکر کیا ہے جو ہندی زبان میں شاعری کرتے تھے۔ اسی طرح دوسری مقامی ز
مثلاً مراٹھی، بنگالی، گجراتی، پنجابی اور سندھی پر بھی مسلمانوں کا اثر نمایاں ہے۔

ہندو سائنس میں ریاضی، طب اور علم نجوم بہت ترقی یافتہ علوم تھے اور ان علو
عرب اور ایران ہندوستانی علوم کے مرہون منت تھے لیکن عربوں نے یونانی اور ہندوستانی عا
کے ذریعہ خالص اپنے علوم کو ترقی دی۔ اس لئے جب مسلمان ہندوستان آئے تو وہ اپنے ساتھ سا
نظام بھی لائے۔ ان میں بعض منفرد عناصر بھی تھے۔ اس لئے ہندوؤں نے ان بعض عناصر کو ا
جو ان کے علوم کے لحاظ سے نئے تھے۔ ہندو منجموں نے مسلمانوں سے فنی اصطلاحیں اخذ کیں
مسلمانوں کا طول البلد اور عرض البلد ناپنے کا طریقہ اور زیچ کی بہت سی اصطلاحیں اور تا
(HOROSCOPE) مہاراجہ جے سنگھ (۱۶۸۶ - ۱۷۴۳ء) نے ہندو علم زیچ کی اصلاح کا
سرانجام دیا۔ اس نے جے پور، متھرا، دہلی اور بنارس میں رصدگاہیں قائم کیں۔ اس
درباری پنڈتوں نے عربی سے "المجسطی" نامی کتاب کا سنسکرت میں ترجمہ کیا اور "زیچ محمد شا
کی ترتیب میں الغ بیگ ناظر الدین طوسی الگرگان جمشید کاشی اور دوسرے نجومیوں سے

فلکیاتی جدول (ASTRONOMICAL TABLES) کا اس نے استعمال کیا۔ ہندستانی علماء نے مسلمانوں سے فلزاتی تیزاب (METTALIC ACID) اور IATRO-CHEMISTRY کے طریقے اخذ کئے۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے جن دستکاریوں اور صنعتوں کو رائج اور ترقی دی، ان میں سے کاغذ بنانا، بُنے جانے والے مختلف قسم کے کپڑے، منبت کاری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اگرچہ ہندوستانی معاشی زندگی میں بھی کئی تبدیلیاں ہوئیں لیکن سماجی اور سیاسی زندگی میں اس سے کہیں زیادہ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ہندوستانی سماجی زندگی پر اخوت انسانی کے اصول اور انداز فکر کا بہت گہرا اثر پڑا۔ اس میں خاندان اور نسلی امتیاز کی اہمیت کم ہوگئی اور اس کے اثر کی وجہ سے ہندو مذہب میں سماجی مساوات کے احساس کی رفتار تیز تر ہوگئی۔ اور اس تحریک نے ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کی جن کی وجہ سے ہندوستانی سماج پیشہ ورانہ طبقوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ مسلمانوں نے سیاسی لحاظ سے ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کے سیاسی مرکزوں کو ختم کرکے سیاسی اتحاد اور یکسانیت قائم کرنے کی کوشش کی اور قومی جذبہ پیدا کیا۔

ہندوستانی تہذیب پر اسلام کے اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر تاراچند نے لکھا ہے کہ ہندوستانی زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کس حد تک اثر انداز ہوا، اس بارے میں مبالغہ سے کام لینا بہت مشکل ہے، لیکن یہ اثرات رسم و رواج، فن موسیقی، لباس، کھانے پکانے کے طریقوں، شادی بیاہ کی رسموں، تہواروں، میلے ٹھیلوں کے منانے کے طریقوں اور مراٹھا، راجپوت اور سکھ حکمرانوں کے درباری اداروں اور درباری آداب میں بہت زیادہ نمایاں ہیں۔ بابر کے دور حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے طرز زندگی اور انداز فکر میں یہاں تک یکسانیت پائی جاتی تھی کہ اسے ان کے مخصوص "ہندوستانی طرز" کا مشاہدہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کے جانشینوں نے اس ورثے کو اس شاندار اور حیرت انگیز طریقے سے پروان چڑھایا کہ ہندوستان آج اس ورثے پر فخر کرسکتا ہے، جو انھوں نے اپنے پیچھے چھوڑا تھا۔

ہندوستانی مذہبی اور روحانی زندگی میں اسلام کے اثر سے ایک ایسا انقلاب ہوا کہ اس نے یہاں کی مذہبی اور روحانی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی۔ بھگتی تحریک کا جنم اسلام کے زیر اثر ہوا اور اس تحریک کے پیشواؤں کی تعلیمات بڑی حد تک اسلام کی تعلیمات پر مبنی تھیں مثلاً فلسفۂ توحید۔ ہندوؤں میں بھی توحید کا عقیدہ موجود تھا لیکن ایک خدا کے ساتھ دوسرے خداؤں کو شریک نہ کرنے کا تصور نہ تھا۔ اس کے برعکس اسلام کا فلسفۂ توحید "وحدہٗ لاشریک لہ" ہے۔ بھگتی تحریک کے پیشواؤں نے خالص اسلامی توحید کا فلسفہ اپنا لیا۔ مثلاً کبیر اور نانک نے فلسفۂ توحید کی ترویج کے ساتھ ساتھ دوسرے دیوی دیوتاؤں کو ترک کرنے کی بھی تعلیم دی اور انھوں نے ایک ایسے خدا کا تصور پیش کیا جس کا کوئی شریک نہیں۔ کبیر نے عبادت پر زور دیا جس پر انسانی برتری کا انحصار تھا۔ نسلی برتری کی مذمت کی۔ یہی مسلمانوں کا فلسفہ ہے کہ اللہ کے قریب وہ شخص ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار اور عبادت گزار ہے۔

ابھی تک ہم نے سرسری طور پر ہندوستانی تہذیب پر اسلام کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ہندوستانی تہذیب نے مسلمانوں کو کس حد تک متاثر کیا۔ یہ موضوع بہت وسیع ہے اور اس وقت تفصیل سے جائزہ لینا ممکن نہیں، لیکن بلامبالغہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستانی تہذیب کو متاثر کرنے کے مقابلے میں اسلام یا اسلامی تہذیب ہندوستانی تہذیب سے کہیں زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ عہد مغلیہ میں بادشاہوں اور بالخصوص اکبر نے اپنے ملک کے باشندوں کے مذہبی اختلافات کو دور کرنے کی کوشش کی اور انھیں ایک ایسے مذہب کا پیرو بنانا چاہا جس میں تمام مذاہب کی اچھی اچھی باتیں سمو دی جائیں، اور ان باتوں کو دور کر دیا جائے جو مذہبی اختلافات اور نزاع کو پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہیں۔ اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے ایک اعلان جاری کیا۔

"ایک ایسا ملک جس کا ایک بادشاہ ہو، یہ بُری بات معلوم ہوتی ہے کہ اس کی رعایا آپس میں منقسم ہو، اور ایک دوسرے سے اختلاف

رکھتے ہو..... اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ان سب لوگوں کو ایک ہی دھاگے
میں پرو دیں مگر اس انداز سے کہ اس میں "وحدت" اور "کثرت" کی
خصوصیات برقرار رہیں تاکہ انھیں اپنے مذہب کی اچھی باتیں پکڑے
رہنے کا فائدہ حاصل رہے اور جو باتیں دوسرے مذاہب میں اچھی ہوں
ان کو بھی اپنا لیں۔ اس طرح اللہ کی حمد و ثنا ہوگی، لوگوں کو امن و
امان ملے گا اور ملک کو حفظ و امان حاصل ہوگا۔"

اس طرح اکبر نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں رشتۂ اتحاد و یگانگت استوار کرنے اور اس اتحاد کو مستقل بنیادوں پر قائم کرنے کی باقاعدہ کوشش شروع کی۔ اپنی رعایا کے مذہبی اور سماجی اختلافات کو نظر انداز کر کے اس نے اس ملک کے ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لئے سرکاری نوکریوں کے دروازے کھول دئے اور تمام مذاہب کے لوگوں کو رشتۂ اتحاد و اخوت میں منسلک کر کے ہندوستان کی مذہبی اور سماجی تحریک کو تقویت پہونچائی اور اس تحریک میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اس جذبے کے پیچھے سیاسی مقصد پنہاں تھا۔ کیوں کہ اکبر کی دوربین نگاہ، سیاسی بصیرت اور بیدار ذہن نے وقت کے تقاضے کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا اور مغلیہ سلطنت کی جڑوں کو ہندوستان کی سرزمین میں مضبوط کرنے کی خواہش نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ ان تمام باتوں کو دور کر دے جو اس مقصد کی تکمیل میں حائل ہو سکتی تھیں۔ وہ اس بات کو خوب جانتا تھا کہ اگر مذہبی اختلافات باقی رہے تو اس کی حکومت کا شیرازہ ایک نہ ایک دن اسی طرح بکھر جائے گا جس طرح عہد سلطنت کی حکومتوں کا زوال ہوا تھا۔ دنیا کی کوئی حکومت اس وقت تک دیرپا نہیں ہو سکتی جب تک اسے اس ملک کے سارے باشندوں کا تعاون حاصل نہ ہو چاہے ان کا کسی مذہب و ملت سے تعلق ہو۔ آج کے ہندوستان کی حکومت کو انہی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس لئے اکبر نے خاص طور پر مذہبی اختلافات دور کرنے کی طرف پوری توجہ دی اور اس نے بابر کی اس وصیت کو عملی جامہ پہنایا جو اس نے ہمایوں کو کی تھی۔

"تمھیں اپنے دماغ کو مذہبی تعصب سے متاثر نہیں ہونے دینا چاہیئے بلا تعصب انصاف کرنا چاہیئے۔ ساتھ ساتھ ہر طبقے کے لوگوں کے مذہبی رسم و رواج کا پورا پورا خیال رکھنا چاہیئے۔ خاص طور پر گاؤکشی سے پرہیز کرنا چاہیئے جو تمھیں ہندوستان کے لوگوں پر قبضہ کرنے میں معاون اور مددگار ثابت ہوگی اور اس طرح تم اس سرزمین کے لوگوں کو شکرگزاری کے رشتہ سے باندھ دوگے۔ تمھیں کسی فرقہ کی عبادت گاہوں کو کبھی مسمار نہ کرنا چاہیئے اور ہمیشہ انصاف پسندی سے کام لینا چاہیئے تاکہ بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان خوشگوار تعلقات رہیں اور ملک میں اطمینان کا بول بالا ہو۔ اشاعتِ اسلام کا کام ظلم و تشدد کے بجائے محبت اور عہد و پیماں سے بخوبی چلے گا..... اے میرے بیٹے! ہندوستان میں مختلف مذہبوں کے لوگ رہتے ہیں اور یہ خدا کی شکرگزاری کی بات ہے کہ بادشاہوں کے بادشاہ نے اس ملک کی حکومت تمھارے سپرد کی ہے۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہادر شاہ ظفر تک (۱۸۵۷ء) پہونچتے پہونچتے ہندوستان کے مغلوں اور دوسرے مسلمانوں کی رگوں میں ایران اور توران سے کہیں زیادہ ہندوستانی خون جوش مار رہا تھا اور ہندوستانی مسلمان، بادشاہ و امراء اور عوام یہاں کی مقامی تہذیب میں پوری طرح رنگے جا چکے تھے۔

ہندو گھرانوں میں شادی بیاہ کا رشتہ قائم کر کے اکبر نے دونوں مذہبی گروہوں میں ایک دوسرے کے مذہب اور تہذیب کے لئے اس طرح احترام پیدا کر دیا اور اس دیوار کو جس نے محکوم قوم کو سماجی علیحدگی میں مقید کر رکھا تھا گرا دیا۔ ہندو رانیوں اور ان کی نوکرانیوں کو شاہی محل میں اپنے اپنے مذہبی عقائد پر عمل کرنے اور سماجی رسوم ادا کرنے کی پوری آزادی دی گئی۔

۱۔ اکبر نے ہندو تہواروں کو قومی تہواروں کی حیثیت سے دربار میں بڑی

دھوم دھام سے منانا شروع کر دیا۔ اس کی پیروی میں بعد کے مغلیہ بادشاہ ان تہواروں کو مناتے رہے اور بادشاہوں کی پیروی میں عوام نے بھی ہندو تہواروں میں خصوصی دلچسپی لی۔ مثلاً ہولی، دیوالی، دسہرہ، بسنت، سلونوں، جنم اشٹمی کے تہوار مناتے تھے۔ دیوالی کی رات کو مسلمان بھی جوا کھیلتے تھے۔ لال قلعہ میں گوبردھن کی پوجا ہوتی تھی۔ بالعموم مسلمان اور بالخصوص مسلمان عورتیں دسہرہ، ہولی اور دیوالی کے موقع کی تمام رسموں کو ادا کرتی تھیں۔ مرزا مظہر جان جاناں کا بیان ہے :

"چناں چہ در ایام دوالی کفار جہلۂ اسلام علی الخصوص زنان ایشاں رسوم کفر بجا می آرند وعید خود می سازند و ہدایا شبیہ بہ ہدایای اہل کفر بخانہائے دختران وخواہران در رنگ اہل شرک می فرستند۔"

(معمولات مظہری ص ۸۴)

۲۔ ہندوستان میں ابتدائی نسلی امتیاز کی وجہ سے مسلم سماج کی تنظیم رفتہ رفتہ ہندوؤں کے ذات پات کے نظام میں رنگنے لگی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ابتدائی زمانے میں آنے والے قبیلوں میں دوسرے نسلی قبیلوں میں شادی بیاہ کی بنا پر اضافہ ہونے لگا۔ اس طرح سلاطین دہلی کے عہد سے ہندوستان میں ایک ایسے نئے مسلم سماج کی تشکیل کے باب کا آغاز ہوا جس کی تکمیل عہد مغلیہ میں ہوئی۔ اکبر کے دور حکومت سے مسلم سماج کی ترتیب و تشکیل کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ملک کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے اور ملک میں سیاسی استحکام قائم کرنے کی غرض سے اکبر اور اس کے جانشینوں نے ہر طبقے کے لوگوں کی سرپرستی کی اور سرکاری کارخانوں میں ہر فن کے صنعت کاروں کو ملازم رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کے ان قدیم باشندوں کو جنھیں مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد مسلم سماج میں مناسب جگہ نہ ملی تھی، اب مل گئی۔ لیکن اس کا یہ بھی نتیجہ برآمد ہوا کہ مسلم سماج پیشہ ورانہ طبقوں میں تقسیم ہو گیا۔ ہندوؤں کی قدیم طبقاتی تقسیم نے مسلم سماج کے لیے ایک نمونہ پیش کیا اور اسی طرز پر مسلم سماج میں بھی پیشہ ور طبقے نمایاں نظر آنے لگے۔ رفتہ رفتہ ہر پیشہ ور طبقے نے اپنے پیشے کو موروثی بنا لیا، اپنی مخصوص رسمیں قائم کر لیں

اور شادی بیاہ کے تعلقات ہم پیشہ لوگوں کے دائرے میں محدود کر لیے۔ یہ تقسیم ہمارے زمانے تک موجود ہے۔ مسز میر حسن نے لکھا تھا کہ لکھنؤ کے سید خاندانوں میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ محدود دائرے میں مناسب رشتہ نہ ملنے کی وجہ سے بعض لڑکیاں اپنی زندگی ناکتخدائی کی حالت میں گزارتی تھیں۔

۳۔ بچے کی ولادت سے موت کے موقع تک عمل میں آنے والی بعض رسمیں ایسی ہیں جو خالص ہندوستان کی دین ہیں۔ عورت کے حاملہ ہونے اور بچہ کی ولادت کے بعد کی جتنی بھی رسمیں ہندوستانی مسلمانوں میں مروج ہیں وہ سب کی سب ہندوستانی ہیں۔ جنھیں مسلمانوں نے جوں کا توں اپنا لیا ہے۔ ان میں بعض کے نام تو وہی ہندوستانی ہیں مگر طریقے بدل گئے ہیں اور بعض میں برائے نام فرق کر دیا گیا ہے۔ مثلاً تیجا ہندوؤں میں۔ فاتحہ یا پھول مسلمانوں میں۔ اگرچہ پھول کا لفظ یہاں بھی مشترک ہے کیوں کہ ہندوؤں میں پھول مُردے کی جلی ہڈیوں کو کہتے ہیں جو تیسرے دن چُن کر مرگھٹ سے جمع کی جاتی ہیں۔ (رسوم دہلی ۳۷۔ ۳۸) حاملہ عورت سے متعلق رسوم میں ستنوانسا' نومالنسا کی رسوم ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں تھیں۔ چھٹی اور چھٹی کی رسمیں ہندوؤں سے اخذ کی گئی ہیں۔ اس موقع پر چھوچھک کی رسم، اس کے نام سے ہی اس رسم کے ہندوانہ ہونے کی نشاندہی ہوتی ہے۔

زچہ کو تارے دکھانے کی رسم خاندان مغلیہ میں مروج تھی اور دہلی کے مسلمانوں میں بھی عام تھی۔ اس موقع پر اور کئی رسمیں ادا کی جاتی تھیں جو ہندوؤں سے لی گئی تھیں۔ برس گانٹھ یا سالگرہ کی رسم ہندوؤں سے لی گئی تھی، دودھ بڑھانے کے موقع کی رسمیں ہندوؤں سے اخذ کی گئی تھیں۔ ختنے کے موقع پر گھوڑی پر چڑھانے کی رسم ہندوانہ تھی۔

شادی بیاہ کی رسمیں:

مرزا قتیل جو دونوں قوموں کے رسوم سے بخوبی واقف تھا رقمطراز ہیں:

"ہندوستان کے مسلمان بیٹے اور بیٹی کی شادی میں چند رسموں کو چھوڑ کر جیسے آگ کے گرد چکر لگانا، باقی سب رسمیں ہندوؤں کی طرح کرتے ہیں، جیسے لڑکے اور لڑکی کو زرد کپڑے پہنانا، اور کلائی میں ریشمی کلاوا باندھنا، عقد سے فارغ ہونے تک دولہا کا ہاتھ میں لوہے کا ہتھیار رکھنا اور عورتوں کا سٹھنی گانا، عام تجمل و آرائش کے ساتھ دولہا کو دلہن کے گھر ساچق لے جانا خالص ہند سے مخصوص ہے۔"

(ہفت تماشا / ۱۳۹)

دور حاضر میں بھی قصبوں اور دیہاتوں کے رہنے والے زراعت پیشہ مسلمانوں میں بچپنے کی شادی کی رسم ہندوؤں سے اخذ کی گئی رسم کی نشان دہی کرتی ہے۔ شادی بیاہ کے رسوم مسلم سماج میں اس حد تک سرایت کر گئے تھے کہ مسلمانوں کو اس بات کا احساس بھی نہ رہا تھا کہ یہ رسمیں غیر اسلامی تھیں۔ سودا نے حضرت قاسم کی شادی کی رسوم کے ذکر میں ہندوستانی رسموں کو اس انداز سے بیان کیا ہے گویا یہ رسمیں عربوں میں بھی پائی جاتی تھیں۔ مثلاً ساچق، مہندی، برات، رقص و سرود، دھنگانا، رخصتی کے وقت رنگ کھیلنا وغیرہ۔ مسلمانوں میں جہیز کا سامان بھی بہت حد تک ویسا ہی ہوتا تھا جیسا کہ ہندوؤں میں رائج تھا۔

نکاح بیوگان :

قدیم زمانے سے ہندوؤں میں بیوہ کے عقد ثانی کا رواج نہیں تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں نے بھی بیوہ کے عقد ثانی کو مذموم سمجھ لیا۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں :

"ہندوؤں کی ایک بدترین رسم یہ ہے کہ بیوہ کی دوسری شادی نہیں کرتے۔ یہ بدترین رسم عربوں میں کبھی نہ تھی۔ نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل نہ آپ کے زمانے میں اور نہ آپ کے بعد۔" (وصیت نامہ/۴)

جب کسی عورت کا شوہر مرجاتا تو اس کے رشتہ دار اسے عقد ثانی سے منع کرتے اور اگر کوئی عورت عقد ثانی کرلیتی تو لوگ اسے لعن طعن کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالعموم بیوہ عورت اپنی پوری زندگی رنڈاپے میں کاٹتی تھی۔

اٹھارہویں صدی میں اس رسم پر اتنی سختی سے پابندی کی جاتی تھی کہ شاہ اسمٰعیل شہید کی بیوہ بہن کا عقد ثانی نہ ہوا تھا۔ دور حاضرہ میں بھی بیوہ کے عقد ثانی کو مذموم سمجھا جاتا ہے۔ احمد علی کی کتاب ''دلی کی شام'' میں ایسی مثالیں ملتی ہیں۔

تفریحی مشاغل

مہاجر مسلمان بعض تفریحی مشاغل اپنے ساتھ لائے تھے لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے خالص ہندوستانی کھیل تماشے، اپنی تفریح طبع کے لیے اپنا لیے۔ ان کو عربی یا فارسی کے نام دے کر اور بعض ضمنی تبدیلیاں کر کے انھیں اسلامی بنا لیا۔ مثلاً پتنگ بازی، عہد مغلیہ میں مسلمانوں میں پتنگ بازی کا عام رواج تھا۔ اٹھارہویں صدی کے خواص و عوام مسلمان دونوں پتنگ بازی سے خاص طور پر دلچسپی لیتے تھے۔ انند رام مخلص نے دہلی میں پتنگ بازی کے عام رواج کا ذکر کیا ہے، دہلی میں آج بھی پتنگ بازی کا رواج عام ہے۔ نہ صرف دہلی بلکہ شمالی ہندوستان کے تقریباً سارے بڑے شہروں کے مسلمان پتنگ بازی سے خاصی دلچسپی لیتے تھے۔ مسز میر حسن علی نے لکھنؤ کے مسلمانوں میں پتنگ بازی سے خاص دلچسپی کا ذکر کیا ہے۔ آگرہ میں بھی پتنگ بازی کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ نظیر اکبر آبادی نے ان مقابلوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ نوابین و امرائے بنگال و اودھ بھی پتنگ بازی سے دلچسپی لیتے تھے۔ نواب آصف الدولہ کو پتنگ بازی کا بڑا چسکا تھا۔

بھگت بازی، ہندوؤں کے اس فن و پیشے کو مسلمانوں نے اپنا لیا تھا اور اس کے ذریعہ بسر اوقات کرتے تھے۔ دہلی میں بھگت باز مسلمانوں کا ایک قبیلہ تھا اور تقی نامی ایک شخص اس قبیلے کا سردار تھا۔ لکھنؤ میں اس فن نے بہت ترقی پائی۔ واجد علی شاہ کو رہس سے خاص دلچسپی تھی۔ یہاں امانت لکھنوی نے اندر سبھا لکھی۔ اس طرح کٹھ پتلی کا کھیل مسلمانوں نے

اپنالیا اور اس کا نام شب بازی رکھا۔ عہدِ مغلیہ میں شب بازی ایک اہم مشغلہ تھا۔ اٹاوہ میں مسلمانوں کا ایک قبیلہ تھا جو شب بازی کے فن میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ البیرونی نے ہندوؤں کے نٹوں کے فرقے کا ذکر کیا ہے۔ مسلمانوں میں بھی نٹوں کا فرقہ موجود تھا۔ اس فن میں دلچسپی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ مسلمان عورتیں اس فن کی تعلیم حاصل کیا کرتی تھیں۔ شہنابائی نامی ایک عورت نے اس فن میں خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔ مسلمانوں میں بہروپیوں کا فرقہ بھی ہندوؤں کی دین ہے۔ قدیم ہندوستان میں بازی گروں کا فرقہ پایا جاتا تھا۔ مسلمانوں میں بھی بازی گروں کی ایک جماعت پائی جاتی تھی۔ بابر نے مداریوں کا ذکر کیا ہے اس فرقہ کے لوگ خود کو مسلمان صرف اس وجہ سے کہتے تھے کہ ان کے یہاں ختنے کی رسم ادا ہوتی تھی۔ ان کی شادی کی رسمیں ملّا اور قاضی ادا کرتے تھے۔ بس اسلام سے ان کا اتنا ہی واسطہ تھا۔ ان کی بقیہ سب رسمیں وہی تھیں جن پر وہ مشرف بہ اسلام ہونے سے پہلے عمل کرتے تھے۔ گھریلو کھیلوں میں شطرنج، چوسر، چوپڑ خالص ہندوستانی کھیل تھے۔ عہدِ مغلیہ بادشاہ، امراء اور عوام ان کھیلوں سے بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ اکبر نے فتح پور سیکری میں فرش پر شطرنج کی بساط بنوائی تھی اور مہروں کی جگہ غلام عورتوں کو کھڑا کر کے وہ شطرنج کھیلا کرتا تھا۔ شاہی حرم کی مستورات شطرنج کھیلا کرتی تھیں۔ زیب النساء کو چوسر کھیلنے سے بڑی دلچسپی تھی۔ ان کھیلوں کے علاوہ چنڈل منڈل، گنجفہ کا کھیل مسلمانوں نے ہندوستان سے اخذ کیا تھا۔

پرندوں اور جانوروں کی لڑائیاں :

مختلف قسم کے پرندوں کو آپس میں لڑانے کا شوق ہر طبقے کے مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔ ان میں مرغ بازی، بٹیر بازی، تیتر بازی، گلدم بازی، لوا بازی، طوطے بازی اور درندوں میں ہاتھی، شیر، ہرن، چیتے، سُور، تیندوے، سانڈ، مینڈھے اور دوسرے جانوروں کو آپس میں لڑا کر اس منظر سے مسلمان محظوظ ہوا کرتے تھے۔ اسپیر نے لکھا ہے کہ شام کے چار بجے محل کے سامنے کئی سلاطین جمع ہو جاتے اور اپنے مرغ لڑا کر بہادر شاہ

ظفر کا دل بہلاتے تھے اور غالباً یہ روزانہ کا شغل تھا۔ لکھنؤ کے عوام و خواص اپنی فارغ البالی کی وجہ سے اپنا بیشتر وقت پرندوں کو لڑانے اور محظوظ ہونے میں صرف کرتے تھے۔

دوسرے تفریحی مشاغل میں غبارے بازی، ہنڈولہ، بیل گاڑیوں کی دوڑ کے مقابلے اور دریاؤں میں چراغاں کرنا شامل تھے۔ اسی طرح بچوں اور لڑکوں کے بہت سے کھیل خالص ہندوستانی تھے اور ان کے نام بھی ہندی میں تھے۔ انشاء اللہ نے ان کھیلوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ (دریائے لطافت/ ۲۱-۲۲)

سواریاں :

ہندوستان آنے کے بعد اس ملک کے جغرافیائی حالات اور یہاں کے چلن کے مطابق مسلمانوں نے اونٹ اور گھوڑے کی سواری کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں مروجہ دوسری سواریاں بھی اپنا لیں اور ان سواریوں میں جدت سے کام لیا۔ مثلاً ہاتھی کی سواری، پالکی، سکھ پال، سنگھاسن، جوالہ، چنڈول، بہل، رتھ وغیرہ۔ ہندوستانی مسلمانوں کی مخصوص سواری گاڑیاں اور باربرداری کے جانور یہ تھے۔ میانہ، محافہ، چنڈول، پینس، چوپالہ، کھڑکھڑیہ، چھکڑا، لڑھا، رہکلہ، بہل، خچر، ٹٹو، بھینسا، گوخر اور تانگہ۔

علوم وفنون :

قدیم ہندوستان میں علم نجوم وفلکیات کے علوم کا عام رواج تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کو بھی اس علم سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اور علاء الدین خلجی کے دور حکومت میں خواص و عوام کو اہل تنجیم سے بڑی دلچسپی تھی۔ اور برنی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں میں علوم نجوم کا عام رواج پایا جاتا تھا۔ (تاریخ فیروز شاہی / ۳۶۳-۳۶۴) دہلی کا کوئی ایسا محلہ نہ تھا جس میں نجومی سکونت پذیر نہ ہوں۔ ملوک اور امراء اپنے بچوں کے زائچے ان سے تیار کروایا کرتے تھے۔ علاء الدین خلجی کے محل کی عورتوں میں نجومیوں کا بڑا اثر تھا۔ برنی نے اس عہد کے نجومیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے تین رمال

بہت مشہور تھے۔ مولانا صدرالدین لوتی۔ غزلی رمال (باشندۂ کول) اورمعین الملک زبیری (ایضاً۔/۲۶۳۔ ۲۶۴) سلطان فیروز شاہ تغلق کو علم نجوم وہیئت سے بڑی دلچسپی تھی۔ "منجان داتا" اور "کا نہاں راز یک بیر" سے ستاروں کے بارے میں معلومات حاصل کیا کرتا تھا۔ اس علم کا اس نے مطالعہ بھی کیا تھا۔ اور کئی کتابیں اس فن میں لکھوائی تھیں۔ (عفیف۔ تاریخ فیروز شاہی/ ۲۱۔ ۳۴) اس نے اصطرلاب ایجاد کیا تھا جو "اصطرلاب فیروز شاہی" کہلاتا تھا۔ حوالہ مندرجہ بالا۔ فیروز شاہ نے نجوم کے موضوع پر ایک سنسکرت میں تصنیف پائی تھی جس کا ترجمہ اس نے عزالدین خالد خانی سے کروایا تھا۔ اور اس کا نام دلائل فیروز شاہی رکھا تھا۔ فیروز شاہ نے باراہمر کی مشہور تصنیف باراہی سنکھتا کا بھی ترجمہ کروایا تھا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا خیال ہے کہ غالباً اس زمانے کے مدارس میں طلبار کو اس علم کی تعلیم دی جاتی تھی۔

عہد مغلیہ میں علم نجوم سے گہری دلچسپی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اکبر کو اس علم سے بڑی دلچسپی تھی۔ علم فلکیات میں تاجک نامی مشہور کتاب کا فارسی میں ترجمہ کروایا گیا تھا۔ اس زمانے میں سید میر بہت مشہور نجومی تھے۔ اکبر نے مدارس کے نصاب میں علم نجوم و رمل کے مضامین کو لازمی مضامین کی حیثیت دی تھی۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی میں علم نجوم کا عام چرچا تھا۔ اور خواص وعوام دونوں نجومیوں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور ان کے مشورہ کے بغیر کوئی اہم کام شروع نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جنگ کرنے اور بچہ کی ولادت کا وقت تک ان سے دریافت کیا جاتا تھا۔ محمد شاہ بادشاہ کے دربار سے وابستہ نجومیوں میں منشیر خاں، منجم خاں، مرزا حسن تاریخ نویس بہت مشہور تھے۔ اٹھارہویں صدی کے ادب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے مسلمانوں نے اس علم میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ مثلاً قلندر بخش جرأت۔ درالو نجوم ہندیاں.... مہارت دارد) حکیم مومن خاں مومن کو علم نجوم میں ایسی مہارت حاصل تھی کہ بڑے بڑے نجومی ان کا منہ دیکھا کرتے تھے۔ ایسے مسلمان نجومیوں کے سیکڑوں ناموں کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک موقع پر شاہ عالم ثانی

نے یہ کہاوت دہرائی تھی ۔ ”آنچہ بود دزد برد و آنچہ از دزد باقی ماند، رمال گرفت ۔“ (روزنامچہ شاہ عالم ۱/۱۱۸ ب)

باہر سے آئے مسلمانوں نے بھی سحر و افسوں کے فن میں مہارت حاصل کر لی تھی ۔ نتیجتاً عام مسلمان سحر و افسوں پر اعتقاد رکھنے لگے ۔ اٹھارھویں صدی میں تقی نامی بھگلتیہ سحر سامری کا ایک کہنہ مشق اور کامل جادوگر تھا ۔

اوہام پرستی :

عام مسلمانوں میں اوہام پرستی کا رواج پایا جاتا تھا ۔ شادی کے موقعوں پر قسم قسم کے اوہام پر عمل کیا جاتا تھا ۔ اور آج بھی ان کی ادائیگی لوازم میں سے ہے ۔ مثلاً نوشہ کے مکان کی باہری دیواروں پر عقائد باطلہ کے تحت تیل یا چونے سے بعض نشانات بنائے جاتے تھے ۔ موسل سے ناڑا باندھا جاتا تھا ۔ اور بعض دوسری ایسی رسمیں تھیں جن کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا اور خالص ہندوستانی ماحول کی دین تھیں ۔ مثلاً نثار اتارنے کا رواج ۔

شاہ مدار ، غازی میاں یا کسی دوسرے بزرگ کے نام کی چوٹی بچوں کے سر پر رکھی جاتی تھی ۔ شاہ عالم ثانی نے اپنے بیٹے کے سر پر شاہ شرف الدین پانی پتی کے نام کی چوٹی رکھی تھی ۔ اور اس کو ترشوانے کے لئے وہ اپنے بیٹے کو ساتھ لیکر مزار پر حاضر ہوا تھا ۔ بچوں کے گلے میں ہنسلیاں اور پیروں میں بیڑیاں ڈالی جاتی تھیں ۔ تعویذ گنڈوں پر عام طور پر عقیدہ پایا جاتا تھا ۔ چیچک کی وبا کے موقع پر سیتلا دیوی کی پوجا ہوتی تھی ۔ ہندو عورتوں کی طرح مسلمان عورتوں نے بھی روزے کسی خاص تاریخی شخصیت کے نام سے اختراع کر لیے تھے اور ان کو اسلامی رنگ دیدیا تھا ۔ ان کے نام کے روزوں کے موقعوں پر خاص قسم کا اہتمام کیا جاتا تھا ۔

ارواح خبیثہ کے اثرات پر عقیدہ رکھنے کا جتنا رواج ہندوستان میں تھا غالباً دنیا کے کسی دوسرے حصے میں نہ تھا ۔ نصیحۃ المسلمین کے مصنف نے لکھا ہے کہ حاضری

عباس کی ،صحنک حضرت فاطمہ کی ، گیارھویں حضرت عبد القادر جیلانی کی ،ملیدہ شاہ مدار کا بوعلی قلندر کی ، نوشہ شاہ عبد الحق کا اس نیت سے کرنا کہ یا حضرت تم ہمارا فلاں کام کر د کھانے کا خاص اہتمام کرنا ، فاتحہ عباس کا صرف شیرمال اور کباب ہی پر ہو ، اور فاتحہ شاہ عبد الحق کا پوری حلوے پر ہی ہو ، اور تاریخ کی تخصیص صرف ہندوستانیوں نے نکالی ہے ۔ اور ہندوؤں کی طرح لیپنا پوتنا ، کھانے کے ساتھ پانی کا رکھنا اور بعضے تو حقہ اور افیون بھی رکھ دیتے تھے (النصیحۃ المسلمین/۲۳، ۴۴، ۴۵)

سات عورتوں اور مردوں کے نام کی فاتحہ ہوتی تھی ۔عورتوں کا عقیدہ تھا کہ ان میں سے ہر ایک باری باری کسی عورت میں حلول کرتے تھے ۔ ان کے نام یہ تھے ۔ شیخ سدو زین خاں ، ننھے خاں ، صدر جہاں ، چہل تن ، شاہ دریا اور شاہ سکندر اور سات عورتیں یہ تھیں ۔ لال پری ، سبز پری ، سیاہ پری ، زرد پری ،آسمان پری دریا پری اور نور پری ۔

تغیّر دادن راہ :

مسلمانوں میں یہ رسم تھی کہ جس راستے سے جاتے تھے واپسی میں اس راستے سے آتے تھے ۔

سیّدہ کی کہانی :

جس طرح ہندوؤں میں کسی خوشی کے موقع پر ست نرائن کی کتھا ہوتی تھی اسی طرح مسلمانوں نے منت کے طور پر سیّدہ کی کہانی سننا شروع کر دیا تھا اور بڑی دلچسپ بات یہ تھی کہ ست نرائن کی کتھا اور جناب سیّدہ کی کہانی کے بعض اجزاء میں یکسانیت پائی جاتی تھی ۔

دربار مغلیہ میں ایک رسم یہ تھی کہ بادشاہوں کو نذر پیش کرتے وقت اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا تھا کہ نذر کی رقم جفت نہ ہو بلکہ طاق ہو مثلاً ۵۱ یا ۱۰۱ وغیرہ ۔ یہ رسم

ہندوستان کے مسلمانوں میں اب بھی شادی کے موقعوں پر برتی جاتی ہے اور دولہا کو جو سلامی کی رقم دی جاتی ہے وہ طاق ہوتی ہے، یہ رسم بھی ہندوؤں سے آئی ہے۔

مزاروں پر چھڑیاں چڑھانا:

قدیم زمانے سے ہندوؤں میں یہ رسم چلی آ رہی تھی کہ وہ لوگ مندروں میں سالانہ میلے کا بندوبست کرتے تھے اور زائرین بالعموم ہاتھوں میں جھنڈیاں لے کر دور دراز کا سفر طے کر کے وہاں جاتے تھے۔ مسلمانوں نے اس طریقے کو دوسری شکل میں اختیار کر لیا اور وہ عرس کے زمانے میں اپنے بزرگوں کے مزاروں پر جھنڈے یا بینرے لے کر جانے لگے۔ رائے چترمن اور دوسرے مصنفین نے ان چھڑیوں یا بینروں کے جلوسوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے، جو دہلی سے روانہ ہوتے تھے مثلاً چھڑی خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، چھڑی غازی میاں، چھڑی شاہ مدار، چھڑی سخی سرور وغیرہ۔

بزرگوں کے مزاروں کی زیارت کے موقع پر مسلمان بعض ایسی رسمیں ادا کرتے تھے جو غالباً ہندوؤں سے اخذ کی گئی تھیں کیوں کہ وہ مندروں میں دیویوں کے سامنے چڑھاوے چڑھایا کرتے تھے۔ فاتحہ اور نذر کے مخصوص کھانے ہوتے تھے۔ شاہ اسمٰعیل شہید کے بیان کے مطابق "اس طعام کے آداب کا حاصل ہندوؤں سے مشابہت پیدا کر لینے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کیوں کہ اکثر اوقات وہ دالوں، غلوں اور طعام کے اجناس کی پرستش کرتے ہیں۔ اور کھانے والوں کے لئے قید لگائی یعنی ایک کو کھانے سے منع کرنا اور دوسرے کو اس کی اجازت دینا۔ نذر و نیاز کی رسم اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ اشیاء خوردنی سے گزر کر جانوروں کی نذر چڑھانے لگے تھے۔"

اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں قبر پرستی کا رواج اتنا عام ہو چکا تھا کہ شاید ہی کوئی ایسا مزار ہو جہاں زائرین کا مجمع نہ ہوتا ہو اور منتیں نہ مانی جاتی ہوں، چڑھاوے نہ چڑھائے جاتے ہوں، زیارت قبور کو درجۂ حج دیدیا گیا تھا، مسجدیں ویران تھیں، مگر مزارات آباد تھے، ہر سال عرس کے موقع پر میلے لگتے تھے، نزدیک اور دور سے

زائرین آتے تھے اور ایسی زبوں حالی تھی کہ شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کو مخاطب کرکے کہا تھا۔ "تم مدار صاحب اور سالار صاحب کی قبروں کا حج کرتے ہو، یہ تمہارے بدترین افعال ہیں۔" قرون وسطیٰ بالخصوص اٹھارھویں صدی قبر پرستی کا عہد تھا اور ہندوستانی تہذیب کے بوجھ سے اسلام اپنا ظاہری وجود کھوتا جارہا تھا۔ روزہ اور نماز ہی ایسی دو باتیں تھیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کی انفرادیت باقی تھی۔

سورج گرہن اور چندر گرہن کی رسموں پر بھی مسلمان عمل کرتے تھے۔ میر حسن علی نے لکھا ہے کہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں ہندو اور مسلمان دونوں سورج گرہن کے موقع کی مروجہ رسموں پر یکساں عمل کرتے تھے۔

مظاہر پرستی :

ہندوستانی مسلمانوں کے بعض طبقوں میں بت پرستی کا رجحان بھی پایا جاتا تھا اور ہندوؤں کے دیوتا دیوی کی وہ پوجا کرتے تھے۔ نذر چڑھاتے تھے اور اس معاملے میں ہندوؤں کی پیروی کرتے تھے۔ سجان رائے بھنڈاری کے ایک بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ کانگڑہ کے قلعے کے نیچے بھوانی کا مندر تھا اور ہر سال سارے ہندوستان کے زائرین وہاں آتے تھے۔ اور ان میں مسلمان بھی ہوتے تھے جن کا مذہب بت پرستی کی تردید کرتا تھا:

"قطع نظر ہنود کہ بت پرستی آئین دین آنہاست گروہا گروہ مسلمین
مسافت بعید طے کردہ نذورات می آرند، بحکمت ایزدی مرادات
مردم بحصول می انجامد۔"

(خلاصۃ التواریخ۔ ۲۴۷)

اسی طرح بنگال کی مسلمان عورتیں بالعموم بھوانی یا کالی مائی کی پوجا کیا کرتی تھیں اور ہندو مسلمان دونوں ایک ہی طریقے سے ست پیر کی پرستش کرتے تھے۔

شب برات :

شاہ ولی اللہ، شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد بریلوی کی تصانیف میں شب برات کی رسموں کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق ہندوؤں کی کناگت اور شب برأت کی رسموں میں کافی مماثلت پائی جاتی تھی۔ مسلمانوں نے اس رسم کو شب برات کے حلوے پوری سے تبادلہ کر لیا تھا۔ اور بعض دوسری رسمیں اس میں شامل کر لی تھیں۔ چہار شنبہ، ماہ رجب اور شعبان کی بعض رسمیں بھی ہندوؤں کی رسموں کی تقلید میں وجود میں آئیں

(باقی آئندہ)

"اگرچہ ہندوستانی مسلمانوں پر ایران اور ترکستان کی تہذیب و شائستگی کا بہت بڑا اثر رہا ہے، لیکن انھوں نے ہندوستان کے ماحول سے متاثر ہو کر اپنی مخصوص شائستگی اور تمدن کی بنیادیں رکھیں۔ مغلوں کے زمانے میں ہندوستانی اثرات کی کارفرمائیاں نظر عام پر آگئیں۔ کیا بہ لحاظ عمارتوں کے طرز کے اور کیا بہ لحاظ طرز رہائش و لباس کے، ہندوؤں کی شائستگی و تہذیب کا اثر چھپا ہوا نہیں۔ مسلمان باوجود اس کے کہ اپنے مذہب کے معاملے میں ہمیشہ سخت رہے لیکن مذہب اور عقائد کی دنیا بھی اس اثر سے محفوظ نہ رہ سکی۔ قوموں کی آپس کی اثر پذیری بالکل قدرتی بات ہے، اس کے خلاف کوشش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی قانون فطرت کے خلاف سعی کی جائے۔ دو قومیں، جن میں چاہے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، جب ایک جگہ آپس میں رہتی سہتی ہیں، رستی بستی ہیں تو لازمی طور پر پہلے پہل ایک دوسرے کی معاشرت اور رسوم سے متاثر ہوتی ہیں اور بالآخر چند صدیوں کے بعد بالکل ایک ہو جاتی ہیں۔"

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

(ماہنامہ جامعہ، ستمبر ۱۹۲۵ء، صفحہ ۲۲۴)

کاظم علی خاں

منشی نول کشور

منشی نول کشور ایک شریف اور صاحبِ ثروت خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ نول کشور کے نسب نامے سے ہمیں اُن کے جن بزرگوں کے نام معلوم ہوتے ہیں وہ سلسلے وار پیش کیے جاتے ہیں :

(۱) کھیم چند (۲) رام داس (۳) کپور چند (۴) دھرم داس (۵) کرپال داس سنول داس (۷) سہاج رام (۸) اندر سنگھ [کمانڈر اِن چیف مرہٹہ فوج] (۹) بال مکند (۱۰) جمنا پرشاد بھارگو۔ منشی نول کشور انھیں جمنا پرشاد بھارگو کے فرزند تھے اور نول کشور کی والدہ کا نام یشودا دیوی تھا۔ جمنا پرشاد موضع ساسنی (ضلع علی گڑھ) کے زمین دار تھے۔ جمنا پرشاد کے پانچ بیٹے تھے : (۱) پھول چند (۲) نول کشور (۳) تلسی رام (۴) سیوک رام (۵) دامودر داس۔

نول کشور یک شنبہ ۳ جنوری ۱۸۳۶ء کو موضع ریڑھا [ضلع متھرا] میں پیدا ہوئے۔[۱] جیون چرتر (ص ۲) میں نول کشور کا سنہ ولادت پُوس سمبت ۱۸۹۲ وکرمی درج ملتا ہے۔ نظامی بدایونی نول کشور کا سنہ ولادت خلافِ واقعہ ۱۸۳۵ء فرض کرتے ہیں۔[۲] عبدالرؤف عروج کا یہ اندراج بھی نظرِ ثانی کا محتاج ہے کہ "منشی نول کشور دسمبر ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے۔"[۳] امین سلونوی نول کشور کا سنہ ولادت ۱۸۳۷ء بتاتے ہیں جو محلِ نظر ہے [تعمیر ہریانہ نول کشور نمبر ص ۳۴]۔ مرزا محمد عسکری[۴]، مولانا غلام رسول مہر،[۵]

جناب کاظم علی خاں، لکچرر شعبۂ اردو، شیعہ انٹر کالج۔ لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۳

مولانا مرتضیٰ حسین فاضل[6] اور ڈاکٹر گیان چند[7] کا یہ ارشاد بھی ناقابلِ قبول ہے کہ نول کشور بستوئی ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ جیون چرتر (ص ۲ تا ۳) میں نول کشور کا مولد ریڑھا [ضلع متھرا] ہی ملتا ہے۔

نول کشور کی ابتدائی تعلیم چھ برس کے سن میں موضع ساسنی ضلع علی گڑھ میں شروع ہوئی۔ دس سال کے سن [۱۸۴۶ء] میں آگرہ کالج میں داخل ہوئے جہاں وہ پانچ برس تک زیرِ تعلیم رہے۔ نول کشور کے ابتدائی مضامین اخبار سفیر آگرہ میں شائع ہوئے۔ نول کشور اخبار سفیر آگرہ کے مہتمم رہے پھر منشی ہرسکھ راے[8] [مالک اخبار کوہ نور لاہور] کی دعوت پر [۱۸۵۳ء کے آس پاس] لاہور جاکر اخبار کوہ نور کے پریس سے منسلک ہو گئے۔ نول کشور لاہور میں چار سال [۱۸۵۷ء] تک مقیم رہ کر آگرہ واپس ہوئے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد جب انگریزی حکومت کا دوبارہ تسلط ہوا تو منشی نول کشور آگرے سے لکھنؤ منتقل ہو گئے۔[9]

لکھنؤ میں منشی نول کشور نے ۲۶ نومبر ۱۸۵۸ء سے قبل اپنا ذاتی پریس قائم کیا۔ جیون چرتر (ص ۴) سے پتا چلتا ہے کہ یہ پریس پہلے کوٹھی غالب جنگ میں کھلا۔ تاریخِ اودھ میں غالب جنگ کا نام راجا درشن سنگھ ملتا ہے[10]۔ امیر حسن نورانی لکھتے ہیں کہ نول کشور پریس پہلے محلہ ڈیوڑھی آغا میر لکھنؤ میں کھلا پھر محلہ گولا گنج چلا گیا اور پھر گولا گنج سے یہ پریس کوٹھی راجا مان سنگھ واقع محلہ رکاب گنج لکھنؤ پہنچا [تعمیر ہریانہ نول کشور نمبر ص ۲۹]۔ راجا مان سنگھ قائم جنگ [متوفیٰ ۱۱ اکتوبر ۱۸۷۰ء] راجا درشن سنگھ غالب جنگ (متوفیٰ ۱۸۴۴ء) کے چھوٹے فرزند تھے[11]۔ تذکرہ سراپا سخن طبع ۱۸۶۱ء سے پتا چلتا ہے کہ مطبع نول کشور ۱۸۶۱ء تک راجا بختاور سنگھ کے مکان واقع محلہ رکاب گنج لکھنؤ میں قائم تھا[12]۔ راجا بختاور سنگھ [متوفیٰ ۱۸۵۵ء] راجا درشن سنگھ غالب جنگ کے بڑے بھائی اور راجا مان سنگھ کے سگے چچا تھے [متعلقاتِ غالب، ص ص ۸۶ تا ۸۷]۔ مکتوبِ غالب بہ نام تفتہ مورخہ ۱۲ فروری ۱۸۶۵ء تک نول کشور پریس راجا مان سنگھ کی حویلی میں واقع تھا[13]۔ پریس نے جب ترقی کی تو نول کشور نے اِسے خود اپنی تعمیر کردہ عمارت واقع حضرت گنج لکھنؤ میں منتقل کیا

[جیون چرتر ص ۲] ۔ خیابانِ تواریخ طبع اکتوبر ۱۸۸۱ء کا خاتمۃ الطبع بتاتا ہے کہ مطبع منشی نول کشور ماہ اکتوبر ۱۸۸۱ء میں محلہ حضرت گنج لکھنؤ میں موجود تھا۔[14] مطبع نول کشور کے محلِ وقوع کے متعلق مذکورہ بیانات کی تصدیق کے لیے مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ بعد کو نول کشور پریس کی شاخیں دوسرے شہروں میں بھی کھلیں جن میں کان پور اور لاہور شامل ہیں۔[15]

منشی نول کشور نے اپنے پریس سے ۲۶ نومبر ۱۸۵۸ء کو اودھ اخبار لکھنؤ جاری کیا۔ [بہ حوالہ تعمیر ہریانہ نول کشور نمبر ص ۳۰] جو اردو صحافت کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا مالک تھا۔ اودھ اخبار اتنا مقبول ہُوا کہ یہ پریس مطبع اودھ اخبار کے نام سے بھی مشہور ہو گیا۔ چناں چہ غیاث اللغات طبع نومبر ۱۸۷۴ء کے خاتمۃ الطبع میں منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی نے منشی نول کشور کو "مالکِ مطبع اودھ اخبار" لکھا ہے۔[16] اودھ اخبار اور پریس کے ذریعے منشی نول کشور نے صحافت و طباعت کے میدان میں جو خدمات سر انجام دی ہیں وہ اُردو ادب کی تاریخ میں ناقابل فراموش ہیں۔ نول کشور پریس سے مختلف موضوعات پر اُردو، فارسی اور عربی میں جو انبار در انبار اور بے شمار کتابیں شائع ہوئی ہیں اُن کے متعلق یہاں کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں۔ یہ موضوع بجائے خود ایک ضخیم کتاب کا طالب ہے۔

میرے ذخیرۂ کتب میں نول کشور پریس سے شائع شدہ مَلک محمد جائسی کے منظوم شاہ کار پدماوت بھاکا طبع مئی ۱۸۷۰ء کا فارسی رسم الخط میں جو نسخہ موجود ہے اُس میں محسن علی ساقی کی بہ طرز مثنوی ایک منظوم اُردو تقریظ بھی شامل ہے۔[17] مئی ۱۸۷۰ء میں شائع ہونے والی یہ تقریظ نول کشور پریس اور اودھ اخبار پر مفصل روشنی ڈالتی ہے۔ اس تقریظ میں ساقی نے منشی نول کشور کے جس جود و سخاوت کی تعریف کی ہے اُس کا عملی ثبوت جیون چرتر (ص ص ۷ تا ۹) میں موجود ہیں۔ منشی نول کشور نے جن تعلیم گاہوں، شفاخانوں، اداروں اور کتب خانوں کو ہزاروں روپے نقد یا جنس کی شکل میں بہ طورِ امداد عطا کیے اُن میں مندرجہ ذیل ادارے بھی شامل ہیں :

(۱) آگرہ کالج ہاسٹل۔ بیس ہزار روپے نقد اور ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ آمدنی کا ایک گاؤں عطا کیا۔

(۲) علی گڑھ کالج لائبریری۔ دس ہزار روپے نقد اور ہزاروں روپے کا کتب خانہ

(۳) جوبلی اسکول لکھنؤ ـــــ پندرہ ہزار روپے

(۴) لیڈی ڈفرن فنڈ برائے اسپتال ـــــ بیس ہزار روپے

(۵) البرٹ اسکول ـــــ تین ہزار روپے

(۶) رمینرے اسپتال نینی تال ـــــ پانچ سو روپے

(۷) پریاگ میور سنٹرل کالج ـــــ ہزاروں روپے کا کتب خانہ

(۸) کیننگ کالج لکھنؤ ـــــ " " "

(۹) جلسۂ تہذیب لکھنؤ ـــــ " " "

(۱۰) میرٹھ پبلک لائبریری ـــــ " " "

منشی نول کشور کی خدمات کی بدولت انھیں ۵ر جنوری ۱۸۸۸ء کو حکومت نے سی۔آئی۔ای کے خطاب سے نوازا تھا۔ لکھنؤ میں وہ آنریری مجسٹریٹ بھی بنائے گئے تھے[۱۸]۔ منشی نول کشور نے ایک کامیاب زندگی گزار کر ۱۹ر فروری ۱۸۹۵ء مطابق ۲۲ر شعبان ۱۳۱۲ھ یوم سہ شنبہ کو صبح چار بجے لکھنؤ میں وفات پائی[۱۹]۔ یومِ وفات سہ شنبہ کی تصدیق جیون چرتر (ص ۱۳) سے بھی ہوتی ہے۔ تاریخِ ولادت ۳ر جنوری ۱۸۳۶ء اور تاریخِ وفات ۱۹ر فروری ۱۸۹۵ء کی بنیاد پر منشی نول کشور کا عرصۂ حیات اٹھاون سال ایک ماہ اور سولہ دن متعین ہوتا ہے۔ جیون چرتر (ص ۱۳) میں بھی وفات کے وقت نول کشور کا سن ۵۹ برس بتایا گیا ہے۔ ان حقائق کے پیشِ نظر پاکستانی اہلِ قلم عبدالرؤف عروج کا یہ لکھنا محلِ نظر ہے کہ منشی نول کشور نے ۶۱ سال کی عمر میں انتقال کیا [بزمِ غالب ص ۳۹۶]۔ قاموس المشاہیر جلد دوم (ص ۲۷۲) میں نول کشور کا سنہ وفات خلافِ واقعہ ۱۸۹۴ء درج کیا گیا ہے۔

منشی نول کشور کے اہل وعیال اور اخلاف کے متعلق مختلف مصادر[۲۰] سے جو معلومات دست یاب ہوئی ہیں وہ مختصراً سطورِ ذیل میں پیش ہیں:

۱۔ نول کشور کی اہلیہ کا نام سرسوتی کور تھا۔

۲۔ منشی نول کشور اولادِ ذکور سے محروم تھے اور انھوں نے اپنے بھتیجے رائے بہادر منشی پراگ نرائن بھارگو کو متبنیٰ کر لیا تھا۔ پراگ نرائن ۲۴؍ دسمبر ۱۹۱۶ء کو فوت ہوئے تھے۔ اب ڈاکٹر رنجیت کمار بھارگو اور تیج کمار بھارگو منشی نول کشور کے وارث ہیں۔

۳۔ نول کشور کی ایک صاحب زادی نے ۱۲۸۴ھ میں وفات پائی تھی۔ منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی نے نول کشور کی ان صاحبزادی کی تاریخِ وفات بہ قاعدۂ توشیح کہی تھی جو ذیل میں منقول ہے:

دلاسا چاہیے طبعِ حزیں کا — فغاں کیسا موئی گر خرد دختر
خدا دے گا تمھیں نعم البدل میں — خلف خورشید منظر ماہ پیکر

[۴ + ۸۰ + ۶۰۰ + ۶۰۰ = ۱۲۸۴ھ]

حواشی

لہ منشی نول کشور کے یہ حالات مندرجہ ذیل مصادر پر مبنی ہیں:

۱۔ رسالہ فروغِ اردو لکھنؤ۔ منشی نول کشور نمبر۔ مارچ ۱۹۷۰ء ص ص ۵۰، ۴۰ نیز ۱۲۔

۲۔ رسالہ تعمیرِ ہریانہ چنڈی گڑھ۔ نول کشور نمبر۔ جولائی اگست ۱۹۷۹ء ص ص ۲۸، ۳۰، ۴۹، ۵۹، ۶۶۔

۳ جیون چرتر منشی نول کشور صاحب: منشی لال جی۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع ۱۹۰۳ء ص ۲ [مملوکہ کاظم علی خاں]

— پروفیسر نور الحسن ہاشمی نے ایک مضمون میں نول کشور کا سنہ ولادت ۱۸۲۸ء تجویز کیا ہے مگر اس سلسلے میں موصوف خود شک کرتے ہیں [فروغِ اردو۔ نول کشور نمبر ص ۲۰] فروغ اردو نول کشور نمبر کے لیے ڈاکٹر انوار الحسن کا ممنون ہوں۔

ے۲ه قاموس المشاہیر (جلد دوم) . مرتبہ نظامی بدایونی ۔ نظامی پریس بدایوں طبع ۱۹۲۶ء ص ۲۷۲

ے۳ه بزمِ غالب : عبد الرؤف عروج ۔ ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی طبع مارچ ۱۹۶۹ء ص ۳۹۴

ے۴ه تاریخ ادب اردو : تالیف ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ۔ مترجمہ مرزا محمد عسکری ۔ مطبع تیج کمار لکھنؤ، طبع ۱۹۶۹ء [حصۂ نثر] ص ۹۹

ے۵ه خطوطِ غالب : مرتبہ غلام رسول مہر ۔ علمی پرنٹنگ پریس لاہور طبع ۱۹۶۸ء ص ۵۰۹

ے۶ه عودِ ہندی : غالب ۔ مرتبہ . مرتضیٰ حسین فاضل ۔ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور طبع جون ۱۹۶۷ء ص ۴۹۳

ے۷ه تعمیر سرمایہ نول کشور نمبر ص ۶۱

ے۸ه منشی ہرسکھ رائے مقیم لاہور کے نام سرسید احمد خاں کا ایک انگریزی خط مورخہ ۹ ستمبر ۱۸۶۵ء انگریزی کتاب سلکٹڈ ڈاکیومنٹس فرام دی علی گڑھ آرکائیوز : مرتبہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ علی گڑھ یونی ورسٹی پریس علی گڑھ طبع ۱۹۶۶ء (صفحہ ۶۹) میں موجود ہے ۔

ے۹ه نول کشور کی تعلیم، ملازمت اور آگرہ و لاہور وغیرہ میں سکونت پر مشتمل یہ حالات جیون چرتر (ص ص ۳ تا ۴) نیز تعمیر سرمایہ نول کشور نمبر ص ص ۲۸، ۲۹ نیز ۵۶ کے مندرجات پر مبنی ہیں ۔

ے۱۰ه تواریخ اودھ (جلد دوم) : کمال الدین حیدر [ناقص الطرفین] ص ۳۶۰ [بہ شکریہ جناب ضیغم الدین حیدر لکچرر شیعہ انٹر کالج لکھنؤ]

ے۱۱ه بہ حوالہ متعلقاتِ غالب : کالی داس گپتا رضا ۔ ومل پبلی کیشنز بمبئی طبع اگست ۱۹۷۸ء ص ۸۷ [یہ کتاب جناب کالی داس گپتا رضا نے مجھے عنایت کی تھی جس کے لیے میں موصوف کا ممنون ہوں ۔]

ے۱۲ه سراپا سخن : میر محسن علی محسن ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ طبع ۱۸۶۱ء سرورق نیز ص ۴۰۱

ے۱۳ه اردوئے معلیٰ (حصہ اوّل) : مرزا غالب ۔ اکمل المطابع دہلی طبع مارچ ۱۸۶۹ء ص ۱۱۰ [نمبر ۲ کاظم علی خاں]

۱۴؎ خیابانِ تواریخ : مولفہ سید محمد علی جو یا مراد آبادی ۔ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ طبع اکتوبر ۱۸۸۱ء ص ۳۴۴ [مملوکہ کاظم علی خاں]

۱۵؎ مطبع منشی نول کشور کان پور اور لاہور سے چھپی ہوئی مندرجہ ذیل کتابیں میرے پاس موجود ہیں :

۱۔ احکامِ طعامِ اہلِ کتاب : سر سید احمد خاں ۔ مطبع نول کشور کان پور ۔ مطبع ۱۸۶۸ء

۲۔ غیاث اللغات : مولوی غیاث الدین رام پوری ۔ مطبع نول کشور کان پور طبع نومبر ۱۸۷۴ء ــــ اس لغت کی ضخامت ۵۱۸ صفحات ہے ناپ ۲۴½×۳۱ سنٹی میٹر ہے اور ص ۵۱۸ پر اس کا خاتمۃ الطبع منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کے قلم سے بہ زبانِ فارسی شامل ہے ۔

۳۔ مجمع الاشعار ۔ مطبع نول کشور کان پور طبع جون ۱۸۸۰ء

۴۔ گلدستۂ عشق : نواب سید محمد خاں رند مطبع نول کشور کان پور طبع جولائی ۱۸۸۴ء

۵۔ نہرالفصاحت : قتیل ۔ مطبع نول کشور کان پور طبع دسمبر ۱۸۸۵ء

۶۔ کلیاتِ نثرِ غالب : مطبع نول کشور کان پور طبع اپریل ۱۸۸۸ء

۷۔ کلیاتِ آتش : مطبع نول کشور کان پور طبع اپریل ۱۸۸۸ء

۸۔ سیرِ مقبول : سید غلام حیدر خاں ۔ مطبع نول کشور کان پور طبع فروری ۱۸۹۸ء

۹۔ عجائباتِ فرنگ : یوسف خاں کمل پوش ۔ مطبع نول کشور کان پور طبع مارچ ۱۸۹۸ء

۱۰۔ خم خانۂ جاوید (جلد اول) : لالہ سری رام ۔ نول کشور پریس لاہور طبع ۱۹۰۸ء

۱۶؎ غیاث اللغات : طبع نومبر ۱۸۷۴ء ص ۵۱۸

۱۷؎ پدماوت بھاکا : ملک محمد جائسی ۔ مطبع نول کشور لکھنؤ طبع مئی ۱۸۷۰ء ص ص ۳۴۵ تا ۳۵۹ [مملوکہ کاظم علی خاں] ــــ اس کتاب کے تقریظ نگار شیخ محسن علی ساقی نگینہ [ضلع بجنور] کے رئیس اور ناسخ لکھنوی کے شاگرد تھے ۔ کلب حسین نادر نے ساقی کو "لکھنوی" لکھا ہے ۔ سخن شعرا میں ساقی کو شیخ کی بجائے "میر محسن علی" لکھا گیا ہے جو بظاہر رسالۂ گلدستۂ شعرا، لکھنؤ مورخہ ۱۸ جنوری ۱۸۶۰ء (ص ۱۱) کے ایک غلط اندراج

کی تقلید کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے لیکن گلدستۂ شعرا لکھنؤ کے بعد کے متعدد شمارے ساقی کو شیخ ثابت کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے قدیم جریدے گلدستۂ شعرا کے بعض شماروں کا تذکرۂ سخن شعرا از نساخ سے مقابلہ کرنے پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ گلدستۂ شعرا لکھنؤ بھی سخن شعرا کے ماخذوں میں شامل تھا۔ یہ اطلاع ڈاکٹر محمد صدر الحق کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے نساخ (حیات و تصانیف)۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی طبع ۷۹۔ ۱۹۷۷ء پر اضافہ ہے۔ ڈاکٹر محمد صدر الحق نے اپنے اس مقالے میں سخن شعرا کے دوسرے متعدد ماخذوں کی نشان دہی کی ہے [نساخ (حیات و تصانیف) ص ۲۴۲ تا ۲۴۵] لیکن ماخذوں کی اس فہرست میں رسالہ گلدستۂ شعرا لکھنؤ کا نام شامل نہیں ملتا۔ شیخ محسن علی ساقی کے حالات مندرجہ ذیل مصادر پر مبنی ہیں:

۱۔ سخن شعرا: نساخ۔ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ۲۰۳
۲۔ تذکرۂ نادر: مرزا کلب حسین نادر۔ مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی۔ کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۵۷ء ص ۴۸
۳۔ رسالہ گلدستۂ شعرا، لکھنؤ مورخہ ۶ فروری ۱۸۶۰ء ص ۶
۴۔ رسالہ گلدستۂ شعرا، لکھنؤ مورخہ ۶ مئی ۱۸۶۰ء ص ۴

۱۸ نادر روزنامچہ: مرتبہ پروفیسر نور الحسن ہاشمی۔ ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ ص ۴۳

۱۹ ایضاً ص ص ۴۸ تا ۴۹

۲۰ ان مصادر کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ تعمیر ہریانہ نول کشور نمبر ص ص ۳۹، ۴۰ نیز ۶۰
۲۔ جیون چرتر ص ص ۱۳ تا ۱۴
۳۔ فروغ اردو نول کشور نمبر ص ۲۰
۴۔ نادر روزنامچہ ص ۴۹
۵۔ ملہم تاریخ: تصنیف منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی۔ مترجمہ سید اقتدار احمد ساحر سہسوانی۔ مطبع مطلع العلوم، مراد آباد طبع دسمبر ۱۹۱۲ء ص ۹۳

[مملوکہ کاظم علی خاں]

مولانا بدرالدین

سعودی عرب میں ادب کی رفتار ترقی

ہندوستان کے معیاری ادبی رسائل میں عربی ادب کے قدیم و جدید رجحانات پر جو کچھ شائع ہوتا رہا ہے اولاً ان کی تعداد بہت کم ہے دوسرے جو کچھ شائع ہوا ہے وہ زیادہ تر مصری ادب سے متعلق ہے کیونکہ عربی کے جدید اصناف مثلاً ناول، افسانہ اور مزاح نگاری وغیرہ پر صحیح معنی میں کام مصر و شام میں ہوا ہے اور اسی علاقے کے ادیبوں نے عالمی ادب میں شہرت اور مقام حاصل کیا ہے، مگر اب دوسرے علاقوں اور ملکوں کے ادیبوں اور نقادوں نے بھی اپنے وسائل کے مطابق، عربی ادب کے جدید رجحانات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اس سلسلے میں سعودی عرب میں جو کچھ کام ہوا ہے اور جو کچھ لکھا جارہا ہے، اس کے بارے میں اس مضمون میں روشنی ڈالی جائے گی۔

سعودی عرب کو اسلامی دنیا میں مذہبی لحاظ سے جو اہمیت حاصل ہے، اس کے پیش نظر عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہاں صرف مذہبی موضوعات ہی پر کام ہوتا ہوگا، لیکن وہاں کے اخبارات اور رسائل کے گراں قدر مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس خطے کے ادیب، ناول نگار اور مزاح نگار بھی اب دیگر زبانوں کے شانہ بشانہ ترقی کے منازل طے کر رہے ہیں، اس سلسلے میں ہم سعودی ادب کے تاریخی پس منظر پر تھوڑی سی روشنی ڈالتے ہوئے موجودہ ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیں گے۔

پہلی جنگ عظیم سے قبل، حجاز کے ادب کی جو کیفیت اور حالت تھی، اس پر روشنی

مولانا بدرالدین، لکچرر عربی جامعہ کالج، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ڈالتے ہوئے، حجاز کے مشہور ادیب عبدالقدوس انصاری نے لکھا ہے کہ ۱۹۱۴ء سے قبل ہم لوگ جو کچھ لکھتے تھے، اس میں قرون وسطیٰ کے ادیبوں کی اندھی تقلید کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا، چنانچہ اُس وقت نظم ونثر کا ہمارے پاس جو کچھ سرمایہ تھا، اس کی خصوصیات وہی تھیں جو قدیم ادب میں پائی جاتی تھیں، مگر پہلی جنگ عظیم نے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی آنکھیں کھولدیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مصری ادیبوں اور دور دراز ملکوں میں رہنے والے عرب مہاجروں کی شاعری میں قوم پرستی اور وطن دوستی کے جذبات کی بھرپور ترجمانی ہوتی ہے اور غلامی اور بیرونی استحصال کے خلاف بڑی شدّت اور انتہائی جرأت کے ساتھ اظہار خیال کرتے ہیں، اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ خود ان کے ادب کے مقابلے میں مصری اور مہجری ادب میں سلاست اور روانی کہیں زیادہ ہے، نیز ان کے خیالات احساسات زمانے کے رجحانات کے عین مطابق ہیں اور اس طرح وہ ادب اور قوم دونوں کی زیادہ بہتر طور پر خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس احساس نے سعودی عرب کے ادیبوں کو اپنا رخ بدلنے پر مجبور کیا۔

اس سے خیال ہوتا ہے کہ سعودی ادیب مصریوں کے مقابلے میں تاخیر سے بیدار ہوئے مگر اس کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ مصر پر نپولین کا حملہ ادبی بیداری کا خاص سبب بنا پھر محمد علی جیسے بیدار مغز اور اصلاح وترقی کے شیدائی رہنما اور سربراہ حکومت نے مصری قوم میں انقلاب پیدا کیا، اس کے علاوہ مصر اور اس کے قرب وجوار سے ہجرت کر کے امریکہ اور یورپ جانے والے مہاجر ادیبوں کو بُعد وطن اور حُبّ وطن کی خلش نے جدید رنگ اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ مگر سعودی عرب اس طرح کے تغیرات سے محفوظ رہا اور اس کے ادیب ایسے حالات سے دوچار نہیں ہوئے کہ کسی نئے رنگ کو اختیار کرنے پر مجبور ہوتے۔ چنانچہ حقیقتاً حجاز میں جدید طرز کا احساس اور قومی ادب کا رجحان سعودی حکومت کے قیام کے بعد ہی رونما ہو سکا۔

اس جدید دور میں حجازی شعراء الغزاوی، احمد عبدالغفور اور عبدالوہاب آشی نے بہت سے قومی نغمے لکھے جن کے ذریعے اپنے قدیم فضل وکمال کا احساس، قوم کی غفلت

اور دوسری قوموں کی ترقی کے احساس کو اپنے ہموطنوں کے قلوب میں اتارنے کی کوشش کی۔ چنانچہ عبدالمجید شبکشی نے لکھا ہے کہ حجاز میں حقیقی ترقی اور ادبی بیداری ۱۹۲۶ء سے شروع ہوئی اور اس دور میں حجازی ادیبوں نے جدید طرز میں طبع آزمائی کی کوشش کی۔ اس عہد میں صفِ اوّل کے ادیب محمد سرور الصبان سمجھے جاتے ہیں جن کی کتاب "مختارات لادباء الحجاز" ان کے تعارف کے لیے کافی ہے۔

مگر یہ ضرور ہے کہ اس زمانے میں ممتاز ادیبوں کی تعداد دس سے زیادہ تجاوز نہ کر سکی اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ باوجود بیداری کے حجازی ادیبوں میں کوئی جدّت پسندی یا اختراعی قوت رونما نہیں ہوئی تھی بلکہ صرف تقلیدی طرز کو چھوڑ کر یہ مصری اور مہجری ادب اور ادیبوں سے متاثر ہونے لگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۳ء میں جب ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری مرحوم کے سامنے حجازی شعراء کا کلام پیش کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ:

"حجازی جدّت پسندوں نے نثر اور نظم میں جدید اسلوب اختیار تو کیا ہے لیکن ابھی ان میں کوئی شخص ادبی شخصیت کہلانے کا مستحق نہیں ہے کیونکہ یہ تو اصل میں اُن شامی ادیبوں کے شاگرد ہیں جو امریکہ میں جا کر آباد ہو گئے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ امین الریحانی اور جبران وغیرہ سے روشنی حاصل کر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس تبصرے میں صرف شامی اور مہجری ادیبوں کا تذکرہ کیا ہے مگر النور الجندی نے جہاں الگ الگ مقامات کے ادیبوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں بتایا ہے کہ حجازی ادیب و شاعر کہیں عراقی شعراء سے متأثر تھے کہیں شمالی افریقہ کے ادیبوں سے، مگر یہ ضرور ہے کہ حجاز میں ہر جگہ تقلیدی ادب کا چلن ماند پڑ چکا تھا۔

حالات بدلتے رہے ترقی ہوتی رہی اور تقریباً ۱۰ سال بعد ایک موقع پر جب ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے حجاز کے مشہور ادیب و شاعر حسین عبد اللہ قرشی کے دیوان پر مقدمہ لکھا تو ان الفاظ میں تبصرہ کیا: "عرصہ دراز کے سکوت کے بعد اب حجازی شعر و نغمہ نے پھر کروٹ لی ہے میں نے حجاز کے شعراء کو سنا ہے، وہ اب محبّت اور آرزوؤں کے ترانے گا رہے ہیں، انھیں اپنی محرومی کا احساس ہو گیا ہے، شوق اور عروج کی تمنّا اب اُن کے

دلوں میں مچلنے لگی ہے، چنانچہ میں نے شدت سے محسوس کیا کہ میں اپنے اس خیال کو بدل دوں جس کا اظہار میں نے ۲۰ سال قبل کیا تھا کہ صحیح معنی میں حجاز میں شاعری کا وجود نہیں ہے مگر اب حقیقت یہ ہے کہ ۲۰ سال میں وہاں کی قومی زندگی میں انقلاب آگیا ہے اب ان کی غنائیہ شاعری میں قلوب کو تڑپا دینے والا ایک سوز ہے، وہ جذبہ ہے جو دلوں میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے، غزل کی شیرینی ہے، شجاعت اور دلیری کی مضبوطی ہے، قومی فضل و کمال کا احساس ہے، بلند عزائم اور عمل کا شوق ہے۔"

گویا ۱۹۵۳ء کے قریب ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے خیال میں حجازی ادب نئی کروٹ لے چکا تھا اور وہاں کے ادیب و شاعر مصر، عراق اور شام کے رجحانات و خیالات اور مہجری ادب سے متاثر ہو کر خود کو جدید طرز تحریر سے ہم آہنگ کر چکے تھے۔ اُس وقت سے اب تک گویا گذشتہ ۲۸ سال میں ہمیں حجازی ادب میں نئی سرگرمی اور جدید اصناف سخن کے قابل قدر اضافے نظر آتے ہیں۔

ترجمہ نگاری کے سلسلے میں محمد جابر انصاری اپنے ایک عربی مقالہ میں لکھتے ہیں کہ افلاطون کے جمہوری نظریات کا پہلا عربی ترجمہ حجازی ادیب حنا خباز نے کیا ہے۔ ڈارون کے نظریات کا عربی ترجمہ سعودی ادیب الاستاذ اسماعیل مظہر نے کیا ہے۔ اس کے بعد لطفی السید باشا کا نام سامنے آتا ہے جن کے علمی فضل و کمال اور فکری صلاحیت سے علمی طبقہ خوب واقف ہے۔ انھوں نے ارسطو کی کتاب "سیاست" کا فرنچ سے عربی میں ترجمہ کیا ہے جو ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔

سعودی نثر و نظم

قدیم شعراء کے علاوہ حجاز کے ترقی پسند شعراء میں آج کل ڈاکٹر غازی القصیبی عظیم شہرت اور مقبولیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ آپ کا بچپن الاحساء میں گذرا، بحرین میں ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر قاہرہ میں یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی، برطانیہ سے ایم اے کیا اور امریکہ سے ڈاکٹریٹ کی سند لی، آپ کا شعری ذوق خود ذاتی مطالعہ اور فطری صلاحیت کا مرہون منت

ہے، اسی صلاحیت نے کئی وقیع کتابوں کو وجود بخشا ہے۔

آپ کی پہلی کتاب "التجارب الشعریہ" کو ادبی دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل ہے، اس مجموعے میں دو دوسرے عرب شعراء البیانی عبدالصبور، عبدالمعطی اور بعض ہم عصر شامل ہیں۔ آپ کی دوسری اہم کتاب "سیرۃ شعریہ" زیور طبع سے آراستہ ہو کر سامنے آئی ہے، اس گراں قدر کتاب پر استاذ محمد بن سعد بن حسین نے ایک گراں قدر تبصرہ کیا ہے جو روزنامہ الریاض مورخہ ۱۳؍اکتوبر ۸۰ء میں ص ۱۲ پر شائع ہوا ہے۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر غازی کے چار دیوان (۱) ابیات غزل (۲) فطرات من ظماء (۳) اشعار من جزائر اللؤلؤ (۴) معرکہ بلارایہ" شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کے انگریزی ترجمے اس کے علاوہ ہیں اور نثری نتیجہ فکر "ہذا وذاک" کے نام سے شائع ہوا ہے جو فاضل مصنف کی فکری صلاحیت اور غور و تدبّر کا آئینہ دار ہے، اس میں ظرافت اور مزاح کے ذریعے ملک و قوم کی اصلاح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حجاز کے دوسرے نامور ادیب و شاعر استاذ عبدالعزیز الرفاعی ہیں۔ یہ ریاض کے شاہی دفتر میں مشیر خاص کے فرائض انجام دے رہے ہیں، شعر و ادب کا عمدہ ذوق ہے۔ گذشتہ ۲۶ سال سے ان کے دولت کدے پر ہر جمعرات کو ادبی مجلس منعقد ہوتی ہے جس میں سعودی اور غیر سعودی ادباء و شعراء جمع ہوتے ہیں اور بڑی دلچسپی اور سنجیدگی سے شعر و ادب پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ استاذ رفاعی خود تو قافیہ و ردیف کی قید و بند سے ہٹ کر آزاد نظم کہتے ہیں مگر ان کی مجلس میں تقلیدی اور غیر تقلیدی ہر طرح کی نظمیں پڑھی جاتی ہیں۔ اس ادبی مجلس کے نتائج فکر اور قلمی شاہکار شائع کرنے کے لیے ایک اشاعتی ادارہ المکتبۃ الصغیرہ کے نام سے قائم ہے جس سے چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں اور ہر ہفتہ مجلس میں شریک ہونے والے حضرات کو ایک ایک کتاب تحفۃً دی جاتی ہے۔

سعودی ادیبوں میں الاستاذ محمد نصر اللہ بھی علمی حلقے میں اچھی شہرت اور مقبولیت رکھتے ہیں، ان کے ادبی نمونے ریاض سے شائع ہونے والے اخبار "الریاض" میں شائع ہوتے ہیں اس کے علاوہ سعودی ٹیلیویژن پر ان کا ایک ہفتہ واری پروگرام "الکلمۃ تدق"

کے عنوان سے نشر ہوتا ہے، اس میں مختلف ادیب وشاعر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ادبی پروگرام اس قدر مقبول ہے کہ دمشق، قاہرہ اور مغرب کے ہر مکتب خیال کے ادیب اس میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں، ان کے مضامین ادبی مجلة العربیة میں بھی شائع ہوتے ہیں۔

سعودی عرب کے وزیر اطلاعات ڈاکٹر محمد عبدہ یمانی کا نام حکومت کے ایک ذمہ دار عہدیدار کی حیثیت سے تو مشہور رہے ہی لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ موصوف ایک فاضل ادیب اور مضمون نگار بھی ہیں۔ آپ کا ایک عربی ناول "الید السفلی" شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے، دوسرا ناول "فتاة من حائل" عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ ڈاکٹر یمانی گوناگوں صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ علم وادب سے آپ کی غیر معمولی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ اپنے اہم منصب کی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے سماجی اصلاحی ناول نگاری پر خصوصی وقت اور توجہ صرف کرتے ہیں جس سے سعودی ادب میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔

مزاح نگاری

سعودی ادب میں مزاح نگاری نے بھی اچھی خاصی ترقی کی ہے۔ کسی ملک اور قوم کی اصلاح میں مزاح نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ایک ماہر مزاح نگار بڑی خوبصورتی سے معاشرے کی خامیوں کو آشکارہ کرتے ہوئے کہیں صرف انگلی رکھ کر ہٹ جاتا ہے کہیں صرف اشاروں سے کام لیتا ہے اور کہیں کہیں سماج کے دُکھتے پھوڑوں پر نشتر سے کام لیتا ہے، یہ ہر ادیب کے بس کی بات نہیں کہ ہنستے کھیلتے سماجی خامیوں کو کریدتا، نوچتا، نشتر لگاتا، سجائے رکھتا گذر جائے۔ اس لئے سعودی ادب کا اس منزل تک پہونچ جانا یقیناً قابل فخر ہے۔

سعودی عرب کے مزاح نگاروں میں سب سے پہلے استاذ حمزہ شحاتہ کا نام قابل ذکر ہے۔ ان کی کتاب "حمار حمزہ شحاتہ" منظر عام پر آچکی ہے۔ اس کتاب کا نام سنتے ہی مصری ادیب

توفیق الحکیم کی کتاب "حمار الحکیم" کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، مگر حمزہ شحانہ کی کتاب کے مقدمے میں استاذ عبداللہ عبدالجبار لکچرار ادارہ دراسات عربیہ قاہرہ نے لکھا ہے کہ حمزہ شحانہ سعودی ادب کے مزاح نگاروں میں منفرد حیثیت کے مالک ہیں، ان کی کتاب اب سے چوتھائی صدی قبل لکھی گئی تھی، مگر ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی ہے۔ تاریخ تصنیف کے لحاظ سے حمزہ شحانہ ایک مزاح نگار کی حیثیت سے توفیق الحکیم مصری پر مقدم ہیں۔ اس موضوع پر دوسری کتابیں "حماری قال لی" (میرے گدھے نے مجھ سے کہا)، "انا و حماری" (میں اور میرا گدھا)، "خواطر حمار" (گدھے کے خیالات) بعد میں شائع ہوئیں۔

سعودی ادب میں دوسرے مزاح نگار حسین سرحان ہیں۔ ان کی کتاب "ادیب یسخر من نفسہ" (ادیب خود اپنے آپ سے مذاق کرتا ہے) شائع ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر غازی القصیبی کا شمار مزاح نگاروں میں بھی کیا جاتا ہے۔ ان کی کتاب "الرشوقراطی" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ حمزہ شحانہ اور ڈاکٹر قصیبی کی مندرجہ بالا دونوں کتابوں پر مجلہ الدّوحہ شمارہ مارچ ۸۰ئ میں نہایت وقیع تبصرے شائع ہوئے ہیں۔

افسانہ نگاری اور ناول نویسی

اگرچہ عربی میں ناول نگاری کی ابتدا لبنان کے سلیم بستانی کی کتاب "زنوبیہ" مطبوعہ ۱۸۷۱ء سے مانی جاتی ہے اور اس کی تمام تر ترقی مصر کی سرزمین پر ہوئی مگر آج سعودی ادب میں بھی اچھے ناول نگاروں کی کمی نہیں اور یہ فن حجاز میں روزافزوں ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔

اس کی قدرے تفصیل سعودی ادیب محمد منصور الشقحاء کے مقالے میں درج ہے جو مجلہ الدوحہ قطر شمارہ مارچ ۱۹۸۰ء ص ۱۱۶ پر شائع ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سعودی عرب میں قصص قصیرہ (مختصر افسانے) کے مندرجہ ذیل مجموعے اب تک شائع ہو کر کافی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں:

(۱) "الخبز والصمت" (روٹی اور خاموشی) جو محمد علوان کے افسانوں کا مجموعہ ہے،

اور ۱۳۹۷ھ میں قاہرہ سے شائع ہوا۔

(۲) "النساء والخیل" (عورت اور گھوڑا) خلیل ابراہیم الفزیع کے افسانوں کا مجموعہ ۱۳۹۸ھ میں دوحہ قطر سے شائع ہوا۔

(۳) "ثوت علی الماء" (پانی پر موت) عبدالعزیز مشری کے انسانوں کا مجموعہ جو ۱۳۹۹ھ میں ریاض سے شائع ہوا ہے۔

ان تین کتابوں کا تذکرہ کرنے کے بعد فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ: حجاز کے متعدد رسائل اور اخبارات میں جو مختصر اور طویل افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں ان کا شمار مشکل ہے، سعودی ناول نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ حجازی ناول کے آغاز کا تعین کرنا مشکل ہے کیونکہ یہاں قصہ کسی نہ کسی شکل میں اسی وقت سے موجود ہے جب سے ادب کی نشوونما ہورہی ہے۔ لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ سعودی قصے کی ابتداء ترجمے کی منزلوں سے گذرکر قصۂ طویلہ (ناول) تک نہیں پہونچی جس طرح مصر و شام اور لبنان میں ہوا۔ یہاں تو سعودی قصے کی بنیاد سب سعودی سرزمین ہی میں پڑی۔ ہاں اس کا سلسلۂ نسب ضرور غیر معروف ہے۔ اس سلسلے میں شامی مجلہ "الثقافۃ السوریہ" شمارہ جولائی ۱۹۷۸ء کا بیان بھی قابل غور ہے، وہ لکھتا ہے کہ مملکت عربیہ سعودیہ میں فن قصہ کی ابتداء کا تعین کرنا دشوار ہے کیونکہ یہاں تو قصے کا آغاز رسائل اور اخبارات سے ہوا لہٰذا اس اول شمارہ کا تلاش کرنا مشکل ہے جس میں حجاز کا پہلا قصہ شائع ہوا ہے لیکن حجاز میں سعودی ادباء کی ایک کانفرنس ۱۳۹۲ھ میں منعقد ہوئی تھی جس کا موضوع بحث "جدید سعودی ادب میں ناول نگاری" تھا۔ اس کانفرنس میں حصہ لیتے ہوئے ڈاکٹر منصور الحازمی نے یہ تحقیق پیش کی تھی کہ عبدالقدوس انصاری نے مجلہ المنہل کی ابتداء ۱۹۳۰ء میں کی اور اس سے ۷ سال قبل انھوں نے "التوأمان" (دو جڑواں بچے) کے نام سے ایک قصہ طویلہ شائع کیا تھا جس کے کور پر لکھا تھا: "حجاز میں شائع ہونے والا پہلا ناول"۔ اس کے بعد ڈاکٹر الحازمی نے سعودی ناول کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) اصلاحی تعلیمی ناول (۲) تاریخی ناول (۳) عشقیہ ناول (۴) فنی ناول۔

قسم اول کے ناول اور ناول نگار :

التوأمان	عبدالقدوس انصاری
البعث	محمد علی مغربی
فکرة	استاذ احمد السباعی

قسم دوم کے ناول اور ناول نگار :

امیر الحب	استاذ زارع عقیل

قسم سوم کے ناول اور ناول نگار :

الارتقاء	محمد عالم الفالی
الزوجہ والصدیق	محمد عمر توفیق
علماء المنفی	ابراہیم الناصر
تقوب فی نداء اللیل	"
القصاص	عبداللہ سعید جمعان
ثمن التضحیہ	حامد دمنہوری

فنی ناولوں میں حامد دمنہوری کے دو ناول ثمن التضحیہ اور موت الایام کو شمار کیا جاتا ہے۔

عربی روزنامہ عکاظ جدہ اشاعت ۱۹ رمضان ۱۴۰۰ھ کے صفحہ ۳ پر سعودی ادیب استاذ عزیز ضیاء نے سعودی ادیبہ محترمہ آمل محمد شطا کے ایک جدید معرکۃ الآرا ناول "غدا انسی" کا پرزور الفاظ میں تعارف کرایا ہے۔ یہ تعارف طویل ہے اس میں سعودی ناول نگاری کی تاریخ بھی آگئی ہے۔ فاضل ادیب نے لکھا ہے کہ "مجھے یہ کہنے میں قطعاً تامل نہیں کہ سیدہ امل محمد شطا کا ناول فنی اصولوں کی مکمل رعایت کے ساتھ ڈرامے کی خوبیوں سے بھی آراستہ ہے، اس میں ہمہ گیر صلاحیت کے ساتھ عوام کے قلوب میں خیالات کو سمانے کی مکمل کوشش کی گئی ہے، ناول کے کردار راؤنڈ کیرکٹر کے آئینہ دار نظر آتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے فاضل مصنفہ کے قلم کی قدرت اور فنی مہارت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ اس تعارف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے

کہ سعودی ادب میں خواتین نے بھی بلند مقام حاصل کر لیا ہے۔

ڈرامہ نگاری

اگرچہ ڈرامہ نگاری نے سعودی ادب میں عمومی شکل اختیار نہیں کی ہے مگر بہر حال سعودی ادب اس صنف سے خالی نہیں ہے۔ روزنامہ الجزیرہ شمارہ ۱۷ر جولائی ۱۹۸۰ء میں ص ۳ پر اسکولی ڈراموں کی اہمیت اور فوائد پر مشعل القحطانی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں فاضل مضمون نگار نے بتایا ہے کہ اسکولی ڈراموں کے ذریعے بچوں کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے میں مدد ملتی ہے، معاشرہ کی روزمرّہ کی گفتگو زبان زد ہو جاتی ہے، اجتماعی طریقہ پر کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور عوام کے سامنے آنے کی جھجھک نکل جاتی ہے۔

گویا اس طرح مقالہ نگار نے ڈرامہ نگاری اور اسے اسٹیج کرنے کی فنّی افادیت کی وضاحت کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب سعودی ادب دوسرے عالمی ادیبوں کے قدم بہ قدم ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔

کتابیات

۱۔ الادب العربی الحدیث۔ النور الجندی ص ۲۱۵ تا ۲۲۰۔

۲۔ مجلّہ الدّوحہ۔ قطر۔ العدد ۵۰ فروری ۱۹۸۰ء ص ۹۴۔

۳۔ مجلّہ الدّوحہ۔ قطر۔ العدد ۵۱ مارچ ۱۹۸۰ء ص ۶۰، ۱۱۶۔

۴۔ روزنامہ الجزیرہ عربی، ریاض، العدد ۲۹۰۹، ۱۷ر جولائی ۱۹۸۰ء ص ۳۔

۵۔ روزنامہ عکاظ عربی، جدہ، ۱۹ر رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ ص ۳۔

۶۔ ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۷۸ء ص ۲۷۴۔

۷۔ روزنامہ الریاض، ریاض، ۱۳ر اکتوبر ۱۹۸۰ء ص ۱۲۔

عبداللطیف اعظمی

بجھے کیا کیا چراغِ خانماں افروز

اردو کے ممتاز ادیبوں یا ملک کے مشہور دانش وروں کی وفات کی خبروں اور ان کے بارے میں ضروری معلومات کی اشاعت کا اردو اخبارات و رسائل میں کوئی معقول انتظام نہیں ہے، جس کی وجہ سے بعد میں لکھنے والوں کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اکثر تاریخوں میں اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ پبلیشرز جناب مالک رام صاحب نے اپنے سہ ماہی رسالہ "تحریر" (دہلی) میں اس کا اہتمام کیا تھا اور پابندی کے ساتھ متوفی ادیبوں اور شاعروں کے حالات پوری تحقیق اور چھان بین کے بعد شائع کرتے تھے، مگر ان کے موقر رسالے کے بند ہونے کے بعد یہ مفید سلسلہ بند ہو گیا۔ اللہ کا نام لیکر اب اس ماہ سے خاکسار یہ سلسلہ شروع کر رہا ہے۔ اگر دوست احباب کی مدد اور تعاون حاصل رہا تو امید ہے کہ کامیابی حاصل ہو گی۔ سب سے بڑی دقت پاکستان کے متوفی ادیبوں کے متعلق خبریں اور معلومات حاصل کرنے میں پیش آتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ میرے دوست ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری (کراچی) نے وعدہ فرمایا ہے کہ اس سلسلے میں وہ ہماری پوری مدد فرمائیں گے اور بر وقت ضروری معلومات بھیجدیا کریں گے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے بارے میں جو نوٹ لکھا گیا ہے، اس میں ان کے مرسلہ اخباری تراشوں سے کافی مدد لی گئی ہے۔

حکیم محمد یوسف حسن ـــــ بانی ایڈیٹر ماہنامہ نیرنگ خیال

لاہور کے مشہور ماہنامہ "نیرنگ خیال" کے بانی ایڈیٹر، حکیم محمد یوسف حسن صاحب کا ۱۸ ر جنوری

۱۹۸۱ء کی سہ پہر میں اتوار کے دن تقریباً ۸۸ سال کی عمر میں راولپنڈی (پاکستان) میں اچانک انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مرحوم ایک کامیاب طبیب، بالغ نظر صحافی اور ادیب تھے۔ ۳ر جون ۱۸۹۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں لاہور سے "نیرنگ خیال" کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا جس نے نہ صرف یہ کہ اردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمت کی بلکہ ایسے ادیب بھی پیدا کئے، جن کا اردو کے صف اول کے ادیبوں اور شاعروں میں شمار ہوتا ہے، مثلاً پطرس بخاری، ڈاکٹر دین محمد تاثیر، حفیظ جالندھری، غلام عباس، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی اور مالک رام وغیرہ۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۲ء میں "نیرنگ خیال" کا اقبال نمبر شائع ہوا تھا جسے اقبالیات میں ایک اچھا اضافہ اور رسالوں کے اقبال نمبروں میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اس ماہنامے کے صفحۂ اول پہ یہ لکھا ہوتا تھا کہ "ایجاد ہمارا حصہ ہے اور تقلید دوسروں کا۔" اس فقرے سے دوسرے معاصر ماہناموں کو شکایت پیدا ہوئی، اس لیے بعد میں اس کو حذف کر دیا گیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے اقبال نمبر کے شذرات میں لکھا گیا ہے: "یہ اعلان کہ: "ایجاد ہمارا حصہ ہے اور تقلید دوسروں کا" محض اس لیے روک دیا گیا کہ اس سے ہمارے بعض معاصرین کے قلوب پر ٹھیس لگتی تھی۔ ہمارا مسلک صلح کل ہے اور ہم اپنے معاصرین کا احترام کرنا اور ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی قدر کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں، لیکن اگر آج کا زیر مطالعہ "نیرنگ خیال" اقبال نمبر اس حقیقت کو دہرائے تو اسے معذور رکھا جائے۔" اس کے بعد اس خصوصی شمارے کے بارے میں لکھا گیا ہے: "نیرنگ خیال" ہندوستان کا واحد مجلہ علمیہ ادبیہ ہے جس نے رسائل کے لیے ایک جدید شاہراہِ عمل پیش کر کے کامیابی کی منزل پر پہونچنے کی کوشش کی ہے۔ اس جدید شاہراہ عمل میں خاص نمبروں کی ایجاد بھی ایک حصہ ہے۔ ہمارے دوست اور دشمن دونوں کو اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ "نیرنگ خیال" کے خاص نمبر واقعی لاجواب اور بے مثل ہوتے ہیں" (صفحہ ۴)

مرحوم کی مطبوعہ کتابوں کی جو تفصیل پاکستانی اہل قلم کی ڈائرکٹری (مطبوعہ: اسلام آباد) سے معلوم ہو سکی ہے، وہ حسب ذیل ہے:

طب محفیٰ۔ صنعت اکبر۔ مجلس خلوت۔ افسانوں کا مجموعہ۔ ڈراموں کا مجموعہ۔

پنکھڑیاں وغیرہ۔

پروفیسر اشتیاق حسین قریشی ــــــ ایک ممتاز مورخ اور ماہر تعلیم

پروفیسر اشتیاق حسین قریشی ایک ممتاز مورخ، ایک تجربہ کار ماہر تعلیم اور مخلص خدمت گذار تھے۔ افسوس کہ ۲۲ جنوری (۱۹۸۱ء) کو بروز جمعرات، اسلام آباد کے ایک ہسپتال میں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے موصوف کا انتقال ہو گیا۔ اسی دن رات کے وقت بذریعہ ہوائی جہاز میت کراچی پہنچائی گئی اور دوسرے روز بعد نماز جمعہ انھیں ان کی اہلیہ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

مرحوم ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو اتر پردیش کے ایک گاؤں پٹیالی ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا، چچا نے پرورش کی، ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی، ۱۹۲۶ء میں دلی یونیورسٹی سے بی اے آنرز اور ۱۹۲۸ء میں ایم اے کیا، دوسرے سال ۱۹۲۹ء میں فارسی میں ایم اے کیا اور ۱۹۳۹ء میں کیمبرج (انگلستان) سے تاریخ میں پی ایچ ڈی لیا۔ ۱۹۲۸ء میں سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی کے شعبہ تاریخ میں لکچرر مقرر ہوئے، ۱۹۴۰ء میں دلی یونیورسٹی میں ریڈر اور ۱۹۴۳ء میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد انڈیا آفس کی تقسیم کے سلسلے میں انھیں انگلستان بھیجا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں مشرق وسطیٰ کی فلسطین کمیٹی میں پاکستان کی نمائندگی کی نیز اسی سال پنجاب یونیورسٹی لاہور میں تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں پروفیسری کے ساتھ ساتھ محکمۂ اطلاعات ونشریات کی ذمہ داریاں بھی سپرد کر دی گئیں۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء تک کولمبیا یونیورسٹی (امریکہ) کے شعبۂ تاریخ میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا اور ۱۹۶۰ء میں مرکزی ادارۂ تحقیقات اسلامیہ (کراچی) کے سربراہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۱ء تک کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز رہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات کے مطابق علمی اور تعلیمی خدمات کے علاوہ موصوف نے قومی اور سیاسی خدمات بھی انجام دیں۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۴ء تک مجلس دستور ساز کے رکن رہے، ۱۹۴۹ء میں حکومت پاکستان کے نائب وزیر اور ۱۹۵۰ء میں وزیر مملکت مقرر ہوئے اور ۱۹۵۱ء سے

۱۹۵۴ء تک وزیرِ تعلیم اور وزیرِ آبادکاری و مہاجرین کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۷۹ء میں وہ مقتدرہ ادارہ قومی زبان (کراچی) کے چیرمین مقرر ہوئے اور اس حیثیت سے وفات تک کام کرتے رہے۔

ان کی مخلصانہ اور شاندار خدمات کے اعتراف میں حکومت کی طرف سے انھیں اعزازات بھی عطا کئے گئے۔ ۱۹۶۵ء میں صدر ایوب نے ستارۂ پاکستان اور ۱۹۸۰ء میں صدر جنرل ضیاء الحق نے تمغۂ ہلال عطا کیا۔

مرحوم نے انگریزی اور اردو میں بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں، جن کی تفصیل اس مختصر تحریر میں دینا ممکن نہیں۔

مسعود اختر جمال ــ ایک ترقی پسند شاعر

مسعود اختر جمال کی شاعری اس زمانے میں پروان چڑھی جب ترقی پسند تحریک کا عروج تھا۔ موصوف مجاز، جذبی، سردار جعفری، جاں نثار اختر اور مخدوم محی الدین کے ہم عصر تھے اور اُس وقت کے اُن نوجوان شعراء میں سے تھے، جن کا کلام بہت پسند کیا جاتا تھا اور مشاعروں اور اخبارات و رسائل میں خاصے مقبول تھے۔ ان کا بانکپن اور ان کے پڑھنے کا دلکش انداز اب بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے، مگر بعد میں نہ جانے کیا اسباب پیش آئے کہ ان کو وہ شہرت و عزت حاصل نہ ہو سکی جو ان کے دوسرے ساتھیوں اور ہم عصروں کو حاصل ہوئی۔ ایک طویل عرصے سے وہ بیمار تھے اور الہ آباد میں اپنے صاحبزادے، شاہد مسعود صاحب ایڈوکیٹ کے ساتھ رہتے تھے۔ وہیں ۲۵ر جنوری کو اتوار کے دن رات کے ۱۱ بجے تقریباً ۶۵ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا اور دوسرے روز ۲۶ر جنوری کو حسن منزل کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔

مرحوم ۱۹۱۵ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے کہ ۱۹۴۲ء کی مشہور تحریکِ آزادی، "ہندوستان چھوڑو" شروع ہوئی جس میں مرحوم نے حصہ لیا اور جیل گئے، آزادی کے بعد محکمۂ راشننگ سے وابستہ رہے اور ایک طویل عرصے تک الہ آباد میں قیام رہا۔ اُس وقت بہت سے ترقی پسند ادیب و شاعر وہاں موجود تھے، مثلاً پروفیسر سید اعجاز حسین اور فراق گورکھپوری کے علاوہ وامق جونپوری، مظفر شاہجہاں پوری اور

تیغ الہ آبادی جو پاکستان جانے کے بعد مصطفیٰ زیدی کے نام سے مشہور ہوئے ۔ یہ ادبی اور شعری فضا مرحوم کے لیے بڑی سازگار ثابت ہوئی ۔ محکمہ راشننگ سے مرحوم کا تعلق ختم ہوا تو رائے بریلی چلے گئے ، مگر کچھ عرصے کے بعد پھر الہ آباد لوٹ آئے اور عمر کا آخری حصہ وہیں بسر کیا اور جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں ، مستقل آرام گاہ کے لیے بھی دو گز زمین اسی سرزمین کی میسر آئی ۔

مرحوم کی شاعری بڑی صاف ستھری اور دلآویز ہے ، بقول ڈاکٹر اجمل اجملی : "ان کے یہاں وہ چیخ وپکار اور شور وغل نظر نہیں آتا جو ایک مخصوص دور میں مخصوص حالات کی وجہ سے بعض دوسرے قدآور ترقی پسند شاعروں کے یہاں راہ پاگیا تھا ۔" (قومی آواز ، دلی ایڈیشن ، مورخہ ۳ فروری ۱۹۸۱ء) اور پروفیسر محمد حسن کے الفاظ میں : "مسعود اختر جمال نے اس دور میں بربط اٹھایا جب وقت کی پرچھائیاں گہری ہو چلی تھیں اور اپنی شاعری کی کیف آفرینی ، تغزل اور نفاست و لطافت کو قائم رکھتے ہوئے ان پرچھائیوں کو خوبی سے اپنے فن میں سمو لیا ۔ جمال کی شاعری اس اعتبار سے محض تاریخی اہمیت کی شاعری نہیں ہے بلکہ اس میں آج بھی کیفیت اور تاثر کے شعلے لپکتے ہیں اور ان کی رنگینی اور روانی دامنِ دل کو کھینچتی ہے ۔" (دیباچہ "لالۂ شاداب" صفحہ ۴)

مرحوم کے تازہ مجموعۂ کلام : "لالۂ شاداب" سے جو اترپردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا ہے ، چند اشعار بطور نمونے کے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں :

الجھ کے رہ گئیں نظریں جو آشیانوں سے ۔۔۔ بہارِ وادئ غربت کو ہم نہ دیکھ سکے

مل گئی عمرِ جاوداں ہم کو ۔۔۔ اب وہ دنیائے بے ثبات کہاں

زندگی کیا جمال کی اے دوست ! ۔۔۔ دل ہے شعلہ تو آنکھ شبنم ہے

خوب ہے ترکِ آرزو لیکن ۔۔۔ دل سے کافر کو رام کون کرے

آہٹ سی پا رہا ہوں کسی کی قریبِ دل — پہچانتا ہوں شوخیِ آوازِ پا کو میں

زمانہ میری محبت کا درد کیا جانے — وہ چوٹ دل پہ لگی تھی کہ آہ کر نہ سکا

آئی لب تک نہ بات بھی میری — ہو گیا رازِ دل بھی خاموش جمالؔ

محمد کریم چھاگلا — ایک ممتاز ماہرِ قانون

محمد کریم بھائی چھاگلا ایک کامیاب سفارت کار، ممتاز ماہرِ قانون اور بے باک رہنما تھے اور سیکولرزم میں اپنی انتہا پسندی کی وجہ سے مسلمانوں کے ایک بڑے حلقے میں ان کی شخصیت خاصی متنازع فیہ تھی۔ وہ دوشنبہ کے دن ۹ فروری کی شام کو بالکل ٹھیک تھے، چنانچہ تقریباً ساڑھے نو بجے شب ۹ کو، حسب معمول مرکزی بمبئی کے ویلنگٹن کلب گئے، وہاں ان پر دل کا شدید دورہ پڑا، جس کی تاب نہ لاکر انتقال کر گئے، اس وقت ان کی عمر تقریباً ۸۰ سال کی تھی۔

مرحوم ۳۰ ستمبر ۱۹۰۰ء کو بمبئی میں پیدا ہوئے، بمبئی اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، ۱۹۲۱ء میں آکسفورڈ ایشیاٹک سوسائٹی کے صدر منتخب ہوئے، ۱۹۲۲ء میں ۲۲ سال کی عمر میں وکالت شروع کی، ۳۰-۱۹۲۷ء میں گورنمنٹ لا کالج بمبئی میں دستور کے پروفیسر رہے، ۴۷-۱۹۴۱ء میں بمبئی ہائی کورٹ کے جج رہے، ۱۹۴۶ء میں انجمن اقوام متحدہ کے اجلاس میں ہندوستان کی نمایندگی کی، ۱۹۴۷ء میں کچھ عرصے کے لیے بمبئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے، آزادی کے بعد وہ پہلے ہندوستانی ہیں جو ۱۹۴۷ء میں بمبئی ہائی کورٹ کے چیف جج مقرر ہوئے، ۱۹۵۶ء میں دو مہینے کے لیے بمبئی کے گورنر مقرر ہوئے، ۱۹۵۷ء میں ہیگ کے انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے ایڈہاک جج مقرر ہوئے، ۱۹۵۸ء میں حکومت ہند کی طرف سے لائف انشورنس کارپوریشن کے بعض معاملات کی تحقیقات کی، ۱۹۵۸ء میں جی۔ ایل مہتا کی جگہ امریکا میں ہندوستان کے سفیر مقرر ہوئے، ۱۹۶۱ء میں لندن میں ہائی کمشنر کا عہدہ سنبھالا، ۱۹۶۳ء میں مرکزی حکومت کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے، ۱۹۶۴ء میں انجمن اقوام متحدہ میں ہندوستانی وفد کی قیادت کی، ۱۳ نومبر ۱۹۶۶ء کو وزیر خارجہ مقرر ہوئے

مگر دوسرے ہی سال ۱۹۶۷ء میں، حکومت کے اس فیصلے پر کہ یونیورسٹیوں میں ذریعۂ تعلیم انگریزی کے بجائے مقامی زبانیں ہوں گی، بطور احتجاج وزیر خارجہ کے عہدے سے استعفا دیدیا، ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی کے خلاف سخت بیانات دیئے اور بڑی شدت سے مسز اندرا گاندھی کی مخالفت شروع کر دی اور بالآخر ۱۹۷۷ء میں جنتا پارٹی میں شامل ہوگئے۔

چھاگلا صاحب کی وفات پر قومی رہنماؤں نے پرخلوص تعزیتی بیانات دئے ہیں۔ صدر جمہوریہ جناب سنجیوا ریڈی نے گورنر مہاراشٹر کے نام اپنے تعزیتی پیغام میں اپنے رنج و افسوس کا اظہار کیا اور ان کی وفات کو قومی نقصان قرار دیا۔ نائب صدر جمہوریہ جسٹس محمد ہدایت اللہ صاحب نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا: موصوف ایک قابل جج، ایک عظیم محب وطن، ایک ذہین مصنف اور مقرر تھے، وہ اپنی خدمات کے لحاظ سے ملک کے صف اول کے لوگوں میں سے تھے۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے مسٹر چھاگلا کی وفات پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ مرحوم اپنے آزاد افکار اور نظریات کے لیے مشہور تھے، ان سے ہمارے سیاسی اختلافات تھے لیکن آج میں اس شخص کو خراج عقیدت پیش کرتی ہوں جس نے ملک و قوم کی بے لوث خدمت کی۔ معمر سیاست داں اچاریہ جے بی کرپلانی نے فرمایا کہ مسٹر چھاگلا نے ہندوستان کے وقار اور شہرت کو ہمیشہ بلند کرنے کی کوشش کی، ان کی موت سے ملک ایک عظیم محب وطن، ایک پختہ کار ڈپلومیٹ اور ایک ماہر قانون سے محروم ہوگیا۔

سید نذیر نیازی ــــ ایک ممتاز اقبال شناس

سید نذیر نیازی صاحب کا لاہور میں ۲۷ر جنوری کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم ۱۹۰۰ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر اقبال کے استاد شمس العلماء میر حسن مرحوم کے بھتیجے تھے۔ مرحوم کے بارے میں تفصیل شذرات میں ملاحظہ ہو۔

تعارف و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

بستی (ناول) از انتظار حسین

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۲۲۴ صفحات، خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے، طباعت اور کاغذ

عمدہ، مجلد، قیمت: ۳۰ روپے، تاریخ اشاعت: اکتوبر ۱۹۸۰ء

ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵

جناب انتظار حسین پاکستان کے مہاجر ادیب ہیں اور ان کا شمار وہاں کے مشہور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ پچھلے سال جامعہ کے شعبۂ اردو کے اہتمام میں اردو کے افسانوی ادب پر جو بین الاقوامی سیمینار ہوا تھا، اس میں صاحب موصوف نے بھی شرکت کی تھی، اس موقع پر ان سے پہلی مرتبہ ملنے اور ان کو سننے کا موقع ملا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، ان کے تعارف میں، جہاں ان کے فن اور اسلوب کی تعریف کی گئی تھی، وہاں یہ بھی کہا گیا تھا کہ ان کی شخصیت متنازع فیہ ہے۔

ابھی حال میں مشفق خواجہ صاحب نے کراچی سے "تخلیقی ادب" کا جو مفید سلسلہ شروع کیا ہے اور جس کا جامعہ کے پچھلے شمارے میں تعارف شائع ہوا ہے، اس کے دوسرے حصے میں پاکستان کے مشہور ناولوں پر شہزاد منظر صاحب کا ایک طویل مضمون شائع ہوا ہے۔ چونکہ زیر تبصرہ ناول "بستی" پاکستان سے بھی شائع ہوا ہے، اس لیے اس مضمون میں اس ناول پر بھی تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس خیال سے کہ ایک پاکستانی مصنف کے بارے میں ایک پاکستانی نقاد کی رائے شاید زیادہ صحیح اور وقیع سمجھی جائے اس لیے اس کے بارے میں اپنی رائے پیش کرنے کے بجائے اس مضمون کے کچھ اہم اور ضروری اقتباسات ذیل میں درج کرتا ہوں:

"۱۹۸۰ء کے عشرے میں شائع ہونے والا انتظار حسین کا ناول "بستی" بلاشبہ ایک اہم اور قابل ذکر ناول ہے، اس ناول کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب سے یہ ناول شائع ہوا ہے، ادبی حلقوں میں اس پر بحث جاری ہے اور قارئین اور ناقدین واضح طور پر دو حلقوں میں بٹ گئے ہیں، ایک حلقے کا کہنا یہ ہے کہ "بستی" ناول ہی نہیں ہے، کیونکہ اس میں ناول کے وہ تمام عناصر موجود نہیں ہیں جن سے ناول، ناول بنتا ہے۔ اس حلقے کا کہنا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ افسانے کی توسیع شدہ صورت کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے حلقے کا خیال ہے کہ "بستی" نہ صرف ایک عمدہ اور معیاری ناول ہے بلکہ یہ اردو ناول میں ایک اہم اور قابل قدر اضافہ ہے۔ اسے صرف اس لیے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ناول کی کلاسیکی تعریف اور معیار پر پورا نہیں اترتا۔ اس لیے کہ ناول کی تعریف اور معیار آج وہ نہیں ہے جو آج سے ایک سو سال قبل تھا۔ جدید ناول کلاسیکی ناول سے قطعی مختلف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ افسانہ نویس اور ناول نگار کے درمیان مزاج اور ذہنی تربیت کا فرق ہے۔ انتظار حسین مزاجاً افسانہ نگار ہیں اور انھوں نے ناول لکھنے کی کوشش میں طویل افسانہ لکھ ڈالا ہے۔ "بستی" کا کینوس زیادہ بڑا نہیں ہے۔ یہ ایک افسانے کا کینوس ہے، حالانکہ انتظار حسین چاہتے تو کینوس کو مزید پھیلا سکتے تھے، لیکن شاید انھوں نے عمداً ایسا نہیں کیا۔ زمانے کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ناول کا زمانہ چالیس پینتالیس سال پر محیط ہے۔ ناول برطانیہ کے خلاف آزادی کی جدوجہد سے شروع ہوتا ہے اور ہندو مسلم تنازع اور فرقہ وارانہ فسادات سے ہوتا ہوا، قیام پاکستان، تبادلۂ آبادی، بھارت اور پاکستان میں جنگ، سقوط ڈھاکہ، سابق حکومت کے خلاف جدوجہد اور آخر میں غیر یقینی صورت حال کے پیش نظر بشارت پر ختم ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ناول کا عرصہ مختصر نہیں ہے، لیکن انتظار حسین نے اسے کلاسیکی ناول نویسوں کی طرح برتنے کے بجائے افسانے کا سا انداز اختیار کیا، تاکہ اظہار میں دقت نہ ہو۔"

"بستی" کے تمام معترضین اس بات پر متفق ہیں (اور یہ حقیقت بھی ہے) کہ ناول کا ابتدائی حصہ خصوصاً روپ نگر کا ذکر بہت خوبصورتی اور چابکدستی سے کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں

کلاسیکی ناولوں جیسا ربط و تسلسل ہے اور اس میں تقسیم ملک سے قبل کی تہذیب اور معاشرے کی بڑی حقیقت پسندانہ عکاسی کی گئی ہے ... اس کے بعد کا حصہ خصوصاً ہجرت کر کے پاکستان آنے اور پھر پاکستان میں سیاسی افراتفری اور ہنگامہ آرائی پر مشتمل حصے کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ انتظار حسین نے اس ناول کو بغیر کسی منصوبے کے نہایت عجلت میں لکھا ہے اور اس پر زیادہ توجہ نہیں دی، جبکہ میرا خیال ہے کہ انتظار حسین نے ایسا عمداً اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا ہے ....''

''بستی'' کو اگر ہندوستان کے تارکینِ وطن کا نوحہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا، اس لیے کہ اس میں وہ تمام درد و کرب اور کیفیت موجود ہے جو ہجرت کے نتیجے میں پیدا ہوتی اور محسوس کی جاتی ہے۔ اس ناول کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے اسے صرف انتظار حسین جیسا مصنف ہی لکھ سکتا ہے جس نے ہجرت کے کرب کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اپنی تحریروں میں پیش کیا جو ماضی کی یادوں کو آج بھی سینے سے لگائے ہوئے ہے .... اس ناول میں انتظار حسین نے موجودہ پاکستان کے بارے میں وہ تمام سوالات اٹھائے ہیں جو اس وقت پاکستانی عوام کے ذہن میں گشت کر رہے ہیں۔''

''بستی'' کس پائے کا ناول ہے اور اس کی اردو ناول میں کیا قدر و قیمت ہے؟ ہو سکتا ہے اس بارے میں کسی حتمی رائے کا اظہار مشکل ہو، اس لیے کہ عصری ادب اور ہم عصر ادیبوں کے کے بارے میں ضروری نہیں کہ ہم عصر نقادوں کی رائے صد فی صد درست ہو ... اس لیے ''بستی'' کی ادبی اور فنی حیثیت کے تعین کا کام مستقبل پر چھوڑتے ہوئے کم از کم اتنا تو کہہ سکتے ہیں کہ ''بستی'' ایسا ناول نہیں جسے بہ آسانی نظر انداز کر دیا جائے۔''

بچوں کے جذباتی مسائل از ڈاکٹر محمد اکرام خاں

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۳۲ صفحات، مجلد، قیمت: ساڑھے آٹھ روپے، تاریخ اشاعت: دسمبر ۱۹۸۰ء۔ ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

اردو ادب میں بعض موضوعات ایسے ہیں جن کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے، ان ہی

میں سے ایک نفسیات بھی ہے، خاص طور پر بچوں کی نفسیات اور ان کے مسائل پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس سلسلے میں آزادی سے پہلے لاہور سے کچھ کتابیں شائع ہوئی تھیں، ممکن ہے پاکستان میں وہ اب بھی ملتی ہوں مگر ہندوستان میں نظر نہیں آتیں۔ خوشی کی بات ہے کہ جامعہ ٹیچرس کالج کے سابق استاد ڈاکٹر محمد اکرام صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اردو مطبوعات میں ایک مفید اضافہ کیا ہے۔

فاضل مصنف نے پیش لفظ میں کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ: "زیر نظر کتاب میں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ نشو و نما کے سلسلے میں شیر خوارگی، بچپن، نو بالغی اور بالغی کا زمانہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگر کسی ایک دور میں بھی بچوں کو مناسب توجہ، ضروری محبّت، بروقت تعریف، رہنمائی نیز قربت نہیں ملتی ہے تو وہ جذباتی مسائل کا شکار بن کر رہ جاتے ہیں۔ ہم نے بتایا ہے کہ جذباتی مسائل کا بچوں کی سماجی زندگی پر کس طرح غلط اثر پڑتا ہے ... اور آخر میں یہ بتایا ہے کہ جذباتی مسائل کو وقتی اور مستقل طور پر حل کرنے کے لیے کس کی مدد حاصل کی جائے۔"

یہ مختصر کتاب ۶ ابواب پر مشتمل ہے:

۱۔ جذباتی مسائل
۲۔ شیر خوارگی اور بچپن
۳۔ نو بالغی اور جذباتی مسائل
۴۔ بالغوں کے مسائل
۵۔ غیر متوازن شخصیت اور اس کی پہچان
۶۔ رہنمائی اور مدد کے طریقے۔

امید ہے کہ یہ کتاب علمی حلقوں میں مقبول ہوگی اور پسند کی جائے گی۔

(عبداللطیف اعظمی)

بیان ملکیت ماہنامہ جامعہ اور دیگر تفصیلات

(بمطابق فارم نمبر ۴، قاعدہ نمبر ۸)

۱۔ مقام اشاعت : جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

۲۔ وقفہ اشاعت : ماہانہ

۳،۴ پرنٹر پبلشر : عبداللطیف اعظمی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : ۳۴۹۔ ذاکر نگر۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

۵۔ اڈیٹر : ضیاء الحسن فاروقی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : اعزازی ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ نئی دہلی ۲۵

۶۔ ملکیت : جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵

میں عبداللطیف اعظمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم ویقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط پبلشر : عبداللطیف اعظمی

۱۸ فروری ۱۹۸۱ء

ماہنامہ جامعہ کی سالانہ قیمت

۱۔ ہندوستان کے لیے	۹ روپے
۲۔ پاکستان کے لیے	۳۰ روپے
۳۔ دوسرے بیرونی ممالک کے لیے	دو پاؤنڈ یا پانچ امریکی ڈالر

جامعہ معمولاً ہر ماہ کی ۲۰ یا ۲۱ تاریخ کو پوسٹ کیا جاتا ہے

جامعہ

سالانہ قیمت ۹ روپے

قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

جلد ۷۸	بابت ماہ مارچ ۱۹۸۱ء	شمارہ ۳

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط وکتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: جمال پریس دہلی ۶ • ٹائیٹل: فائن پریس دہلی ۶

افسوس

اب عرشی صاحب بھی نہیں رہے

مولانا امتیاز علی عرشی جو ہماری علمی و ادبی بزم دوشیں کی یادگار تھے، ۲۴ر اور ۲۵ر فروری کی درمیانی رات میں تقریباً پونے تین بجے اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ ۸ر دسمبر ۱۹۰۴ء کو رام پور میں پیدا ہوئے، ان کے والد جناب مختار علی خاں نے ان کی تعلیم پر خاص توجہ کی، انھوں نے پہلے حافظ جعفر علی کے مکتب میں پڑھا، پھر پرائمری اسکول میں کچھ عرصہ تک تعلیم حاصل کی، اسی مرحلے میں انھوں نے فارسی سیکھنی بھی شروع کردی، ان کے والد کی تمنا تھی کہ وہ عالم دین بنیں، اس لئے ان کے لئے میزان الصرف پڑھانے کا خاص انتظام کیا گیا، اس کے بعد انھیں حکیم عبدالعزیز شہید کے حوالے کردیا گیا، حکیم صاحب مولانا عبدالحق خیرآبادی کے شاگرد تھے اور معقولات میں پوری دستگاہ کے حامل، طب انھوں نے حکیم عبدالمجید دہلوی سے پڑھی تھی، حکیم صاحب نے عرشی صاحب کو صرف ونحو کی تعلیم دی اور طب کی فارسی کتابیں بھی پڑھائیں اور اسی زمانے میں انھوں نے میزان الطب اور شفاء الامراض ختم کرلیں۔ اس کے بعد انھوں نے مدرسۂ مطلع العلوم میں داخلہ لیا جہاں عربی کے علاوہ فارسی کی متداول کتابیں پڑھیں۔ اسی مدرسے میں انھوں نے عربی لکھنے اور بولنے کی مشق کی، علوم دینیہ خصوصاً قرآن اور اس کے متعلقات کا مطالعہ کیا، لیکن اس زمانے میں ان کا رجحان علوم عقلیہ کی طرف زیادہ تھا، بعد میں اپنے ذاتی مطالعے اور کاوش سے انھوں نے دینی علوم میں بھی گہری نظر پیدا کرلی۔ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی، لاہور، سے عربی میں اور ۱۹۲۵ء میں فارسی میں آنرز کی سندیں حاصل کیں۔ غالباً اس سے پہلے ہی عرشی صاحب نے مدرسہ عالیہ میں داخل ہوکر مولانا فضل حق رام پوری سے اپنی منطق اور فلسفہ کی تعلیم مکمل کرلی تھی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد ریاست رام پور کے کتب خانے کے ناظم اور لائبریرین مقرر ہونے

(۳۱ جولائی ۱۹۳۲ء) تک، عرشی صاحب نے ندوۃ العلما کی ملازمت بھی کی اور تجارت بھی، لیکن خالقِ کائنات نے انھیں تصنیف و تالیف کے لیے پیدا کیا تھا، چنانچہ ملازمت اور تجارت کے تلخ تجربوں کے بعد وہ خود اس نتیجے پر پہونچے کہ درحقیقت علمی و ادبی کام ہی ان کا مقدر تھا، اور یہ بات بھی عجیب ہے کہ ریاست رام پور کے ذخیرۂ علمی کا مقدر بھی جس کے نگراں حافظ احمد علی شوق رام پوری اور مولوی نجم الغنی خاں رام پوری جیسے کاملان رام پور رہ چکے تھے، عرشی صاحب سے ہی وابستہ تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ کیسی اچھی بات ہوئی کہ اسی ذخیرۂ علمی کے دامن میں مرحوم کی آخری آرام گاہ بنائی گئی۔ عرشی صاحب کے ہاتھوں رام پور کی رضا لائبریری کتابوں کے ایک ذخیرے سے بڑھ کر ایک ادارہ بن گئی، دوسری طرف، اسی لائبریری میں دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر کے انھوں نے علم کے سمندر میں خوب خوب غواصی کی اور اس کی تہ سے ایسے ایسے خوشنما موتی نکال کر لائے کہ وہ خود اپنی جگہ علم و ادب کی ایک انجمن بن گئے۔ افسوس کہ یہ انجمن بھی اٹھ گئی، ہماری علمی و ادبی محفلوں کی حقیقی رونق یوں تو عرصہ ہوا، ختم ہو چکی تھی، لیکن ان کی یادگار کہیں کہیں نظر آ جاتی تھی، عرشی صاحب کی ذات بھی اُنھیں میں تھی، لیکن اس پرانے کی خاک بھی، بادِ صبا اُڑا لے گئی اور اب دور دور تک، نہ تو مدرسے میں اور نہ یونیورسٹیوں میں، ان جیسا کوئی نظر آتا ہے۔ علم و تحقیق کے بیٹے کا یہ شیر مرد بھی چل بسا۔

عرشی صاحب نے بہت لکھا، بہت کام کیا۔ عربی، فارسی اور اُردو میں تاریخ، تذکرہ، تصوف، تفسیر، حدیث اور شعر و ادب میں جو کچھ ہے، سب پر ان کی نظر تھی، علم و فن کے مختلف صیغوں میں انھیں یکساں دستگاہ حاصل تھی، وہ مستشرقین کے کام اور طریق کار سے بھی خوب واقف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے علم و تحقیق کا معیار بھی انھیں جیسا ہو اور جو چیز وہ چھاپیں وہ تدوین و طباعت کے اعتبار سے اُسی رنگ کی ہو جو عہد جدید کا مذاق ہے۔ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے مکاتیب غالب شائع کی اور اس اہتمام سے شائع کی کہ اُردو میں اس وقت تک کوئی کتاب ویسی نہیں چھپی تھی، اور شاید اب تک اس انداز پر کوئی ادبی کتاب نہیں چھپی، ہاں، انھیں کا مرتب کیا ہوا انتخاب غالب (۱۹۴۳ء) اس کی ہمسری کر سکتا ہے۔ ان کی

تصنیفات وتالیفات کی فہرست خاصی طویل ہے، ان کے علاوہ سَو سے زیادہ ان کے وہ علمی وادبی مضامین ومقالات ہیں جن میں علم وتحقیق کا وہی معیار ہے جو مرحوم کی اپنی خصوصیت تھی اور جو ملک وبیرون ملک کے علمی مجلّوں میں چھپ کر عالموں اور ادیبوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراچکے ہیں۔ ان کے مطبوعہ کام میں دیوان غالب، نادرات شاہی (از شاہ عالم ثانی)، دستور الفصاحت (فارسی)، فرہنگ غالب (فارسی)، تاریخ اکبری (فارسی)، کتاب الاجناس (لابی عبید القاسم بن سلام الهروی البغدادی)، تفسیر القرآن الکریم (امام سفیان ثوری) فہرست مخطوطات عربی (رضا لائبریری ـــــ چھ جلدوں میں) اور فہرست مخطوطات اردو (رضا لائبریری۔ جلد ۱) کو امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔ عرشی صاحب نے تدوین وتالیف اور حاشیہ نگاری کا ایک خاص ڈھب نکالا، اپنی اڈیٹ کی ہوئی کتابوں پر انھوں نے جو مقدمے، حاشیے اور شرحیں لکھیں ان سے جہاں ایک طرف کتاب کی افادیت بڑھ گئی، وہیں یہ نگارشات خود اپنی جگہ مستقل تصنیف بھی بن گئیں اور نئی نسل کے محققین کے لئے متعلقہ موضوعات پر تحقیق کا راستہ بہت ہموار ہوگیا۔ ان کی غیر مطبوعہ علمی کاوشوں میں ابھی تو کچھ نامکمل ہوں گی لیکن کئی ایسی ہوں گی جنھیں بس زیور طبع سے آراستہ ہونا ہوگا۔ انھیں میں ایک کتاب فصل الخطاب لعمر بن الخطاب بھی ہو گی جس کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ یہ اُن کی پوری تصنیفی زندگی پر محیط ہے، یعنی اس پر انھوں نے کوئی نصف صدی سے زیادہ کام کیا تھا اور نہ معلوم کہاں کہاں سے مواد جمع کیا تھا، امید ہے کہ یہ مکمل صورت میں ہوگی، یہاں مرحوم کی اس غیر مطبوعہ کتاب کا خاص طور پر اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا یہ کام ایک لحاظ سے علامہ شبلی کی الفاروق ہی کے پایے کا ہوگا۔ خدا کرے کہ یہ مکمل ہو اور چھپ جائے۔ الفاروق اور فصل الخطاب (یہ عربی میں ہے، اردو میں اس کا ترجمہ ضروری ہوگا) دونوں کو ساتھ ساتھ پڑھا جائے گا تو حضرت عمرؓ کی عظیم شخصیت کے کئی نئے پہلو سامنے آئیں گے اور یہ دونوں کتابیں دنیا کے پورے اسلامی لٹریچر میں ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے ایک ایسا مہتم بالشان اضافہ ہوں گی جس کی نظیر عرصہ تک نہ مل سکے گی۔

عرشی صاحب ماہر غالبیات تو تھے ہی لیکن میرا خیال ہے کہ علوم اسلامیہ پر بھی ان کی نظر بہت گہری تھی اور پھر فارسی ادبیات میں بھی ان کے علم اور جانچ پرکھ کے معیار کا بھی ایک خاص مقام تھا، اسلامی زبانوں کی لسانیات میں بھی ان کی ژرف نگاہی مسلّم تھی، ان زبانوں کی صرف و نحو کے بھی وہ ایک اچھے مزاج داں تھے، شعر بھی کہتے تھے اور اچھا کہتے تھے، مسلمانوں کی تاریخ کے بھی اچھے عالم تھے، غرض علم کے ان تمام صیغوں میں اُن کا علم انسائیکلوپیڈیائی تھا، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ان کی علمی شخصیت نے ایک ادارہ کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ ایسے لوگ کم ہوتے ہیں کہ جب اِس دنیا سے رخصت ہوں تو محسوس ہو کہ جیسے ایک روایت ختم ہو گئی، ایک ادارہ ختم ہو گیا۔

علم کے بوجھ نے ہمارے عرشی صاحب کو اتنا جھکا دیا تھا کہ اُن کا انکسار، ان کی عالی ظرفی، ان کے قلب کا سوز و گداز اور ان کا انداز دلنوازی ضرب المثل بن گیا تھا، حُسن چاہے خطاطی میں ہو چاہے شعر و ادب میں اور چاہے تاریخی شخصیتوں کے خد و خال میں، وہ اس پر مرمٹتے تھے، ان باتوں نے خود ان کی شخصیت میں ایسی شستگی و برشتگی پیدا کر دی تھی جو دلوں کو موہ لیتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ جب ۲۵ر فروری کو سوا پانچ بجے مرحوم کا جنازہ اُٹھا تو ایک شور ماتم بھی اٹھا اور ان کے ہزاروں عقیدتمند جن میں ہر مذہب کے ماننے والے تھے، ہچکیوں، آہوں اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ انھیں اپنے دوش پر لے کر ان کی آخری آرام گاہ تک لے گئے، یہ اس لئے کہ یہ محض ایک اچھے آدمی ہی کا جنازہ نہ تھا، یہ ایک عالم کا جنازہ تھا اور عالِم کی موت ایک عالَم کی موت ہوتی ہے۔

ریاض الرحمٰن شروانی

مولانا آزاد کی معنویت

دورِ حاضر میں

مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات کو ۲۳ سال کی مدت گزر گئی۔ ۱۹۵۸ء اور ۱۹۸۱ء کے درمیان ایک نسل کا فاصلہ حائل ہے۔ اس دوران میں ذہنی اور جذباتی اعتبار سے دنیا اور خود ہمارے ملک نے بڑی طویل مسافت طے کی ہے۔ یہ مانتے ہوئے بھی کہ خوب اور زشت کے بعض عالمی اور دائمی پیمانے ہوتے ہیں، یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے کہ ہر دور اپنی بعض مخصوص اقدار بھی رکھتا ہے جن سے چشم پوشی نہ ممکن ہے اور نہ مناسب۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دائمی اور عارضی اقدار کے درمیان تصادم ہو تو کن اقدار کا ساتھ دیا جائے اور کن اقدار سے روگردانی کی جائے۔ دراصل یہ سوال بہت پیچیدہ ہے کیوں کہ اس بارے میں اگر کوئی حتمی فیصلہ کیا جائے تو اور بہت سی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک طرف ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے اور بالکل سچ کہا ہے کہ :

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اَڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

دوسری طرف یہ بھی واقعہ ہے کہ جو قوم یا ملت ماضی کے فکری اور اخلاقی سرمائے سے اپنا دامن یک سر خالی کر لیتی ہے وہ راستے کی تاریکیوں میں بھٹکتی ہی رہتی ہے

ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شروانی، ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۱

اور منزلِ مقصود تک پہنچنا اس کے لیے آسان نہیں رہتا ہے۔ اس مشکل کا حل سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے جو کسی عرب دانش ور نے تجویز کیا ہے یعنی "خذ ما صفیٰ و دَع ما کدر"۔ ماضی کے سرمائے میں جو اچھا اور تاب ناک نظر آئے اسے لے لو اور جو خراب اور گندہ ہو اسے چھوڑ دو۔ بالعموم صورت حال اس سے مختلف ہوتی ہے یعنی اختیار کرنے والے روایات کے نام پر وہ سب کچھ اختیار کر لینا چاہتے ہیں جس کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے اور ترک کرنے والے جدت پسندی کے نام پر ماضی کی ہر چیز سے اپنا رشتہ منقطع کر لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ دونوں رویے مریضانہ ہیں جو ذہن کے کسی چھپے ہوئے چور کا پتہ دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ماضی کے اُجلے نقوش میں شخصیتوں کے روشن افعال و اعمال کو خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے کیوں کہ ماضی نام ہی ہے اشخاص کے اچھے بُرے کارناموں اور کارستانیوں کا۔ خصوصاً اگر کسی قوم یا مُلک کا حال فکری اور عملی انتشار کا شکار ہو تو اس کے لئے اور ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ماضی کی عظیم شخصیتوں کے کارناموں سے روشنی، حرارت اور حرکت مُستعار لینے کی کوشش کرے۔ بدقسمتی سے اِس وقت ہمارا مُلک، بالخصوص اس کی سیاسی زندگی، شدید فکری اور عملی انتشار سے دوچار ہے۔ اِس صورت میں ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ ہم ان قومی رہ نماؤں کے افکار و اعمال کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائیں جنھوں نے ماضیٔ قریب میں ہماری تاریک راہوں کو اپنی سلامتِ فکر اور حُسنِ عمل سے منوّر کیا تھا۔ ان عظیم شخصیتوں میں مولٰنا ابوالکلام آزادؔ کی ذاتِ گرامی، بقول پنڈت جواہر لال نہرو، ایک ایسی مخصوص عظمت کی حامل تھی جو انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی تھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ مولٰنا آزادؔ کے فکر و عمل کے وہ کون سے گوشے ہیں جن کی تابانی آج بھی بدستور قائم ہے اور توقع ہے کہ ابدالآباد تک قائم رہے گی۔ آج کے دور میں مولٰنا آزادؔ کی معنویت ان کے فکر و عمل کے ان ہی گوشوں سے عبارت ہے۔

شخصیّت کی تشکیل میں فکر اور عمل کو یکساں اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ فکرِ محض،

چاہے وہ کتنی ہی ارفع و اعلیٰ کیوں نہ ہو، اگر اس کا نتیجہ عمل صالح کی صورت میں نہ نکلے تو صاحب فکر کو زیادہ سے زیادہ ایک اچھا مصنف یا مقرر بنا سکتی ہے، قوموں اور ملکوں کی قسمت اس کی ذات سے وابستہ نہیں کر سکتی۔ اسی طرح عملِ محض، اگر اگر اس کی پشت پر فکرِ سلیم کا سہارا نہ ہو، اکثر بے راہ کر دیتا ہے۔ یہی بات ہم عقل اور عشق کے رموز میں بھی بیان کر سکتے ہیں۔ عقل کا کام فکرِ سلیم مہیا کرنا ہے لیکن صرف عقل کے ذریعہ کوئی جاوداں کارنامہ مشکل ہی سے انجام پاتا ہے۔ جب تک مقصد کی لگن، جس کا دوسرا نام عشق ہے، اسے متحرک نہ بنائے۔ عشق کی آگ میں تپے بغیر عقل "محوِ تماشائے لبِ بام" ہی رہتی ہے، "بے خطر.... آتشِ نمرود میں کود" پڑنا تنہا عشق کا کام ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اگر عشق عقل کا دامن چھوڑ دے تو اس کے لئے یہ تمیز کرنا آسان نہیں رہتا کہ کون سی آتش میں کب کود پڑنا چاہیئے اور کس آتش سے کب دامن بچانا چاہیئے۔ عشق صحراؤں کی خاک بھلے ہی چھنوا دے لیکن وہ انسانی صلاحیتوں کو تعمیری رُخ اسی وقت عطا کر سکتا ہے جب اس کی رہ نمائی کے لئے عقل موجود ہو۔ جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو ہمارے ماضیٔ قریب کے کتنے ایسے رہ نماؤں کے نام میرے پردۂ ذہن پر اُبھر رہے ہیں جن کی شخصیت اس لئے ادھوری رہ گئی کہ اس کے خمیر میں فکر و عمل یا عقل و عشق کا صحیح امتزاج نہیں تھا۔ جو عقلِ محض تھے انھوں نے ممکن ہے کسی نہ کسی طرح اپنا وقتی مقصد حاصل کر لیا ہو لیکن عشق سے تہی مایہ ہونے کے سبب وہ گُدازِ قلب کی نعمت سے محروم ہی رہے جو انسانیت کا اصلی سرمایہ اور حیاتِ جاودانی کا ضامن ہے اور اسی لئے ان کا حصولِ مقصد کتنے بے گناہ انسانوں کی جسمانی اور روحانی اذیت کا پیش خیمہ بن گیا۔ اسی طرح جن شخصیتوں میں عشق کا رنگ چوکھا تھا لیکن عقل کی اس درجے فراوانی نہیں تھی وہ "آتشِ نمرود" میں بھلے ہی کود پڑے ہوں لیکن اپنے پیچھے ایسے تابندہ نقشِ قدم نہیں چھوڑ سکے جن کی پیروی کر کے بعد میں آنے والی نسلیں اپنے مستقبل کی صحیح خطوط پر تشکیل کر سکتیں۔

قدرت نے مولانا آزادؒ کی ذات گرامی میں فکر و عمل یا عقل و عشق کا جو توازن مہیا کیا تھا میرے نزدیک وہ مولانا کی شخصیت کا امتیازی جوہر ہے۔ کم لوگ ہوں گے جن کی ذات میں فکر و عمل کی ایسی مطابقت پائی جاتی ہو جیسی مولانا کی ذات میں پائی جاتی تھی۔ مولانا نے اپنی مختلف تصانیف اور مضامین (بالخصوص تذکرہ) میں ماضی کی جن عظیم شخصیتوں کا ذکر کیا ہے ان کی قدرِ مشترک جبر و زیادتی اور ظلم و تعدی کے مقابلے میں سر نہ جھکانا بلکہ اس کا مردانہ وار مقابلہ کرنا تھی۔ یہ وصف خود مولانا آزادؒ میں بدرجۂ اتم پایا جاتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ وقت کی سب سے بڑی استعماری طاقت کے مقابلے میں ہمیشہ سینہ سپر رہے بلکہ خود اپنوں کے سب و شتم اور دل آزاری کا مقابلہ بھی انھوں نے اسی عزم و حوصلہ اور متانت و وقار کے ساتھ کیا۔ انھوں نے جو راہ اپنے لئے ۱۹۱۲ء میں متعین کر لی تھی اس پر ۱۹۵۸ء تک، جب وہ اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے یکساں پامردی اور مستقل مزاجی کے ساتھ گام زن رہے۔ مولانا کے بارے میں مختلف اوقات میں مختلف گوشوں سے جو غلط فہمیاں پھیلائی گئیں ان میں ایک غلط فہمی یہ بھی تھی کہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے مولانا آزادؒ اپنے افکار و عقائد کے اعتبار سے ۱۹۱۲ء کے مولانا آزادؒ سے یک سر مختلف تھے۔ ۱۹۱۲ء میں مولانا کا مشن احیائے دین تھا جب کہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء میں وہ متحدہ قومیت کے نقیب بن گئے تھے۔ یہ خیال سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ مولانا آزادؒ نے اپنی عملی زندگی کے ابتدائی دور سے ہندو مسلم اتحاد (جس کا دوسرا نام متحدہ قومیت ہے) کو اپنا سب سے بڑا مشن بنایا تھا اور وہ حتی الامکان اس مشن کی تکمیل سے کبھی غافل نہیں ہوئے یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں، جب ان کے دوسرے سب ساتھی یکے بعد دیگرے تقسیم ملک پر راضی ہو گئے تھے، وہ آخر وقت تک اس کی مخالفت کرتے رہے کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ تقسیم ملک سے متحدہ قومیت کے تصور کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا اور، جیسا کہ ہم سب دیکھ رہے ہیں، وقت کے مورّخ نے اس خیال پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں ہے کہ مولانا آزادؒ کے خیالات کا بنیادی سرچشمہ تعلیماتِ اسلام تھیں لیکن یہ سوچنا مولانا کے

ساتھ سخت ناانصافی کے مُترادف ہوگا کہ وہ اِس سرچشمے سے اکتساب فیض کرنے میں اپنی زندگی کے کسی مرحلے پر بھی غافل ہوئے ہوں۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام میں مجھے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جو ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں حائل ہو۔ مولانا کا ارشاد ہے: "خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہوسکتی ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز تھی۔ اُس وجودِ مقدس نے عہد نامہ لکھا، بجنسہٖ اس کے الفاظ ہیں: ہم اُن قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک" اُمتہ واحدة" بننا چاہتے ہیں۔ "اُمتہ" کے معنیٰ ہیں قوم اور نیشن، "واحدة" کے معنیٰ ہیں ایک۔" اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو (جن کی اکثریت نے اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا) "میری قوم" فرمایا تھا۔ آپ نے ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی تھی کہ "اللھم اِھدِ قومی، فاِنّھم لا یعلمون۔" اے اللہ "میری قوم" کو ہدایت فرما کیوں کہ وہ جانتے نہیں ہیں۔" اصل بات یہ ہے کہ بقول ڈاکٹر ذاکر حسین (مرحوم) "مولانا آزادؒ کا مذہب لوگوں کو جوڑتا تھا، توڑتا نہیں تھا۔" اس کے برعکس جن لوگوں کا مذہب توڑتا ہے، جوڑتا نہیں ہے وہ اِن رموز کا وجدان کیسے کرسکتے ہیں!

اسلامی تعلیمات کے مطابق سلطانِ جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ مولانا آزادؒ اس جہاد کی تلقین اہلِ وطن، بالخصوص مسلمانوں کو برابر کرتے رہے اور نہ صرف تلقین کرتے رہے بلکہ جب بھی موقع آیا خود اس پر عمل کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت مولانا کا برطانوی دور کی ایک عدالت کے روبرو وہ بیان ہے جو بعد میں "قولِ فیصل" کے نام سے شائع ہوا۔ مولانا پر الزام تھا کہ انھوں نے برطانوی افواج کے ہندستانی سپاہیوں کو بغاوت پر اُکسایا تھا۔ مولانا نے نہ صرف یہ الزام قبول فرمایا بلکہ عدالت کو للکارا کہ تم اپنا کام کیے جاؤ (یعنی سزا دیتے رہو)، ہم اپنا کام کیے جائیں (یعنی بار بار اِس طرح کے "جرائم" ہوتے رہیں)۔ آخری فیصلہ کسی اور عدالت میں ہوگا اور اُس فیصلے کا ہم سب کو انتظار کرنا چاہیئے۔ "سُلطانِ جابر" صرف کوئی حکومت ہی نہیں ہوتی ہے بلکہ معاشرہ کبھی کبھی اُس سے بھی بڑھ کر یہ رول

اختیار کر لیتا ہے۔ دنیا گواہ ہے کہ مولانا نے معاشرے کے جبر کو بھی اسی صبر و استقلال اور خندہ پیشانی کے ساتھ انگیز فرمایا اور اپنی متعینہ راہ پر مضبوطی سے قائم رہے جیسا کہ ان کا طرز عمل برٹش حکومت کے مقابلے میں تھا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مولانا نے اپنی عمر کے آخری حصے میں اسلامی تعلیمات سے منہ پھیر لیا تھا انھیں مولانا کی اس بے مثال تقریر پر ایک نظر ڈالنی چاہیئے جو انھوں نے ۱۹۴۷ء کے خون آشام دور میں دہلی کی شاہجہانی مسجد میں ارشاد فرمائی تھی اور جس نے کم سے کم دہلی کے مسلمانوں کے لئے مسیحائی کا کام کیا تھا۔ اس تقریر میں مولانا نے صاف صاف فرمایا تھا کہ میرے پاس تمھارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے بلکہ وہی پرانا نسخہ ہے جو ساڑھے تیرہ سو سال قبل عالم انسانیت کا محسن اعظم لایا تھا یعنی "لا تھنوا ولا تحزنوا وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين" کمزور نہ بنو، غمگین نہ ہو۔ تم ہی سربلند رہو گے بشرطیکہ صاحب ایمان ہو۔

مولانا آزادؒ کی تعلیمات میں خودداری کو مرکزی مقام حاصل تھا اور خود مولانا کی زندگی خودداری کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی تھی جس کی مثالیں ان کے دور میں بھی کم یاب تھیں اور اب تو تقریباً نایاب ہیں۔ مولانا کی زندگی کے اس پہلو پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، خود راقم الحروف کا ایک مضمون اسی موضوع پر "چٹان" لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔ اس لئے اس کا اعادہ غیر ضروری ہے۔ یہاں صرف اتنا یاد دلا دینا چاہتا ہوں کہ اپنی سیاسی زندگی کے ایک خاص دور میں مولانا عوامی زندگی سے بڑی حد تک الگ تھلگ ہو گئے تھے۔ اس کی مختلف لوگوں نے مختلف توجیہیں کیں جو زیادہ تر معاندانہ تھیں۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (مرحوم) نے اپنی تالیف "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" میں اس "راز" پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ اس زمانے میں مولانا آزادؒ کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ ٹرین میں ہمیشہ اونچے درجے میں سفر کرنا پسند فرماتے تھے اور کلکتہ میں بھی کار یا ٹیکسی ہی میں باہر نکلتے تھے۔ ان کی جیب انھیں اس کی اجازت نہیں دیتی تھی اور ان کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ وہ اپنا سفر خرچ کانگریس یا کسی دوسری جماعت سے وصول کریں۔ اس کا حل انھوں نے یہ تجویز

فرمایا کہ کلکتہ میں اپنے مکان میں گوشہ نشین ہوگئے اور سفر سے احتراز کرنے لگے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ سیاسی زندگی کی کامیابی کے لیے عوام سے رابطہ رکھنا اور ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہونا کتنا ضروری ہے لیکن مولانا آزادؒ اس قسم کے ادنیٰ تصورات سے بدرجہا بلند و بالا تھے۔ انھوں نے سیاسی زندگی شہرت و نام آوری کے لئے اختیار نہیں فرمائی تھی بلکہ، جیسا کہ عرض کیا گیا، ان کی زندگی کا ایک مشن تھا اور ان کے نزدیک سیاست اس مشن کی تکمیل کا ایک ذریعہ تھی۔ یہی کیفیت مولانا آزادؒ کی صحافتی زندگی کی بھی تھی۔ انھوں نے صحافت کا پیشہ تجارت کے لئے نہیں، دعوت کی خاطر اختیار فرمایا تھا۔ انھوں نے "الہلال" کے ایک شمارے میں خاص اس موضوع پر ایک اداریہ سپردِ قلم فرمایا تھا جس میں "داعی" اور "تاجر" کے فرق کی وضاحت فرمائی تھی۔ اس میں انھوں نے اخبار نکالنے والوں کو سمجھایا تھا کہ ان کا مقام "داعی" کا ہے، "تاجر" کا نہیں ہے۔

ایک مرتبہ مولانا کے کسی معتقد سرمایہ دار نے "الہلال" کے لئے ایک گراں قدر رقم دینے کا ارادہ ظاہر کیا تو مولانا نے اس کی یہ پیش کش شکریے کے ساتھ رد فرمادی کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ سرمائے کی سنہری زنجیر راہِ حق میں پیش قدمی کرنے سے کسی نہ کسی درجے میں ضرور باز رکھتی ہے۔ آج کتنے اخبار نویس ہیں جو اس جرأتِ رندانہ کا مظاہرہ کر سکتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان کی آواز صدا بالصحرا ثابت ہوتی ہے، اس پر لبیک کہنے والا کوئی مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔ مولانا آزادؒ پنڈت جواہرلال نہرو کی وزارت میں وزیر تھے لیکن دنیا جانتی ہے کہ پنڈت جی کا رشتہ ان سے عقیدت اور احترام کا تھا۔ اس کی بہت اچھی شہادت آں جہانی شری شری مَن نرائن سابق گورنر گجرات نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں دی ہے۔ یہ بات محض قابلیت سے حاصل نہیں ہوسکتی ہے البتہ اس کا اصلی سبب کردار کی عظمت ہوتا ہے اور یہ ان دونوں کے کردار کی عظمت ہی تھی جس نے خود وزیر اعظم کو اپنے وزیر تعلیم کے احترام پر مجبور کر دیا تھا۔

میری ناچیز رائے میں آج کا سب سے اہم مسئلہ اخلاقی اقدار کا زوال ہے۔ یوں تو اخلاقی اقدار کا یہ زوال زندگی کے کسی ایک شعبے تک محدود نہیں ہے لیکن

اس کا سرچشمہ یقیناً ہماری موجودہ سیاسی جماعتیں اور سیاسی رہنما ہیں۔ ہماری سیاسی زندگی آج جس بے اخلاقی کی تصویر پیش کرتی ہے جب ہم اس کا موازنہ مہاتما گاندھی اور مولانا آزادؒ کے دور کی سیاسی زندگی سے کرتے ہیں تو ہمارے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ خان عبدالغفار خاں نے بہت صحیح فرمایا ہے کہ اُس دور میں سیاست نام تھا ایثار، قربانی اور خدمتِ خلق کا اور آج سیاست ذریعہ بن گئی ہے حصولِ اقتدار کا۔ پروفیسر خواجہ غلام السیدین (مرحوم) نے چند سال قبل اپنی مختصر مگر بیش بہا تصنیف "زبان، زندگی اور تعلیم" میں موجودہ سیاسی جماعتوں اور سیاست دانوں کے کردار کی کتنی اچھی نقاب کشائی فرمائی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے": گویا ساری خوبی، ساری دیانت داری، ساری دانش مندی ہماری طرف ہے، جو بھی (دل بدل کی مصلحتوں کے ماتحت!) اس وقت ہماری طرف ہو اور جس قدر بُرائی، بے اصولی، بے ایمانی ہے وہ "دوسری" طرف ہے جس سے مُراد ہے وہ طرف جو ہماری نہ ہو" خواجہ صاحب نے "دل بدل" کی جن "مصلحتوں" کا ذکر فرمایا ہے وہ اب اُس وقت سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ آج سیاست داں جس آسانی سے جماعتیں بدلتے رہتے ہیں اور دوسری جماعتیں انھیں جس خوش دلی کے ساتھ قبول کرتی رہتی ہیں چند برس قبل اس کا تصوّر بھی مُحال تھا۔ وہی آدمی جب تک دوسری جماعت میں ہے بُرا ہے، بے ایمان ہے، ناقص العقل ہے لیکن جب ہمارے ساتھ آ گیا تو اس کی ساری خرابیاں دور ہو گئیں اور وہ دودھ کا دُھلا بن گیا۔ عربی قول ہے "الناس علیٰ دین ملوکھم" (عوام اپنے حکمرانوں کے طریقے کی پیروی کرتے ہیں)۔ یہ بے اخلاقی کی کیفیت سیاسی جماعتوں اور سیاسی رہنماؤں سے بڑھ کر عوام میں سرایت کر گئی ہے اور پورا معاشرہ اس سے متاثر ہو گیا ہے۔ مولانا آزادؒ کا طریقہ اس کے برعکس تھا۔ مہاتما گاندھی کی مانند وہ بھی اخلاقیات کو ہر دوسری چیز پر ترجیح دیتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ گاندھی جی کی طرف جس چیز نے انھیں سب سے پہلے کھینچا تھا وہ گاندھی جی کی دیانت داری تھی۔ ایک مرتبہ چندے میں کوئی معمولی رقم ان کے پاس آئی اور انھوں نے وہ رقم کستوربا جی کو دیدی کہ اس کو چندے کے حساب میں

جمع کردیں۔ جب چند دن کے بعد انھوں نے کستوربا جی سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ جمع کرنا بھول گئیں۔ اس پر گاندھی جی نے نہ صرف کستوربا جی کو تنبیہ فرمائی بلکہ اس واقعے کا ذکر "ہریجن" میں بھی کیا۔ مولانا آزادؒ کی نظر سے گاندھی جی کی یہ تحریر گزری تو اسے پڑھ کر انھیں یقین ہو گیا کہ جو شخص ایک معمولی رقم کے معاملے میں اتنا دیانت دار اور راست باز ہو سکتا ہے اس کے ہاتھ میں ملک و قوم کا مستقبل یقیناً محفوظ ہے۔ مولانا آزاد کی زندگی کے آخری دنوں میں "مُندرا گھپلے" کے سلسلے میں "چھاگلا کمیشن" نے جو فیصلہ دیا تھا اس کے مطابق اس وقت کے وزیرِ خزانہ شری ٹی۔ ٹی۔ کرشنم اچاری کا دامن صاف نہیں تھا۔ پنڈت نہرو اپنی خلقی مروّت کے پیشِ نظر اس کے حق میں نہیں تھے کہ شری کرشنم اچاری کے خلاف کارروائی کی جائے۔ مرکزی کابینہ نے اس وقت کے وزیرِ داخلہ پنڈت گووند بلبھ پنت کی سرکردگی میں ایک سہ رُکنی کمیٹی مقرر کی کہ وہ اس فیصلے سے متعلق اپنی رائے پیش کرے۔ مولانا آزادؒ اس کمیٹی کے ممبر نہیں تھے لیکن انھیں اندیشہ ہوا کہ کمیٹی پنڈت نہرو کی مرضی کا لحاظ رکھ کر ایسی رائے نہ دیدے جو حق و انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہو۔ چناں چہ وہ ذاتی طور پر کمیٹی کے ممبروں، بالخصوص پنڈت پنت، سے ملے اور ان پر زور دیا کہ وہ پنڈت نہرو کی مرضی سے زیادہ حکومت اور ملک کی نیک نامی کو پیشِ نظر رکھ کر رائے دیں۔ بالآخر کمیٹی نے "چھاگلا کمیشن" کے فیصلے کے حق میں رائے دی اور شری کرشنم اچاری کو وزارت سے مستعفی ہونا پڑا۔ اس کے چند ہی دن کے بعد مولانا آزادؒ کو فالج ہوا جس کے نتیجے میں انھوں نے جان جان آفریں کو سونپ دی۔ گویا یہ زندگی کی آخری خدمت تھی جو مولانا نے ملک و قوم کی انجام دی۔ ان کا رویہ اپنے مخالفین کے ساتھ جس عفو و درگزر بلکہ رافت و مرحمت کا رہا اس کا تصور بھی آج کے بیشتر سیاست دانوں کے لئے مُحال ہے۔ آج کی سیاست تو عبارت ہے بدلہ اور انتقام سے۔ خیر گاندھی جی اور مولانا آزادؒ تو مذہبی اخلاقیات کے پابند اور پیرو تھے، پنڈت جواہرلال نہرو (جن کا روایتی مذہب سے برائے نام ہی تعلق تھا) بھی سیاسی زندگی میں اخلاقی اقدار کی برتری کے اسی طرح قائل تھے جیسے اوّل الذکر دونوں بزرگ۔ یہی

سبب ہے کہ آج کے سیاسی پیمانوں کے مطابق پنڈت جی ایک سادھو تھے جو اتفاق سے سیاست میں آگئے تھے۔ گویا سیاست کا مطلب ہے اخلاقی اقدار سے یک سر صرف نظر ورنہ آپ سنت سادھو تو ہوسکتے ہیں، سیاست داں نہیں ہوسکتے۔

آج جس طرح عقائد و نظریات کے ساتھ وفاداری کی جگہ جماعتوں بلکہ اشخاص کے ساتھ وفاداری نے لے لی ہے اور اس پر جس طرح اصرار کیا جاتا ہے وہ بھی سیاست کے اخلاقیات کی گرفت سے آزاد ہوجانے ہی کا کرشمہ ہے۔ اس کے برعکس مولانا آزادؒ کا ہمیشہ اس پر اصرار رہا کہ افراد کی اہمیت صرف یہ ہے کہ وہ بعض اصول و نظریات کی نمائندگی کرتے ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ "ترجمان القرآن" میں ایک جگہ انھوں نے تحریر فرمایا ہے کہ کوئی شخصیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو لیکن اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کسی اصل اور سچائی کی راہ دکھانے والی ہے۔" گویا اصلی اہمیت "سچائی" کی ہے اور اگر کوئی شخصیت کسی سچائی کی راہ نہ دکھائے تو ہیچ ہے خواہ دُنیوی پیمانوں کے اعتبار سے کتنی ہی بڑی اور صاحب جاہ و اقتدار کیوں نہ ہو۔ ایک موقع پر جب مولانا آزادؒ کی خدمت میں حاضری ہوئی تو ایک مسئلے پر مولانا ہم سے ناراض ہوگئے، دوسرے وقت پھر حاضر ہوئے تو نہایت دریا دلی اور شفقت سے اپنے گزشتہ رویے پر اظہارِ ندامت فرمایا اور اس کے ساتھ ارشاد فرمایا "میں جانتا ہوں کہ آپ کو میرے ساتھ تعلقِ خاطر ہے اور یہ تعلقِ خاطر میری ذات سے نہیں ہے بلکہ میرے عقائد و نظریات سے ہے۔" گویا عقائد و نظریات کے مقابلے میں ذات لاشئ محض ہے۔

اگر آج کے سیاست داں بھی رویہ اختیار کرلیں تو ہماری سیاسی زندگی اور اس کے ساتھ معاشرے کی کتنی خرابیاں دُور ہوجاسکتی ہیں۔ شخصیت پرستی کا اظہار خوشامد اور چاپلوسی کی صورت میں ہوتا ہے اور، جیسا کہ عرض کیا گیا، چوں کہ اب وفاداری کا مرکز اصول و نظریات بلکہ جماعتوں کی جگہ سکڑ اور سمٹ کر افراد تک محدود ہوگیا ہے، اس لیے خوشامد کی لے بہت تیز ہوگئی ہے اور اس کے ایسے طریقے ایجاد کرلیے گئے ہیں جو اب سے چند برس پہلے تک مفقود تھے۔ زیادہ

افسوس اس کا ہے کہ اس خوشامد سے بعض ایسے لوگوں کا دامن بھی آلودہ ہے جن کے بزرگوں نے اس ملک میں عزیمت کی راہیں متعین کی تھیں نیز خوشامد کی اس فضا نے سیاسی جماعتوں سے بڑھ کر تعلیمی اور علمی اداروں اور دانش گاہوں کا بھی احاطہ کرلیا ہے۔ مولانا آزادؒ خوشامد سے سخت بے زار تھے۔ ان کی حصول آزادی کے بعد کی جس تقریر کا حوالہ اوپر دیا جاچکا ہے اُسی میں انھوں نے مسلمانانِ ہند سے فرمایا تھا: "میں تم سے نہیں کہتا کہ تم اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی پالیسی اختیار کرو جو غیر ملکی حکومت کے دور میں تمھارا شعار رہا ہے۔" مولانا کا یہ مشورہ آج سب ہندستانیوں کے لئے اس سے کہیں زیادہ مستحق عمل ہے جیسا کہ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کے لئے تھا۔ مولانا آزادؒ کی رانچی میں نظر بندی سے رہائی کے بعد کلکتہ سے ایک عربی رسالہ "الجامعۃ" کے نام سے نکلنا شروع ہوا جس کے مدیر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (مرحوم) اور سرپرست مولانا آزادؒ تھے۔ اس کے دوسرے شمارے میں مولانا ملیح آبادی نے گاندھی جی کی تصویر چھاپی جس پر ان کے بارے میں کئی مدحیہ الفاظ لکھے۔ مولانا آزادؒ نے اسے ناپسند فرمایا اور لکھا کہ گاندھی جی کے لئے صرف ہندستان کی پُرامن تحریک کے قائد لکھنا کافی ہے۔ مولانا آزادؒ خود اپنے لئے بھی خوشامد کو سخت ناپسند فرماتے تھے بلکہ وہ تو اپنی جائز تعریف و توصیف سے بھی اپنے عقیدت مندوں کو باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی وفات سے ٹھیک ایک ہفتہ قبل عین اس مقام پر جہاں اب ان کا مزار ہے کل ہند اُردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں انھوں نے اپنی زندگی کی آخری تقریر فرمائی تھی۔ اس موقع پر انجمن ترقیٔ اردو (ہند) کے اس وقت کے نائب صدر پنڈت سندر لال نے انجمن کی طرف سے مولانا کا استقبال کرتے ہوئے ابھی ان کی تعریف میں چند جملے ہی کہے تھے کہ ہزاروں انسانوں کے مجمع میں مولانا نے انھیں ٹوکتے ہوئے فرمایا "پنڈت جی! اب آپ ہی کہتے رہیں گے یا مجھے بھی کچھ کہنے کا موقع دیں گے۔" مولانا کی اس تنبیہ کے بعد پنڈت سندر لال کے لئے سوائے خاموش ہو جانے کے چارہ نہیں تھا۔

عوامی زندگی کی ایک اور نمایاں خرابی یہ ہے کہ کبھی مذہب، کبھی قوم، کبھی ملت، کبھی زبان، کبھی پردیش اور کبھی ذات برادری کے نام پر لوگوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز اور فیصلے کے خلاف رائے عامہ کی برتری تسلیم کرلیں اور اس کے سامنے سر جھکا دیں۔ مولانا آزادؒ اس رویئے کے خلاف ہمیشہ سینہ سپر رہے اور انھوں نے اس منطق کو قبول کرنے سے ہمیشہ انکار فرمایا۔ تحریک پاکستان کے دورِ شباب میں مولانا کے ہم مذہبوں کا ان کے ساتھ جو برتاؤ رہا اس کے باوجود وہ اس تحریک کو ملک اور مسلمانوں کے لئے مُضر ہی سمجھتے اور کہتے رہے کیوں کہ ان کے نزدیک سچ یہی تھا اور سچ کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ "صداقت اپنے حامیوں کی کثرت و قلت اور استقامت و تزلزل سے ہمیشہ بے پرواہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی ... سچ کی کسوٹی اس کے حامیوں کی کثرت نہیں ہے، اس کے لئے تو اتنا کافی ہے کہ وہ سچ ہے"۔
ایک دوسری جگہ اسی سلسلے میں انھوں نے فرمایا ہے: "کوئی سچی بات اس لئے ترک نہیں کردی جاسکتی کہ لوگ اس کا استقبال نہیں کریں گے۔ سچ سچ ہے اگرچہ تمام عالم اس کا دوست نہ ہو۔" ظاہر ہے کہ سچ کی کسوٹی انسان کی عقل سلیم اور ضمیر کی آواز ہی ہوسکتی ہے۔ اس لئے اگر سچ بولنے والے اور سچ سننے والے دونوں مولانا آزادؒ کے ان ارشادات عالیہ کو حرزِ جاں بنالیں تو ایک طرف سچ بولنے والوں پر مخالفین کے سبّ و شتم کا کوئی اثر نہیں ہوگا اور دوسری طرف سچ سننے والے (چاہے وہ اسے سچ نہ بھی مانیں) سچ بولنے والے کی کردارکُشی سے باز آجائیں گے۔ افسوس ہے کہ اس وقت صورتِ حال یہ نہیں ہے۔ یا تو کسی بات کو سچ سمجھنے والا رائے عامہ کے دباؤ سے مجبور ہوکر سچ بولنے سے باز آجاتا ہے ورنہ اس کی رائے سے اختلاف کرنے والے اس پر زندگی حرام کر دیتے ہیں اور حیرت ہے کہ اس دوسرے گروہ میں بعض وہ لوگ بھی شامل ہوگئے ہیں جو کبھی پہلے گروہ میں شامل رہ چکے ہیں۔ قبولِ عام اور حصولِ اقتدار کی خواہش لوگوں کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے!
جہاں تک وقت کے بعض دوسرے اہم مسائل یعنی فرقہ پرستی، خویش پروری

جاہ طلبی وغیرہ سے متعلق مولانا آزادؒ کی معنویت کا تعلق ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس لئے اس پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں صرف ان امور کی نشان دہی کی کوشش کی گئی ہے جس پر عام طور سے لوگوں کی نظر بہت کم جاتی ہے۔ اگر ہم مولانا کی زندگی سے سبق لینا چاہیں تو وہ آج بھی ہمارے لئے روشنی اور ہدایت کے ایک عظیم مینارے کی صورت میں موجود ہے۔

"مولانا آزاد ایک کیرکٹر کے انسان تھے، انھوں نے اپنی زندگی کا ایک مقصد معین کرلیا، ان کو خدا کی مرضی کے مطابق کام کرنا ہے، اپنے مذہب کی ہدایت کے مطابق کام کرنا ہے، جن سچائیوں پر ان کا یقین جم گیا تھا ان سچائیوں کو پیش کرنا ہے۔ ان کو اس سے مطلب نہیں کہ لوگ خوش ہوتے ہیں یا ناخوش ہوتے ہیں .... انھوں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی کہ ان کے ہم مذہب کیا کہتے ہیں، کیا رائے قائم کرتے ہیں، ہم کو اور آپ کو ہمیشہ اس بات کے آگے سر جھکا دینا پڑے گا، ان کی اس بڑائی کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کی ساری عمر صحیح بات کہنے اور اس پر اصرار کرنے میں گذری۔ اس کی ان کو وہ قیمت ادا کرنی پڑی جو ایسے سب حق پسندوں کو ادا کرنی پڑی ہے.....خواہ مذہبی عقائد ہوں خواہ سیاسی خیالات، انھوں نے جس چیز کو صحیح سمجھا، ہمیشہ بہ بانگ دہل اس کا اعلان کیا۔"

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

(مولانا آزاد اور ان کے ناقد صفحہ ۶۲ و ۶۳)

ڈاکٹر محمد عمر

ہندی اسلامی سماج ــــ تہذیبی لین دین

(۲)

تصوف پر ہندوستانی اثر

اسلامی تصوف بھی ہندوستانی تصوف سے متاثر ہوا ہے۔ ایران میں بالخصوص خراسان کے صوفیائے کرام بدھ مذہب کی تعلیمات سے بڑی حد تک متاثر تھے۔ گیارھویں صدی میں صوفی میر ابو القاسم فندرسکی نے ہندوؤں کی مشہور کتاب "یوگ" کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کتاب میں ہندوستان کے جوگیوں اور سنیاسیوں کے افعال، اشغال، آداب اور ریاضتوں کے طریقوں پر بڑی اچھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ صوفی موصوف نے ترجمہ کے علاوہ اس کتاب کی تفسیر بھی لکھی تھی۔ سعید نفیسی کا خیال ہے کہ ایران کے تصوف کے اصول ہمیشہ ہندوستان میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گئے تھے اور ایران کے اثر سے صوفی سلسلے مثلاً چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ اور نقشبندیہ دورِ جدید تک نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں میں باقی ہیں بلکہ اہل ہنود خصوصاً بدھوں میں خاصے رائج ہیں اور اس سرزمین میں تصوف کا تعلق نہ صرف مسلمانوں سے بلکہ ہندوؤں سے بھی تھا۔ (سرچشمۂ تصوف در ایران۔ ۴۱۔۴۲)

ڈوزی اور وان کریمر جیسے مشہور مستشرقین کا خیال ہے کہ تصوف، فلسفہ ویدانت سے ماخوذ ہے۔ پروفیسر حبیب کا بھی یہی خیال تھا کہ تصوف اسلام کے عروج سے برسوں پہلے انسانی فکر میں جگہ پا چکا تھا اور انھوں نے دارا شکوہ کے خیالات کی تائید کی ہے کہ تصوف کی اولین مستند تشریح اپنشدوں میں پائی جاتی ہے۔ دارا شکوہ نے بڑی تحقیق و جستجو

کے بعد یہ خیال اپنی کتاب مجمع البحرین کے مقدمہ میں ظاہر کیا ہے۔

دوسرے مصنفین نے بھی تصوف پر ویدانت کے اثرات کا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے:

"جب تصوف کی تحریک وسط ایشیا میں پہونچی تو ناگزیر تھا کہ بدھ مذہب کے کچھ اثرات قبول کئے جائیں۔ شیخ علی ہجویری نے کچھ صوفی گروہوں کا حال لکھا ہے۔ غور سے پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ بدھ مذہب کے کتنے اثرات اس طبقے نے قبول کر لیے تھے۔ جب ہندستان میں یہ تحریک پہونچی تو ناممکن تھا کہ یہاں کے ان قدیم مذہبی اصولوں کو جذب نہ کرے جو اس کے بنیادی اصولوں سے نہ ٹکراتے ہوں۔ حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری شطاری نے بحر الحیات اور دارا شکوہ نے مجمع البحرین میں اسلامی تصوف اور ہندو فلسفہ کا اسی نظریہ سے مطالعہ کیا ہے۔" (تاریخ مشایخ چشت ص ۲۲-۲۳)

(۱) اسلامی تصوف میں "فلسفۂ صلح کل" بدھ مذہب سے ماخوذ ہے۔ حافظ شیرازی مرحوم کا ایک شعر ہے:

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

اس سلسلے میں داس گپتا کا خیال ہے کہ سترہویں اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کے تصوف میں "صلح کل" کا تصور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت پہلے ہی بالواسطہ ہندو مذہب کے لوگ کے عقیدہ کے بجائے مہایان بدھ عقائد سے اخذ کیا جا چکا تھا۔

(۲) ترک دنیا: تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ فضیل بن عیاض اور ابراہیم بن ادہم بلخی نے ترک دنیا کا تصور بدھ مذہب سے لیا ہے۔ گوتم بدھ اور ابراہیم بن ادہم کی شہزادگی ترک کرنے میں جو مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس کے بارے میں گولڈ زیہر

کی رائے ہے کہ ترک دنیا کا تصور صوفی عقیدے میں بدھ مت کے تصور سے اخذ کیا گیا تھا۔"

(۳) اسلامی تصوف اور ہندوستانی تصوف کے اصولوں میں مماثلت :

(الف) فنا کا تصور : فنا کے تصور اور بدھ مت کے تصور نروان میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اسلامی تصوف میں فنا کا تصور بایزید بسطامی سے شروع ہوتا ہے۔ سعید نفیسی نے لکھا ہے۔ "واین ہمہ اصول معروف "نروانہ" در تعلیمات بودائی است کہ نتیجہ آں فناست۔"

(ب) وحدت الوجود کا تصور : اسلامی تصوف میں وحدت الوجود کا تصور ابن العربی کی تعلیمات سے داخل ہوا لیکن پروفیسر حبیب کا خیال ہے کہ "وحدت الوجود کی تعلیم سب سے پہلے اوپنشدوں نے دی۔" (تاریخ مشایخ چشت۔ تعارف ص ۳۱)

(ج) معرفت کا تصور : البیرونی کی تحقیق کے لحاظ سے مقام معرفت کے متعلق صوفیاء کے اشارے ہندوؤں کے اشاروں کے مشابہ ہیں کتاب الہند ا، ص ۸۰ - ۸۱) عبدالرحمان جامی کی کتاب لوایح میں جو صوفیائے کرام کی تعلیمات کی تلخیص ہے لایحۃ ص ۲۶ میں ایک ایسا بیان پایا جاتا ہے جو بعینہ، بدھوں کے "نروان" کے تصور کے مطابق ہے۔

(د) گولڈ زیہر کے مطابق بدھ مت کے پسندیدہ طریقے اور تصوف کے "طریقے" مراقبہ اور دھیان میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔

(ہ) خرقہ : گولڈزیہر کا خیال ہے کہ یہ لباس بدھ مت سے مستعار لیا گیا ہے۔

(و) حبس دم : یہ تصور بدھ اشغال کے ذریعہ یوگ پرانایام سے اخذ کیا گیا ہے۔ داراشکوہ نے رسالۂ حق نما میں بڑی تفصیل سے اس شغل پر روشنی ڈالی ہے۔ دارا نے یہ شغل ملا شاہ بدخشی سے کسب کیا تھا۔ خواجہ اجمیری بھی اس شغل پر عمل کیا کرتے تھے۔ امیرالامراء خان دوراں خان (اٹھارہویں صدی کا

ایک امیر) کے بارے میں بندرابن خوشگو نے لکھا ہے :

"وے درفن جوگ اشغال باطنی حبس دم خود را بپایۂ کمال رسانیدہ بود، چناں چہ کمالان ایں فن از و بحساب بودند ۔"

(سفینۂ خوشگو/۲۲۱)

نقشبندی، قادری اور شطاری سلسلوں میں اس شغل کا رواج پایا جاتا تھا۔

(ز) عزیز احمد کا خیال ہے کہ نقشبندی سلسلے میں تصور شیخ کا نظریہ بھی بدھ مت سے اخذ کیا گیا ہے جس کا سرچشمہ اور مخرج فی الواقع بعد میں "ویدک عہد" کا "دھیان" کا تصور تھا۔ مرزا مظہر جان جاناں نے تصور شیخ اور بت پرستی کو مماثل بتایا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ صوفیائے کرام اپنے پیر و مرشد کی صورت کا تصور کرتے ہیں اور اس سے فیض اٹھاتے ہیں لیکن اس کا بت نہیں تراشتے ۔

(ح) گیروے رنگ کا لباس : کہا جاتا ہے کہ گوتم بدھ کے چیلوں کا لباس گیروے رنگ کا ہوتا تھا اور بعد میں راہبوں کے لیے اسی رنگ کا لباس متعین کر دیا گیا تھا۔ جوگی اور سنیاسی بھی اسی رنگ کا لباس پہنتے تھے ۔ صوفیائے کرام نے بالخصوص چشتی سلسلے کے صوفیوں نے یہ رنگ اپنا لیا تھا اور دور جدید تک اس سلسلے کے صوفیوں میں گیروے رنگ کی پگڑی باندھنے کا رواج ہے ۔ شاہ عبدالرزاق بانسوی حالاں کہ قادری سلسلے میں بیعت تھے لیکن وہ بالعموم گیروے رنگ کی دستار باندھتے تھے اور اسی رنگ کی چادر اور رومال استعمال کرتے تھے (ملفوظ رزاقی۔ ۷۲)

(ط) ریاضت شاقہ : کا تصور بھی سنیاسیوں اور جوگیوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ خواجہ محمد چشتی "درخانۂ خویش چاہے داشت در آنجا خود را سرنگوں آویختہ خدا تعالیٰ را عبادت کردے ۔" جب کہ رہبانیت اسلام میں ناجائز ہے۔ (قول الجمیل ۱۶)

(ی) اعلیٰ سطح پر بدھ مرتاضوں کے دھیان اور "عقلی تجرید" نے اسلامی تصوف پر گہرے نقش چھوڑے ہیں ۔ ہندوستانی صوفیاء کی ایک بڑی خصوصیت یہ رہی ہے کہ

انھوں نے طریقت کی ترویج کے لیے ہندو مذہب ان کی دیومالاؤں اور متصوفانہ اقوال سے اخلاقی تعلیمات اخذ کی تھیں کیوں کہ ہندوستانی مسلمان اسلامی روایات کے مقابلے میں ہندوستانی روایات سے زیادہ مانوس تھے اور ان کے ذریعہ انھیں بڑی آسانی سے رموز روحانی سمجھائے جاسکتے تھے۔ حضرت بندہ نواز گیسو دراز نے ہندوؤں کے فرضی قصوں کو مسلمانوں کی اخلاقی تعلیم کے لیے استعمال کیا ہے۔ بدھ مت فلسفۂ ترک دنیا، مرتاضیت اور جنگلوں کی سیر و سیاحت کے عناصر مسلمان صوفیوں میں کارفرما نظر آتے ہیں۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری نے بڑی سیر و سیاحت کے بعد روحانی ارتقاء کے لیے مگدھ میں ایک جھرنے کے کنارے ایک ایسا مقام تلاش کیا تھا جسے ہندو اور بدھ متبرک سمجھتے تھے۔ وہ مقام اب مخدوم کنڈ کہلاتا ہے۔ غیر متشرع فرقوں میں ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں کے اعمال کے بعض عناصر پائے جاتے ہیں۔ شطاری سلسلے نے بالواسطہ یوگ سے اور بہت ممکن ہے ہندو تصوف کے دوسرے طریقوں سے ہندوستانی عناصر اخذ کئے ہیں۔ شطاری سلسلے کے بزرگ جوگیوں کی طرح غاروں اور جنگلوں میں رہتے تھے اور بہت کم کھاتے تھے، عموماً پھل اور درختوں کے پتے کھاکر زندگی گزارتے تھے اور ریاضت شاقہ پر عمل کرتے تھے۔ اس سلسلے میں شغل، ہندی، عربی، فارسی کسی بھی زبان میں کیا جاسکتا تھا۔ ذکر کی بعض اصطلاحیں ایسی ہیں جو بالواسطہ ہندو تصوف سے لی گئی ہیں۔ مثلاً "او ہی ہی" اس میں اپنشد کے عبادت کے ارکان کی جھلک پائی جاتی ہے۔ شطاری سلسلے کے جسمانی اشغال میں بالخصوص جوگیوں کے "آسن" اور "سمادھی" شامل تھے۔ بحرالحیات میں یوگیوں کے افعال و اشغال کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔

چشتی صوفیائے کرام میں کھڑاؤں پہننے کا عام رواج تھا۔ بابا فرید کھڑاؤں پہنا کرتے تھے۔ کسی شخص کو خلافت عطا کرتے وقت دوسری چیزوں کے علاوہ مرشد کی استعمال کردہ کھڑاؤں بھی دی جاتی تھی۔

ہندو یوگیوں کے زیر اثر مسلمانوں میں بعض غیر متشرع فرقے پیدا ہوگئے مثلاً مداری فرقہ۔ اس فرقہ کے لوگ برہنہ پھرا کرتے تھے، جسم پر بھبھوت ملا کرتے تھے آگ کے

سامنے بیٹھتے اور سر پر جٹا رکھا کرتے تھے۔ زنجیریں مار کر اپنے جسم کو ایذا پہنچایا کرتے تھے۔ تجرد کی زندگی گزارتے تھے اور بلبشتر گوشت سے پرہیز کیا کرتے تھے اور جوگیوں کی طرح بھنگ پیا کرتے تھے۔ عباسی فرقے کے لوگ سندھ میں پائے جاتے تھے۔ ان پر سکھوں کی تعلیمات کا اثر تھا۔ وہ استرے کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے۔ ملنگوں کے فرقے کے پیشوا مخدوم جہاں گشت تھے۔ اس فرقے کے لوگ کثرت سے چرس و بھنگ پیا کرتے تھے۔ لنگوٹی باندھتے ورنہ برہنہ رہا کرتے تھے۔ سر پر جٹا رکھا کرتے تھے۔ رسول شاہی فرقے کے لوگ منہ پر بھبھوت ملتے تھے اور بھنویں اور مونچھیں ترشواتے تھے، سر منڈاتے تھے، شراب اور بھنگ خوب پیتے تھے۔

مختصر یہ کہ اسلامی تصوف ہو یا ہندوستانی تصوف، اس نے مجموعی طور پر ہندوستانی عقائد سے بہت زیادہ اثرات قبول کئے تھے اور صوفیاء کے اقوال، اشغال اوضاع اور اطوار میں بڑی حد تک ہندوستانی تہذیب اور ہندی تصوف کے عناصر ملتے ہیں۔

فن موسیقی اور سنگیت

اسلام میں ساز کے ساتھ سنگیت سننا حرام ہے لیکن ہندوستان میں سلاطین دہلی اور شاہانِ مغلیہ نے موسیقی اور موسیقاروں کی دل کھول کر سرپرستی کی ہے۔ علاءالدین خلجی کے عہد میں فن موسیقی نے نمایاں ترقی کی۔ اس عہد کے سازندوں اور مغنیوں کا برنی نے تفصیل سے ذکر کیا ہے، ان میں بلبشتر مسلمان تھے۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں فن موسیقی پر دو کتابیں لکھی گئیں: غنیتہ المنیہ، اس میں ہندوستانی سنگیت کا بیان ہے دوسری فرید الزمان فی معرفت الالحان کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ امیر خسرو نے جس انداز سے ہندوستانی سنگیت کی تعریف کی ہے اس سے قیاس ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں امیر خسرو پہلے مسلمان تھے جنھوں نے ہندوستانی موسیقی میں مہارت پیدا کی۔ سکندر لودی کے زمانے میں فن موسیقی پر ایک کتاب لکھی گئی جس کا نام

لہجاتِ سکندری ہے۔

اکبر بادشاہ نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کے سلسلے میں فنِ موسیقی میں بھی یکجہتی پیدا کرنے کی کوشش کی اور ہندوستان کے مشہور گویّوں کو اپنے دربار میں ملازم رکھ کر ان کی سرپرستی کی۔ ابو الفضل نے بڑی تفصیل سے ہندوستانی فنِ موسیقی اور رقص کا ذکر کیا ہے۔ شاہ جہاں بادشاہ بذاتِ خود بہت اچھا رقص کرتا تھا اور اکبر کی طرح ہندوستانی سازوں کو بڑی چابکدستی سے بجاتا تھا۔ تخت نشینی سے پہلے اور بعد میں اپنے دورِ حکومت کے گیارہویں سال تک اورنگ زیب رقص و سرود میں دلچسپی لیتا تھا، اس نے خوشحال خاں کلاونت کو روپیوں میں تلوا کر ساری رقم اسے انعام میں دیدی۔

اٹھارہویں صدی میں مسلمان سازندوں اور رقاص مردوں اور عورتوں کی ایک ایسی جماعت وجود میں آئی جو ہندوستانی سازوں کے بجانے اور خالص ہندوستانی رقص کرنے میں مہارت کلی رکھتے تھے۔ شاکر خاں نے دربار مغلیہ کے اربابِ طرب کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ "مرقع دہلی" میں بھی دہلی کے مسلمان گویّوں اور رقص کرنے والے مردوں کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ گویّوں اور رقّاصوں کے نام بھی ہندوستانی تھے۔ مثلاً گنگا، کالی گنگا، سرس روپ، چیلا سروپ، آمنی وغیرہ۔

لکھنؤ میں آزاد حکومت قائم ہونے کے بعد نوابین اودھ نے فنِ موسیقی، سازندوں اور گویّوں کی بڑی سرپرستی کی اور بہت سے مسلمانوں نے ہندوستانی فنِ موسیقی میں دسترس حاصل کی۔ اٹھارہویں صدی کو ہندوستانی فنِ موسیقی کی ترقی کے سلسلے میں عہدِ زرین سمجھا جانا چاہئے۔ اس زمانے میں سیکڑوں مسلمان سازندے اور موسیقار پیدا ہوئے جنھوں نے اس فن کو پروان چڑھایا۔ پیشہ ور سازندوں اور موسیقاروں کے علاوہ دوسرے بہت سے ایسے لوگ تھے جو اس فن میں مہارت رکھتے تھے۔ محمد محسن فدوی اور قلندر بخش جرأت ستار خوب بجاتے تھے۔ میر سوز، میر مدد اللہ، حکیم پناہ خاں پناہ، عبدالرزاق بے ہوش، مرزا صادق علی خاں مرزا، محمد رفیع سودا، حافظ غلام اشرف

کو ہندوستانی موسیقی میں مہارت حاصل تھی ۔ آخرالذکر نے ایک نیا ساز ایجاد کیا تھا جس کا نام سندربین تھا ۔ حافظ غلام محمد سرخوش ، ساکن جہاں آباد ، ستار اور سارنگی بہت اچھا بجاتے تھے ، نیز ہٹہ اور خیال خوب گاتے تھے ۔ قزلباش خاں امید نے ایرانی النسل ہونے کے باوجود ہندوستانی فن موسیقی میں مہارت پیدا کرلی تھی ۔ مولوی حیدر علی خاں سندیلوی ہندوستانی راگوں میں بھیروی ، بھبھاس ، توڑی ، اسالوری ، بلاول ، الھیا ، دیوگیری اور دوسرے راگ راگنیوں اور خیال کے گانے میں پوری مہارت رکھتے تھے ۔ میر عبدالجلیل بلگرامی نے بلگرام کی تعریف میں "امواج الخیال" نامی ایک مثنوی لکھی ہے ، اس میں انھوں نے "اکثر قواعد موسیقی ضبط نمودہ ۔" اسی طرح انھوں نے در مثنوی کتخدائی فرخ سیر بادشاہ با دختر اجیت سنگھ" میں ہندوستانی موسیقی کے پردوں کو فارسی میں بیان کیا ہے ۔ میر غلام نبی بلگرامی ہندوستانی راگ اور راگنیوں کے گانے اور ہندوستانی سازوں کے بجانے میں قدرت رکھتے تھے ۔ سید نظام الدین مدھنایک نے ہندوستانی فن موسیقی کے موضوع پر دو کتابیں ۔ نادچندرکا اور مدھنایک سنگار لکھیں ۔ روشن ضمیر ، ہندوستانی موسیقی کے کامل استاد تھے اور اس فن میں ان کی اعلیٰ کتابیں تھیں ۔ علم موسیقی اور رقص کے موضوع پر ہوبل کی کلاسیکی سنسکرت کی کتاب پارجاتک کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا تھا ۔ عمدۃ الملک امیر خاں انجام ، فن موسیقی میں خاص مہارت رکھتے تھے اور ڈھولک جو ہندوستانی ساز ہے خوب بجاتے تھے ۔ اسی طرح دوسرے بہت سے مسلمان موسیقی کے فنکاروں کے ناموں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے ۔ انیسویں صدی میں بھی ہندوستانی موسیقی کے فنکاروں نے بڑی شہرت پائی ۔ سرسید احمد خاں نے آثارالصنادید میں ارباب موسیقی کے نام سے ایک الگ باب لکھا ہے ۔

صوفیائے کرام بالخصوص چشتی سلسلے کے بزرگوں کو موسیقی سے گہری دلچسپی تھی اور ان میں سے بعض نے اس فن میں مہارت پیدا کی ۔ مثلاً خواجہ میر درد ، ایک دوسرے بزرگ شیخ بہاء الدین برناوی خاتم التارکین تھے ۔ موسیقی سے ان کا تعلق عشق کے کے درجے تک تھا ۔ جکری ، خیال ، چٹکلہ ، ترانہ و قول ، ساورہ ، حریر ، بشن پد وغیرہ میں

انھوں نے اشعار کہے تھے۔ ساز خیال و ساز کھڑتس کے موجد تھے۔ شیخ عطاء اللہ المعروف بہ شیخ رتن موسیقی میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔

صوفیائے کرام نے ہندوستانی فن موسیقی کی تہذیب و ترقی میں بہت مدد کی۔ جہاں وہ فارسی موسیقی، قول و ترانہ وغیرہ کے دلدادہ تھے، وہاں ہندی موسیقی سے ان کی خانقاہیں خالی نہ تھیں۔ وہ سنسکرت زبان میں بھی نغمات سننا پسند کرتے تھے۔ شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی اس فن میں مہارت رکھتے تھے۔ ملتانی دھناسری انہی کی ایجاد ہے۔ شیخ سعد اللہ گلشن موسیقی سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ اس فن میں ان کی کئی تصانیف بتائی جاتی ہیں، جو اب نایاب ہیں۔

کتابیں

ہندوستانی فن موسیقی پر مسلمانوں نے اتنی قدرت حاصل کر لی تھی کہ انھوں نے اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں جو خالص ہندوستانی فن موسیقی سے متعلق ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) غنیۃ المنیہ۔ ہندوستانی کتابوں کی بنیاد پر لکھی گئی ہے۔

(۲) لہجات سکندری۔ اس کتاب کی تصنیف میں عمر سمع یحیٰی نے سنگیت رتناکر، سنگیت ماتنگ، نرت سنگرہ، ادبھرت، سدھی ندھی، سنگیت سامیا، اور سنگیت چکتر و سے مدد لی ہے۔

(۳) کنز التحف

(۴) آئین اکبری میں ابوالفضل نے ہندوستانی موسیقی کے بارے میں علیحدہ ایک باب لکھا ہے۔

(۵) پارجاتک۔ سوبل کی کتاب کا روشن ضمیر نے ترجمہ کیا تھا۔ مراۃ الخیال کے مصنف کا بیان ہے کہ روشن ضمیر نے موسیقی کے موضوع پر عربی، فارسی اور ہندی زبانوں میں دوسری کتابیں بھی لکھی تھیں جو دست برد زمانہ کی نذر ہو گئیں۔

(۶) سیف خاں نے راگ اور نغمہ کے فن پر ایک رسالہ راگ درپن کے نام سے لکھا ہے۔

(۷) راگ درپن مان کتوہل کا ترجمہ اور تشریح ہے اور اس کے مترجم امیر فقیر اللہ خاں ہیں۔

(۸) مفتاح السرود۔ قاضی حسن بن خواجہ طاہر نے لکھی ہے۔

(۹) معرفۃ النغم۔ ابوالحسن قیصر۔

(۱۰) شمس الاصوات۔ راس برس نے ہندی سنگیت کی کسی کتاب سے ترجمہ کیا ہے۔

(۱۱) اصول النغمات الآصفیہ۔ نواب آصف الدولہ کے زمانے میں یہ کتاب فارسی میں لکھی گئی تھی۔

(۱۲) تحفۃ الہند۔ اکبر ثانی کے عہد میں مرزا خاں نامی ایک بزرگ نے پنڈتوں اور سنسکرت کے عالموں کی مدد سے یہ کتاب لکھی تھی۔ اس میں بہت سے ہندی فنون کو جمع کر دیا گیا ہے۔ جوتش، سرود، سامدرک، کوک، نائکہ بھید، اندر جال وغیرہ موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ ہندی موسیقی پر بھی بحث ہے۔

(۱۳) دھرپد، ترانہ و خیال تازہ کے نام سے مبارز الملک سربلند خاں نے ایک کتاب فن موسیقی پر لکھی تھی، اور محمد شاہ کے نام معنون کی تھی۔

(۱۴) تذکرہ مشاہیر عالم، مصنفہ ۱۸۰۴ء میں ہندوستان کے مشہور مسلمان گویوں کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔

مسلمانوں نے گذشتہ زمانے ہی میں موسیقی کی خدمت نہیں کی ہے بلکہ آج بھی مسلمان موسیقار اور سازندے ہندو موسیقی کاروں کے دوش بدوش اس فن میں اپنا کمال دکھاتے نظر آتے ہیں۔

پان اور حقہ نوشی

پان کھانے اور حقہ پینے کا شوق ہندوستانی مسلمانوں نے اس ملک میں رہ کر پیدا

کیا تھا۔ پان ہندوستان کے علاوہ کسی دوسرے ملک میں پیدا نہیں ہوتا۔ امیر خسرو نے پان کی تعریف میں زور قلم دکھایا ہے۔ حقہ پینے اور پان کھانے کا رواج آج تک ہر طبقے کے مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔

لباس، زیورات اور لوازمات حُسن

اکبر کے عہد سے پہلے ہی اس ملک کی آب وہوا کے لحاظ سے مسلمانوں نے ہندوؤں کے لباس کو بعض تصرفات کر کے اپنا لیا تھا۔ مقامی لوگ مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد بھی اپنا قدیم لباس پہنتے رہے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں "سنگار کے طریقے" کے باب میں ہندو عورتوں کے لباسوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً انگیا، لہنگا، ڈنڈیا، ڈوپٹہ، اوڑھنی، کرتی یا کرتنا۔ جمیلہ برج بھوشن کا خیال ہے:

> "اکبر کے عہد تک مسلمان عورتیں ایرانی لباس پہنتی تھیں، لیکن اس بادشاہ کے عہد میں راجپوت لباس اپنا لیے گئے۔ یہ اسی وقت ہوسکتا تھا جب کہ مسلمان بادشاہوں اور امراء کی مستورات کی پگڑی کی جگہ راجپوت عورتوں کے ڈوپٹہ اور پردہ (نقاب) گھونگھٹ، مقنع (برقع) نے لے لی ہو۔ اور اس زمانے سے راجستھان کا برقع گھاگھرا اور انگیا سترھویں صدی کے حرم میں بناوٹ اور ساخت میں تبدیلیوں کے ساتھ مروج ہو گیا ہو۔"

مختلف لباسوں کے ناموں سے بھی ان کے ہندی ہونے کی نشاندہی ہوتی ہے مثلاً کرتا، کرتی، اوڑھنی، چولی، انگیا، لہنگا، ساڑی، پشواز وغیرہ۔

ہندوستانی مسلمان عورتوں میں تقریباً ایک سو پچاس ایسے زیور مروج تھے جو خالص ہندوستانی تھے اور ان کے ہندوستانی نام بھی آج تک باقی ہیں۔ بعض کے فارسی نام رکھ لئے گئے تھے مثلاً اربسی، ہندی کا لفظ جس کے معنی دل۔ یہ عورتوں کے سینے پر لٹکا ہوتا تھا۔ انگوٹھی وغیرہ۔ ان زیورات پر یہاں تفصیلی گفتگو ممکن نہیں ہے۔

سنگار کے طریقے

مردوں سے زیادہ عورتوں میں سنگار کرنے کا فطری جذبہ پایا جاتا ہے۔ ملک محمد جائسی نے پدماوت میں ہندو عورتوں کے سنگار کے طریقوں اور لوازمات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے ۔ ابو الفضل نے بھی ہندو عورتوں کے سولہ سنگار بیان کئے ہیں مسلمان عورتوں نے سنگار کے طریقے ہندو عورتوں سے اخذ کئے تھے اسی لئے ان کے نام بھی ہندی ہیں ۔ اردو ادب میں ان سنگاروں کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں ۔ ٹیکا، اُبٹنا ، ارگجا ، کاجل ، غازہ ، مسّی ، پان ۔ بالوں کے سنوارنے کے دو طریقے تھے چوٹی کرنا اور جوڑا باندھنا ۔ بال کنگھی سے سنوارے جاتے تھے جو اب بھی مروج ہے ۔ مہندی لگانا ، مہندی کا لگانا سہاگ کی نشانی تصور کی جاتی تھی۔

اردو ادب کا سماجی پس منظر

ہندوستان کی مقامی زبانوں اور فارسی وعربی کے میل جول سے ایک ایسی زبان وجود میں آئی جو پہلے ریختہ اور بعد میں اردو کے نام سے مشہور ہوئی ۔ ابتدا میں یہ زبان صرف روزمرہ کی گفت وشنید میں مستعمل تھی مگر بہت جلد ملکی اور ادبی زبان کی حیثیت حاصل کرلی ۔ صفِ اول کے مسلمان شعراء کے کلام کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس پر مقامی زبانوں کی گہری چھاپ ہے ۔ اگر اس کو ہندوستانی ماحول نہ ملا ہوتا تو اس میں موضوعات کے اعتبار سے اتنی وسعت نہ آتی اور نہ یہ زبان ایک ایسی زبان کا مقام حاصل کرسکتی جو سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہو ۔ اردو ادب اور بالخصوص مسلمان شاعروں کے کلام کو ہندوستانی تہذیب ، عقائد ، رسم ورواج ، دیو مالاؤں ، میلوں ٹھیلوں وغیرہ کا مرقع سمجھنا چاہیئے۔ اگر اس کلام کو ہندی زبان میں لکھدیا جائے تو بڑی مشکل سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاعر ہندو ہے یا مسلمان ۔ کیونکہ اس کلام میں دجلہ وفرات کے

کے بجائے گنگا اور جمنا کا ذکر ملتا ہے۔ ایرانی پرندوں، درندوں، موسموں، جشنوں لباسوں، زیوروں، سنگاروں، کھیل تماشوں کے بجائے ہندوستانی موسموں، لباسوں، زیوروں، میلوں ٹھیلوں وغیرہ کی تفصیل ملتی ہے اور جس تہذیب و تمدن کا ان مسلمان شاعروں نے ذکر کیا ہے۔ اب وہ مسلمانوں کی تہذیب تھی جو یہاں کی تہذیب میں اس حد تک رنگ گئی تھی کہ یہ شناخت کرنا مشکل ہو گیا کہ کون سی اسلامی تہذیب ہے اور کون سی ہندو۔

وقت کی کمی کی وجہ سے اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کرنا ممکن نہیں ہے کہ اسلامی تہذیب نے ہندوستان کو کیا دیا اور انھوں نے ہندوستانی تہذیب سے کیا لیا۔ لیکن یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب کا بیشتر حصہ ہندوستانی تہذیب کے ان عناصر پر مشتمل ہے جو انھوں نے مقامی اثرات کے تحت اپنا لیے تھے۔ آج کے عام مسلمانوں اور بالخصوص قصبات اور دیہاتوں کے مسلمانوں کے رسم و رواج، توہمات اور خانگی زندگی کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ان پر اسلامی زندگی کی گہری چھاپ ہے۔

مسلمانوں نے غیر شعوری طور پر ہندوؤں کی تقلید کی جو ذات پات کی تفریق کے تصوّر کے قائل ہیں۔ اگرچہ مسلم صوفیاء اور علماء اصولی طور پر اس طرح کی تفریق کے مخالف تھے لیکن مقامی اثرات مذہبی تصورات پر غالب آ کر رہے میں مسلمانوں میں سید، مغل، پٹھان اور شیخ کی تفریق اسی کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح دینیات، تفسیر، علم کلام اور تصوف پر بہت سے ہندوستانی اثرات ہیں۔ عربی اور فارسی ادب میں آپ کو ایسے عناصر مل جائیں گے جو خالص ہندوستانی ہیں۔

ڈاکٹر تارا چند (ماہنامہ جامعہ، جون ۱۹۶۵ء)

پروفیسر عبدالسلام
ترجمہ: شہاب الدین انصاری

طُلیطلہ سے تری الیسٹ تک

تجدید عہد

آج سے ۷۶۰ برس پہلے اسکاٹ لینڈ کا ایک نوجوان جس کا نام میکائیل تھا اپنے وطن سے جنوب میں واقع اسپین کے شہر طلیطلہ کے سفر پر روانہ ہوا۔ وہ طلیطلہ اور قرطبہ کی عرب یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ یہ وہ یونیورسٹیاں تھیں جہاں عہد وسطی کا مشہور یہودی النسل مفکر موسیٰ بن میمون ایک نسل پہلے معلم رہ چکا تھا۔

میکائیل طلیطلہ ۱۲۱۷ء میں پہونچا تھا اور وہاں پہونچکر اس نے لاطینی یورپ کو ارسطو سے روشناس کرانے کا بیڑا اٹھایا۔ اس نے ارسطو کی کتابیں یونانی زبان سے نہیں ترجمہ کیں کیونکہ وہ یونانی زبان سے ناواقف تھا۔ اس نے اپنے ترجمے اُن عربی متون سے کئے جو اس زمانے میں وہاں پڑھائے جاتے تھے۔ میکائیل طلیطلہ

پروفیسر عبدالسلام مشہور سائنس داں جنھیں ۱۹۷۹ء کا فزکس میں نوبل انعام ملا اور یہ پہلے مسلمان ہیں جنھیں یہ اعزاز حاصل ہوا ہے۔ پچھلے سال کے اواخر میں ہندوستان کے دورے پر تشریف لائے۔

جناب شہاب الدین انصاری، لائبریرین ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری جامعہ۔

طلیطلہ میڈرڈ سے جنوب مغرب میں اسپین کا ایک شہر ہے جو عربوں کے دور میں مشہور علمی مرکز تھا۔ تری الیسٹ اٹلی میں نظری طبعیات کا بین الاقوامی ادارہ ہے۔

سے سسلی آیا اور شہنشاہ فریڈرک ثانی کے دربار میں حاضر ہوا۔ سالرنو میں ایک طبی تعلیم کا مدرسہ تھا جسے فریڈرک نے ۱۲۳۱ء میں شاہی اجازت نامہ عطا کیا تھا۔ میکائیل جب اس طبی مدرسہ کو دیکھ رہا تھا تو وہاں اس کی ملاقات ڈنمارک کے طبیب ہنرک ہارپس ٹرائینگ سے ہوئی۔ ہنرک ہارپس ٹرائینگ آگے چل کر شاہ ایرک چہارم والڈر مازون کا شاہی طبیب مقرر ہوا۔ ہنرک ایک کتاب جراحت اور خون چڑھانے کے موضوع پر تصنیف کر رہا تھا اور وہ سالرنو اس خیال سے آیا تھا کہ یہاں اپنی کتاب مکمل کرلے گا کیونکہ اس کی کتاب کے ماخذ حکیم ابوبکر محمد بن زکریا الرازی اور حکیم ابن سینا کے قوانین طب تھے جن کا ترجمہ اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا میکائیل ہی کرسکتا تھا۔

تاریخ کے اس دور میں طلیطلہ اور سالرنو کے مدارس عربی، یونانی، لاطینی اور عبرانی زبانوں میں موجود علوم کا بہترین امتزاج پیش کر رہے تھے۔ یہ بین الاقوامی سائنسی اشتراک کا عمدہ نمونہ تھا۔ یہاں نہ صرف شام، مصر، ایران، افغانستان جیسے ترقی یافتہ ملکوں کے مفکر آتے تھے بلکہ مغربی دنیا کے اس دور کے اسکاٹ لینڈ اور اسکینڈے نیوین ممالک جیسے ترقی پذیر علاقوں کے عالم بھی آتے تھے۔ جس طرح آج سائنس کے میدان میں بین الاقوامی اشتراک کی کوششوں کی راہ میں بے شمار روکاوٹیں ہیں اسی طرح اس زمانے میں بھی تھیں۔ ان میں سے بڑی روکاوٹ دنیا کے مختلف ملکوں اور علاقوں کی معاشی اور علمی سطح کی نابرابری بھی تھی۔ اسکاٹ لینڈ کا باشندہ میکائیل یا ڈنمارک کے ہنرک ہارپس ٹرائینگ تو بس اکادکا ہی تھے۔ وہ اپنے ملک کے اندر قائم کسی بڑے تحقیقی ادارے کے نمائندے نہیں تھے۔ طلیطلہ اور سالرنو کے اساتذہ انھیں تعلیم دینے پر پورے طور پر آمادہ تھے لیکن اعلیٰ سائنسی تحقیق کے واسطے ان کی تعلیم وتربیت کی افادیت کے بارے میں سینکڑوں وسوسے رکھتے تھے۔ میکائیل کے استادوں میں سے ایک نے تو اس سے اسکاٹ لینڈ واپس جاکر بھیڑوں کا اون کاتنے اور اونی کپڑوں کے بُننے کا مشورہ دیا۔ سائنس کے میدان میں اس قسم کی

نابرابری کی غالباً میں بہت سی مثالیں دے سکتا ہوں۔ جارج سارٹن نے سائینس کی جو تاریخ پانچ جلدوں میں مرتب کی ہے اس میں اس نے سائینس میں کامیابی کی تاریخ کو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ہر دور پچاس برس کا ہے۔ ہر پچاس سالہ دور کے ساتھ اس نے سائینس میں اعلیٰ مقام رکھنے والی ایک شخصیت کا نام جوڑا ہے۔ ۴۵۰ سے لے کر ۴۰۰ ق۔م کا زمانہ عہد افلاطون ہے، اس کے بعد کی نصف صدی ارسطو کی ہے۔ اسی طرح اقلیدس، آرکمیڈیز، وغیرہ وغیرہ۔ ۶۰۰ عیسوی سے ۶۵۰ عیسوی تک کا دور چینی سائنسدان شین سانگ کا ہے اور ۶۵۰ عیسوی سے ۷۰۰ عیسوی تک ای چنگ کا۔ اس کے بعد ۷۰۰ عیسوی سے لے کر ۱۱۰۰ عیسوی تک ۴۰۰ برس کا ایک مسلسل دور ہے۔ اس لمبے عرصہ میں جابر بن حیان (م ۸۱۳ء)، محمد بن موسیٰ الخوارزمی (م ۸۳۵ء) ابوبکر محمد بن زکریا الرازی (م ۹۲۵ء) المسعودی (م ۹۵۶ء)، البوالوفا (م ۹۹۸ء)، البیرونی (م ۱۰۴۸ء)، ابن سینا (م ۱۰۳۷ء) اور پھر عمر خیام (م ۱۱۳۲ء) ہوئے۔ یہ سب اسلامی تہذیب کے پروردہ تھے اور ان میں سے کوئی عرب، کوئی ترک، کوئی افغان تو کوئی ایرانی النسل تھا۔

۱۱۰۰ء کے بعد مغربی دنیا کے سائینسدانوں کا دور ہے جن میں لیبرارڈ آف کریمونا، راجر بیکن، جیکب اناطولی پیش پیش ہیں، اگرچہ اب بھی ہمیں ان کے ساتھ ساتھ ابن رشد (م ۱۱۹۸ء) نصیر الطوسی (م ۱۲۷۴ء) اور ابن النفیس (م ۱۲۸۸ء) کے نام ملتے ہیں۔ ابن نفیس وہ شخص ہے جس نے سر ہاروے سے بھی پہلے خون کے دوران کے بارے میں لکھا ہے۔ افسوس کہ سائنس کی تاریخ لکھنے والا کوئی ایسا سارٹن نہیں ہوا ہے جو اسپین سے پہلے کے سائینسی خیالات ـــــ انکاس، مایا اور ازٹیکس تہذیبوں کی تاریخ لکھ سکے، جو یہ بتائے کہ صفر کی ایجاد کہاں اور کب ہوئی، جو چاند اور مریخ کی رفتار کی دریافت کا سراغ بتائے، جو یہ بتائے کہ ان کے مختلف النوع اثرات کس نے معلوم کئے اور کس نے تلاش کی۔ لیکن تلاش و تحقیق کی اس کہانی کا خاکہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس سے مختلف نہیں۔ یعنی اپنی ہم عصر مغربی دنیا کے مفکرین پر فوقیت۔

ہاں ۱۳۵۰ء کے بعد اس وقت کی ترقی یافتہ دنیا اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہے لیکن

اس کے باوجود مشرق کی تاریکی کے اس دور میں ہمیں کہیں کہیں چند شرارے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً سمرقند میں ۱۴۰۰ء کے آس پاس تیمور لنگ کے پوتے اولغ بیگ کا دربار یا ۱۷۲۰ء میں مہاراجہ جے سنگھ کا کارنامہ جب اس نے مغربی دنیا کے چاند گرہن اور سورج گرہن کے حساب کو بہ دلیل دائرہ کی ۶ منٹ جیسی بڑی غلطی کی گرفت کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ یورپ ٹیلیسکوپ کی ایجاد کی بدولت جلدی ہی جے سنگھ سے کہیں آگے نکل گیا۔ اس دور کے ایک ہندوستانی مورخ کے مطابق جے سنگھ کے چتا پر جلنے کے ساتھ ساتھ مشرقی دنیا سے سائینس بھی ختم ہوگئی۔ اس طرح ہم بیسویں صدی میں داخل ہوتے ہیں اور وہ گردش جو میکائیل کے سفر کے ساتھ شروع ہوئی تھی اپنا دائرہ پورا کر لیتی ہے اور اب آج کے ترقی پذیر ملکوں کے ہم جیسے لوگ ہیں کہ سائینسی تحقیقات کے لیے مغرب کا سفر کرتے ہیں۔

اس صدی میں فزکس کی دنیا میں ہماری ملاقات کی ابتدا ہندوستان کے سی۔ وی رمن سے ہوتی ہے جنھیں ۱۹۳۰ء کا نوبل انعام ملا تھا۔ اس کے بعد جاپان کے یوکاوا، توموناگا اور اے ساکی ہیں، پھر اس کے بعد چین سے ای یانگ اور ٹنگ ہیں اور ۱۹۷۹ء میں جزائر غرب الہند کے ڈبلیو آرتھر لیوس ہیں جنھیں معاشیات کا نوبل انعام دیا گیا۔

۱۱۰۰ برس پہلے ابوعمر محمد بن یوسف الکندی (م ۹۶۱ء) نے لکھا تھا "ہمارے لئے یہی صحیح ہے کہ ہم حق کے تسلیم کرنے میں پس وپیش نہ کریں اور وہ چاہے کسی سمت سے آیا ہو، اسے اپنانے سے گریز نہ کریں۔ اس شخص کے لیے جو حق کی تلاش کرتا ہے کوئی چیز سچ سے بڑھ کر حقیقت نہیں رکھتی اور حق کو تسلیم کر لینے سے نہ اس کے ظرف میں کمی آتی ہے اور نہ شخصیت میں۔" اس ضمن میں ہمیں یہ سوال ضرور کرنا چاہیئے کہ کیا آج ترقی پذیر ممالک ثابت قدمی کے ساتھ سائینس کے میدان میں اسی طرح نشاۃ ثانیہ کی راہ پر گامزن ہیں جس طرح مغرب، اسکاٹ لینڈ کے میکائیل کے دور میں تھا؟ ہماری بدقسمتی سے اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔

سائینس کے میدان میں اس نشاۃ ثانیہ کے لیے دو شرطیں ہیں، اول طلیطلہ اور سالرنو جیسے مقامات کی موجودگی جہاں بین الاقوامی قسم کی آمدورفت ہو رہی ہو، جہاں چراغ سے چراغ جل سکیں اور دوم یہ کہ ہمارے ترقی پذیر معاشرہ میں حصول علم اور علم کی ترویج کے کام کو دوسرے تمام کاموں پر فوقیت دی جائے جیسا کہ ہم جاپان میں مے ایجی انقلاب کے بعد دیکھتے ہیں جہاں دستور کی دفعات کی رو سے یہ دونوں شرطیں پوری ہوئیں۔

بدنصیبی سے سائینسی تحقیق کے لین دین کے مواقع دن بدن تیزی کے ساتھ کم ہوتے جارہے ہیں۔ انگلینڈ اور امریکہ میں دوسرے ملکوں سے آنے والے سائینسدانوں پر پابندیاں بڑھ رہی ہیں۔ اس رجحان سے ترقی پذیر ملکوں سے آنے والے طلبا بھی متاثر ہوتے ہیں۔ میرے تعلیمی دور میں کیمبرج میں سالانہ فیس ۷۰ پاؤنڈ تھی اور اب آئندہ سال میں یہ بڑھ کر ۳۵۰۰ پونڈ ہو جائے گی۔ اعلیٰ سطح پر سائینس کی تعلیم کے لئے بین الاقوامی اداروں کے زیر انتظام چلنے والی یونیورسٹیوں کی ضرورت کا احساس اب واضح ہو رہا ہے۔ یہ یونیورسٹیاں اپنے دائرہ کو تحقیقی کاموں تک محدود نہ رکھ کر جدید سائینسی علوم اور ٹکنالوجی کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کی اعلیٰ سطح کی تعلیم کا بندوبست کریں گی۔

سائینسی علوم کی نشاۃ ثانیہ کے لئے دوسری لازمی شرط پوری کرنے کے واسطے ترقی پذیر ممالک میں ایک اُمنگ، سائینس اور ٹکنالوجی کو فروغ دینے کی ایک لگن کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں ہر قسم کی سماجی پابندیوں اور رکاوٹوں کو ہٹا دینے کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے اس سلسلے میں بھی شگون بہت نیک نہیں ہے۔

آئیے پہلے سائینسی اور تکنیکی علوم کے حصول اور اس کی خصوصیات پر غور کریں۔ آج سے سترہ برس پہلے بین الاقوامی اٹیمک انرجی ایجنسی کی مجلس انتظامیہ نے ترقی پذیر ممالک میں سائینس کے سلسلے میں دو غلط رجحانات کی جانب اشارہ کیا تھا۔ یہ رجحانات ہیں ان ممالک میں سائینس کے معیار کی پستی اور ان ممالک کی سائینسی تحقیق کا بین الاقوامی سائینس کا حصہ نہ ہونا۔ ترقی پذیر ملکوں سے بڑے پیمانے پر سائینسدانوں کا مغرب کی جانب

مراجعت کا بڑا سبب ان ملکوں میں سائینسی تحقیق کے سلسلے میں تنہائی کا احساس ہے۔

اس تنہائی کو ختم کرنے اور ترقی پذیر ممالک کے لئے اعلیٰ سطح کے سائنسداں مہیا کرنے کی غرض سے ۱۹۶۴ء میں پہلا قدم اٹھایا گیا جب یونسکو، حکومت اٹلی اور تری ایست شہر کے تعاون اور امداد سے نظری طبعیات کا ایک بین الاقوامی ادارہ تری ایست میں قائم ہوا۔ ۱۹۷۰ سے یونسکو اس ادارہ کو چلانے میں برابر کے حصہ دار کی حیثیت سے شریک ہوا۔ پچھلے پندرہ سال کے عرصہ میں جب سے یہ ادارہ عالم وجود میں آیا ہے، یہاں نظری فزکس سے ہٹ کر نظری اور عملی فزکس کے ملتے ہوئے ڈانڈے کے موضوعات پر تحقیق کے کاموں پر زور دیا جا رہا ہے اور ایسے موضوعات مثلاً مادّہ، انرجی، فیوزن، ری ایکٹر اور سورج اور ایسے ہی دوسرے غیر رواجی ذرائع سے اِنرجی حاصل کرنے کی طبعیات، ارضیات کی طبعیات، لیزر فزکس، ریگستان اور سمندر کی طبعیات، تشریح نظام کائنات وغیرہ زیر تحقیق ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ اعلیٰ سطح کی انرجی کی طبعیات، کوانٹیم کشش، خلائی سیارے، ایمٹی اور نیوکلیائی فزکس اور عملی ریاضی پر بھی کام ہو رہا ہے۔

نظری اور عملی طبعیات کے ملے جلے موضوعات پر تحقیق کی جانب رجحان کی وجہ یہ نہ تھی کہ ہم لوگ ترقی پذیر ملکوں کے لئے نظری طبعیات کی اہمیت کو کم سمجھتے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ترقی پذیر ملکوں کو ایسی تکنیکی معلومات کی جو فزکس کی تحقیق سے ملتی ہیں شدید ضرورت ہے اور اس کی جانب توجہ کرنے کے لئے کوئی دوسرا بین الاقوامی سطح کا ادارہ نہ پہلے موجود تھا اور نہ اب ہے۔ اس کی سب سے اہم مثال طبعیات اور انرجی کے میدان میں تحقیق کا کام ہے۔

آج کے دور کے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ انرجی کی فراہمی ہے۔ ایک کے بعد دوسرے ملک میں اِنرجی کی ضرورت پر غور کرنے کے لئے نئے شعبے کھولے جا رہے ہیں یا ان ملکوں میں موجود ایمٹی انرجی کے شعبوں کو وسعت دے کر انھیں انرجی کے جملہ ذرائع پر غور کرنے کے شعبے کی شکل دی جا رہی ہے۔ تری ایست کا ادارہ بھی اب اس

بات پر تیار ہو گیا ہے کہ وہ طبعیات اور انرجی کے جملہ پہلوؤں پر غور کرنے کے لئے اپنے تحقیق کے دائرہ کو وسعت دے۔ دوسرے لفظوں میں اب اس کے دائرہ میں نہ صرف نیوکلیائی انرجی کے ری ایکٹر اور فیوزن آتے ہیں بلکہ شمسی انرجی کی طبعیات اور اس کے ساتھ ساتھ اخراج اور جذب کرنے والی سطح اور فوٹو وولٹائیکس اور انرجی کے نظام کا ریاضیاتی مطالعہ بھی شامل ہیں۔

اس ادارہ کے تحت ہر سال تحقیق کے کاموں کے ایک قلیل المدتی مذاکرے اور تحقیقی کاموں کے ایک توسیعی کالج میں شرکت کے لئے ۱۲۰۰ ماہرین طبعیات تری ایست میں جمع ہوتے ہیں جن میں نصف دنیا کے ۹۰ ترقی پذیر ملکوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ یہ لوگ یہاں دو مہینے یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ گذارتے ہیں۔ اسی طرح اس ادارہ نے رفقاء (فیلوشپس) کا نظام مرتب کیا ہے جس کے تحت ترقی پذیر ملکوں سے اعلیٰ ماہرین طبعیات یہاں آکر چھ ہفتے سے لے کر تین مہینے تک رہ سکتے ہیں اور یہ قیام ۶ برس کے عرصے میں تین بار کیا جا سکتا ہے تاکہ یہ لوگ اپنے شعبۂ علم کی قدآور شخصیتوں کے ساتھ ایک ہمت افزا ماحول میں کچھ وقت گذار کر اپنی صلاحیتوں کو نئی توانائی بخش سکیں۔

آج کل یہاں ۷۰ ایسے رفقاء کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر افراد کی مالی اعانت سویڈن کی ایجنسی برائے ترقیات کرتی ہے۔ چند افراد کی امداد ڈنمارک کی حکومت کر رہی ہے۔ ترقی پذیر ملکوں کے ۲۵ طبعیات کے سائینسی ادارے ہمارے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ اس طرح ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں میں طبعیات اور ماہرین طبعیات کی برادری کو اس ادارہ نے ایک نیا استحکام دیا ہے، لیکن بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی کی یہ خواہش کہ ایسے ہی مراکز تجرباتی طبعیات، علم کیمیا اور ری ایکٹر انجینیرنگ کے شعبوں میں بھی قائم کئے جائیں، عمل کا جامہ نہیں پہن سکی ہے۔

پچھلے پندرہ برسوں میں جب سے میں یہاں ڈائریکٹر ہوں میرے اندر گھٹن کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ شروع شروع میں مجھے خوشی تھی کہ میں اپنا آدھا

وقت تحقیق کے کاموں میں لگاتا ہوں اور آدھا انتظامی امور کی نگرانی میں۔ لیکن گذشتہ پانچ برسوں سے تقسیم کار کا یہ امکان ختم ہوتا جارہا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ انتظامی معاملات زیادہ دقت طلب ہو گئے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مرکز کی حیثیت بین الاقوامی مراکز کے موجودہ ماحول میں غیر یقینی ہو گئی ہے۔ اور یہ بات اس وقت ہوئی ہے جبکہ اس کی کامیابی واضح ہو چکی ہے اور اس کی ضرورت کا احساس پیدا ہو چکا ہے۔ سال بہ سال اس کی بقا خطرہ میں پڑتی جارہی ہے۔ یہاں کوئی سائینسی عملہ لمبے عرصہ کی ملازمت کا نہیں ہے، اس کی فیکلٹی مختصر مدت کے واسطے رضا کارانہ طور پہ کام کرنے والے حضرات پر مشتمل کمیٹیاں ہیں۔ ۲۰۰ افزکس کے اساتذہ کے انتظامی معاملات کی دیکھ بھال کے واسطے صرف ایک ایڈمنسٹریٹر اور ۱۸ سکریٹری ہیں اور گذشتہ سال اس مختصر اسٹاف میں بھی کمی کرنی پڑی۔

تری ایسٹ کا مرکز مستقبل میں سائینس کے میدان میں بین الاقوامی سطح پر تعاون کے لئے بلاشبہ ایک مثالی مرکز ہے، خاص طور پر ترقی پذیر ممالک کے لئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پذیر ملکوں کو ایسے مراکز کی ضرورت ہے، لیکن جس طرح کا استحکام گیہوں یا چاول کی تحقیق پر کام کرنے والے اداروں کو حاصل ہے یا جو استحکام نظری طبعیات کی تحقیق کے تری ایسٹ کے مرکز کو حاصل ہے، اسی طرح کے استحکام کی ضرورت ان مراکز کو بھی ہے۔ بین الاقوامی تعاون کے بغیر سائنس کا فروغ ممکن نہیں۔ ایسے ادارے خاص طور پر جب وہ ادارۂ اقوام متحدہ کے تحت ہوں اعلیٰ معیار کی، نئے تصورات اور خیالات کو اپنانے کی اور تخلیقی ذہن کی مدد سے سائینس اور ٹکنالوجی کو دوسروں تک منتقل کرنے کی ضمانت ہیں ـــــ ایسے تخلیقی ذہن جو ان مراکز میں خدمتِ خلق کے جذبہ کے تحت آتے ہیں اور جو دوسری جگہوں پر انھیں مل سکنے والی تنخواہ کے مقابلہ میں بہت قلیل معاوضہ پر کام کرتے ہیں۔ اگر ایسے مرکز ترقی پذیر ملکوں میں قائم کئے جائیں تو اس بات کا بہت امکان ہے کہ تخلیقی ذہن کے لوگ ترقی پذیر علاقوں کی طرف آئیں گے اور ترقی پذیر ملکوں کے ذہین انسانوں کا سفر مغرب کی طرف رک جائے گا۔

فرانس نے ترئی الیست کی مثال کی تقلید کرتے ہوئے گذشتہ برس نیس کے مقام پر ریاضیات کا ایک بین الاقوامی مرکز قائم کیا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں میکسیکو میں بین اقوامی حیثیت کا علم طبعیات کا ایک قومی مرکز قائم ہوا ہے۔ سری لنکا میں بنیادی تحقیقات کا بھی ایک مرکز حکومت سری لنکا نے قائم کیا ہے۔ برازیل متبادل توانائی کے مرکز کے قیام کے بارے میں غور کر رہا ہے۔ اور پیرو کان کنی کی ٹکنالوجی کا ادارہ قائم کرنے والا ہے۔ کولمبیا میں فوٹو ولٹائیکس کا ادارہ اور وینیز ویلا میں پٹرولیم ٹکنالوجی کا بین الاقوامی ادارہ بن رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ متحدہ اقوام کی نوعیت کے دوسرے ادارے مثلاً یونسکو، انٹرنیشنل اٹیمک انرجی ایجنسی اور یو۔این۔ او کی تنظیم برائے صنعتی ترقی وغیرہ کو اس معقول تحریک کی بلاواسطہ یا بالواسطہ ضرور امداد کرنی چاہیئے۔ سائنس کے میدان میں دنیا کے تمام ملکوں کا اشتراک باہمی ہی سب کچھ نہیں ہے، لیکن یہ اس کا ایک اہم حصہ ضرور ہے۔

سائنس کے سلسلے میں بھی، دوسرے معاملات ہی کی طرح، دنیا امیر اور غریب میں بٹی ہوئی ہے۔ خوشحال نصف علاقے میں شمالی کرہ کے صنعتی ممالک اور کمیونسٹ نظام کے تحت آنے والی انسانی برادری کا شمار ہوتا ہے۔ اس علاقے کی سالانہ آمدنی ۵ ٹریلین* ڈالر (۵۰ کھرب ڈالر) ہے اور یہ اپنی آمدنی کا ۱۰۰ بیلین* ڈالر (۱۰۰ ارب ڈالر) غیر دفاعی سائنس کی تحقیق و ترقی پر خرچ کرتا ہے۔ دوسرے نصف علاقے میں جنوب کا پسماندہ علاقہ ہے جس کی آمدنی امیر علاقہ کی آمدنی کا $\frac{1}{5}$ حصہ ہے۔ یہ علاقے سائنس اور ٹکنالوجی پر ۲ بیلین ڈالر (۲ ارب ڈالر) سے زیادہ نہیں خرچ کرپاتے۔ امیر ملکوں کے فیصد کے معیار کے مطابق انھیں اس رقم کا دس گنا سائنس کی تحقیق و ترقی کی مد پر خرچ کرنا چاہیئے۔ ۱۹۷۹ء میں سائنس اور ٹکنالوجی کے موضوع پر بین الاقوامی

---

* ٹریلین (۱۰۰۰ ... ...) ایک پر بارہ صفر کو کہتے ہیں اور بیلین (۱۰۰۰ ... ...) ایک پر نو صفر کو کہتے ہیں یہ امریکی اصطلاح ہے۔

ادارہ کی جانب سے منعقد دیا نا کانفرنس میں غریب ملکوں نے یہ گذارش کی تھی کہ سائینس کی تحقیق و ترقی کی مد پر خرچ ہونے والی رقم کی مقدار بین الاقوامی امداد کی مدد سے بڑھا کر ۴ ارب ڈالر کردی جائے لیکن اُن ملکوں سے صرف وعدہ کیا گیا اور وہ وعدہ بھی اس رقم کے ساتویں حصے کے برابر امداد کا ۔ انھیں آخر میں اس سے بھی کم رقم ملنے کا امکان ہے۔

اب میری اپیل دنیا کے ملکوں کے مندرجہ ذیل تین طبقوں سے ہے:

۱۔ ترقی پذیر ملک : سب کچھ کہہ لینے کے بعد بھی اس علاقے کے ملکوں میں سائینس اور ٹکنالوجی کی توسیع و ترویج خود انھیں کی ذمہ داری ہے ۔ اُن کے سائنسداں ان کا قیمتی سرمایہ ہیں ۔ انھیں مواقع ملنے چاہئیں ۔ ابھی تک اُن کی مختصر تعداد کا بھی پورا مصرف نہیں ہوا ہے ۔لیکن ہمارا مقصد اس تعداد کو بڑھا کر اسے دس گنا کرنا ہے۔ اسی طرح سائینس کی تحقیق و ترقی پر خرچ ہونے والی ۲ ارب ڈالر کی رقم کو بڑھا کر ۲۰ ارب ڈالر کیا جائے۔ سائینس کوئی سستی چیز نہیں اور ٹکنالوجی میں ترقی سائینس کے بغیر ممکن نہیں ۔ سمٹسن یونیورسٹی کے ایک ترک استاد طبعیات نے حال ہی میں بتایا کہ ترکی میں سلطان سلیم ثالث نے الجبرا، ٹرگنامیٹری، میکینکس، بالسٹکس اور ٹیلرجی کی تعلیم کا بندوبست ترکی میں کیا تھا اور سویڈن اور فرانس سے اساتذہ کو بلایا گیا تھا جنھیں خاص قسم کے تعلیمی مراکز میں ملازم رکھا گیا ۔ سلطان سلیم کی خواہش ترکی افواج کو جدید آلات و ہتھیار سے لیس کرنا اور اس مقصد کے لئے بندوق سازی اور توپ سازی کے فن میں یورپ کے دوسرے ملکوں کی ہمسری کرنا تھا لیکن چونکہ اس کے لئے متعلقہ موضوعات پر تحقیق کے کاموں پر ضرورت کے مطابق توجہ نہیں دی گئی اور ترکی کی اعلیٰ سطحی درسگاہوں کے ارباب حل و عقد جو خود کو سائنس داں کہتے تھے ، ان نئے قائم شدہ تعلیمی مراکز کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اس لئے ترکی اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہا ۔ ٹکنالوجی کو اگر سائنس کا سہارا نہ ملے تو کچھ عرصہ بعد اس میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے ۔

۲۔ بین الاقوامی برادری : اس برادری میں حکومتیں ، میرے رفیق سائنس داں اور

اقوام متحدہ کی ایجنسیاں شامل ہیں ۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے لحاظ سے صاحب حیثیت اور تہی دست گروہوں میں منقسم دنیا زیادہ دنوں نہیں قائم رہ سکتی ۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ۹۰ ترقی پذیر ملکوں کے اعلیٰ طبعیات کے ماہرین کے واسطے نظری طبعیات میں تحقیق کے لیے صرف ایک ادارہ ہے جو بین الاقوامی سطح پر قائم ہے، یعنی تری ایست بین الاقوامی مرکز برائے نظری طبعیات ۔ اس کا کل بجٹ ۱۸ لاکھ ڈالر ہے ۔ اس کا مقابلہ یورپی ممالک کے صرف طبعیات کی تحقیق کے لئے مشترکہ منصوبوں سے کیجئے جہاں سالانہ ۵۰۰ ملین ڈالر خرچ ہو رہا ہے ۔ یا اس کا مقابلہ صرف ایک نیوکلیائی آبدوز کشتی سے کیجئے جس پر ۱،۸ ارب ڈالر خرچ آتا ہے، یعنی صرف ایک نیوکلیائی آبدوز کشتی کا خرچ تری ایست جیسے ایک ہزار مراکز کے ایک سال کے خرچ کے برابر ہے ۔ دنیا کے سمندروں میں آج ۲۵۰ آبدوز کشتیاں دوڑ رہی ہیں ۔ بے حسی کے اس ماحول کو کسی نہ کسی مقام پر اور کسی نہ کسی صورت میں ٹوٹنا چاہیئے ۔

۳ ۔ اوپیک* ملکوں سے : فروری ۱۹۷۹ء میں وینزویلا کے صدر نے اوپیک ملکوں کے واسطے بین الاقوامی سطح پر سائنسی تحقیق کے ایک مرکز کے قیام کا ذکر کیا تھا ۔ میں اپنی آواز اوپیک ملکوں کی برادری میں شریک اپنے اسلامی بھائیوں تک پہونچانا چاہتا ہوں ۔ ان میں سے کچھ کو اللہ نے بے پناہ دولت دی ہے ان کی سالانہ آمدنی ۱۰۰ ارب ڈالر ہے ۔ سائنس کی تحقیق پر خرچ ہونے والی رقم کے بین الاقوامی معیار کے مطابق انھیں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحقیق پر ایک ارب ڈالر سے لیکر ۲ ارب ڈالر تک خرچ کرنا چاہیئے ۔ اُن کے مورثین اعلیٰ بین الاقوامی سائنسی تحقیقات کے میدان میں چراغ راہ تھے ۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے بیت الحکمت جیسے ایک عظیم ادارہ کی بنیاد رکھی تھی جہاں ہر شعبۂ علم کے عالموں کا قافلہ عرب، ایران، ہندوستان، ترکی اور بازنطین سے آکر اُترتا تھا ۔ میں ان لوگوں سے ایک بار پھر اسی فراخ دلی کا مظاہرہ کرنے کی اپیل کرتا ہوں ۔ اگر دوسرے

---

* تیل اور پٹرولیم کی برآمد کرنے والے ملکوں کی برادری

لوگ امداد کے لئے خرچ نہ بھی کرنا چاہتے ہوں تو بھی آپ سائنس کی تحقیق کے کام پر اربوں ڈالر خرچ کیجئے ــــ ترقی پذیر ملکوں میں سائنس کی ترویج کے لئے ایک فنڈ قائم کیجئے تاکہ ان ملکوں میں رہنے والے کسی بھی اعلیٰ صلاحیت کے سائنسداں کی صلاحیت ضائع نہ ہو۔ اس فنڈ کو شروع کرنے کے واسطے میرا حقیر چندہ وہ ساری پونجی ہوگی جو اس وقت میرے پاس ہے، یعنی وہ تمام انعامی رقم جو نوبل فاؤنڈیشن نے اپنی فراخ دلی کا مظاہرہ کرکے مجھے دی ہے۔ ربّنا تقبّل منّا۔

(بلیٹن آف اٹیمک سائنٹسٹس کے شکریہ کے ساتھ)[1]

۱۔ یہ مضمون مذکورہ رسالے کے ستمبر ۱۹۸۰ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

عبداللطیف اعظمی

مولانا آزاد کی ۲۳ ویں برسی

مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات کو امسال ۲۲ فروری کو ۲۳ سال ہوگئے۔ ان کی یاد ہر سال ان کے عقیدت مند کسی نہ کسی انداز میں منانے کی کوشش کرتے ہیں، اس سال مرحوم کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے خود مولانا آزاد کی وہ کتاب ہے جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز سے "البیرونی اور جغرافیۂ عالم" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کو دیکھ کر لکھنؤ سے مولانا کے ایک عقیدت مند نے اپنی مسرت کا اظہار کیا ہے اسی کے ساتھ اپنی مایوسی اور شکایت کا اظہار بھی کیا ہے کہ مولانا کی یاد میں کوئی ٹھوس کام نہیں ہو رہا ہے، ان کی خواہش ہے کہ مولانا کی یاد میں جو سرکاری اور غیر سرکاری ادارے قائم کئے گئے ہیں انھیں بہت کچھ کرنا چاہیئے، خاص طور پر مولانا آزاد کی جو کتابیں ختم ہوگئی ہیں ان کو دوبارہ شائع کرنا چاہیئے اور ان کے مضامین اور خطبات کو دوبارہ مرتب کرکے شائع کرنے کی جو تجویز ساہتیہ اکیڈمی کے سامنے تھی اس کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ موصوف کی مایوسی اور شکایت دونوں بڑی حد تک درست ہیں اور ان کی آواز مولانا کے تمام عقیدت مندوں کی آواز ہے مگر اسی کے ساتھ یہ سمجھنے کی بھی ضرورت ہے کہ اگر ان کے اور ہمارے حوصلے اور خواہش کے مطابق کام نہیں ہو رہا ہے تو اس کے بھی کچھ اسباب ہیں، محض غفلت اور لاپرواہ نہیں ہے۔

مولانا آزاد کی یاد میں، ایک سرکاری ادارہ آزاد بھون قائم ہے جو مولانا کی یاد میں ہر سال مولانا آزاد میموریل لکچر کا انتظام کرتا ہے، اس کے علاوہ ساہتیہ اکیڈمی نے مولانا کی کتابوں کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داری لی ہے اور اب تک متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، البتہ ادھر

کئی سال سے کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ دلی ہی میں عرصے سے ایک مولانا ابوالکلام آزاد اسٹڈی فورم قائم ہے، جس کے بانی صدر پیرزشتاق احمد صاحب ہیں۔ اسی طرح لکھنؤ میں کئی سال سے مولانا ابوالکلام آزاد اکیڈمی قائم ہے جس کے سرپرست یا صدر آج کل مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہیں۔ عرصہ ہوا اس کے زیر اہتمام مولانا آزاد پر دو کتابیں شائع ہوئی ہیں اور اس وقت عربی سے ایک کتاب کا ترجمہ ہو رہا ہے جو مولانا آزاد کی شخصیت اور خدمات پر ایک مصری عالم کا تحقیقی مقالہ ہے۔ مولانا علی میاں کی یہ بھی خواہش اور کوشش ہے کہ مولانا کی تفسیر ترجمان القرآن کی تلخیص اور ترجمہ عربی میں شائع کیا جائے۔ مولانا آزاد کی یاد میں ایک ادارہ آزاد انسٹی ٹیوٹ کے نام سے کراچی میں بھی قائم ہے جس کے سکریٹری اور بانی ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری ہیں۔ انھوں نے بھی مولانا آزاد پر متعدد کتابیں لکھی اور شائع کی ہیں، امسال بھی موصوف کی کوشش سے، برصغیر ہند و پاک کے مشہور ادیبوں کے مضامین کا ایک مجموعہ: "مولانا آزاد اور ان کے ناقد" کے نام سے ۲۲ فروری کو شائع ہوا ہے، جس کے مرتب ایم۔ اے شاہد صاحب ہیں، ان مضامین میں مولانائے مرحوم کے ذاتی اوصاف اور ملکی، سیاسی، مذہبی اور علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مرحوم کے دفاع اور حمایت میں معترضین اور ناقدین کے جوابات دئے گئے ہیں۔ ہندوستان کے جن ادیبوں کے مضامین شامل ہیں، ان میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحوم، پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم، مولانا عبدالماجد دریاآبادی مرحوم، مولانا سید ابوالحسن ندوی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شروانی جن کا ایک مضمون مولانا کے بارے میں اس شمارے میں شامل ہے۔ اور پاکستانی ادیبوں میں، مولانا غلام رسول مہر، مولانا امین احسن اصلاحی اور ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری قابل ذکر ہیں۔ بالکل شروع میں مولانا نصراللہ خاں عزیز مرحوم اور جناب شورش کاشمیری مرحوم کی نظمیں شامل ہیں۔ اول الذکر نظم کا عنوان ہے: "امام الہند"، اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اے امام محترم! اے رہبر عالی مقام! — علم و تدبیر و سیاست ہیں ترے در کے غلام
تری تحریر و خطابت نازش اسلام ہے — تیرا ہر اک لفظ گویا پارۂ الہام ہے

عزم تیرا کوہ پیکر، حزم تیرا بے مثال ۔۔۔ صدق تیرا ہے عدیل اور عدل تیرا لازوال
تجھ پہ کھولا حق نے راز معنی ام الکتاب ۔۔۔ فیض ہے روح القدس کا جس سے تو ہے فیضیاب

آخری شعر ہے :

غیر مسلم کو بھی تیرے عدل پر ہے اعتبار ۔۔۔ ہند بھر میں اسلام کا تیرے سبب سے برقرار

جناب شورش کی نظم : "ابوالکلام آزاد" کے چند شعر ملاحظہ ہوں :

عشق میں رومی، فکر میں رازی، عزم کا منبع، جہد کا حامل
حسنِ عمل کا گوہر یکتا، علم و نظر کا جلوۂ کامل
اس کی روش سے گردشِ دوراں اپنے کیے پر آپ پشیماں
اس کی صدا سے سربگریباں، شورشِ گیتی، لشکرِ باطل
اس کی روانی گنگ و جمن میں، اس کی کہانی دار و رسن میں
اس کی سیادت جادہ جادہ، اس کی قیادت منزل منزل

آخری شعر :

بت خانے کے طاق میں شورش، شمعِ حرم کو دیکھ رہا ہوں
صحنِ چمن میں شام کو جیسے دورِ خزاں میں شورِ عنادل

کراچی کے ایک ماہنامے کے ایڈیٹر، جو اب مرحوم ہو چکے ہیں، مولانا آزاد کے پیچھے پڑے رہتے تھے۔ ان کے ایک مضمون کے جواب میں مولانا امین احسن اصلاحی کا ایک مختصر مضمون اس کتاب میں شامل ہے، اس میں ایک جگہ فاضل مضمون نگار نے بڑے پتے کی بات کہی ہے، وہ یہ کہ : "مولانا آزاد میں [جو] بڑائیاں اور خوبیاں تھیں، وہ یہ نہیں تھیں کہ وہ بہت بڑے باپ کے بیٹے یا کسی بہت بڑی درگاہ سے نسبت رکھنے والے تھے، بلکہ یہ ساری خوبیاں ان کی ذاتی خوبیاں تھیں اور وہ اتنی شاندار تھیں کہ ان کے بدتر سے بدتر حاسد بھی ان کا انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ مولانا آزاد نے دوسروں کی نسبت سے خود شرف حاصل نہیں کیا، بلکہ اپنی نسبت سے دوسروں کو شرف بخشا۔"
(صفحہ ۳۷)

قرآن خوانی، خراجِ عقیدت اور نمائش

حسبِ معمول ۲۲ فروری کو مولانا آزاد کے مزار پر اسٹڈی فورم کی طرف سے قرآن خوانی کا انتظام کیا گیا اور ایک جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اور دوسرے رہنماؤں کے پیغامات پڑھے گئے۔ مسز گاندھی نے فرمایا کہ: "مولانا آزاد جدید ہندوستان کے معماروں میں سے تھے اور ان کی دیانتداری اور سیکولر خیالات ہم سب کے لیے شمعِ راہ ہیں۔" مسز ارونا آصف علی کے مولانا آزاد سے گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے، انھوں نے اپنے پیغام میں فرمایا کہ مولانا آزاد ایک بیدار مغز سیاست داں اور ممتاز اسکالر تھے اور انھیں ملک کی آزادی بہت عزیز تھی، اس موقع پر خورشید عالم خاں صاحب وزیر مملکت برائے کامرس اور میر مشتاق احمد صاحب نے بھی خراج عقیدت پیش کیا۔ روزنامہ قومی آواز (دلی ایڈیشن) نے ۲۲ فروری کے شمارے میں مولانا آزاد کی وہ تاریخی تقریر شائع کی جو انھوں نے ۱۹۴۷ء میں دلی کی جامع مسجد میں کی تھی۔

مولانا کی اس برسی کے موقع پر نیشنل آرکائیوز آف انڈیا (نئی دہلی) نے "مولانا آزاد اور کیبنٹ مشن" کے عنوان سے ایک نمائش کا انتظام کیا تھا جو ۲۰ سے ۲۸ فروری تک پبلک کے لیے کھلی ہوئی تھی۔ اس نمائش میں مشن سے متعلق فوٹو، انگریزی اخبارات کے تراشے اور مولانا آزاد اور وائسرائے کے متعدد خطوط کی نقلیں لگائی گئی تھیں۔ نمائش کے بارے میں آرکائیوز کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید اکبر علی ترمذی صاحب کا ایک تعارف نامہ بھی تقسیم کیا گیا تھا جس میں بہت مفید معلومات درج ہیں اور اس نمائش کے مطالعہ سے مولانا آزاد کی عظمت ابھر کر سامنے آتی ہے اور انھوں نے اس موقع پر جس طرح ہندوستان کی نمائندگی اور وفد کی قیادت کی ہے، وہ بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

مولانا آزاد اور کیبنٹ مشن

ہندوستان کی تاریخ آزادی میں ۱۹۴۶ء کے نصف اول کا زمانہ بڑی اہمیت رکھتا

ہے ۔یہی وہ زمانہ ہے جب برطانوی کیبنٹ مشن آیا، ہندوستان کے قومی رہنماؤں سے باتیں ہوئیں، مختلف اسکیمیں پیش ہوئیں، ان پر بحثیں ہوئیں، ایسے ایسے نشیب و فراز آئے کہ کبھی بڑی خوش آیند توقعات پیدا ہوتی تھیں اور کبھی انتہائی مایوسی ہوتی تھی، مگر بالآخر تقریبًا پانچ ماہ کی بحث و گفتگو کے بعد ایک اسکیم منظور کرلی گئی اور کیبنٹ مشن برطانیہ واپس چلا گیا۔ یہ نمائش دیکھ کر یہ پورا زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ تاریخوں اور واقعات کی روشنی میں آیئے ایک نظر اس دور پر ڈال لیں :

۱۸ فروری ۱۹۴۶ء کو برطانوی وزیر اعظم مسٹر کلیمنٹ اٹیلی نے اعلان کیا کہ ہندوستان کی آزادی کے سوال پر گفت و شنید کرنے کے لیے حکومت برطانیہ ایک کیبنٹ مشن بھیجے گی جس میں وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس، تجارتی بورڈ کے پریذیڈنٹ سر اسٹیفرڈ کرپس اور محکمۂ بحر کے پہلے لارڈ، اے۔ وی الگزنڈر شامل ہوں گے ۔ اس اعلان کے فورًا بعد ایسوسی ایٹڈ پریس کے ایک نمایندے نے کانگریس صدر مولانا آزاد سے سوال کیا کہ برطانیہ کے اس فیصلے کے بارے میں ان کا ردّ عمل کیا ہے؟ مولانا نے جواب دیا کہ : "مجھے خوشی ہے کہ لیبر حکومت نے ایک فیصلہ کن قدم اٹھایا ہے، مجھے اس کی بھی مسرت ہے کہ سر اسٹیفرڈ کرپس بھی مشن کے ایک رکن ہوں گے، وہ ہم سے گفتگو کر چکے ہیں، اس لیے ایک پرانے دوست کی طرح ہیں ۔"

اس نمائش میں ایک خفیہ رپورٹ کی نقل بھی پیش کی گئی جس میں یوپی گورنمنٹ کے چیف سکریٹری ایچ۔ جے۔ فرامپٹن (FRAMPTON) نے اپنی پندرہ روزہ خفیہ رپورٹ میں فروری ۱۹۴۶ء کے آخر میں حکومت ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ کے سکریٹری، اے۔ ای۔ پورٹر کو اطلاع کی ہے کہ: "آزاد اور قوم پرور مسلمانوں نے مشن میں سر اسٹیفرڈ کرپس کی شمولیت کا خیر مقدم کیا ہے ۔" اس رپورٹ میں یہ بھی ہے کہ: "مشن اور غذائی صورت حال دونوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، قوم پرور حلقے مطالبہ کرنا چاہتے ہیں کہ فوری طور پر آزادی کا اعلان کیا جائے اور عارضی قومی حکومت تشکیل دی جائے ۔"

۱۵ مارچ کو دارالعوام میں مسٹر اٹیلی نے ہندوستان کی سیاسی صورت حال کے

بارے میں ایک بیان دیا جس میں انھوں نے مولانا آزاد کے الفاظ میں یہ تسلیم کیا کہ: حالات بالکل بدل گئے ہیں اور ان پر ایک نئے نقطۂ نظر سے غور کرنا ضروری ہو گیا ہے۔"

۲۴ مارچ کو کیبنٹ مشن دہلی پہنچا۔ (مولانا آزاد نے "ہماری آزادی" میں ۲۳ مارچ لکھا ہے۔ صفحہ ۲۸۱) مولانا اس وقت کلکتہ میں تھے، انھوں نے سر اسٹیفرڈ کرپس کو ایک دستی خط بھیجا جس میں "ان کے دوبارہ ہندوستان آنے پر ان کا خیر مقدم کیا۔" یکم اپریل کو مشن گاندھی جی سے ملا، دوسرے دن ۲ اپریل کو نوابوں، مہاراجوں اور حزب اختلاف کے لیڈروں، سندھ کے جی۔ ایم سید، پنجاب کے نواب آف ممدوٹ اور آسام کے سر محمد سعد اللہ سے ملا۔ اسی تاریخ کو یعنی ۲ اپریل کو مولانا آزاد کلکتہ سے دہلی پہنچے اور ۶ اپریل کو مشن سے ملاقات کی اور اپنی اس ملاقات کی تفصیلات سے ۱۲ اپریل کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کو آگاہ فرمایا۔ مولانا نے لکھا ہے: "میں نے فرقہ وارانہ مسئلے کا جو حل پیش کیا تھا، اس کو میں نے کافی تفصیل سے بیان کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب گاندھی جی اور دوسرے ساتھیوں کو میری اس اسکیم پر گفتگو کا موقع ملا۔ ورکنگ کمیٹی کو شروع میں اس حل کے بارے میں بہت سے شکوک تھے، چنانچہ ممبروں نے طرح طرح کی دقتیں اور شبہات بیان کئے، میں نے ان کے اعتراضات کے جواب دئے اور جو پہلو صاف نہیں تھے، ان کی وضاحت کی، بالآخر ورکنگ کمیٹی کو تجویز کے صحیح ہونے کا یقین ہو گیا اور گاندھی جی نے ظاہر کر دیا کہ وہ اس حل سے پورے طور پر متفق تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ گاندھی جی نے یہ کہہ کر مجھے مبارکباد دی کہ میں نے ایک ایسے مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالا، جس نے ہر ایک کو زچ کر دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ میرا حل سب سے کٹر مسلم لیگیوں کے خوف کو بھی دور کر دے گا۔ اسی کے ساتھ اس کی پشت پر فرقہ وارانہ رجحانات کے بجائے سچی قومیت کی روح ہے۔" (ہماری آزادی صفحہ ۲۸۵)

مولانا آزاد نے ۱۵ اپریل کو مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے مطالبات کے بارے میں اخبارات کو ایک طویل بیان دیا جس میں انھوں نے فرمایا کہ: "مسلم لیگ نے پاکستان کی جو اسکیم تجویز کی ہے اس پر میں نے ہر پہلو سے غور کیا ہے۔۔۔۔ میں اس

پہنچے پر پہنچا ہوں کہ یہ نہ صرف بحیثیت مجموعی پورے ہندوستان کے لیے بلکہ خاص طور پر مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہوگی اور دراصل جتنے مسئلے اس کے ذریعے حل ہوں گے، ان سے زیادہ نئے مسئلے اٹھ کھڑے ہوں گے۔" آگے چل کر مولانا نے کہا کہ "بحث کی خاطر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر پاکستان خود مسلمانوں کے مفاد کے لیے اس قدر مضر ہے تو مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد اس کے فریب حسن میں کیونکر مبتلا ہوگئی؟ اس کا جواب انتہا پسند فرقہ پرست ہندوؤں کے رویے میں ملتا ہے۔ جب مسلم لیگ نے پاکستان کی گفتگو چھیڑی تو انھیں اس میں اتحاد اسلامی کی ایک ناپاک سازش نظر آنے لگی اور انھوں نے اس خوف میں اس کی مخالفت شروع کی کہ یہ ہندوستانی مسلمانوں اور مسلمانوں کی ریاستوں کے درمیان جتھا بندی کا پیش خیمہ ہے۔" انھوں نے مزید فرمایا: "میں نے کانگریس کو جو فارمولا قبول کرنے پر راضی کرلیا ہے، اس میں وہ تمام خوبیاں جو پاکستان کی اسکیم میں ہیں حاصل ہو جائیں گی اور اس میں جو خامیاں ہیں ان سے بچا جاسکے گا۔" وغیرہ۔

لارڈ پیتھک لارنس نے ۲۷ اپریل کو مولانا آزاد کو لکھا کہ مشن سے بات چیت کرنے کے لیے وہ کانگریس کے چار نمایندوں کو نامزد فرمادیں، چنانچہ مولانا نے دوسرے دن ۲۸ اپریل کو جواہر لال نہرو، ولبھ بھائی پٹیل، خان عبدالغفار خاں اور خود اپنا، چار ناموں کی فہرست بھیج دی۔

گرمیاں شروع ہوئیں تو یہ گفتگو دہلی سے شملہ منتقل ہوگئی جو ۲ مئی سے ۱۲ مئی تک جاری رہی۔ بالآخر ۱۶ مئی کو مسٹر ایٹلی نے دارالعوام میں ایک بیان دیا جس میں کیبنٹ مشن کے پلان کی تفصیلات پیش کی گئی تھیں اور کہا گیا تھا کہ "ہندوستان کا ایک نیا دستور جلد سے جلد تیار کرنے کے لیے برطانوی کیبنٹ اس انتظام کو سب سے زیادہ مناسب سمجھتی ہے۔" ۱۷ مئی کو وائسرائے ہند لارڈ ویویل نے اپنی نشری تقریر میں ہندوستانی رہنماؤں سے اپیل کی کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے کیبنٹ مشن نے جو خاکہ تیار کیا ہے اسے قبول کرلیا جائے۔

آخرکار کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے کیبنٹ مشن پلان منظور کرلیا، مگر مجوزہ عارضی حکومت میں مسلمان ممبروں کی نامزدگی پر دونوں میں اتفاق نہ ہوسکا۔ مسلم لیگ کا اس پر اصرار

تھا کہ کانگریس کو کسی مسلمان کو شامل کرنے کا اختیار نہیں ہوگا اور کانگریس اپنے اس حق سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھی۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے: "[کانگریس] ورکنگ کمیٹی میں جو بحثیں ہوئیں ان میں میں نے سمجھایا کہ کیبنٹ مشن پلان بنیادی طور پر وہی اسکیم ہے جو کہ کانگریس منظور کرچکی ہے۔ اس طرح کانگریس کو پلان کے بنیادی سیاسی فیصلے کو منظور کرنے میں کچھ زیادہ دشواری پیش نہیں آتی.... سمجھوتے کی طویل گفتگوؤں کے بعد ورکنگ کمیٹی نے اپنے ۲۶ جون کے رزلیوشن میں کیبنٹ پلان کو مستقبل کے لیے منظور کرلیا، البتہ وہ انٹرم حکومت کی تجویز کو منظور نہ کرسکی۔" (ہماری آزادی صفحہ ۳۰۶) لیگ کے فیصلے کے متعلق مولانا نے لکھا ہے کہ: "میں مسوری میں تھا، جب مسلم لیگ کے کچھ ممبر مجھ سے ملے تھے اور اپنی حیرانی اور تعجب کی کیفیت مجھ سے بیان کی تھی۔ انھوں نے صاف صاف کہا کہ اگر مسلم لیگ کو کیبنٹ مشن پلان ہی منظور کرنا تھا تو آخر اس نے ایک آزاد ریاست کا نعرہ بلند کرکے مسلمانوں کو گمراہ کیوں کیا۔؟" (ہماری آزادی صفحہ ۳۰۵)

مشن اور وائسرائے سے مولانا کی مراسلت

اس نمائش میں مولانا آزاد کے متعدد خطوط کی مکمل نقلیں اور اہم اقتباسات بھی لگائے گئے تھے۔ غالباً یہ خطوط ابھی تک شائع نہیں ہوئے ہیں، کم از کم راقم الحروف کی نظر سے نہیں گذرے ہیں۔ ایک دو خط میں نے مکمل طور پر نقل کئے ہیں، مگر اس مختصر مضمون میں ان کا مکمل ترجمہ دینا ممکن نہیں ہے اس لیے ان خطوط کے اہم اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

مولانا ابوالکلام آزاد نے لارڈ پیتھک لارنس کے خط کے جواب میں ۲۸ اپریل کو کانگریس کے چار نمایندوں کی جو فہرست بھیجی تھی، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اسی خط میں مولانا نے یہ بھی لکھا تھا کہ: کانگریس ورکنگ کمیٹی "ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں مسلم لیگ کے نمایندوں سے تمام مسائل پر پوری طرح گفتگو کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہی ہے۔ انھوں نے مزید لکھا تھا کہ: "ہم اس کو غلط سمجھتے ہیں کہ وفاقی یونین کے ماتحت مذہبی اور فرقہ وارانہ بنیادوں

پر صوبوں کو مختلف گروپ میں تقسیم کیا جائے۔" اپنے ۱۶ رمئی کے خط میں مولانا نے پیتھک لارنس کو لکھا: کانگریس ہو یا کیبنٹ مشن یا مسلم لیگ کے نمائندے، ہمیں اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنا نہیں چاہئے کہ اب تک گفتگو جس نہج پر ہوتی رہی ہے اس سے کامیابی کی امید پیدا ہوگئی ہے۔" انھوں نے مزید لکھا کہ: "ہمارے سامنے بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان آزاد ہو اور نتیجے کے طور پر برطانوی فوج ہندوستان سے چلی جائے۔" ۶ رمئی کو ہی شملہ میں مولانا نے لارڈ پیتھک لارنس کو لکھا کہ: "منطقی اسباب وعلل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور خواہ مخواہ کی بے انصافی کسی وقت بھی خطرناک نتائج کا موجب بن سکتی ہے، خصوصاً جب ہم کروڑوں انسانوں کے مستقبل کی تعمیر کر رہے ہوں۔" کیبنٹ مشن کے بیان مورخہ ۱۶ رمئی پر تبصرہ کرتے ہوئے ۲۰ رمئی کو مولانا نے لارڈ پیتھک لارنس کو لکھا: "کچھ اہم فرقہ وارانہ مسائل کے بارے میں ہم (کانگریس) تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا فیصلہ کرتے وقت اس کا لحاظ رکھا جائے کہ دونوں اہم فرقوں کی اکثریت کی تائید حاصل ہو۔" ۲۵ رمئی کو وائسرائے ہند لارڈ ویول کو مولانا نے قانون اور دستور میں ترمیم کے لئے لکھا، تاکہ عارضی حکومت کو صحیح معنی میں قومی حکومت کا درجہ حاصل ہو سکے۔ انھوں نے فرمایا کہ: "جب تک عارضی حکومت کو یہ درجہ حاصل نہیں ہوگا، وہ ہندوستانی عوام میں آزادی کا وہ جذبہ پیدا نہ کر سکے گی جس کی آج شدید ضرورت ہے۔" اس خط کے جواب میں ۳۰ رمئی کو لارڈ ویول نے مولانا کو یقین دلایا کہ: "ہم (ہز مجسٹیز گورنمنٹ) اس انداز سے تعاون کریں گے کہ جس سے ہندوستان میں آزادی کا احساس پیدا ہوگا اور جب تک نیا دستور مکمل ہو، ہم اسے مکمل آزادی کے لیے تیار کریں گے۔"

مولانا آزاد نے ۱۳ رجون کو لارڈ ویول کو خط لکھا جس میں پندرہ رکنی حکومت تجویز کرتے ہوئے فرمایا کہ: "ملک کے انتظام کو چلانے اور چھوٹی اقلیتوں کو مناسب نمائندگی دینے کے لیے ضروری ہے۔" نیز اس سے بھی آگاہ کیا کہ: "مخلوط حکومت کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہے کہ مطمح نظر اور پروگرام میں کسی نہ کسی حد تک یکسانیت ہو۔" اس کے دوسرے ہی دن، ۱۴ رجون کو مولانا نے کانگریس کی اس پالیسی کی دوبارہ وضاحت کی کہ: "وہ صوبوں کی قومی حکومتوں میں برابری (پیریٹی) کے اصول کے خلاف ہے، مزید فرمایا کہ "ہمارے خیال میں

اس کی وجہ سے مستقل طور پر کشمکش اور مصیبت رہے گی اور جیسا کہ اس سے پہلے علیحدہ پسندی کے بعض اقدامات کی وجہ سے ہماری پبلک زندگی زہر آلود ہوگئی تھی اسی طرح اس برابری کے اصول (پیریٹی) سے بھی ہمارا مستقبل مسموم ہوسکتا ہے۔" مولانا آزاد کے اس خط کے جواب میں لارڈ ویول نے ۱۵ رجون کو مولانا کو لکھا کہ: "مجھے یقیناً تسلیم کرلینا چاہیئے کہ عارضی حکومت کے بارے میں دونوں بڑی پارٹیوں میں سمجھوتہ کرانے کی میری کوشش ناکام ہوگئی ہے۔" اس کے بعد ۲۲ رجون کو لارڈ ویول نے مولانا کو لکھا کہ: "کانگریس کے اس حق کو تسلیم کرنا کہ عارضی حکومت میں وہ اپنے نمایندوں میں کسی مسلمان کو بھی شامل کرسکتی ہے، کیبنٹ مشن یا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔"

اس خط کے بعد، عارضی حکومت کے بارے میں کانگریس اور لیگ کے درمیان سمجھوتے کی بات چیت ختم ہوگئی اور ۲۶ رجون کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے وہ فیصلہ کیا جس کا ہم اس سے قبل ذکر کرچکے ہیں۔

مولانا آزاد کی عظمت اور تدبّر کا اعتراف

کیبنٹ مشن کی آمد سے لے کر اس کی واپسی تک، اس اہم اور نازک موقع پر مولانا آزاد نے ملک و قوم کی رہنمائی کے فرائض جس خوبی اور صبر و تحمل کے ساتھ انجام دئے، انتہائی پیچیدہ مسائل کی جس طرح گرہ کشائی کی اور بعید نازک اور مشکل مواقع پر جس عزم و حوصلہ اور عقل و تدبر کا ثبوت دیا، اس کا اعتراف مخالفوں نے بھی کیا تھا۔ لیکن ابھی ایک اہم مرحلہ باقی تھا، جس میں مولانا کی تدبیر اور تدبر کی آزمائش تھی۔ ۷ رجولائی کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ تھا جس میں کیبنٹ مشن پلان کی منظوری لینا تھی اور خیال تھا کہ اس موقع پر شدید مخالفت ہوگی۔ جلسہ شروع ہوا تو مولانا آزاد کی تجویز پر نئے صدر کی حیثیت سے، پنڈت جواہر لال نہرو مسند صدارت پر بیٹھے اور مولانا نے پلان کی منظوری کے لیے ریزولیوشن پیش کیا۔ حسب توقع مخالفت ہوئی اور کانگریسی سوشلسٹوں نے پیش قدمی کی اور بقول مولانا آزاد: "قیفنت کو پس پشت ڈال کر اداکاری کے انداز دکھائے" مگر مولانا کی خطابت اور

دلائل کے سامنے کسی کی نہ چلی اور دو دن کی بحث و گفتگو کے بعد یہ ریزولیوشن بھاری اکثریت سے پاس ہو گیا، روزنامہ امرت بازار پتریکا مورخہ ۹ر جولائی کے مطابق ۲۰۴ (دو سو چار) ووٹ حق میں آئے اور ۵۱ (اکاون) مخالفت میں۔

اس کامیابی پر لارڈ پیتھک لارنس اور سر اسٹیفرڈ کرپس نے مولانا آزاد کو مبارکباد کے تار بھیجے، جس میں انھوں نے اس پر خوشی ظاہر کی تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ریزولیوشن منظور کر لیا" (ہماری آزادی صفحہ ۲۱۳) ان تاروں میں اس کا بھی اعتراف کیا گیا تھا کہ مولانا آزاد نے کیبنٹ مشن پلان کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا۔"

کانگریس کے اسی اجلاس میں، مولانا آزاد کے ریزلیوشن سے پہلے سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ایک ریزولیوشن پیش کیا، جس میں مولانا آزاد کی خدمات کا اعتراف کیا گیا تھا۔

نیشنل آرکائیوز کی اس نمائش میں روزنامہ "ہندو" مورخہ ۷ر جولائی کا ایک تراشہ لگایا گیا تھا جس کے مطابق سردار پٹیل نے فرمایا کہ: "اس زمانے میں کانگریس نے، مولانا آزاد کی کامیاب اور موثر قیادت میں مشکلات کا بڑی جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ ان کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو وہ اس طرح اپنے فرائض ادا نہ کر پاتا جس عزم و حوصلے کے ساتھ مولانا نے انجام دئے ہیں۔"

اس نمائش میں پونا سے بھیجی گئی ایک خفیہ رپورٹ مورخہ ۱۸ر جولائی بھی پیش کی گئی تھی، جو حکومت بمبئی کے ہوم ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے، ہوم سکریٹری حکومت ہند (نئی دہلی) مسٹر پورٹر کے نام ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ: "یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ [کانگریس کے اجلاس میں] ریزلیوشن کی کامیابی کا، منجملہ اور اسباب کے بڑا سبب یہ تھا کہ اسے مولانا آزاد نے پیش کیا تھا اور انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ مشن کی تجاویز اور ورکنگ کمیٹی کی پالیسی کا جائزہ لیا اور آخر میں انھوں نے اپیل کی کہ آپ کوئی ایسا فیصلہ نہ کریں جس سے فتح جو نظروں کے سامنے ہے، شکست میں تبدیل ہو جائے۔" اپنی تقریر کا جو خلاصہ مولانا آزاد نے اپنی کتاب "انڈیا ونس فریڈم" میں دیا ہے، اس میں ایک جگہ بیان کیا

ہے کہ: "...چالیس کروڑ کی ایک قوم، فوجی اقدامات کی بدولت نہیں بلکہ گفتگو اور مفاہمت کے ذریعے آزاد ہو رہی ہے، صرف اس نقطۂ نظر ہی سے دیکھا جائے تو یہ بڑی حماقت ہوگی، اگر ہم اپنی کامیابی کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہ کریں۔۔۔۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کانگریسی سوشلسٹوں جیسے لوگ یہ کیسے کہتے ہیں کہ ہم نے فتح حاصل نہیں کی ہے، شکست کھائی ہے۔" (ہماری آزادی صفحہ ۳۱۴)

روزنامہ "ہندو" کے ۹ جولائی کے شمارے میں مولانا آزاد کے بارے میں اخبار کے نامہ نگار کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں مولانا آزاد کو قومی رہنما کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور انھیں خداداد صلاحیت کے مدبر اور اسکا جیسے شاندار الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ نامہ نگار نے لکھا ہے کہ: "ہندوستان کی بدقسمتی تھی کہ نہ تو وائسرائے ہند لنلتھگو کے زمانے میں مولانا آزاد کانگریس کے صدر تھے اور نہ مسٹر جناح نے ان کی مدبرانہ خداداد صلاحیتوں کو تسلیم کیا۔" نامہ نگار نے مولانا آزاد سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ: "ان کے پروقار طریق کار نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا۔" اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ: "مختلف مواقع پر صدر کانگریس کے غیر معمولی صبر و تحمل، ان کی ذہانت اور دوررس بصارت نے میرے دل پر لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔"

ماہنامہ جامعہ کی سالانہ قیمت

۱۔ ہندوستان کے لیے	۹ روپے
۲۔ پاکستان کے لیے	۳۰ روپے
۳۔ دوسرے بیرونی ممالک کے لیے	ڈیڑھ پونڈ یا پانچ امریکی ڈالر

جامعہ

سالانہ قیمت
۹ روپے

قیمت فی پرچہ
۷۵ پیسے

جلد ۷۸ | بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۸۱ء | شمارہ ۴

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: جمال پریس دہلی ۶ • ٹائیٹل: فائن پریس دہلی ۶

شذرات

ایران اور افغانستان میں پچھلے دنوں سیاسی نظام میں جو تبدیلیاں ہوئیں، ان سے بحر ہند، خلیج ممالک اور برصغیر ہند و پاک کے علاقوں میں بین الاقوامی سیاست کا توازن بگڑ گیا ہے اور یہ علاقے بڑی طاقتوں کے مفاد کی باہمی کشاکش کی براہ راست زد میں آگئے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایران اور افغانستان میں اس وقت جو صورت حال ہے اس کا اثر ہندوستان اور پاکستان دونوں کے سیاسی اور دفاعی رویے پر پڑ رہا ہے یا پڑ سکتا ہے۔ افغانستان میں روسی فوجیں موجود ہیں جن کا مقابلہ وہاں کا مزاحمتی طبقہ جوانمردی کے ساتھ کر رہا ہے اور افغانستان کی قومی آزادی کی بحالی کے لیے سینہ سپر ہے، نتیجے میں پاکستان کی سرزمین پر لاکھوں افغان پناہ گزیں موجود ہیں۔ ان پناہ گزینوں کو مختلف ملکوں سے ہر قسم کی مدد مل رہی ہے۔ پاکستان اپنی شمال مغربی سرحدوں پر ایک ایسے نظام حکومت کے قیام کو جو پاکستانی نظام حکومت سے نظریاتی اعتبار سے ہر رنگ میں ہمہ وقت متصادم اور برسرپیکار ہے، اپنے وجود کے لیے ایک بڑا خطرہ تصور کرتا ہے۔ یہ ایک فطری بات ہے، ہمیں اس پر متعجب اور متحیر نہیں ہونا چاہیے، لیکن ہمیں اس بات پر ضرور حیرت ہوتی ہے کہ پاکستان کیونکر مغربی طاقتوں کی مدد سے اپنے آپ کو اس خطرہ سے محفوظ اور اپنی سیاسی آزادی کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں دانشمندی اور تدبر کا تقاضا یہ تھا کہ وہ بڑی طاقتوں کی کشاکش میں غیر جانبدار رہتا اور افغان پناہ گزینوں کا مسئلہ بین الاقوامی ایجنسیوں کے ذریعہ خوش اسلوبی سے حل کرنے کی کوشش کرتا۔ ہمارا یہ احساس بھی ہے کہ شروع میں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق اسی موقف کے حق میں تھے، لیکن پاکستان کی معاشیات کے تقاضوں نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ اس موقف کو چھوڑ دیں، پھر پاکستان کی داخلی سیاست نے بھی جس کا ایک اہم شاخسانہ پی آئی اے کے ہوائی جہاز کا اغوا تھا، ان کے

طرزِ فکر اور سیاسی رویے پر اثر ڈالا۔ اب وہ ایسی جگہ کھڑے ہیں جہاں سے سیدھی راہ رزافزوں اسلحہ بندی اور امریکہ کے صدر ریگن کی مکمل ہمنوائی تک جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں پاکستان کے لیے یہ صورتِ حال بھی خطرات سے پُر ہے۔

پاکستان کا پکا ارادہ اور سوچا سمجھا پروگرام ہے کہ وہ نیوکلیائی اسلحے خود تیار کرے، امریکہ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اس بار پاکستان کو بڑے پیمانے پر مسلح کرے گا۔ اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس طرح مسلح ہو کر کیا پاکستان افغانستان کی موجودہ اشتراکی حکومت پر کوئی ایسا دباؤ ڈال سکتا ہے کہ سوویٹ یونین کی فوجیں اپنے وطن واپس چلی جائیں اور افغان پناہ گزینوں کو اپنے وطن واپس جانے کا موقع ملے۔ ہمارا خیال ہے کہ ایسا ممکن نظر نہیں آتا۔ سوویٹ یونین کسی غیر ملک میں اپنی فوجیں بھیجتا ہے تو اس نیت سے بھیجتا ہے کہ وہاں سے اُن کی واپسی اسی وقت ہوگی جب اُسے اس کا یقین ہو جائے گا کہ اس ملک میں جو حکومت ہوگی وہ اسی کی مرضی کی ہوگی۔ کوئی سو برس بعد روس کو اس کا موقع ملا ہے کہ کابل اس کے اثر ہی میں نہیں بلکہ زیرِ نگیں ہے، درحقیقت وہاں روس ہی کی حکومت ہے۔ اب روس جیسی بڑی طاقت کو باوجود اس کے کہ وہ سخت ناانصافی اور جارحیت سے کام لے رہی ہے، کابل سے ہٹانا بہت دشوار ہے۔ افغانستان میں روس کی موجودگی سے امریکہ شاید اتنا پریشان نہ ہوتا اگر ایران میں ایسی حکومت ہوتی جس پر وہ پوری طرح اعتماد کر سکتا جیسا کہ شاہ کے زمانے میں تھا۔ اور وہ سوویٹ یونین سے خاموش یا پوشیدہ سمجھوتہ کر لیتا کہ اچھا جب تم کابل میں آگئے ہو تو خوش رہو، ہاں طہران کی طرف نہ دیکھنا کہ وہاں ہم موجود ہیں، سوویٹ یونین بڑی خوشی سے اس پر راضی ہو جاتا اور ایک عرصہ تک بحرِ ہند اور خلیج کا علاقہ مشرق اور مغرب کی طاقتی سیاست کی رزم گاہ نہ بن سکتا۔ لیکن صورتِ حال ایسی نہیں ہے اور امریکہ اور اس کے حلیف مغربی ممالک کو جن کا معاشی مفاد ہی کیا ساری زندگی خلیج کے تیل سے وابستہ ہے، اس علاقے کے تیل سے زیادہ دلچسپی ہے، انسانوں سے نہیں، اگر انھیں یقین ہو جائے کہ خلیج کا تیل ہمیشہ مغرب ہی کی طرف بہے گا تو غیور افغانوں پر خواہ کتنے ہی مظالم ہوں انھیں اطمینان رہے گا۔

ایسی صورت میں کیا پاکستان اس امر سے بے خبر ہوگا کہ وہ رفتہ رفتہ بحر ہند اور خلیج کے علاقے میں امریکی نظام تحفظ و دفاع کا جو کسی وقت بھی جارحانہ رویہ اختیار کر سکتا ہے، ایک بازو بنتا جا رہا ہے۔ امریکہ کے اس نظام تحفظ و دفاع کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا، اور ایسا پہلے بھی دیکھنے میں آیا ہے، کہ صدر ریگن کی یہ خواہش ہوگی کہ ہندوستان کا سیاسی و معاشی نظام مستحکم نہ ہونے پائے اور دہلی میں جو حکومت ہو وہ یا تو اُس کی ہمنوا ہو یا اتنی کمزور کہ بین الاقوامی سیاست پر کسی طرح اثر انداز نہ ہو سکے اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس ڈرامہ میں امریکہ پاکستان کو کوئی ایسا رول دے جس میں ہندوستان کے لئے بڑا خطرہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کو پاکستان کے اس عزم سے کہ وہ نیوکلیائی اسلحہ ضرور تیار کرے گا اور امریکہ کے اس فیصلے سے کہ وہ پاکستان کو پہلے کے مقابلے میں کافی بڑے پیمانے پر اسلحے سپلائی کرے گا سخت تشویش ہے۔ ہندوستان میں سیاستدانوں اور دانشوروں کا ایک طبقہ ایسا ہے جو یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر افغانستان میں سوویٹ یونین نے فوجی مداخلت نہ کی ہوتی تو شاید پاکستان ایٹم بم بنانے کے لئے زیادہ بے چین نہ ہوتا اور نہ امریکہ ہی اتنے بڑے پیمانے پر پاکستان کو اسلحے دینے کے لئے تیار ہوتا۔ اس بات میں ایک حد تک صداقت ضرور ہے، لیکن یہ ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ پاکستان نے ایٹم بم بنانے کا فیصلہ افغانستان میں سوویٹ یونین کی فوجی جارحیت سے بہت پہلے کر لیا تھا اور امریکہ باوجود ہمارے احتجاج کے پہلے بھی پاکستان کو اسلحے سپلائی کر چکا ہے جو ہمارے ہی خلاف استعمال ہوئے ہیں۔

ان امور پر غور کرتے وقت ہمیں چین کو اور چین سے سوویٹ یونین، امریکہ اور پاکستان سے تعلقات کی نوعیت کو بھی نظر میں رکھنا چاہیئے۔ ہمالیہ کے پہاڑ خواہ کتنے ہی اونچے کیوں نہ ہوں اور چین ہندوستان سے اپنے تعلقات استوار کرنے کے لئے کتنا ہی متمنی کیوں نہ ہو، ہمیں چین کی طرف سے بہرحال ہوشیار رہنا چاہیئے۔ ماضی میں ہمیں اپنی غفلت اور خوش فہمی کا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ پارلیمنٹ میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے ہندوستان کے دفاع سے متعلق ابھی حال میں جو متوازن اور فکر انگیز تقریر کی ہے، اس سے بڑی حد تک یہ اطمینان ہوا کہ حکومت ہند کو حالات کی پیچیدگیوں کا بھرپور احساس ہے۔ اب ہندوستان کے سامنے

یہ چار باتیں ہیں :

۱۔ ہندوستان اس بات کا یقین کرلے کہ پاکستان کو اپنے نیوکلیائی پروگرام میں کامیابی نہیں ہوگی یا پاکستان اپنی فوجی طاقت اور نیوکلیائی اسلحوں کا غلط استعمال نہیں کرے گا یا بین الاقوامی کمیونٹی اُسے انھیں استعمال کرنے کی اجازت نہ دے گی۔

۲۔ ہندوستان حفظ ماتقدم کے طور پر پاکستان کی نیوکلیائی تنصیبات کو تباہ کردے۔

۳۔ ہندوستان سوویٹ یونین سے سکیوریٹی سے متعلق اپنے معاہدے کو اور مضبوط کرے اور نیوکلیائی خطرے کی صورت میں اس پر مکمل بھروسہ رکھے۔

۴۔ ہندوستان خود اپنا نیوکلیائی اسلحے کا پروگرام شروع کرے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے اس میں سے کسی شق پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور امید ہے کہ مسز گاندھی مُرارجی ڈیسائی کی طرح پاکستان اور امریکہ کی یقین دہانیوں کے سلسلے میں اپنے انداز فکر میں کسی خوش فہمی کو راہ نہ دیں گی۔ دوسری بات بھی قابلِ اعتنا نہیں کیونکہ ہندوستان کا اپنا ایک کردار ہے اور وہ اس سے کسی قیمت پر دستبردار نہیں ہوگا۔ تیسری بات کا مطلب یہ ہوگا کہ ناوابستگی کا موقف جو ہندوستان کی خارجہ پالیسی کا بنیادی عنصر ہے، اسے ہندوستان چھوڑ دے، یہ بھی نامناسب ہوگا۔ اب رہا یہ کہ ہندوستان خود اپنا نیوکلیائی اسلحے کا پروگرام شروع کرے، تو یہ بات بھی اس کی اخلاقی شکست کے مرادف ہوگی، ہندوستان کی طرف سے برابر اس کا اعلان ہوتا رہا ہے کہ ہم نیوکلیائی ٹیکنولوجی میں جو تجربے کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں، وہ پُرامن مقاصد کے لیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اخلاقی فتح اسی میں ہے کہ سرحد پر اشتعال انگیز اور خطرناک صورتِ حال کے باوجود ہندوستان اپنے اعلانات کا بھرم قائم رکھے۔ اس طرح موجودہ حالات میں ہماری سیاسی اور حکومتی قیادت کے سیاسی تدبّر اور دوراندیشی کا سخت امتحان ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ جس طرح ماضی میں ہماری قومی قیادت نے تدبّر اور صحیح اقدام سے کام لے کر بین الاقوامی دنیا میں ہندوستان کا سر اونچا رکھا ہے، اسی طرح وہ قومی تاریخ کے اس سخت مرحلے میں بھی، ہندوستان کے مزاج، کردار اور امن پسندانہ روایات کا لحاظ رکھتے ہوئے، ملک و قوم کو سرخرو رکھے گی۔

کمال جعفری

خان بہادر پروفیسر ایم محفوظ الحق
اور
اُن کے علمی کارنامے

دنیا میں کچھ ایسی شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں جن کی علمی صلاحیتوں اور تحقیقی کارناموں پر دنیا ناز کرتی ہے۔ خان بہادر پروفیسر ایم محفوظ الحق مرحوم کی شخصیت علمی حیثیت سے بڑی ہمہ گیر تھی۔ وہ ایک ذہین انشاء پرداز اور کامیاب محقق تھے۔ حیف صد حیف کہ ان کا انتقال ایسے وقت میں ہوا جب وہ علم و تحقیق کی شاہ راہ پر تیزی سے گامزن تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی عمر کی ایک قلیل مدت میں علم و ادب کا جو سرمایہ چھوڑا ہے وہ بہرحال ناقابل فراموش ہے۔

مولد و مسکن

خان بہادر پروفیسر ایم، محفوظ الحق ۷ رجنوری ۱۹۰۰ء کو موضع سعد اللہ پور (ڈاکخانہ خسرو پور، ضلع پٹنہ، بہار) میں پیدا ہوئے۔ سعد اللہ پور ضلع پٹنہ کا وہ مشہور قصبہ ہے جہاں مسلمانوں کو ہمیشہ خوشحالی نصیب رہی۔ آزادی سے قبل یہاں بڑے

کمال جعفری ایم، اے، یو، جی، سی، ریسرچ فیلو، شعبۂ عربی، فارسی و اسلامک اسٹڈیز، وشوابھارتی، شانتی نکیتن (مغربی بنگال)

بڑے زمیندار موجود تھے ۔ پروفیسر محفوظ الحق کے والد بزرگوار جناب عبدالحمید خان صاحب بھی ایک خوشحال زمیندار تھے ۔

تعلیم

خان بہادر پروفیسر محفوظ الحق نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن سعداللہ پور میں حاصل کی ۔ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے بزرگوں کے ہمراہ کلکتہ تشریف لے گئے ۔ جہاں ان کا داخلہ مشہور علمی درسگاہ "کلکتہ مدرسہ" میں ہوا ۔ پروفیسر موصوف اپنی ذہانت اور خداداد صلاحیت کی وجہ سے اساتذہ اور طلبا میں بہت جلد مقبول ہوگئے ۔ انھوں نے ۱۹۱۶ء میں میٹرکیولیشن کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا ۔ اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں داخل ہوئے اور ۱۹۱۸ء میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں اول آئے ۔ انھوں نے ۱۹۲۰ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے بی ۔ اے آنرز (فارسی) کا امتحان دیا اور فرسٹ کلاس فرسٹ آئے اور پھر وہ ۱۹۲۲ء میں ایم، اے (فارسی) اور ۱۹۲۹ء میں ایم، اے (عربی) کے امتحانات میں شریک ہوئے اور حسب روایت اول پوزیشن حاصل کی ۔

ملازمت

خان بہادر پروفیسر ایم، محفوظ الحق کا تقرر ۱۹۲۳ء میں بحیثیت فارسی لکچرار، رپن کالج کلکتہ (موجودہ سریندر ناتھ کالج) میں ہوا لیکن ایک مختصر مدت کے بعد ہی ان کا تقرر مشہور علمی درسگاہ پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں بحیثیت فارسی، اردو اور عربی لکچرار ہوا جہاں وہ تادم آخر کام کرتے رہے ۔ وہ بحیثیت آنریری لکچرار کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی، فارسی اور اسلامک ہسٹری سے بھی منسلک تھے ۔

خان بہادر کا خطاب

پروفیسر محفوظ الحق مرحوم کو سرکار انگریزی نے ۱۹۴۲ء میں خان صاحب کے خطاب سے نوازا۔ دوبارہ ان کی علمی خدمات کے پیش نظر حکومت نے ۱۹۴۶ء میں "خان بہادر" کا خطاب دیا۔

ازدواجی زندگی اور خاندانی حالات

پروفیسر محفوظ الحق کی شادی صوبہ بہار میں ضلع آرہ کے ملکی محلہ میں ایک معزز خاتون سے ہوئی تھی۔ ان کے خسر کا نام محمد شعیب تھا۔ شعیب صاحب ضلع آرہ میں سب رجسٹرار کے عہدے پر فائز تھے اور اپنے زمانے کے ایک معروف انسان تھے۔ پروفیسر موصوف نے اپنی زندگی کا بیشتر زمانہ آرہ میں گذارا۔ ان کا علمی ذخیرہ ان کی اہلیہ کے پاس موجود تھا لیکن افسوس ہے کہ چند سال قبل ان کی اہلیہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ پروفیسر محفوظ الحق کے تین صاحبزادے ہیں۔ ان کے بڑے صاحبزادے محمد فضل الحق، رانچی ایگریکلچر کالج رانچی یونیورسٹی کے شعبۂ نباتیات میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کے منجھلے صاحبزادے رشید الحق ایم۔ اے بھارت کوکنگ کول لمیٹڈ، جھریا (دھنباد) میں لیبر اینڈ ویلفیئر آفیسر ہیں۔ ان کے چھوٹے صاحبزادے محبوب الحق بوکارو اسٹیل سیٹی، دھنباد میں سری مکس ڈپارٹمنٹ سے منسلک ہیں۔ ان کی ایک بہن عائشہ خاتون کراچی (پاکستان) میں قیام فرما ہیں۔ پروفیسر محفوظ الحق کے بھائیوں کے نام معین الحق، ڈاکٹر مسعود الحق اور مظہر الحق ہیں۔ ڈاکٹر مسعود الحق صاحب ایم، بی، بی، ایس بہار شریف کے محلہ کاشی تکیہ میں قیام فرما ہیں، ان کا مطب بھی وہیں ہے۔ وہ بحیثیت ڈاکٹر بہت مشہور رہیں۔

احباب اور شاگرد

پروفیسر محفوظ الحق صاحب کے معاصرین اور احباب کی فہرست بہت طویل

ہے۔ فی الحال چند ہی کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔ ان کے احباب میں پروفیسر طاہر رضوی مرحوم (پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی)، ڈاکٹر زبیر احمد صدیقی مرحوم (صدر شعبۂ تاریخ اسلامی، کلکتہ یونیورسٹی)، نواب نصیر حسین خیالؔ مرحوم، مولانا سید سلیمان ندویؒ، پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم، ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم (صدر شعبۂ عربی و فارسی کلکتہ یونیورسٹی و بانی ایران سوسائٹی، کلکتہ)، مولوی نصیر الدین ہاشمی، پروفیسر اے۔ ایچ ہارلے (پرنسپل اسلامیہ کالج کلکتہ) اور خان بہادر مولوی عبدالمقتدر کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ علامہ جمیل مظہری، ڈاکٹر عندلیب شادانی (ڈھاکہ یونیورسٹی) بشیر مرزا اور ڈاکٹر مختار الدین آرزو (صدر شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) سے بھی دوستانہ مراسم تھے۔

ان کے شاگردوں میں پروفیسر مسعود حسن (ممبر پبلک سروس کمیشن، مغربی بنگال)، ڈاکٹر عطا کریم برقؔ (سر آسوتوش پروفیسر و صدر شعبۂ عربی و فارسی، کلکتہ یونیورسٹی)، پروفیسر اسمٰعیل بدرؔ (مولانا آزاد کالج، کلکتہ) اور ڈاکٹر عبدالرؤف (ریڈر شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ پروفیسر محفوظ الحق اپنے دوستوں اور شاگردوں میں بے حد مقبول تھے۔ اُن کے حسنِ اخلاق اور فیاضی کے تذکرے لوگ فخر سے کرتے ہیں۔

علمی کارنامے

خان بہادر پروفیسر محفوظ الحق تمام عمر علمی اور تحقیقی کاموں میں منہمک رہے۔ انھوں نے کلکتے میں اپنے دولت کدہ واقع ۸ بی۔ درگاہ روڈ۔ پارک سرکس میں ایک ذاتی لائبریری قائم کی تھی۔ راقم الحروف کو پروفیسر مرحوم کی ایک نایاب تصویر دستیاب ہوئی ہے جس میں وہ اپنی ذاتی لائبریری میں مطالعہ کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ انھوں نے علم و تحقیق کا ایک بڑا عرصہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں "اسلامی خطاطی" پر صرف کیا۔ اس موضوع پر ان کی ایک کتاب زیرِ ترتیب تھی لیکن افسوس کہ موت نے مکمل کرنے کی مہلت

نہ دمی - ان کے پاس خطاطی سے متعلق بہت سے نادر اور نایاب نسخے تھے۔

تصانیف

مجمع البحرین

مجمع البحرین شہزادہ محمد دارا شکوہ کی مشہور فارسی تصنیف ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش خان لائبریری (پٹنہ) میں تھا۔ پروفیسر محفوظ الحق نے چالیس صفحے کے اس نسخہ کا سہل انگریزی میں نہایت سلیس ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے مجمع البحرین پر ایک مقدمہ بھی لکھا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شہزادہ محمد دارا شکوہ کے اندر شاعرانہ صلاحیت بھی تھی، چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے دارا شکوہ سے منسوب کچھ فارسی اشعار کا بھی انکشاف کیا ہے، انھوں نے مجمع البحرین کی ادبی خوبیوں کا بھرپور تنقیدی جائزہ لیا ہے اور تصوف سے متعلق دارا شکوہ کے نظریات کو واضح کیا ہے۔ یہ تصنیف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے زیر اہتمام ۱۹۲۹ء میں ببلو تھیکا انڈیکا سریز میں شائع ہوئی اور بہت مقبول ہوئی۔

دیوان کامران

دیوان کامران جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، شہزادہ کامران کی ایک نایاب تصنیف ہے۔ پروفیسر محفوظ الحق نے اس کا ایک قلمی نسخہ اورینٹل لائبریری پٹنہ سے حاصل کیا اور نہایت تزک و احتشام کے ساتھ مرتب کیا۔ انھوں نے بالترتیب اردو اور انگریزی میں دیوان کامران پر پیش لفظ لکھا ہے اور کامران کی شاعرانہ عظمتوں کو اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے شہنشاہ ہمایوں اور مرزا کامران کے سیاسی اختلافات پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ انھوں نے دیوان کامران کا انگریزی میں سلیس ترجمہ کر کے فارسی ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ ان کی یہ کاوش ادبی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتی

ہے۔ انھوں نے یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرزا کامران ایک فطری شاعر تھے۔ ان کی یہ تصنیف ۱۹۲۹ء میں شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔

ہفت اقلیم جلد اوّل

ہفت اقلیم کے مصنف کا نام احمد رازی ہے، مصنف کا تعلق شاہ طہماسپ کے زمانے سے ہے، یہ تصنیف ایک مکمل بایوگرافی ہے۔ اس کا ایک نسخہ خدابخش خاں لائبریری میں تھا۔ پروفیسر محفوظ الحق نے مسٹر اے۔ ایچ ہارلے اور خان بہادر مولوی اے۔ مقتدر کے تعاون سے ہفت اقلیم جلد اول کو مرتب کیا۔ یہ کتاب ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے زیر اہتمام ۱۹۳۹ء میں بیپٹسٹ مشن پریس کلکتہ سے شائع ہوئی۔ انھوں نے امین احمد رازی کی ادبی صلاحیتوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مصنف نے کس طرح نثر اور نظم کی مدد سے یہ تصنیف مکمل کی۔ ہفت اقلیم تین جلدوں میں ہے، اس کی ہر جلد پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ محفوظ الحق صاحب نے انگریزی میں اس پر مقدمہ بھی لکھا اور اس کا دلکش ترجمہ فارسی سے انگریزی میں کیا ہے۔

رباعیات عمر خیام

رباعیات عمر خیام کا ایک قلمی نسخہ (مرقومہ ۹۱۱ ہجری) پروفیسر محفوظ الحق نے اپنے عزیز دوست پروفیسر نجیب اشرف ندوی سے حاصل کیا اور بڑے اہتمام سے ترتیب دیا، انھوں نے اس کا انگریزی ترجمہ نہایت شیریں اور دلکش انداز میں کیا۔ انھوں نے اس پر ایک تمہیدی نوٹ بھی لکھا ہے اور خیام کی شاعرانہ وفلسفیانہ عظمت کو اجاگر کیا ہے۔ ان کی یہ تصنیف بھی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے زیر اہتمام ۱۹۳۹ء میں بیپٹسٹ مشن پریس، کلکتہ سے شائع ہوئی۔ پروفیسر محفوظ الحق کا یہ کارنامہ علم وتحقیق

کے میدان میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں محققین نے ان کو بے پناہ داد وتحسین سے نوازا۔

ماہ پیکر

ماہ پیکر اردو کی ایک پرانی مثنوی ہے، مؤلف کا نام احمد جلیدی اور سال تصنیف ۱۲۰۸ھ ہجری ہے۔ اِس کا ایک نسخہ ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں تھا، دوسرا نسخہ امپیریل لائبریری، کلکتہ کے بوہار سکشن میں تھا۔ اس میں کل ۱۸۱ اوراق ہیں، پروفیسر محفوظ الحق نے اس مثنوی کے نسخے کو بڑے اہتمام کے ساتھ ترتیب دیا اور اس مثنوی کی ادبی خوبیوں کو اجاگر کیا۔ نواب نصیر حسین خیال صاحب نے مثنوی ماہ پیکر کا ذکر اپنی کتاب داستانِ اردو میں کیا ہے۔ پروفیسر محفوظ الحق صاحب نے اِس گمنام مثنوی کو ترتیب دے کر اردو ادب پر گراں قدر احسان کیا ہے۔

ان تحقیقی وتدوینی کاموں کے علاوہ پروفیسر محفوظ الحق نے اردو اور انگریزی میں بہت سے علمی اور تحقیقی مقالات بھی لکھے، یہاں میں چند اہم مقالات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان کے اردو مقالات "زیب النساء بیگم اور اس کا مرتب کردہ مرقع" (مطبوعہ "شمع" حسن منزل، آگرہ، جلد دوم ۱۹۲۵ء)، "فرنچ مستشرق دی تاسی کا تذکرۂ شعرائے اردو" (مطبوعہ معارف، اگست وستمبر ۱۹۲۲ء) اور "زیب النساء اور دیوانِ مخفی" (مطبوعہ معارف، ماہ مئی ۱۹۲۳ء) تحقیقی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مقالات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر محفوظ الحق ایک ذہین اور سچے محقق تھے۔ ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب وہ کسی موضوع پر قلم اٹھانا چاہتے تھے تو مختلف ذرائع سے معلومات فراہم کر کے اطمینان حاصل کر لیتے تھے اور یہی سبب ہے کہ ان کے مقالات بڑے علمی اور معیاری تحقیق وتنقید کا نمونہ ہیں۔

پروفیسر محفوظ الحق کے انگریزی مقالات "اسلامی خطاطی کے کچھ نمونے" (مطبوعہ "روپام" ۱۹۲۹ء)، "اردو شاعری کو اہلِ یورپ اور اینگلو انڈین کی دین" (مطبوعہ "اورینٹ" لاہور

۱۹۲۵ء) اور کیا اکبر بالکل ان پڑھ تھا؟" (مطبوعہ اسلامک کلچر ۱۹۳۲ء) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ بالا مقالات کے علاوہ پروفیسر محفوظ الحق کے خطوط بھی ادبی نقطۂ نظر سے بڑے اہم ہیں۔ ان کے چند خطوط بنام ڈاکٹر مختار الدین آرزو اور نصیر الدین ہاشمی رسالہ "نقوش" (لاہور) کے مکاتیب نمبر (نومبر ۱۹۵۷ء) میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان خطوط سے پروفیسر محفوظ الحق کے حالات زندگی اور علمی کاموں پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

مرض اور وفات

پروفیسر محفوظ الحق سعد اللہ پوری کافی عرصہ تک علیل رہے۔ علامہ جمیل مظہری صاحب فرماتے ہیں کہ ۔ وہ ٹی ۔ بی کے مرض میں مبتلا تھے۔ پہلے ان کا علاج کلکتہ میڈیکل کالج میں ہوا، جب صحت کی امید نظر نہیں آئی تو اپنے ایک قریبی عزیز پروفیسر زین العابدین (لنگرٹولی پٹنہ) کے دولت کدے پر تشریف لے گئے اور عرصۂ دراز تک علالت کی سختی اور مصائب جھیل کر ۱۵؍جون ۱۹۴۶ء کی شب میں تقریباً چار بجے صبح اپنے مولا سے جا ملے، ان کی موت کی غمناک خبر ہندوستان کے مختلف اخبارات میں شائع ہوئی تھی، اس موقع پر رسالہ "معاصر" پٹنہ کے صفحہ ۸ کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس میں ان کی موت سے متعلق گہرے تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے:

> "مرحوم ایک نفس دوست، زندہ دل اور با مذاق انسان، ادیب و انشا پرداز اور فاضل محقق تھے۔ تعصب مذہبی کا مرحوم میں شائبہ تک نہ تھا۔ داراشکوہ کی مجمع البحرین اور اس کی تصنیفات کو منظرِ عام پر لانے والا ایک راسخ العقیدہ حنفی مسلمان اور مسلم لیگ کا حامی و شیدا تھا۔ مسلمانوں کے جائز حقوق سے مرنے والے کو ہمدردی تھی، لیکن برادرانِ وطن سے بگاڑ بھی اسے پسند نہ تھا۔ چنانچہ اس ہردلعزیز ہستی کے کمالات کا اعتراف نہ صرف مسلمانوں

بلکہ ہندوؤں نے کما حقہٗ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مرحوم باوجود شعبۂ فارسی و
اردو سے تعلق رکھنے کے ممتاز مورخین اور ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال
کے مختلف شعبوں کے حضرات کے درمیان صف آرا[1] رہتے تھے۔

مختصر یہ ہے کہ خان بہادر پروفیسر محفوظ الحق مرحوم اگر کچھ عرصہ اور باحیات رہتے تو اپنے قیمتی علمی کام سے فارسی، اردو اور انگریزی ادب کو بہت کچھ دیتے تاہم انھوں نے اپنی مختصر زندگی میں جو کارنامہ انجام دیا وہ انھیں زندۂ جاوید بنانے کے لئے کافی ہے۔

۱۔ یہاں صف آرا کا استعمال محل نظر ہے۔

پروفیسر محمد محفوظ الحق صاحب کے ایک خط بنام نصیر الدین ہاشمی مرحوم مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۴۳ء کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے (مزید معلومات)

"رسالہ اردو میں جو تنقید چھپی ہے ۔۔۔۔ اگر وہ ذاتی اختلاف کی بنا پر لکھی گئی ہے تو مجھے اس کا بیحد افسوس ہے، تحقیقات کا کام ایسا ہے کہ غلطیوں کا ہونا لازم ہے۔ بھول چوک ضرور ہوگی، فروگذاشتیں بھی ہوں گی، بعض نظریوں سے اختلاف بھی ہوں گے اور چند سال بعد آپ خود ترمیم و تنسیخ کریں گے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ محاسن سے چشم پوشی کی جائے اور چند غلطیوں کی بنا پر مولف اور اس کی کتاب کو مورد طعن و تشنیع بنایا جائے۔ اس قسم کی دل آزار تنقید دل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمت پست ہوتی ہے اور نئے کام کرنے والوں کو جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اس میدان میں قدم اٹھائیں۔"

(نقوش۔ مکاتیب نمبر، حصہ دوم صفحہ ۶۲۲)

شیخ الجامعہ انور جمال قدوائی

جامعہ ملیہ کی رپورٹ

(۱۹ مارچ ۱۹۸۱ء کو جامعہ ملیہ کا جلسۂ تقسیمِ اسناد امیرِ جامعہ جناب جسٹس محمد ہدایت اللہ صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں جناب شیخ الجامعہ صاحب نے حسب ذیل رپورٹ پیش فرمائی۔)

محترم امیرِ جامعہ جسٹس ہدایت اللہ صاحب، محترمہ ڈاکٹر منرما دھوری شاہ، اسناد حاصل کرنے والے طلبائے جامعہ اور خواتین و حضرات!

جامعہ کا کانووکیشن اپنے ساتھ کچھ یادیں لاتا ہے۔ اس موقع پر جامعہ اپنے بانیوں اور معماروں کو انتہائی احسان مندی سے یاد کرتی ہے۔ مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی، جنھوں نے اس کو قائم کیا، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری، جنھوں نے ابتدائی برسوں میں، جامعہ کو، جو ایک باغی ادارے کی حیثیت سے برطانوی کنٹرول سے باہر تھی اور سرکاری امداد قبول کرنے سے انکار کر چکی تھی، بڑی حد تک اپنے ذاتی وسائل سے زندہ رکھا۔ شفیق الرحمٰن قدوائی، جنھوں نے تعلیم بالغاں کا کام پھیلانے کے لیے دلّی کی خاک چھانی، ہمارے تین رتن یعنی ذاکر حسین، عابد حسین اور محمد مجیب، جنھوں نے غریبی اور مفلسی کے زمانے میں جامعہ کی تعمیر کی اور اس کا باغیانہ جھنڈا اونچا رکھا، ان تین رتنوں میں صرف پروفیسر محمد مجیب ہمارے درمیان موجود ہیں جنھیں ہم خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

گذشتہ دو برسوں میں ہم نے مختلف مواقع پر اپنے دو بانیوں کی وسیع پیمانے پر یاد منائی۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء میں مولانا محمد علی کے صد سالہ یوم پیدائش کی تقریبوں کا افتتاح ہمارے امیرِ جامعہ جسٹس ایم، ہدایت اللہ، نائب صدر، جمہوریۂ ہند نے کیا۔ ڈاکٹر انصاری کے یوم پیدائش کی سو سالہ تقریبات کا افتتاح ۲۶ مارچ ۱۹۸۰ء کو وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھوں ہوا۔ ان دونوں تقریبوں کے موقع پر شعبۂ تاریخ و تمدّن نے سیمینار منعقد کیے جن میں ہندوستان کے مختلف حصّوں سے آنے والے مؤرّخین نے حصّہ لیا اور ان رہنماؤں کی زندگی اور کارناموں پر روشنی ڈالی اور اُس سیاسی پس منظر کو نمایاں کیا، جس میں انھوں نے ملک کی خدمت کی تھی "مولانا محمد علی اور ہندوستانی سیاست" کے موضوع پر اکتوبر ۱۹۷۹ء میں سیمینار منعقد ہوا۔ "ہندوستانی قوم پرستی کی علاقائی بنیادیں" کے موضوع پر نومبر ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹر انصاری سیمینار ہوا، جس کا افتتاح جناب سید میر قاسم نے کیا۔ اردو ڈیپارٹمنٹ نے "ڈاکٹر عابد حسین کی ادبی اور قومی خدمات" کے موضوع پر ۱۲ فروری ۱۹۸۰ء کو ایک سیمینار کیا۔

چودھویں صدی ہجری کے سلسلے میں ایک بین اقوامی سیمینار وگیان بھون میں منعقد ہوا، جس کا موضوع تھا: "عالمی تہذیب میں اسلام کا حصہ"۔ اس کا افتتاح ۲۸ جنوری ۱۹۸۱ء کو وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کیا۔ اس سیمینار کی تنظیم اور کاروائی میں جامعہ کے اساتذہ نے نمایاں حصہ لیا۔ ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک اینڈ عرب۔ ایرانین اسٹڈیز نے بھی جنوری ۱۹۸۱ء میں ایک سہ روزہ سیمینار کیا۔ عنوان تھا "ہندستان میں اسلامی تمدّن کا ارتقار"۔ اس سیمینار میں پرانے اور نئے دونوں قسم کے عالموں نے حصّہ لیا۔

شعبۂ اردو کا ایک غیر معمولی کارنامہ منشی پریم چند کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں اُردو افسانے کے موضوع پر ہند و پاک سیمینار تھا۔ اس کا افتتاح وزیر خارجہ شری پی، وی نرسمہا راؤ نے کیا اور اس میں ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز تخلیق کاروں نے شرکت کی۔

اس سیمینار سے جامعہ میں ایک خیال پیدا ہوا جسے ہم وزیر خارجہ کے سامنے رکھ چکے

ہیں اور اب ہم یو جی سی کے چیرمین کے سامنے بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ ہندُستان میں ایک ایسے سینٹر کی ضرورت ہے جو ہندوستان اور پاکستان کے اردو ادیبوں کو ایک ساتھ بیٹھنے اور غور کرنے کا موقع فراہم کرے اور جہاں وہ اپنے مشترک بندھنوں کو پھر باندھ سکیں اور اپنی انفرادی شناخت کو دوبارہ پاسکیں۔ گذشتہ تیس برسوں میں جو خون بہا ہے اس کے باوجود یہ روحانی اور فنی رشتے آج بھی مضبوط ہیں۔ اس کے باوجود کہ دونوں ملکوں کے اُردو ہندی اخبار فرقہ پرستی کی آگ اُگلتے رہے ہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اُردو اور ہندی ادب فرقہ وارانہ نفرت سے بالکل پاک رہے ہیں۔ دونوں نے انسان کی انسان کے ساتھ حیوانیت پر آنسو بہائے ہیں اور انسان دوستی اور اس کے وقار کی خاطر لڑتے رہے ہیں۔

اردو افسانہ سیمینار نے ہمیں یہ بھی یاد دلایا کہ اس تقسیم شدہ برصغیر کے دونوں حصوں کے درمیان ابھی ایک زبان باقی ہے، جس میں ہم تبادلۂ خیال کر سکتے ہیں اور تہذیبی لین دین کر سکتے ہیں اور جو ہماری پرانی یک جائی کے روحانی نچوڑ کو اب بھی بچا سکتی ہے۔ یہ زبان ہمارے رشتوں کی ایک انمول زنجیر ہے۔ اسے ہمیں بچانا بھی ہے اور مضبوط بھی کرنا ہے۔ ہم ایک بڑی قوم ہیں اور بڑی قوموں کی طرح دور اندیشی سے کام لینا چاہیئے۔ روس کے ساتھ سرد جنگ ہو یا نیم گرم دوستی، دونوں حالتوں میں برطانیہ اور امریکہ نے وسیع پیمانے پر روسی مطالعے اور تحقیقات کا کام جاری رکھا اور روسی ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ آنے جانے کا سلسلہ بھی قائم رکھا۔ وہ جانتے ہیں کہ خواہ کسی ملک سے وہ جنگ کی حالت میں ہوں یا امن کی حالت میں، انھیں اس ملک سے بات کرنے کے لیے ایک مشترک زبان کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ہندوستان میں ایک ایسے مرکز کا قیام جو ہندوستان اور پاکستان کے اُردو مصنّفین کو سمیٹ کر ایک جگہ لائے ایک بہت بڑا کام بھی ہوگا اور ایک بڑی دولت بھی ثابت ہوگا۔ یہ مرکز دلی میں قائم ہونا چاہیے اور اس کام کے لیے جامعہ سے بہتر جگہ اور کون سی ہو سکتی ہے۔

اسی گہرے یقین کے تحت کہ اردو اور ہندی ادیبوں کا اندازِ فکر سیکولر ہے،

ہم نے وزارت داخلہ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ مراد آباد میں جہاں ابھی تک فرقہ وارانہ قتل و غارت گری کے زخم تازہ ہیں، قومی یکجہتی میں اُردو اور ہندی کے رول پر ایک سیمینار کیا جائے۔ ہم مراد آباد کے عوام کو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اُردو اور ہندی ادب کے بہترین تخلیق کاروں کے دامن فرقہ وارانہ نفرت سے کتنے پاک رہے ہیں۔ جس وقت بھائی سے بھائی لڑ رہا تھا اُردو اور ہندی کے لکھنے والے تعصب سے بلند ہو کر صرف انسانی قدروں کی حمایت کر رہے تھے۔

ہمارا شعبۂ اردو ملک میں اُردو کی اشاعت کے لیے ایک اور اہم خدمت انجام دے رہا ہے۔ یہ ایک اُردو خط کتابت کورس چلا رہا ہے جس کے تحت ہندی اور انگریزی زبانوں کے ذریعے اُردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ پچھلے سال تمام ہندوستان سے تقریباً ۴۰۰۰ طلبا نے اس کورس میں داخلہ لیا۔

یو جی سی کی مالی مدد اور ترقی اردو بورڈ سے شائع ہونے والی "اُردو کتب کی سالانہ وضاحتی ببلیو گرافی" پر شعبے میں اس سال بھی کام جاری رہا۔ اس بڑے منصوبے کی پہلی جلد شائع ہو چکی ہے۔ صدر پاکستان نے اُردو کے پروفیسر، پروفیسر گوپی چند نارنگ کو اقبال کی صد سالہ تقریبات کے موقع ایک طلائی تمغہ دیا۔

بد قسمتی سے ہمارا ہندی ڈیپارٹمنٹ صرف آنرز کی سطح تک تعلیم دے رہا ہے۔ لیکن ہمارے لیے یہ بات بڑے فخر کی ہے کہ ہم نے اردو اور ہندی کی پہچان مسلم اور اردو سے تسلیم نہیں کی ہے۔ ہمارے اردو کے پروفیسر ہندو ہیں اور شعبۂ ہندی کے صدر ڈاکٹر مجیب رضوی ایک مسلمان ہیں۔ شعبۂ ہندی کے استاد ڈاکٹر اصغر وجاہت ہندی کے ممتاز لکھنے والے ہیں اور انھیں ایک اہم ادبی انعام ملا ہے۔ جناب اشوک چکردھر کی رہنمائی میں شعبۂ ہندی نے تصویروں اور کارٹونوں کی ایک نمائش کا اہتمام کیا جس میں خاص طور پر مراد آباد کے فسادات کے حوالے سے فرقہ وارانہ فسادات کے وحشیانہ اور المناک مناظر کو پیش کیا گیا تھا۔

شعبۂ اسلامک اسٹڈیز نے ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے

اشتراک سے "سیکولر ہندوستان میں اقلیتی مذہبی تعلیم" کے عنوان پر ایک عیسائی مسلم سیمینار کا انتظام کیا۔

باہمی مفاہمت اور قومی یکجہتی کے لیے یہ ہماری چند حقیر سی کوششیں تھیں۔ اپنے بانیوں اور بنانے والوں کے آدرشوں سے قریب رہنے کی وجہ سے ہم اپنے ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل کے لیے فرقہ وارانہ، علاقائی یا لسانی نظریوں کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں میں شامل نہیں ہوتے۔ ایسی جذباتی وابستگیوں سے کنارہ کشی کی وجہ سے جامعہ تنہا رہی ہے اور غالبًا اسی وجہ سے بے توجہی کا شکار بھی ہوئی۔

یو جی سی چیرمین کے اس حالیہ بیان سے ہمارے حوصلے بڑھے ہیں کہ نئی نئی یونیورسٹیاں بنانے کے بجائے یو جی سی کے وسائل کا ایک بڑا حصہ کم ترقی یافتہ یونیورسٹیوں کی ترقی پر صرف ہونا چاہیے۔ ہماری یونیورسٹی اس زمرے میں آتی ہے۔

یونیورسٹی میں جو بنیادی سہولتیں ہونا چاہئیں ہم ان سے محروم رہے ہیں۔ جامعہ ہندوستان کی وہ اکیلی یونیورسٹی ہے جسے اتنے دنوں میں ایک آڈیٹوریم بھی نصیب نہیں ہوا۔ مفلسی کے دور میں جو عمارتیں یہاں تعمیر ہوئی تھیں اُن کی عمر پوری ہو چکی ہے اور وہ برے حال میں ہیں۔ کچھ عمارتوں کو پہلی حالت پر لانے کے لیے نئی چھتیں ڈالنے اور بڑے پیمانے پر مرمّت کی ضرورت ہے۔ اسکول آف سوشل ورک اور ڈیپارٹمنٹ آف انجینیرنگ ابھی تک کچّی جھونپڑیوں میں ہیں۔ گرمی کے تپتے ہوئے مہینوں میں یہ واقعی تنور ہو جاتی ہیں۔ کاغذ پر دیکھیے تو ہمارا کیمپس بہت وسیع نظر آئے گا لیکن درحقیقت یہ بہت چھوٹا تھا کیونکہ ڈی ڈی اے نے ماسٹر پلان میں ہمارے لیے جو زمین مخصوص کی تھی اس کا بڑا حصّہ ابھی تک جامعہ کے حوالے نہیں کیا تھا۔

تعلیمی نقطۂ نظر سے ہماری حیثیت یونیورسٹی اور ڈگری کالج کے درمیان ہے۔ ہمارے یہاں کئی روایتی تعلیمی شعبوں میں، جن میں نیچرل سائنسز بھی شامل ہیں، پوسٹ گریجویٹ تعلیم کی سہولتیں نہیں ہیں اور ابھی وہاں صرف آنرز تک تعلیم دی جا رہی ہے۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ حکومت اور یو جی سی دونوں ہی کو ہماری محرومیوں کا اب احساس ہو چلا ہے اور ہماری طرف ان کے رویے میں آہستہ آہستہ تبدیلی آرہی ہے۔ مارچ ۱۹۸۰ء میں جب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ، انصاری صد سالہ تقریبات کا افتتاح کرنے یہاں آئیں تو انھوں نے اس موقع پر جامعہ کے لیے بطور تحفہ ایک آڈیٹوریم کی تعمیر کا اعلان کیا۔ یہ منصوبہ ابھی تک یو جی سی میں تکمیل کی ابتدائی منزلوں میں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ڈاکٹر انصاری کے نام سے اس منصوبے کی تکمیل کے سلسلے میں کمیشن اُس فراخدلی سے کام لے گا جو قومی رہنما ڈاکٹر انصاری کی شخصیت کے شایان شان ہو اور اس بات کا خیال رکھے گا کہ انصاری آڈیٹوریم، ڈاکٹر ذاکر حسین کے مقبرے کے سامنے بنے گا۔

۱۹۶۳ء میں شری جگموہن کی توجہ سے دہلی ایڈمنسٹریشن کے ذریعے جامعہ کو ایک ماسٹر پلان ملا جس میں اس کی توسیع کے لیے زمین مخصوص کی گئی تھی۔ دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر بننے کے بعد اب انھیں اس بات کا موقع ملا ہے کہ وہ اس پلان کو نافذ کر سکیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ابھی پچھلے ہفتے یہ زمین جامعہ کو مل گئی ہے، ہم شری جگموہن کے بے حد ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنا ایک پرانا وعدہ پورا کیا۔

خوش قسمتی سے وزارت تعلیم ڈی، ڈی، اے کو زمین کی قیمت ادا کرنے پر راضی ہو گئی ہے اور یو جی سی نے زمین کو غیر قانونی قبضے سے بچانے کی غرض سے ایک چہار دیواری کی تعمیر کے لیے تقریباً ۱۲ لاکھ منظور کیے ہیں۔

پانچویں پلان کے دوران یو جی سی نے جامعہ کے یونیورسٹی اسٹاف کی رہائش کے لیے ۲۸ اسٹاف کوارٹروں کی تعمیر کی منظوری دی تھی۔ اس منصوبے پر عملدرآمد میں جو بہت سی رکاوٹیں پیش آئیں، ان کی وجہ سے اسٹاف کوارٹروں کی تعمیر پلان کے آخری مہینوں میں ہی شروع ہو پائی۔ اس عرصے میں قیمتیں آسمان کو چھونے لگیں اور ہم یو جی سی کی منظور کردہ رقم سے صرف ۱۳ کوارٹر ہی بنا سکے۔ یو جی سی سے ہم مزید رقم کے لیے برابر اصرار کر رہے ہیں تاکہ باقی اسٹاف کوارٹر بھی بنائے جا سکیں۔

پانچویں پلان میں یو جی سی نے جامعہ کو ۱۵۰ طلبا کی رہائش کے لیے پہلے بوائز ہوسٹل کی منظوری دی۔ اس کی تعمیر کا کام سی، پی، ڈبلیو، ڈی کے سپرد کیا گیا ہے اور ڈی، ڈی اے میں تعمیر کا پلان داخل کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ ۱۹۸۱ء کے آخر تک بوائز ہوسٹل کی تعمیر کا کام پورا ہو جائے گا۔

پرائم منسٹر نے ہمیں ۵ لاکھ روپے کا جو عطیہ دیا تھا اس سے ہم نے اپنے کم تنخواہ دار ملازمین کے لیے ۱۰ اسٹاف کوارٹر تعمیر کیے جو مکمل ہو چکے ہیں۔

پانچویں پلان میں کیمپس کو بہتر بنانے کے لیے یو جی سی نے ۴ لاکھ ۷۵ ہزار روپے کی رقم دی تھی۔ اس رقم سے سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ بجلی کے لیمپ نصب کیے گئے۔ اور جن اسٹاف کوارٹرز میں ابھی تک سینیٹری کی سہولتیں نہیں تھیں، وہاں یہ سہولتیں فراہم کی گئیں۔

سعودی حکومت نے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی عمارت کی تعمیر کے لیے ۲ لاکھ ۷۵ ہزار روپے کا عطیہ دیا تھا۔ بڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے اس عمارت کے منصوبے پر اب ۱۰ لاکھ کا خرچ آئے گا۔ لیکن ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ جو رقم اس وقت ہمارے پاس ہے اس سے جتنی بھی عمارت تعمیر ہو سکے، اسے بنوالیا جائے، لہٰذا تعمیر کا کام شروع ہو گیا ہے۔ امید ہے کہ ہمیں کسی نہ کسی ذریعے سے مزید رقم مل جائے گی اور ہم اس عمارت کو پورا کر لیں گے۔

جامعہ کی تعلیمی سرگرمیوں کے ایک حصّہ کی امداد وزارتِ تعلیم کے ذمّے ہے۔ ان میں ہمارے تین اسکول، انجینیرنگ کالج اور اردو خط کتابت کورس شامل ہیں۔ مجھے یہ بتاتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ وزارتِ تعلیم نے اب اپنا یہ خیال بدل دیا ہے کہ اسے ان اداروں کو محض چلتے رہنے کے لیے مالی امداد دینا ہے، اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔

نرسری اسکول اتنے برسوں تک ایک کام چلاؤ عمارت میں تھا، لیکن اسے حال ہی میں ایک نئی عمارت میں منتقل کر دیا گیا ہے جو وزارتِ تعلیم کی مدد سے بنائی گئی

ہے۔ وزارتِ تعلیم نے اُردو خط کتابت کورس کے کام کو آگے بڑھانے کی خاطر شعبۂ اردو کی عمارت کی توسیع کے لیے بھی رقم فراہم کی ہے۔ لیفٹیننٹ گورنر نے جامعہ کیمپس میں اُردو اکیڈمی قائم کرنے کی تجویز رکھی ہے۔ ہم اکیڈمی کے قیام کے لیے شعبۂ اردو کی عمارت میں اور اضافہ کر رہے ہیں۔

چھٹے پلان میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ وزارتِ تعلیم نے ہمارے مستقبل کے توسیعی کاموں کے لیے ایک رقم مقرر کی ہے۔ فینانس کمیٹی میں وزارت تعلیم کے نمائندے نے ہمیں اس قسم کا تاثر دیا تھا کہ یہ رقم ۷۵ لاکھ روپے کی ہوگی لیکن ہمیں منظوری کا جو خط ملا ہے اس میں یہ رقم گھٹا کر ۵۰ لاکھ روپے کر دی گئی ہے۔ ہم نے اس کٹوتی کے خلاف وزارتِ تعلیم میں اپنی پریشانی بیان کر دی ہے۔ وزارتِ تعلیم کی مدد سے چلنے والے جامعہ کے اداروں کے سلسلے میں بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ اسکول کی عمارتوں کی توسیع کرنی ہے۔ انجینیرنگ کالج کو جو کافی عرصے سے ایک عارضی عمارت میں ہے، بہتر عمارت کی ضرورت ہے۔ پرانی دہلی میں بالک ماتا سینٹر کی عمارتوں کی مرمت بھی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اسکول کی تعلیم میں نسبتاً بہتری پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ پیشوں کے نقطۂ نظر سے اس میں ایک نیا دھارا شامل ہو جائے اور اسکول کی تعلیم طالب علموں کو روزگار کے لائق بنا سکے۔ ان تمام کاموں کے لیے ۵۰ لاکھ روپے کی رقم کافی نہیں ہوگی۔

یونیورسٹی کے دائرے میں اس سال کے آغاز سے ہم نے کالج کے ڈھانچے کو ختم کرکے چار فیکلٹیاں قائم کی ہیں اور اس طرح فیکلٹی نظام کی ابتدا کی ہے۔ ان فیکلٹیوں کے نام اس طرح ہیں: فیکلٹی آف ہیومینیٹیز اینڈ لینگویجز، فیکلٹی آف سوشل سائنسز، فیکلٹی آف نیچرل سائنسز اینڈ ٹیکنولوجی اور فیکلٹی آف ایجوکیشن۔ نئے ڈین مقرر کیے گئے ہیں جو ان فیکلٹیوں کی سربراہی کر رہے ہیں۔

ہم یو جی سی کو چھٹے پلان کے لیے اپنا ترقیاتی پلان پیش کر چکے ہیں۔ ہم نے اس پلان میں انڈر گریجویٹ شعبوں کو پوسٹ گریجویٹ سطح تک پہنچا کر اور کامرس اور بائیلوجی میں

انڈر گریجویٹ تعلیم کی مزید سہولتیں فراہم کرنے اور جامعہ کو یونیورسٹی کی شکل دینے پر خاص طور سے زور دیا ہے۔

ہمیں وزیٹنگ کمیٹی کی آمد کا انتظار ہے جو جامعہ کے ترقیاتی منصوبوں کا جائزہ لے گی۔ ہمیں امید ہے کہ ان منصوبوں کی جانچ کرتے وقت یو جی سی اس بات کا خیال رکھے گی کہ جامعہ کی ترقی تقریباً دو دہائیوں سے رکی ہوئی ہے اور یہ کہ گذشتہ پلانوں میں اس کی ترقی کے لیے بہت معمولی رقمیں دی گئی تھیں۔

انجینیرنگ کالج میں ہم ایک بڑا قدم اٹھا چکے ہیں۔ ہم نے سول انجینیرنگ میں چار سال کا ایک ڈگری کورس ان ڈپلوما یافتہ لوگوں کے لیے شروع کیا ہے جو دن میں کام کرتے ہیں اور اپنی تعلیمی استعداد اور کیریئر کو بہتر بنانے کے خواہاں ہیں۔ یہ قدم یو جی سی کے ان اصولوں سے میل کھاتا ہے جن کا ماضی میں وہ اعلان کر چکی ہے۔ کمیشن نے مسلسل تعلیم، یونیورسٹیوں کے درمیان ساز و سامان کی حصہ داری اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے باہمی تبادلے پر کافی زور دیا ہے۔ ہم نے اپنے شام کے ڈگری کورس کو چلانے کے لیے ان تمام اصولوں کی پیروی کی ہے۔ ہم ڈپلوما یافتہ طلباء کے عملی کاموں کے لیے آئی آئی ٹی کی لیبوریٹریاں استعمال کر رہے ہیں اور اس کورس کی تدریس کے لیے آئی آئی ٹی اور دہلی کالج آف انجینیرنگ کے اساتذہ کی خدمات حقیر معاوضے پر حاصل کر رہے ہیں۔ ہماری ڈگریوں کو سستا سودا نہ سمجھ لیا جائے اس لیے اس کورس کے تمام ممتحن جامعہ سے باہر کے ماہر تعلیم مقرر کیے گئے ہیں اور گذشتہ سال میں نے ذاتی طور پر ممتحن حضرات کو ایک خط لکھا تھا کہ وہ جانچ کرتے وقت کسی قسم کی رعایت نہ کریں اور ویسی ہی سختی برتیں جیسی ڈگری کورسز کی تعلیم دینے والے بہترین انجینیرنگ کالجوں کے سلسلے میں برتی جاتی ہے۔

اس کورس کو چلانے میں کچھ مالی دشواریاں بھی پیش آئیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ہمارے تجربے کے سلسلے میں یو جی سی اور وزارت تعلیم کا رویہ ہمدردانہ ہے اور انھوں نے ایک کمیٹی مقرر کی ہے جو اس کورس کی ضرورت پر غور کر کے یہ سفارش

کرے گی کہ جامعہ کو یہ کورس چلانے کے لیے سرکار سے کس قدر مالی امداد ملنی چاہیئے۔
ٹیکنیکل ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے کریکلم ڈیولپمنٹ سینٹر کے زیرِ اہتمام جامعہ میں ایک سیمینار منعقد ہوا جس نے ایک بلڈنگ سروسز کورس کی شکل اختیار کی۔
جامعہ نے بلڈنگ سروسز میں ڈپلوما کورس کا ایک منصوبہ وزارت تعلیم کو پیش کیا ہے۔ اس کورس کا مقصد ایک ایسا ہمہ جہتی انجینیر بنانا ہے جس کی کئی منزلہ اونچی اونچی عمارتوں اور ہوٹلوں اور ہوائی اڈوں کے رکھ رکھاؤ کے کاموں میں سخت ضرورت ہے۔ ان کو ایک ایسا انجینیر درکار ہے جو سول، الیکٹریکل اور مکینیکل انجینیرنگ کے بارے میں اتنی معلومات ضرور رکھتا ہو کہ وہ اس طرح کی بڑی عمارتوں کی آئے دن کی ضروریات سے نمٹ سکے یہ اسکیم وزارت میں زیرِ غور ہے۔
ہمارا جذبۂ شوق جامعہ میں مسلسل تعلیم کی توسیع کی طرف مائل ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس طرح یونیورسٹیوں میں لگائے گئے قومی سرمایے کے بدلے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہوگا۔ ہم نے شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ کے کورسز اور اسکول چھوڑنے والے طالب علموں کے لیے الیکٹرونکس اور ڈرافٹس مین شپ جیسے تکنیکی حرفے بھی شروع کیے ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ آف کوسٹ اینڈ ورکس اکاؤنٹینس کے اشتراک سے ہمارا شعبۂ معاشیات کوسٹ اینڈ ورکس اکاؤنٹینسی کا کورس چلا رہا ہے۔ ہم یوجی سی کے سامنے جامعہ میں مسلسل تعلیم کے سلسلے میں ایک مکمل اسکیم عنقریب پیش کرنے والے ہیں۔
لیکن ہماری سب سے بڑی اور قومی نقطۂ نظر سے بہت اہم اسکیم جامعہ میں سینٹر آف ماس کمیونیکیشن کے قیام کی ہے جو یوجی سی میں زیرِ غور ہے۔ مجوزہ سینٹر ریڈیو اور ٹیلی ویژن اسٹوڈیوز پر مشتمل ہوگا اور اس میں ۱۶ ملی میٹر فلمیں بنانے اور ترتیب دینے کی آسانیاں حاصل ہوں گی۔ یہ سینٹر ماس کمیونیکیشن میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما کے لیے تعلیم و تربیت کا انتظام کرے گا اور اس طرح ملک میں ماس میڈیا کے لیے تربیت یافتہ اشخاص کی بڑھتی ہوئی ضرورت پوری کرے گا۔ یہ سینٹر نرسری اور اسکولی تعلیم سے یونیورسٹی تعلیم تک کی ملک گیر تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے مقصد سے میگننگ

ٹیپ وریڈیو ٹیپ اور فلم کے ذریعے پروگرام بنائے گا نیز ملک کی ترقیاتی ضرورتوں کے پیش نظر یہ سینٹر صحت، خاندانی منصوبہ بندی، زراعت، کمیونٹی ڈیولپمنٹ، سماجی اصلاح وفلاح کے موضوعات پر پروگرام کی ترتیب دے گا۔

۱۹۸۲ء کے شروع میں انڈین نیشنل سٹیلائٹ کا آغاز ہونا ہے۔ اس بات کے پیش نظر ہمارے منصوبے کی قومی اہمیت ہے۔ سٹیلائٹ کو پروگراموں کی کافی ضرورت ہوگی جس کے لیے دور درشن میں بھی سہولتیں ناکافی ہیں۔ ملک میں ہمیں بہت سے اداروں کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ سٹیلائٹ کو زیادہ سے زیادہ پروگرام فراہم کرسکیں۔ اس کام میں یونیورسٹیاں بہت اہم خدمت انجام دے سکتی ہیں۔ ویسے بھی جدید دور میں یونیورسٹیاں ماس کمیونی کیشن جیسے طاقت ور توسیعی وسیلے سے بے اعتنائی نہیں برت سکتیں۔

جامعہ وہ پہلی یونیورسٹی ہے جس نے اس پیمانے پر ماس کمیونیکیشن کے قیام کی تجویز پیش کی ہے۔ پلاننگ کمیشن نے دو بیٹھکوں میں اس منصوبے پر غور کیا اور اس کی حمایت کی۔ یو جی سی نے بھی دو نشستوں میں اس پر غور کیا اور منظوری دی۔ یو جی سی کے ماہرین کی دو ٹیمیں جامعہ آچکی ہیں اور اس منصوبے کا جائزہ لے چکی ہیں۔ اس منصوبے کے لیے رقم کا تعین اب یو جی سی کو کرنا ہے۔ ہم نے یو جی سی سے صرف اتنی درخواست کی ہے کہ وہ ہمیں اسٹوڈیوز کی عمارتیں تعمیر کرنے کے لیے رقم مہیا کردے اور سینٹر کے گردانی (ریکرنگ) اخراجات پوری کرنے کی ذمہ داری لے لے۔ امید ہے کہ سینٹر کے لیے مشینی ساز و سامان ہم ایک معاہدے کے تحت باہر کی ایک یونیورسٹی کے اشتراک سے حاصل کرلیں گے۔ وزارتِ تعلیم نے اس طرح کے معاہدے کے لیے گفت وشنید کی اجازت مجھے عنایت کردی ہے۔ مجھے آپ کو یہ بتاتے ہوئے خوشی محسوس ہورہی ہے کہ اس معاملے میں حالات سازگار رہیں۔

آخر میں، میں اس سال کی اسٹوڈنٹس یونینوں کے عہدیداروں کی تعریف

کروں گا جنھوں نے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔ انھوں نے اپنے انتخابات کی مہموں میں ہماری سیکولر روایات کی آبرو رکھی اور جامعہ کے ترقیاتی کاموں میں دلچسپی لی۔ وہ ڈرائینگ بورڈ پر نئی عمارت کا نقشہ دیکھ کر یا جو بنیادیں رکھی گئی ہیں، انھیں دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے ہیں۔ وہ بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں کہ کب ان کا ہوسٹل بن کر تیار ہو اور کب یو جی سی تمام مضامین میں یکساں طور پر پوسٹ گریجویٹ سطح کی تعلیم اور کامرس اور بائیلوجی جیسے مفید مضامین شروع کرنے کی منظوری دے۔ جناب انیس جنگ، صدر، انجمن اتحاد، جامعہ کالج، جناب ویر سنگھ، سکریٹری، ٹیچرس کالج اسٹوڈنٹس یونین، جناب ذوالفقار مسعودی، صدر، جامعہ ہائر سکنڈری اسکول اسٹوڈنٹس یونین، اور جناب محمد اکبر، صدر، بچوں کی حکومت، جامعہ مڈل اسکول کا میں بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔

یہ جلسۂ تقسیم اسناد کئی برسوں کے بعد منعقد ہو رہا ہے، اس لیے مجھے یہ موقع پہلی بار ملا ہے کہ میں آپ کی خدمت میں اپنے ترقیاتی منصوبوں اور امیدوں کی داستان پیش کر سکوں۔ یہ کہانی ذرا لمبی ہو گئی ہے، جس کے لیے میں معذرت چاہتا ہوں۔

آخر میں، میں جناب امیرِ جامعہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو ان برسوں میں ہمارے مقدر کو بناتے اور سنوارتے رہے ہیں، جنھوں نے بڑی حکمت اور دانشمندی سے ہماری رہبری کی ہے، جنھوں نے موجودہ جمود سے نکلنے میں ہماری ہمت بڑھائی ہے اور جو آڑے وقتوں میں ہمارے کام آئے ہیں۔

یو جی سی کی چیرمین کا عہدہ سنبھالنے کے بعد محترمہ ڈاکٹر (مسز) مادھوری شاہ کا کسی یونیورسٹی میں یہ پہلا خطبۂ تقسیم اسناد ہے۔ ہمیں بے حد خوشی ہے کہ انھوں نے ہم پر نظرِ کرم کی اور یہاں تشریف لائیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے لیے جذبۂ احترام اور اُن کے ہاتھوں پرورش پائے ہوئے اس ادارے سے انھیں جو لگاؤ ہے وہی

انھیں جامعہ میں کھینچ لایا ہے۔ ہم ان سے ایک خاص رشتہ اور تعلق یوں بھی محسوس کرتے ہیں کہ وہ بھی ایک ایسی یونیورسٹی کے معمار ہیں جو تعلیم کی سماجی افادیت کی قائل ہے اور اسے صرف اونچے طبقے کی چمک دمک تک محدود رکھنے پر راضی نہیں ہے۔ تقسیم اسناد کے موقع پر یہاں تشریف لاکر انھوں نے جو عزّت بخشی ہے اس کے لیے ہم ان کے تہِ دل سے شکر گزار ہیں اور ہماری دعا ہے کہ یو جی سی میں ان کا دَورِ صدارت ایک کامیاب اور روشن دَور ثابت ہو۔

"ہم سیاست سے الگ رہ کر تہذیب پر بھروسہ کرتے رہے ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ آج نہیں تو کل انسانیت ان طاقتوں پر فتح پائے گی جو اسے اقتدار، دولت اور ظاہری کامیابی پر قربان کرنا چاہتی ہیں۔ ہمارے ملک کے سیاسی حالات جو نیا رنگ اختیار کرتے جارہے ہیں ان میں اور بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے عقیدے پر عمل کرتے رہیں۔ ہمارا مذہب انسانیت کے رنگ میں رنگا ہو، ہماری تہذیب، عقل اور حس کی ایک دلکش آمیزش ہو اور ایسے مذہب اور تہذیب کی مدد سے ہم تعلیم کی ایک سیاست مرتب کریں جس کا مقصد یہ ہو کہ حق شناس افراد کے ذریعے ہماری قوم میں حق اور حسن کا چرچا کیا جائے۔ ہمارا میدان محدود ہو گا تعلیم اور ادب تک مگر ہم ان دونوں میدانوں ہی میں اثر ڈال سکیں تو بہت ہے۔"

(پروفیسر مجیب، شیخ الجامعہ کی رپورٹ، ۱۹۶۸ء)

کاظم علی خاں

اُردوے معلّیٰ حصہ دوم پر ایک نظر

اردوے معلّیٰ [حصہ اوّل] کے پہلے ایڈیشن میں میر مہدی حسین مجروح نے اپنے دیباچے میں کتاب کے جس دوسرے حصّے کا اعلان کیا تھا[۱] وہ ایک طویل عرصے تک اشاعت سے محروم رہ کر ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا۔ اردوے معلّیٰ [حصہ دوم] پہلی بار اپریل ۱۸۹۹ء[۲] میں بہ اہتمام محمد عبدالاحد مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا تھا۔ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل نے اس کی ضخامت ۷۴ صفحات قرار دی ہے[۳] لیکن راقم الحروف کو یہ حصہ ۷۶ صفحات پر مشتمل ملتا ہے۔ اِس کا سائز ۲۴ × ۱۶ سنٹی میٹر اور مسطر ۲۱ سطری ہے۔ اس میں غالب کے ۵۳ خطوط کے علاوہ پانچ دیباچے اور دو تقریظیں بھی شامل ہیں۔ اُردوے معلّیٰ [حصہ اوّل] دیباچوں اور تقریظوں سے خالی تھا اور یہ صرف غالب کے مکاتیب پر مشتمل تھا۔ اردوے معلّیٰ [حصہ دوم] طبع اپریل ۱۸۹۹ء میں شامل دیباچوں اور تقریظوں کی تفصیل ذیل میں پیش ہے:

۱۔ دیباچہ سراج المعرفت [ص ص ۱ تا ۵]۔ عودِ ہندی طبع اوّل[۴] اور اُس کے بعد کی اشاعتیں اِس دیباچے سے خالی ہیں۔ اردوے معلّیٰ [حصہ دوم] طبع ۱۸۹۹ء سے قبل غالب کا یہ دیباچہ مولوی رحمت علی عرف میر لال کی کتاب موسومہ سراج المعرفت ومنہاج رحمت [مطبع سلطانی دہلی مطبوعہ ۳ جمادی الاوّل ۱۲۷۰ھ مطابق پنج شنبہ ۲ فروری ۱۸۵۴ء] میں شائع ہو چکا تھا[۵]۔ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل نے ایک جگہ

جناب کاظم علی خاں ۔ ۲۱ وکٹوریا اسٹریٹ لکھنؤ ۔ ۲۲۶۰۰۳

غالب کے اس دیباچے کو "تقریظ" لکھا ہے[۶]۔ دیباچہ اور تقریظ میں جو فرق ہے اس کے پیشِ نظر دیباچے کو تقریظ قرار دینا محلِ نظر ہے۔ سراج المعرفت پر جناب قاضی عبدالودود کا ایک مضمون شائع ہو چکا ہے[۷]۔

۲۔ دیباچۂ حدائق الانظار [ص ص ۵ تا ۷] ۔ یہ دیباچہ عودِ ہندی طبعِ اوّل [ص ص ۱۸۲ تا ۱۸۴] میں شامل ہے۔

۳۔ تقریظِ کتاب بہادر شاہ ظفر [ص ص ۷ تا ۹] ۔ اس تقریظ کا تقریباً نصف اوّل تمہیدی حصّہ بعض اختلافات کے ساتھ تقریظِ شارعِ مہر مشمولۂ عودِ ہندی طبع اول [ص ص ۱۷۹ تا ۱۸۰] میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

۴۔ تقریظِ گلزارِ سرور [ص ص ۱۰ تا ۱۱] ۔ یہ تقریظ عودِ ہندی طبع اوّل [ص ص ۱۸۰ تا ۱۸۲] میں بھی بعض اختلافات کے ساتھ شامل ملتی ہے۔

۵۔ دیباچۂ دیوانِ ذکا [ص ۱۱] ۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں اسے بہ دلائل دیباچے کے بجائے تقریظ قرار دیا ہے۔ خلیل الرحمٰن داؤدی کا یہ ارشاد خلافِ واقعہ ہے کہ غالب کی زیرِ بحث تحریر عودِ ہندی میں شامل تھی[۸]۔ مجھے عودِ ہندی غالب کی اس تحریر سے خالی ملتی ہے۔

۶۔ دیباچۂ مجموعۂ قصائد نادر [ص ص ۱۱ تا ۱۲] ۔ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل نے اس دیباچے کو کتاب کے صفحہ ۱۳ پر درج بتایا ہے[۹] لیکن مجھے یہ صفحات ۱۱ تا ۱۲ میں ہی درج ملتا ہے۔ یہ دیباچہ عودِ ہندی طبع اوّل [ص ۱۸۵] میں بھی موجود ہے۔

۷۔ دیباچہ رسالہ فرزند احمد صفیر بلگرامی [ص ص ۱۲ تا ۱۳] ۔ مولانا فاضل لکھنوی اس دیباچے کو کتاب کے صفحہ ۱۴ پر بتاتے ہیں[۱۰] حالاں کہ ص ص ۱۲ تا ۱۳ میں ہی موجود ہے یہ دیباچہ عودِ ہندی طبع اوّل [ص ص ۱۸۴ تا ۱۸۵] میں بھی شامل ہے۔

اردوئے معلیٰ حصّہ دوم میں شامل ان تمام دیباچوں اور تقریظوں پر میں اپنے ۷ عدد مضامین میں الگ الگ بحث کر چکا ہوں اور یہاں ان مباحث کا اعادہ کرنا بے محل ہوگا۔

اِن دیباچوں اور تقریظوں کے بعد اردوے معلّی حصّہ دوم طبع ۱۸۹۹ء [ص ص ۱۲ تا ۵۶] میں غالب کے ۵۳ خطوط شامل ہیں۔ کتاب میں یہ ۵۳ خطوط اگرچہ ۱۰ مکتوب الیہم کے نام ملتے ہیں لیکن بعد کی تحقیق سے مکتوب الیہم کی صحیح تعداد ۱۱ ثابت ہوتی ہے۔ کتاب میں سب سے زیادہ خطوط تفتہ کے نام ہیں اور اُن کی تعداد ۳۴ ہے۔ مولانا فاضل لکھنوی نے ایک جگہ تفتہ کے نام خطوط کی یہ تعداد خلافِ واقعہ ۳۳ قرار دی ہے[۱۱۱]۔ ممکن ہے کہ یہ کتابت کا سہو ہو۔

مہیش پرشاد و فاضل لکھنوی کی متعین کردہ تاریخوں کی روشنی میں اردوے معلّی حصّہ دوم طبع ۱۸۹۹ء کے خطوط اگست ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۸ء تک کے زمانے کو محیط ہیں۔ کتاب [ص ص ۱۹ تا ۲۰] میں تفتہ کے نام چوتھے خط کا زمانۂ تحریر مہیش پرشاد نے اگست ۱۸۵۰ء تجویز کیا ہے[۱۱۲]۔ اس کے علاوہ تفتہ و ہیرا سنگھ کے نام کتاب میں شامل کئی خطوط فاضل لکھنوی کے بموجب ۱۸۶۸ء میں تحریر ہوئے تھے[۱۱۳]۔ بہ لحاظِ ترتیبِ کتاب کا پہلا خط تفتہ کے نام ہے اور آخری خط کے مکتوب الیہ میر مہدی مجروح ہیں۔ اردوے معلّی حصّہ دوم طبع اپریل ۱۸۹۹ء میں شامل خطوط اور اُن کے مکتوب الیہم کی تعداد مع حوالہ صفحات سطورِ ذیل میں درج کی جاتی ہے:

مکتوب الیہم	تعداد خطوط	حوالہ صفحات
۱۔ منشی ہرگوپال تفتہ	۳۴	ص ص ۱۲ تا ۳۷
۲۔ ماسٹر پیارے لال	۱	ص ص ۳۷ تا ۳۸
۳۔ منشی حبیب اللہ ذکا	۵	ص ص ۳۸ تا ۴۱
۴۔ میاں داد خاں سیاح	۵	ص ص ۴۱ تا ۴۵
۵۔ شہزادہ بشیر الدین	۱	ص ۴۵
۶۔ عبدالغفور سرور[۱۱۴]	۱	ص ص ۴۶ تا ۴۷
۷۔ منشی کیول رام ہشیار	۱	ص ص ۴۷ تا ۴۸
۸۔ مولوی کرامت علی	۱	ص ص ۴۸ تا ۵۲

۹۔ منشی جواہر سنگھ جوہر	۱	ص ص ۵۳ تا ۵۴
۱۰۔ منشی ہیرا سنگھ	۱	ص ص ۵۳ تا ۵۴
۱۱۔ میر مہدی مجروح	۲	ص ص ۵۴ تا ۵۶

مکتوب الیہم کی تعداد ۱۱ خطوط کی تعداد ۵۳

اردوے معلیٰ حصہ دوم طبع اپریل ۱۸۹۹ء کی جلد کے آخری صفحے پر کتاب کے ناشر محمد عبدالاحد کا یہ اعلان چھپا ہے:

"رقعات مرزا نوشہ اسداللہ خاں غالب الموسوم بہ اردوے معلیٰ ہندستان کے سعدی مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کی اجازت سے مطبع میں چھپے تو مولنا موصوف نے ایک قلمی مسودہ بھی مرزا صاحب کے رقعات کا اپنے پاس سے بعد نظر ثانی و اضافہ نوٹ مطبع کو عنایت فرمایا جو کہ پہلے کبھی چھپا نہ تھا اور اُن ہی کے ارشاد سے اس کا نام حصہ دوم اردوے معلیٰ رکھا گیا۔ اس حصے میں خاص کر وہ رقعات ہیں جن میں مرزا صاحب نے لوگوں کو اصلاحیں دی ہیں یا شاعری کے متعلق کوئی ہدایت کی ہے یا نکتہ بتایا ہے اور بعض کتابوں کے دیباچے اور ریویو بھی ہیں۔ امید ہے کہ یہ حصہ بھی شائقین کے لیے سرمۂ چشم بصیرت ہوگا۔ کاپی رائٹ بہ ذریعہ رجسٹری باضابطہ محفوظ ہے۔

المشتہر محمد عبدالاحد عفی عنہ پروپرائٹر مطبع مجتبائی دہلی۔"

اس اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ اردوے معلیٰ حصہ دوم مطبع مجتبائی دہلی طبع اپریل ۱۸۹۹ء کا مسودہ مع حواشی ناشر کو مولانا حالی نے برائے اشاعت فراہم کیا تھا[۵۵]۔ اپریل ۱۸۹۹ء کے تقریباً ۱۱ برس بعد جب اردوے معلیٰ حصہ دوم ۱۹۱۰ء میں مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوئی اس کے ناشر محمد عبدالسلام نے اپنے تعارفی بیان میں یہ لکھ دیا کہ اردوے معلیٰ کا

"دوسرا حصہ ...... مولانا حالی نے مرتب کیا۔"[16] مالک رام[17] اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی[18] بھی اسی نظریے کے حامی ہیں لیکن مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی مولانا حالی کو اردوئے معلیٰ حصہ دوم کا مرتب نہیں مانتے۔ مولانا فاضل لکھنوی کا خیال ہے کہ اردوے معلیٰ حصہ دوم کے مرتبین وہی افراد ہیں جنھوں نے کتاب کا حصہ اوّل مرتب کیا تھا۔[19] اردوے معلیٰ حصہ اوّل طبع مارچ ۱۸۶۹ء [ص ص ۴ تا ۵] میں میر مہدی حسین مجروح کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے دونوں حصے جواہر سنگھ جوہر، میر فخرالدین اور لالہ بہاری لال [مشتاق] نے مرتب کیے تھے۔ مجروح نے یہ بھی لکھا ہے کہ کتاب کا دوسرا حصہ مطالب مشکلہ اور تقریظ وغیرہ پر مشتمل تھا۔ کتاب کے دوسرے حصے کے متعلق مجروح کا یہ بیان اردوے معلیٰ حصہ دوم طبع ۱۸۹۹ء کے مندرجات پر منطبق ہوتا ہے۔

اردوے معلیٰ حصہ دوم کے خطوط پر نمبر درج نہیں ہیں۔ کتاب کی اس خامی کے باعث اس کے خطوط کو شمار کرنے اور خطوط کے حوالے دینے میں دشواری ہوتی ہے۔ خطوط کی ایک قابلِ لحاظ تعداد تاریخوں سے محروم ہے لیکن اب غالب شناسوں نے متعدد خطوط کی تاریخیں متعین کر لی ہیں۔ ان تاریخوں کا جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ کتاب میں خطوط کی ترتیب سلسلہ وار تاریخوں پر مبنی نہیں یعنی بہ لحاظ زمانہ پہلے کے تحریر شدہ بعد کو درج ہوئے ہیں اور بعد کے خطوط پہلے درج ملتے ہیں لیکن کتاب میں اس بات کو ضرور ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ہر مکتوب الیہ کے نام تمام خطوط یک جا رہیں۔ عودِ ہندی طبع اول میں خطوط کی ترتیب کئی مکتوب الیہم کے سلسلے میں اس وصف سے بھی محروم ملتی ہے۔

اردوے معلیٰ حصہ دوم طبع اپریل ۱۸۹۹ء کے بعض خطوط کی تاریخوں کے تعین کے متعلق چند ضروری امور سطورِ ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱)

اردوے معلیٰ حصہ دوم طبع اپریل ۱۸۹۹ء [ص ۳۴] میں مکتوب غالب بہ نام تفتہ ["میں تم کو خط بھیج چکا ہوں ...... دونوں جگہ ہے۔ والسلام اسد اللہ"] تاریخ تحریر سے محروم ہے۔ مولانا غلام رسول مہر، مولانا مرتضیٰ حسین فاضل اور مالک رام

جیسے غالب شناسوں نے اِس خط کا زمانۂ تحریر ۱۸۵۱ء تجویز کیا ہے[۲۰] لیکن مکتوب غالب بہ نام منشی نبی بخش حقیر مورخہ ۶ اکتوبر ۱۸۵۲ء [مشمولہ نادراتِ غالب : مرتبہ آفاق حسین آفاق۔ مشہور پریس کراچی طبع ۱۹۴۹ء حصہ دوم ص ص ۴۶ تا ۴۷] کا بافہم مطالعہ تفتہ کے نام اِس زیرِ بحث خط کو ۶ اکتوبر ۱۸۵۲ء کے فوری ابعد کا رقعہ ثابت کرتا ہے۔ دونوں خطوں میں عطا اللہ خاں نامی کے متعلق غالب کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں خط قریبی زمانے کے ہیں[۲۱]۔

(۲)

اردوے معلیٰ حصہ دوم طبع ۱۸۹۹ء [ص ۳۰] میں منشی حبیب اللہ ذکا کے نام غالب کے ایک خط کے خاتمے پر" روز چہارشنبہ ۱۰ ربیع الاول ۱۲۶۹ھ مطابق ۲۶ اگست ۱۸۶۳ء" کا اندراج ملتا ہے۔ یہ اندراج خلافِ تقویم ہے۔ تقویم[۲۲] چہارشنبہ ۲۶ اگست ۱۸۶۳ء کو ۱۰ ربیع الاول ۱۲۸۰ھ کے مطابق بتاتی ہے۔ مولانا غلام رسول مہر بھی اس خط کے لیے ۱۲۸۰ھ کو درست تسلیم کرتے ہیں [خطوطِ غالب : مرتبہ غلام رسول مہر طبع ۱۹۶۸ء ص ۳۸۶] مگر مولانا فاضل لکھنوی نے اس خط کو خلافِ تقویم ۱۲۷۹ھ کا مکتوب مانا ہے۔ [اردوے معلیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ دوم : مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل۔ مجلس ترقی ادب، لاہور طبع اپریل ۱۹۷۰ء ص ۹۳۲ (مع حاشیہ ۱)]۔

(۳)

اردوے معلیٰ حصہ دوم طبع ۱۸۹۹ء [ص ص ۲۳ تا ۲۵] میں تفتہ کے نام غالب کے ایک بے تاریخ خط کے لیے مولانا فاضل لکھنوی[۲۳] اور مولانا غلام رسول مہر[۲۴] نے سالِ تحریر ۱۸۶۲ء درج کیا ہے لیکن میں اِسے جمعہ ۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء کے فوری بعد کا خط قرار دیتا ہوں۔ کیوں کہ میں اِس خط کے بعض مطالب کو مکتوب غالب بہ نام تفتہ مورخہ جمعہ ۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء [مشمولہ اردوے معلیٰ حصہ دوم طبع ۱۸۹۹ء ص ص ۳۱ تا ۳۲] کے مندرجات سے مماثل پاتا ہوں۔ دونوں خطوں کی مماثل عبارتیں ذیل میں منقول ہیں :

(الف) "... وہ شخص ایسا کہاں کا فارسی داں اور عالم ہے کہ میں لڑکوں کی طرح بیت بحثی کروں ۔ دو جوتیاں آپ لگا دیں ایک جوتی تم سے لگوا دی ۔ اب قطع نظر کرو اور سکوت اختیار فرماؤ ...." [خط مرقومہ جمعہ ۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء ۔ اردوے معلّیٰ حصہ دوم ص ۳۲] ۔

(ب) "... فلانے صاحب کے باب میں تم کو نصیحت کر چکا ہوں ۔ اُدھر کے جواب کا ہرگز خیال نہ رکھو ...." [اردوے معلّیٰ حصہ دوم ص ۳۴] ۔

(۴)

اردوے معلّیٰ حصہ دوم طبع ۱۸۹۹ء [ص ۲۵] میں مکتوبِ غالب بہ نام تفتہ [" صاحب گوہر راخاور رایہ قصیدہ بہت اصلاح طلب تھا .... تشدید بھی جائز ہے ...."] کے خاتمے پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے ۔ مولانا غلام رسول مہر، مالک رام اور مولانا فاضل لکھنوی نے اس خط کے لیے تاریخِ تحریر پنج شنبہ ۱۲ ستمبر ۱۸۶۳ء تجویز کی ہے[۲۵] لیکن تقویم ۱۲ ستمبر ۱۸۶۳ء کو پنج شنبے کے بجاے شنبہ بتاتی ہے ۔ اِس خط کے مندرجات کا مقابلہ مکتوبِ غالب بہ نام تفتہ مورخہ ۹ ستمبر ۱۸۶۱ء [مشمولہ اردوے معلّیٰ حصہ دوم طبع ۱۸۹۹ء ص ۳۳] سے کرنے پر میں اسے ۱۸۶۱ء کا خط مانتا ہوں ۔ رہی تاریخ تو وہ زیرِ بحث خط میں غالب کا بیان خود بتا رہا ہے کہ یہ پنج شنبہ ۱۲ کا خط ہے ۔ تقویم ۱۲ ستمبر ۱۸۶۱ء کو پنج شنبے کی تصدیق کرتی ہے ۔

حواشی

[۱] اردوے معلّیٰ [حصہ اوّل] : غالب ۔ اکمل المطابع دہلی طبع مارچ ۱۸۶۹ء ص ۵ [مملوکہ کاظم علی خاں] ۔

[۲] اردوے معلّیٰ [حصہ دوم] : غالب ۔ مطبع مجتبائی دہلی طبع اپریل ۱۸۹۹ء ص ۵۶ [اس کتاب کے لیے میں جناب آغا محمد باقر لکچرر شعبۂ اردو شیعہ کالج لکھنؤ کا ممنون ہوں] ۔

۳ے رک : ۱۔ اردوے معلیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ اوّل جلد اوّل : مرتبہ سیّد مرتضیٰ حسین فاضل ۔ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور طبع ۱۹۶۹ء ص ۲۹

۲۔ اردوے معلیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ دوم وحصہ سوم : مرتبہ سیّد مرتضیٰ حسین فاضل ۔ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور طبع اپریل ۱۹۷۰ء ص ۹۷۳ [حاشیہ ۱]

۴ے عودِ ہندی : غالب ۔ مطبع مجتبائی میرٹھ مطبوعہ رجب ۱۲۸۵ھ [اکتوبر ۱۸۶۸ء] ص ص ۱۷۹ تا ۱۸۵ میں بعض تقریظیں اور دیباچے موجود ہیں لیکن عودِ ہندی کا یہ پہلا ایڈیشن دیباچۂ سراج المعرفت سے محروم ملتا ہے۔ عودِ ہندی طبع اوّل کا یہ کم یاب نسخہ راقم السطور کے پاس موجود ہے۔

۵ے بہ حوالہ اردوے معلیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ دوم وحصہ سوم : مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل ص ۹۵۸ [حاشیہ ۱]

۶ے ایضاً

۷ے ایضاً ص ۲۵۲ [حاشیہ ۱]

۸ے مجموعۂ نثرِ غالب اردو : مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی ۔ مجلس ترقی ادب لاہور طبع نومبر ۱۹۶۷ء ص ۲۷۴

۹ے اردوے معلیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ دوم وحصہ سوم : مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل ص ۸۷۳ [حاشیہ]

۱۰ے ایضاً ص ۸۷۵ [حاشیہ ۱]

۱۱ے اردوے معلیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ اوّل جلد اوّل : مرتبہ مولانا فاضل لکھنوی ص ۲۹

۱۲ے بہ حوالہ اردوے معلیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ دوم وسوم ص ۸۹۰ [حاشیہ ۲]

۱۳ے رک اردوے معلیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ دوم [فہرستِ خطوط ص ۵ نیز ص ۸]

۱۴ے کتاب میں یہ خط غلطی سے شہزادہ بشیر الدین کے نام رقم ہوگیا ہے لیکن در اصل یہ خط عبدالغفور سرور کے نام ہے ۔ عودِ ہندی طبع اول [ص ۸ و بعد] میں یہ خط چودھری سرور کے نام ملتا ہے ۔ عودِ ہندی میں یہ خط مکمل ہے جب کہ اردوے معلیٰ

حصہ دوم میں یہ نامکمل ہے۔ جناب مالک رام نے اِن امور کو ملحوظ نہ رکھ کر چودھری عبدالغفور سرور کے نام اس خط کو بشیر الدین ہی کے نام سمجھا ہے [ملاحظہ ہو ذکر غالب: مالک رام مکتبہ جامعہ نئی دہلی طبع فروری ۱۹۷۶ء ص ص ۲۳۶ تا ۲۳۷]۔ اردوے معلیٰ حصہ دوم طبع ۱۸۹۹ء کے اس غلط اندراج نے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو بھی گم راہ کیا ہے۔ مولانا عرشی نے اردوے معلیٰ [حصہ دوم] طبع ۱۸۹۹ء میں شاہزادہ بشیر الدین کے نام دو خط بتائے ہیں [ملاحظہ ہو مکاتیب غالب: مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی۔ ناظم پریس رام پور طبع ۱۹۴۹ء دیباچہ ص ۲۵۲] حالاں کہ سطورِ گذشتہ سے بہ خوبی ثابت ہو چکا ہے کہ اردوے معلیٰ حصہ دوم طبع ۱۸۹۹ء میں شہزادہ بشیر الدین کے نام دو کے بجاے صرف ایک خط ہے۔ خط کے انتساب میں اردوے معلیٰ حصہ دوم طبع ۱۸۹۹ء کی اس غلطی کی تصحیح مولانا مرتضیٰ حسین فاضل نے فرمائی ہے۔ [رک اردوے معلیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ دوم وسوم: مرتبہ فاضل لکھنوی ص ۹۴۳ حاشیہ ا]۔

لہ اردوے معلیٰ حصہ دوم طبع اپریل ۱۸۹۹ء (ص ۱) میں بھی کتاب کے ناشر محمد عبدالاحد نے ان امور کا ذکر کیا ہے۔

ہ بہ حوالہ اردوے معلیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ دوم وسوم ص ۸۵۰

لہ ذکر غالب: مالک رام طبع فروری ۱۹۷۶ء ص ۱۲۰

لہ خطوطِ غالب (جلد اوّل): مرتبہ مہیش پرشاد۔ ہندستانی اکیڈمی الہ آباد۔ طبع ۱۹۴۱ء [ملاحظہ ہو مقدمہ از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی]

ہ اردوے معلیٰ (صدی ایڈیشن): مرتبہ فاضل لکھنوی مقدمہ ص ص ۲۵ تا ۲۹ نیز ص ۸۵۰ [حاشیہ ۲]

ہ رک: ۱۔ خطوطِ غالب: مرتبہ غلام رسول مہر۔ علمی پریس لاہور طبع ۱۹۶۸ء ص ۱۰۴

۲۔ اردوے معلیٰ (صدی ایڈیشن): مرتبہ مولانا فاضل لکھنوی ص ۹۲۰

۳۔ خطوطِ غالب (جلد اوّل): مرتبہ مالک رام۔ انجمن ترقیِ اردو (ہند) علی گڑھ طبع ۱۹۶۲ء ص ۱۴

۲۱؎ اس امر کی نشان دہی آفاق حسین آفاق نے کی ہے۔ [رک نادراتِ غالب: مرتبہ آفاق حسین آفاق۔ مشہور پریس کراچی طبع ۱۹۴۹ء حصّہ اوّل ص ۸]۔

۲۲؎ تقویم یک صد و دو سالہ مطبع نول کشور لکھنؤ طبع ۱۸۶۵ء [مملوکہ رضا لائبریری رام پور]

۲۳؎ اردوے معلّیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ دوم: مرتبہ فاضل لکھنوی ص ۸۹۹

۲۴؎ خطوطِ غالب: مرتبہ غلام رسول مہر ص ۱۶۸

۲۵؎ رک: ۱۔ خطوطِ غالب: مرتبہ مولانا غلام رسول مہر ص ۱۶۸

۲ خطوطِ غالب جلد اوّل: مرتبہ مالک رام ص ۸۰

۳۔ اردوے معلّیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ دوم: مرتبہ مولانا فاضل لکھنوی ص ۹۰۰

"۱۸۶۹ء میں مولوی عبدالاحد مرحوم، مالک مطبع مجتبائی دہلی نے اردوئے معلّیٰ کی اشاعت کا ارادہ کیا۔ خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم نے حصۂ دوم کے لیے کچھ مواد عطا فرمایا جو مہتمم طباعت نے حصۂ دوم کے نام سے آخر میں شامل کردیا۔۔۔۔ مجتبائی ایڈیشن کا حصہ دوم ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں ۷ سطروں کا ایک مختصر تقریبی نوٹ ہے، اس کے بعد سراج المعرفت اور حدائق الانظار کے دیباچے ہیں، بعد ازاں شاہ ظفر کی ایک کتاب اور مرزا رجب علی بیگ سرور کی گلزارِ سرور کی تقریظیں ہیں ان کے بعد دیوانِ ذکا، مرزا کلب حسین خاں کی ایک کتاب، نیز رسالہ تذکیر و تانیث مصنفۂ سید احمد حسین بلگرامی کے دیباچے ہیں۔ یہ تمام دیباچے اور تقریظیں صفحات ۱۔۱۳ پر درج ہیں۔"

(مولانا امتیاز علی عرشی، مکاتیب غالب صفحہ ۱۸۰)

عبداللطیف اعظمی

بجھے کیا کیا چراغ خانماں افروز

مولانا امتیاز علی خاں عرشی — ممتاز مورخ اور نقاد

جامعہ کے پچھلے شمارے میں مولانا ئے محترم کی وفات پر اداریے کے طور پر مدیر جامعہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب کا ایک تعزیتی مضمون شائع ہو چکا ہے، جس میں مرحوم کی شخصیت اور ان کی علمی و ادبی اور مذہبی خدمات کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے، مگر کچھ باتیں اور عرض کی جا رہی ہیں، انھیں بھی اسی کے ساتھ پڑھا جائے۔

مولانا امتیاز علی عرشی مرحوم کو جامعہ اور اربابِ جامعہ سے بڑی محبت اور عقیدت تھی، ذاکر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب کی وہ بڑی عزت کرتے تھے، اسی طرح ان تینوں بزرگوں کی نظر میں مرحوم کا علمی مرتبہ بڑا بلند تھا، چنانچہ جب یہ فیصلہ کیا گیا کہ مرحوم کی ۶۱ ویں سالگرہ (۸ دسمبر ۱۹۶۵ء) کے موقع پر، ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک یادگار کتاب پیش کی جائے تو اس کمیٹی کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بنائے گئے اور اس کے اراکین میں ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب بھی تھے۔ ذاکر صاحب نے "نذر عرشی" کے مقدمے میں اور عابد صاحب نے اپنے مضمون: "عرشی — شمع علم و یقین، دلیل سحر" میں مرحوم کی علمی خدمات کی دل کھول کر داد دی ہے۔ ذاکر صاحب نے لکھا ہے کہ: "پچھلے ۲۵ — ۳۰ برس میں انھوں نے جو تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہے اس سے جہاں ہماری زبان کے خزانے میں بیش بہا اضافہ ہوا، وہیں ہمارے نئے لکھنے والوں کو رہنمائی بھی ملی ہے۔ کئی قیمتی اور قابل قدر کتابیں محض انھیں کی کوشش ..

اور ذوقِ جستجو کی بدولت پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آئی ہیں، کئی پرانی کتابوں کو انھوں نے اپنے حسنِ ترتیب سے نئی زندگی بخش دی ہے، خاص طور پر متون کے تحشیہ وتدوین کا جو بلند معیار انھوں نے قائم کیا ہے وہ کسی زبان کے لیے باعثِ فخر ہوسکتا ہے۔"

عابد صاحب نے لکھا ہے کہ: "وہ [عرشی صاحب] ان غیر معمولی لوگوں میں سے ہیں جو اپنے آپ کو اپنے کام میں اس طرح کھپا دیتے ہیں کہ انھیں اپنے نفس کا کیا، اپنی بےنفسی کا بھی شعور باقی نہیں رہتا۔" مرحوم کے خلوص وسادگی، خوش مزاجی اور خوش ذوقی، فن کی سچی لگن، کام کا سچا ذوق اور ولولہ وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد عابد صاحب لکھتے ہیں کہ: "مجھے ان میں بڑی خصوصیت یہ نظر آئی کہ انھوں نے اپنے آپ کو وہ روگ جو ہمارے اہلِ علم میں عام ہیں، نہیں لگنے دیئے ــــ خودستائی اور خودنمائی ان کے قریب سے کبھی ہوکر نہیں گذری۔"

جامعہ ملیہ سے مرحوم کی دلچسپی اور تعلق کا ثبوت یہ ہے کہ خاص خاص مواقع پر اپنے علمی مقالات سے اس کی عزت افزائی کی، مثلاً ۱۹۴۶ء میں جامعہ کے جشنِ سیمیں کے موقع پر ایک تحقیقی مقالہ: "اردو پر پشتو کا اثر" پڑھا اور ۱۹۶۷ء میں ۶ر تا ۸ر اکتوبر جامعہ میں اسلامک اسٹڈیز (علی گڑھ) کی پانچویں کانفرنس منعقد ہوئی تو مرحوم نے ازراہ کرم اس کی صدارت فرمائی اور ایک علمی وتحقیقی خطبہ پڑھا، اسی طرح اپنے رشحاتِ قلم سے ماہنامہ جامعہ کی بھی وقتاً فوقتاً مدد فرمائی، مثلاً ستمبر ۱۹۴۲ء میں مرحوم کا ایک مضمون: "دیوانِ غالب کے ابتدائی نسخے" اور جولائی ۱۹۴۷ء میں "کتاب خانۂ رام پور" شائع ہوئے۔ خوشی ہے کہ ملک وقوم نے مرحوم کے علمی مرتبہ کو پہچانا۔ اس قدرشناسی کے شاہد وہ علمی وادبی اعزازات ہیں جو مرحوم کو ملے، ۱۹۴۶ء میں ریاست رام لائبریری کا انعام مبلغ ایک ہزار ملا، ۱۹۶۱ء میں دیوان غالب، نسخۂ عرشی پر ساہتیہ اکیڈمی (دہلی) کا گراں قدر انعام مبلغ پانچ ہزار ملا، ۱۹۷۲ء میں عربی و فارسی ادب کی خدمات پر صدر جمہوریہ کی طرف سے سرٹیفکیٹ آف آنر ملا، جس کی بنا پر تاحیات مبلغ پانچ ہزار روپے سالانہ دیئے جاتے تھے، ۱۹۷۴ء میں حکومت یوپی کی طرف سے مبلغ پانچ

ہزار کا خصوصی ادبی انعام دیا گیا۔

مرحوم متعدد اداروں اور کمیٹیوں کے ممبر تھے۔ مثلاً جامعہ اردو (علی گڑھ)، انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) اور اردو اکاڈمی اترپردیش (لکھنؤ) کے سابق ممبر تھے اور وفات کے وقت تک عثمانیہ اورینٹل بیرو حیدرآباد، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، کل ہند مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ، مدرسہ مطلع العلوم مینجنگ کمیٹی رام پور، کل ہند غالب صدری کمیٹی نئی دہلی اور کل ہند اسلامک اسٹڈیز کانفرنس علی گڑھ کے رکن تھے۔

اسی طرح آزادی سے قبل مرحوم نے انڈین ہسٹری کانگریس، ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن، ادارۂ معارف اسلامیہ (لاہور)، انجمن ترقی اردو (ہند) اور کل ہند اردو کانگریس (حیدرآباد) کے اجلاسوں میں سابق ریاست رام پور کی نمائندگی کی۔ نیز ۱۹۶۷ء میں یونسکو سیمینار منعقدہ کابل اور ۱۹۶۸ء میں افغانستان کے قومی شاعر خوشحال خاں کھٹک کی تقریبات میں ہندوستان کی نمائندگی فرمائی۔

عبدالحمید عدمؔ ـــــ اردو کا ایک نامور شاعر

جناب عبدالحمید عدمؔ اردو کے ایک نامور اور کہنہ مشق شاعر تھے، افسوس کہ ۱۰ر مارچ (۱۹۸۱ء) کو صبح کے چھ بجے لاہور میں ان کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم ایک عرصے سے بیمار تھے، مگر وفات سے ایک روز پہلے، ۹ر مارچ کو شام کے چھ بجے دل کا دورہ پڑا، فوراً ہسپتال پہنچایا گیا لیکن ڈاکٹروں کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ مرحوم نے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں سوگوار چھوڑیں، اہلیہ کا انتقال گذشتہ سال ہو گیا تھا۔

مرحوم ضلع گوجرانوالا کے ایک چھوٹے سے قصبہ تلونڈی موسیٰ خاں میں جون ۱۹۰۹ء[۱] میں

---

[۱] یہ تاریخ لاہور کے ایک روزنامے میں شائع ہوئی ہے، اردو انسائیکلوپیڈیا (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۲ء) میں سال پیدائش یہی ہے (مہینہ درج نہیں ہے) مگر اسلام آباد سے ابھی حال میں پاکستانی اہل قلم کی ڈائرکٹری شائع ہوئی ہے، اس میں مرحوم کا سنہ پیدائش ۱۹۱۰ء ہے۔

میں پیدا ہوئے۔ مگر تعلیم و تربیت لاہور میں ہوئی۔ وہ ابھی تیرہ سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا، کسی نہ کسی طرح اپنی تعلیم جاری رکھنے کی کوشش کی، مگر ایف اے سے آگے نہ پڑھ سکے اور اقتصادی حالت سے مجبور ہوکر ۱۹۲۷ء میں ملٹری اکاونٹس کے دفتر میں ملازمت کرلی۔

مرحوم ایک پُرگو شاعر تھے۔ انھوں نے تقریباً سبھی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی نظموں میں بڑی جان ہے، مگر انھیں شہرت ان کی غزلوں کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں، اس وقت بھی دو مجموعے زیر طبع ہیں، مگر راقم الحروف کی نظر سے صرف حسب ذیل مجموعے گذرے ہیں:

(۱) گردشِ جام (۱۹۵۲ء) (۲) شہرِ فریاد (۱۹۵۶ء) (۳) خرابات (۱۹۵۷ء)
(۴) دورِ جام (۱۹۵۹ء) (۵) نوکِ زبان (نومبر ۱۹۵۹ء) (۶) خمِ ابرو (۱۹۶۰ء)
(۷) بہتے موتی (۱۹۷۵ء)

نمونے کے طور پر ایک مختصر نظم اور ایک غزل درج کی جاتی ہیں۔ پہلے نظم ملاحظہ ہو، جس کا عنوان "ہجرت" ہے۔

آ بہن چھوڑ جائیں دیس اپنا

اب اسے آندھیوں نے گھیرا ہے
کوئی تیرا نہ کوئی میرا ہے
ہر طرف خون اور اندھیرا ہے

آ بہن! چھوڑ جائیں دیس اپنا

اب یہاں قہرمان بستے ہیں
آدمی آدمی کو ڈستے ہیں
رحم مہنگا ہے، ظلم سستے ہیں

آ بہن! چھوڑ جائیں دیس اپنا

آہ لیکن یہ آس بھی تو نہیں
بچ سکیں آگ سے پناہ گزیں
میری تجویز ہے، یہیں نہ کہیں
کسی اندھے کنوئیں کی لہروں میں
سانس کو بند کر کے سو جائیں

غزل:

جس سمت بھی چمن میں وہ غنچہ دہن گیا
ہر ہر قدم پہ ایک خرابات بن گیا
تھا اس قدر اسے مری کم گوئی کا خیال
محشر میں میرے ساتھ مرا ہم سخن گیا
ویسے تو بے شمار تھے شیریں کے مدّعی
لانے کو جوئے شیر فقط کوہکن گیا
رنگ اڑ گیا گلوں کا تو کوئی کمی نہیں
خوشبو چلی گئی تو وقارِ چمن گیا
ایسے جوان دل سے تمنّا اڑی عدم
گلشن سے جس طرح کوئی وحشی ہرن گیا

ایک قطعہ بھی سُن لیجئے:

چھپنے لگا تو ماہ یہ بولا غرور سے
تھا مغتنم جہاں کے اندھیروں میں اپنا دم
اب کون ہے جو رات کو بخشے گا روشنی
جگنو نے مسکرا کے کہا: "بے وقوف! ہم"

کوائف جامعہ

جلسۂ تقسیم اسناد جامعہ

پچھلے تین تعلیمی سال، ۷۸-۱۹۷۷ء تا ۸۰-۱۹۷۹ء کا کانووکیشن، بہ وجوہ، منعقد نہ ہو سکا تھا، امسال ۱۹ مارچ کو سہ پہر میں، امیر جامعہ، جناب جسٹس محمد ہدایت اللہ صاحب (نائب صدر جمہوریہ) کی صدارت میں منعقد ہوا اور یو جی سی کی چیرمین، محترمہ ڈاکٹر (مسز) مادھوری شاہ نے کانووکیشن کا خطبہ دیا۔

جلسے کی کارروائی کا آغاز تلاوت قرآن حکیم سے ہوا، اس کے بعد شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب نے جامعہ کی رپورٹ پیش فرمائی، جو اسی شمارے میں شامل ہے، اور سندیں عطا فرمائیں، اس کے بعد جناب امیر جامعہ نے میڈل اور انعامات دئے۔ آخر میں مہمان خصوصی محترمہ ڈاکٹر مادھوری شاہ صاحبہ نے تقریر فرمائی جس میں جامعہ کی اہمیت اور خدمات کا اعتراف کیا۔ موصوفہ نے زبانی تقریر فرمائی تھی، اس لئے فی الحال شائع نہیں کی جا رہی ہے، انھوں نے بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے، جونہی موصول ہو گی شائع کر دی جائے گی۔ جلسے کا اختتام قومی ترانے پر ہوا۔

ایک استاد اور ایک کارکن کی وفات

جناب محمد خلیق صاحب جامعہ کالج میں لکچرر تھے اور پنڈت سوم ناتھ صاحب جامعہ کے ہسپتال، انصاری ہیلتھ سنٹر میں کمپونڈر تھے، دونوں اصحاب کا انتقال مارچ میں ہوا اور دونوں ہی کینسر جیسے موذی اور لاعلاج مرض کے شکار ہوئے۔ اول الذکر ردولی (ضلع بارہ بنکی) کے رہنے والے تھے اور وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً

۵۹ سال تھی اور ثانی الذکر، سری نگر (کشمیر) کے رہنے والے تھے اور ان کی عمر تقریباً ۵۸ سال تھی۔ خلیق صاحب نے ۱۷ سال ۷ ماہ جامعہ کی خدمت کی اور پنڈت جی نے ۳۰ سال ۵½ ماہ۔

خلیق صاحب ۴ جولائی ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے، ۱۹۳۸ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا، ۱۹۴۴ء میں انٹرمیڈیٹ کا، ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے آنرز کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۴۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی ہی سے ایم اے (معاشیات) کی سند حاصل کی۔

یکم اگست ۱۹۵۲ء کو جامعہ کے ادارۂ تعلیم و ترقی میں نوسکھ بالغوں کے لیے کتابیں تیار کرنے کے لیے موصوف کا تقرر ہوا۔ ۷ ستمبر ۱۹۶۴ء کو جنرل ایجوکیشن کی تعلیم کے لیے مرحوم کی خدمات جامعہ کالج میں منتقل کر دی گئیں، کم و بیش ۶ سال کے بعد ۲۶ اگست ۱۹۷۰ء کو شعبۂ معاشیات میں لکچرر مقرر ہوئے۔

مرحوم کا علمی و ادبی ذوق بہت اچھا اور بلند تھا۔ ماہنامہ جامعہ کے مستقل مضمون نگاروں میں سے تھے اور ان کے مضامین عموماً بہت پسند کیے جاتے تھے۔ انھوں نے کئی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں اور دوسروں کے کئی ترجموں کی نظر ثانی بھی کی ہے۔

مرحوم شاعر نہیں تھے، مگر ۱۹۶۴ء میں جامعہ کے ۴۴ ویں یوم تاسیس کے موقع پر جامعہ ملیہ کے بارے میں ایک نظم کہی تھی جو جامعہ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ نظم اتنی مقبول ہوئی کہ اب ترانے کے طور پر جامعہ کے اہم جلسوں میں پڑھی جاتی ہے۔ اسی سال پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات پر ایک نظم کہی تھی جو "— اب کیا ہوگا؟" کے عنوان سے جامعہ میں جون ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی ہے۔ ان دونوں نظموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ شعر و شاعری کی طرف باقاعدہ توجہ کرتے تو انھیں بڑی شہرت حاصل ہوتی۔

پنڈت سومناتھ جی اپنے فن میں یگانہ تھے، کہنے کو وہ ایک کمپونڈر تھے، مگر ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مشہور تھے اور انجکشن تو اتنا اچھا لگاتے تھے کہ کمزور سے

کمزور دل کے مریض کو بھی کسی قسم کا احساس نہ ہونے پاتا، اپنی ان ہی خوبیوں کی وجہ سے وہ اس علاقے میں بہت مقبول تھے۔

ان دونوں مخلص خادموں کی یاد میں ٹیچرس ایسوسی ایشن اور انتظامی اسٹاف کے تعزیتی جلسے منعقد ہوئے اور دونوں مرحومین کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا، تعزیت کی تجاویز منظور کی گئیں، ان کی روح کے لیے دعائیں کی گئیں اور ان کے متعلقین کے ساتھ گہری اور مخلصانہ ہمدردی کا اظہار کیا گیا اور دعا کی گئی اللہ تعالیٰ انھیں صبر جمیل کی توفیق عطا کرے۔

وضاحتی کتابیات[1] — اساتذۂ جامعہ کا کارنامہ

ایک طویل عرصے سے اردو مطبوعات کی سال بہ سال ببلیوگرافی کی شدید ضرورت محسوس کی جاتی تھی، چنانچہ اسی احساس کے تحت ہم نے ۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۲ء میں اردو ادب کا جائزہ لینے کے لیے "جامعہ" کے خصوصی نمبر نکالے تھے، ان نمبروں میں ہندوستان کی مطبوعات کے علاوہ پاکستان کی مطبوعات کا بھی سرسری جائزہ لیا گیا تھا۔ چونکہ متعلقہ سنوں کی مطبوعات کی مکمل یا مفصل ببلیوگرافی شائع کرنا ممکن نہیں تھا، اس لیے ان دونوں خصوصی شماروں میں مختلف موضوعات کے عنوانات کے تحت جائزہ لیا گیا تھا، مثلاً تحقیقی وتنقیدی ادب، افسانوی ادب، شعری ادب، مزاحیہ ادب، بچوں اور بالغوں کا ادب وغیرہ۔ اس میں ایک خاص بات یہ تھی کہ متعلقہ برسوں کے متوفی ادیبوں اور شاعروں کا بھی ذکر کیا گیا تھا۔ ان دونوں نمبروں کے لیے ملک کے مشہور ادیبوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں، مگر چند در چند مشکلات کی وجہ سے بعد میں یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ ہمیں خوشی

---

[1] مرتبین: پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر مظفر حنفی۔ سائز $\frac{18\times22}{8}$، حجم ۳۱۷ صفحات، اچھا کاغذ، اچھی کتابت وطباعت اور خوبصورت کپڑے کی جلد۔ قیمت: ۱۷ روپے۔ ناشر۔ ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک، آر۔ کے۔ پورم۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۲

ہے کہ جامعہ ملیہ ہی کے دو اساتذہ، پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب اور ڈاکٹر مظفر حنفی صاحب نے مکمل ببلیوگرافی تیار کرنے کا منصوبہ بنایا اور خدا کا شکر ہے کہ ان کا یہ منصوبہ بہر لحاظ سے کامیاب رہا۔ پچھلے سال ۱۹۸۰ء میں اس سلسلے کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے، وہ معنوی لحاظ سے تو قابلِ تعریف ہے ہی، صورت اور گیٹ آپ کے لحاظ سے بھی بہت خوب ہے۔ اس طرح کی اردو میں کتابیات تیار کرنے کے لیے، اس سے پہلے جو کوششیں کی گئی ہیں، ان کے بارے میں، زیرِ تذکرہ کتاب کے دیباچے میں نارنگ صاحب نے لکھا ہے کہ :

"اردو میں سب سے پہلے محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی نے "الفہرست" کے نام سے کتابیات مرتب کی تھی، جو نظام دکن پریس حیدر آباد سے ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی، انھوں نے یہ کام بہت پہلے مولانا شبلی کے مشورے سے شروع کیا تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کو بھی اس کام کی اہمیت کا احساس تھا، چنانچہ انھوں نے کراچی جانے کے بعد کل اردو مطبوعات کی کتابیات کی تیاری کا کام شروع کیا، اس کی پہلی جلد "قاموس الکتب" کے نام سے انجمن ترقی اردو (پاکستان) سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی، سنا ہے کہ حال ہی میں انجمن ترقی اردو (پاکستان) نے اس کتابیات کی دوسری جلد شائع کی ہے[۱]۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی اس کام کی اہمیت سے واقف تھے، ان کے ایما پر جب مرکزی وزارتِ تعلیم نے کلکتہ میں نیشنل لائبریری یعنی ہندوستان کا سب سے بڑا کتب خانہ قائم کیا تو ناشرین و مصنفین سے مطالبہ کیا کہ ہر نئی کتاب کی ایک جلد نیشنل لائبریری کو فراہم کی جائے، اس بارے میں ایک قانون کا اعلان بھی ہوا، تجویز یہ تھی کہ تمام زبانوں کی کتابیات ہر سال شائع کی جائیں گی، لیکن اس اسکیم کا جو حشر ہوا سب کو معلوم ہے، اردو کتابیات کی اشاعت کا کام غالباً حکومت اترپردیش کو سونپا گیا تھا، چند جلدیں شائع بھی ہوئیں، لیکن بعد میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔" (صفحہ ۲۶)

---

[۱] تیسری جلد بھی شائع ہو گئی ہے، دوسری جلد کا موضوع ہے: تاریخیات اور یہ ۷۵/۱۹۷۴ میں شائع ہوئی ہے اور تیسری جلد کا موضوع ہے: عمرانیات اور یہ ۸۰/۱۹۷۸ میں شائع ہوئی ہے۔

"وضاحتی کتابیات" کی یہ پہلی جلد ۱۹۷۶ء کی مطبوعات پر مشتمل ہے اور مختلف موضوعات کے تحت جن کتابوں کی ضروری تفصیلات درج ہیں، ان کی تعداد حسب ذیل ہے :

۱۔ ادبی تحقیق و تنقید :	۷۸	۲۔ شاعری :	۱۰۱
۳۔ ناول :	۳۷	۴۔ افسانہ :	۲۴
۵۔ ڈرامے :	۹	۶۔ مضمون، انشائیہ، خاکہ :	۸
۷۔ سفرنامے :	۲	۸۔ مکتوبات :	۳
۹۔ زبان :	۵	۱۰۔ تاریخ و تہذیب و سیاسیات :	۲۰
۱۱۔ تعلیم :	۳	۱۲۔ صنعت و حرفت :	۶
۱۳۔ سائنسی علوم :	۷	۱۴۔ مذہبیات :	۲۱
۱۵۔ بچوں کا ادب :	۳۸	۱۶۔ متفرقات :	۶

کتاب کے آخر میں کتابوں اور مصنفین کے اشاریے بھی شامل ہیں۔

جس شخص کو اس طرح کا کوئی کام کرنے کا کبھی اتفاق ہوا ہوگا، اسے معلوم ہوگا کہ یہ کام کس قدر دشوار ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ یہ کتاب اپنے مقصد میں تمام مشکلات کے باوجود پوری طرح کامیاب ہے۔ امید ہے کہ باقی جلدیں بھی جلد شائع ہوں گی اور وہ ایسی ہی خوبیوں کی حامل ہوں گی۔ ہم نارنگ صاحب اور مظفر حنفی صاحب کو اس کامیابی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

جناب حنیف کیفی کو اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے حالیہ کانووکیشن میں جناب حنیف کیفی، لکچرر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ان کے مقالہ "اردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم۔ ابتدا سے ۱۹۴۷ تک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ جناب حنیف کیفی نے اپنا تحقیقی مقالہ پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈین فیکلٹی آف آرٹس کی نگرانی میں تیار کیا تھا۔ ان کے ممتحنین پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مسعود حسین خاں اور پروفیسر گیان چند جین تھے۔

اس کے علاوہ پچھلے کانووکیشن میں مختلف مضامین میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ۸ سندیں دی گئیں، جن کی اطلاع، مختلف مواقع پر کوائف جامعہ میں دی جا چکی ہے۔

شعبۂ اردو کی ادبی سرگرمیاں

ہمیں افسوس ہے کہ پچھلے تین شماروں، دسمبر ۱۹۸۰ء اور فروری و مارچ ۱۹۸۱ء میں "کوائف جامعہ" کے لیے گنجائش نکل نہ سکی، جس کی وجہ سے مختلف شعبوں کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی بہت سی اطلاعات جمع ہو گئی ہیں، اب اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں رہ گئی ہے کہ ان کی تلخیص شائع کی جائے، پھر بھی اگر کچھ اطلاعات رہ جائیں گی تو ان کے لیے اگلے شمارے میں جگہ نکالنے کی کوشش کی جائے گی۔

کیلی فورنیا یونیورسٹی (برکلے) کے ڈیپارٹمنٹ آف ساؤتھ اینڈ ساؤتھ ایسٹ ایشین اسٹڈیز کے صدر، پروفیسر بروس، آر، پرے (BRUCE R. PRAY) ۲۵ نومبر ۱۹۸۰ء کو شعبۂ اردو کی دعوت پر جامعہ تشریف لائے اور "اردو غزل کی ساخت اور شعری وحدت" (STRUCTURE AND CONTINUITY IN THE URDU GHAZAL) کے موضوع پر تقریر کی، جلسے کی صدارت کشمیر یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور جامعہ ملیہ کے موجودہ خازن جناب رضی الحسن چشتی صاحب نے فرمائی۔ شعبے کے صدر، پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب نے معزز مہمان کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ: اردو کے صوتی اور نحوی مطالعے کے سلسلے میں موصوف کی کتاب: ASPECT OF HINDI URDU GRAMMER بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ ان دنوں پروفیسر بروس اردو غزل پر کام کر رہے ہیں۔ اس کے بعد معزز مہمان نے انگریزی میں اپنا مقالہ پیش کیا، جسے بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا گیا اور مقالے کے بعد متعدد سوالات کیے گئے۔ آخر میں صدر جلسہ جناب چشتی صاحب نے معزز مہمان کے فکر انگیز مقالے پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ موصوف نے اردو غزل کا بالکل نئے زاویے سے مطالعہ فرمایا ہے اور ایک ایسا نقطۂ نظر پیش کیا جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

پاکستان کے مشہور نقاد پروفیسر ممتاز حسین ، ایک سمینار میں شرکت کے لیے اواخر دسمبر میں دہلی تشریف لائے تھے۔ شعبۂ اردو کی دعوت پر جامعہ تشریف لائے اور پاکستان کے جدید اردو ادب پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ جلسے کی صدارت شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب نے فرمائی۔ پروفیسر نارنگ صاحب نے معزز مہمان کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا کہ: پروفیسر ممتاز حسین ہمارے ان بزرگ نقادوں میں ہیں جن کی فکر وسعت مطالعہ کی وجہ سے ہمیشہ نمو پذیر رہی ہے، اس زمانے میں جب ادب میں سیاسی کاروبار گرم تھا، ممتاز حسین صاحب نے "رسالہ در معرفت استعارہ" لکھ کر اپنی نظر کی گہرائی اور گیرائی کا ثبوت دیا تھا۔ ادھر چند برسوں میں انھوں نے غالب اور امیر خسرو پر تصانیف پیش کی ہیں، ان کا امتیازی وصف یہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ انتہا پسندی سے بچنے کی تلقین کی ہے اور ادبی حسن کاری کی اہمیت پر اصرار کیا ہے۔

ہجری صدی تقریبات کے سلسلے میں ۲۸ رتا ۳۰ رجنوری ۱۹۸۱ء کو نئی دہلی میں سرکاری سطح پر ایک بین الاقوامی سمینار منعقد ہوا تھا جس میں ہندوستان کے علماء و فضلاء کے علاوہ بیرونی ممالک کے اسکالروں نے بھی شرکت کی تھی انھیں میں کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کی استاد محترمہ عطیہ خلیل عرب بھی آئی تھیں۔ وہ جامعہ ملیہ بھی تشریف لائیں اور شعبۂ اردو میں طلبہ اور اساتذہ کے ایک مشترکہ جلسہ کو خطاب فرمایا۔ جلسہ کے آغاز میں پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب ڈین فیکلٹی آف ہیومینٹیز اینڈ لینگویجز نے محترمہ کے والد جناب خلیل عرب مرحوم استاد ندوۃ العلماء لکھنؤ اور ان کے نانا سید امیر علی ملیح آبادی کا خاص طور سے ذکر کیا جن کے دامنِ تربیت میں عصرِ حاضر کے جید ہندوستانی علماء کی پرورش ہوئی۔

محترمہ عطیہ خلیل عرب نے عہد جاہلیت کی عربی شاعری پر ایک پرجوش اور عالمانہ تقریر کی۔ معزز مہمان ایک خوش گو شاعرہ بھی ہیں، صدر جلسہ کی فرمائش پر انھوں نے چند غزلیں بھی سنائیں جو بہت پسند کی گئیں۔ انھوں نے ماہنامہ جامعہ میں اشاعت کے لیے دو غزلیں بھی بطور خاص عنایت فرمائیں۔

جلسے کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی، اور اس میں شعبۂ اردو کے اساتذہ وطلبہ کے علاوہ شعبۂ عربی، فارسی اور اسلامی مطالعات کے اساتذہ اور اسکالروں نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کی۔

پاکستان کے معروف ادیب اور شاعر جناب احسن علی خاں صاحب کی آمد پر شعبۂ اردو میں ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین اور شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ان کی تشریف آوری پر اپنی مسرت کا اظہار کیا اور ان کے کلام میں کلاسیکی شائستگی اور جدید حسیت کے امتزاج کی طرف توجہ دلائی۔ اس موقع پر سفارت خانۂ پاکستان کے پریس کونسلر جناب منیر احمد شیخ اور ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو جناب شمس الرحمان فاروقی بھی موجود تھے۔ جناب منیر احمد شیخ نے معزز مہمان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اسلام آباد میں ان کے گھر پر اکثر ادبی اجتماعات ہوتے ہیں جن کے روح رواں احسن علی خاں اور ان کی بیگم معروف افسانہ نگار اختر جمال ہوا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تازگی احساس کو مرکزی حیثیت حاصل ہے

احسن علی خاں صاحب نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ بھوپال میں پیدا ہوئے تھے۔ ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی کے ہم عمر ہیں۔ جاں نثار اختر ان کے دوست تھے۔ ۱۹۵۱ء میں پاکستان تشریف لے گئے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ بھوپال میں وہ کھلی تلوار تھے، مگر پاکستان میں وہ کند ہوگئی ہے۔ موصوف نے اپنی چند غزلیں اور نظمیں سنائیں جو بہت پسند کی گئیں۔

اس موقع پر پروفیسر گوپی چند نارنگ کی فرمائش پر جناب منیر احمد شیخ نے ایک مختصر افسانہ سنایا اور جناب شمس الرحمان فاروقی نے اپنے تازہ کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

شعبۂ اسلامک اینڈ عرب ایرانین اسٹڈیز کی سرگرمیاں

۷؍ مارچ ۱۹۸۱ء کو شعبۂ اسلامک اینڈ عرب ایرانین اسٹڈیز میں فارسی کے ریسرچ

اسکالروں کا ایک روزہ سمینار منعقد ہوا جس میں تین ریسرچ اسکالروں، شوکت نہال صاحبہ لعل زاد صاحب اور سید کمال الدین جعفری صاحب نے مقالے پڑھ کر سنائے۔ شوکت نہال صاحبہ نے اپنا مقالہ "قزوینی۔ حیات اور کارنامے" کے عنوان سے اردو میں پڑھا اور قزوینی سے متعلق دلچسپ اور فکر انگیز باتیں بتائیں۔ لعل زاد صاحب نے "نظر اجمالی برشعر معاصری دری در افغانستان" فارسی زبان میں پڑھ کر داد تحسین حاصل کی۔ جعفری صاحب نے "بنگال میں چشتیہ صوفیا کی ادبی اور سماجی خدمات" پر اردو میں پڑھا۔

ان مقالوں پر پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر نور الحسن انصاری صاحبان نے مفید اور دلچسپ بحث کی۔ پروفیسر مشیر الحق صاحب نے سمینار کے اغراض و مقاصد سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ شرکاء میں پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر امیر حسن عابدی، پروفیسر عبدالودود اظہر، ڈاکٹر نور الحسن انصاری، خانم صبرہوے دالا، ڈاکٹر شریف حسین قاسمی کے علاوہ، دہلی یونیورسٹی، نہرو یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ کے ریسرچ اسکالروں اور اساتذہ نے شرکت فرمائی۔ مہمانوں میں ڈاکٹر نذیر الدین مینائی اور عبداللطیف اعظمی صاحب نے بھی شرکت فرمائی۔

شعبۂ اسلامک و عرب ایرانین اسٹڈیز کی بزم طلبہ کے اہتمام اور مشیر بزم جناب زبیر احمد فاروقی، ریڈر عربی کی نگرانی میں کچھ عرصہ پیشتر مضمون نگاری کا ایک مقابلہ ہوا تھا، مقابلے کے لیے تین عنوانات مقرر کیے گئے تھے، طلبائے اسلامک اسٹڈیز کے لیے: "ہندوستان میں دراسات اسلامیہ کی ضرورت اور اہمیت"۔ طلبائے فارسی کے لیے: "ارتقائے زبان و ادبیات فارسی در ہند"۔ اور طلبائے عربی کے لیے: "دراسة اللغة العربية فی الهند"۔ پہلے عنوان کے لیے زبان کی کوئی شرط نہیں تھی، اردو، ہندی، انگریزی کسی زبان میں لکھا جا سکتا تھا، البتہ باقی دو عنوانات کے لیے علی الترتیب فارسی اور عربی زبانوں میں لکھنا ضروری تھا۔ اول الذکر عنوان پر لکھنے والوں میں سے راشد القادری متعلم بی اے سال آول کو پہلا انعام اور فوزیہ بدر متعلمہ بی اے فائنل کو دوسرا انعام ملا۔ ثانی الذکر عنوان پر لکھنے والوں میں، عزیز احمد (بی اے فائنل) کو

پہلا انعام اور سراج احمد (بی اے فائنل) کو دوسرا انعام ملا، آخرالذکر عنوان پر لکھنے والوں میں سے فوزیہ بدر کو اول اور آمنہ بی بی امیر کو دوسرا انعام ملا، یہ دونوں بی اے فائنل کی طالبہ ہیں اور ثانی الذکر مارشیس کی رہنے والی ہیں۔

ان انعامات کی تقسیم کے لیے فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز کے ڈین پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں ابھی حال میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس کی نظامت کے فرائض بزم کے سکریٹری محمد سلیمان قاسمی صاحب نے انجام دیئے۔ اس جلسے میں طلبائے شعبہ کے علاوہ، دوسرے شعبوں کے اساتذہ اور صدر شعبہ پروفیسر مشیر الحق صاحب اور اعزازی ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے بھی شرکت کی۔ پروفیسر مشیر الحق صاحب نے مضمون نگاری کے مقابلے کی اہمیت اور افادیت پر ایک مختصر تقریر کی، اس کے پروفیسر نارنگ صاحب نے ڈین کی حیثیت سے انعامات تقسیم کئے اور صدر جلسہ کی حیثیت سے، ایک مختصر تقریر کی جس میں شعبہ کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ جامعہ کا یہ سب سے اہم اور بڑا شعبہ ہے، اسی لحاظ سے دوسرے شعبوں کے مقابلے میں اس کی ذمہ داریاں بھی زیادہ ہیں، خدا کا شکر ہے کہ وہ ان ذمہ داریوں کو بہ احسن انجام دے رہا ہے۔ انعام پانے والے طلبہ اور طالبات کو مبارکباد دیتے ہوئے، بزم کو مشورہ دیا کہ تحریری مقابلے کے ساتھ ساتھ تقریری مقابلے کا بھی انتظام کرے تو اس کی افادیت کا دائرہ اور وسیع ہو جائے گا۔

جلسے کا آغاز تلاوت قرآن حکیم سے ہوا تھا اور اس کے بعد ایک ریسرچ اسکالر جاوداں خاتون نے دلکش ترنم سے اقبال کی نظم سنائی۔

(کوائف نگار)

ایک مراسلہ اور اس کا جواب

اردو ہال ۔ حمایت نگر ۔ حیدر آباد ۔ ۲۹

برادر محترم ، تسلیم و نیاز !

"جامعہ" کے تازہ شمارے ، بابت ماہ مارچ ۱۹۸۱ء میں آپ کا مضمون : "مولانا آزاد کی ۲۳ ویں برسی" پڑھا ۔ جہاں جہاں آپ نے تاریخیں درج فرمائی ہیں ، وہاں اگر سنہ کا بھی اندراج کر دیا جاتا تو آنے والی نسل کے لیے کسی حد تک مفید ثابت ہوتا ..."

نیاز مند

سری نواس لاہوٹی

۲ر اپریل ۱۹۸۱ء

فاضل مراسلہ نگار "جامعہ" کے قدیم قدر دانوں اور مضمون نگاروں میں سے ہیں ، مگر جامعہ کے جدید دور کے قارئین موصوف کے رشحاتِ قلم سے اب تک محروم ہیں ، ہمیں خوشی ہے کہ انھوں نے کم از کم اپنے مراسلے سے مستفید فرمایا ۔

مجھے ذاتی طور پر تاریخوں کی اہمیت کا بہت احساس ہے اور اپنی تحریروں میں ان کا پورا لحاظ رکھتا ہوں ۔ زیرِ تذکرہ مضمون میں سنہ کی تکرار سے اس لیے احتراز کیا گیا ہے کہ : "مولانا آزاد اور کیبنٹ مشن" کے ضمنی عنوان کے شروع ہی میں بایں الفاظ سنہ کا ذکر کر دیا گیا ہے کہ : "ہندوستان کی تاریخ آزادی میں ۱۹۴۶ء کے نصف اول کا زمانہ بڑی اہمیت رکھتا ہے ، یہی وہ زمانہ ہے جب برطانوی کیبنٹ مشن آیا ،... تقریباً پانچ ماہ کی بحث و گفتگو کے بعد ایک اسکیم منظور کر لی گئی ..." اس کے بعد جب کیبنٹ مشن کے اعلان کا ذکر آیا تو دوبارہ تاریخ کے ساتھ سنہ لکھ دیا گیا ، ملاحظہ ہو : ۱۸ر فروری ۱۹۴۶ء کو برطانوی وزیر اعظم

مسٹر کلیمنٹ اٹیلی نے اعلان کیا کہ ...'' اس کے بعد ۹ر جولائی تک جو واقعات پیش آئے یا اخبارات میں تبصرے کئے گئے ان کا تسلسل کے ساتھ تاریخ وار ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مدت صرف چند مہینے کی ہے اور ایک ہی سنہ سے تعلق رکھتی ہے، اس لیے تاریخوں کے ساتھ سنہ کا اندراج غیر ضروری معلوم ہوا، اس کے علاوہ اس مضمون میں جو اقتباسات دئے گئے ہیں، ان کی اصل انگریزی عبارت میں تاریخیں، اسی طرح بغیر سنہ کے، لکھی ہوئی تھیں، لیکن پھر بھی اگر ذرا بھی شبہ ہوتا کہ سنہ کے بارے میں کسی قسم کی الجھن ہوسکتی ہے تو بڑے بریکٹ [ ] میں سنہ کا ضرور اضافہ کر دیا جاتا۔ بہر حال ہم فاضل مراسلہ نگار کے ممنون ہیں کہ انھوں نے وضاحت کا ایک موقع فراہم کیا، ممکن ہے کہ کسی اور کو بھی یہ بات کھٹکی ہو۔ امید ہے کہ ان کا یہ مراسلہ کسی خیال انگیز مضمون کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

عبداللطیف اعظمی

ماہنامہ جامعہ کی سالانہ قیمت

۱۔ ہندوستان کے لیے : ۹ روپے

۲۔ پاکستان کے لیے : ۱۴ روپے

۳۔ دوسرے بیرونی ممالک کے لیے دو پونڈ / پانچ امریکی ڈالر

جامعہ معمولاً ہر ماہ کی ۲۰ / یا ۲۱ / کو شائع ہوتا ہے۔ رسالہ نہ ملنے کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتے میں ضرور مل جانی چاہیے، ورنہ تعمیل ممکن نہ ہوگی۔

(مینیجر)

ماہنامہ جامعہ کا ڈاکٹر انصاری نمبر

ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم جنگ آزادی کے ممتاز مجاہدین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں میں سے تھے اور امیر جامعہ کی حیثیت سے تقریباً ۸½ سال (۱۹۲۷ء تا ۱۰ مئی ۱۹۳۶ء) جامعہ کی سرپرستی فرمائی اور رہنمائی کے فرائض انجام دیئے۔

پچھلے سال ۲۵ دسمبر کو موصوف کی پیدائش کو سو سال ہو گئے اور امسال ۱۰ مئی کو آپ کی وفات کو ۴۵ سال ہو جائیں گے، اس مناسبت سے جون کا شمارہ مرحوم کی یاد کے لیے مخصوص ہوگا۔

ادارہ

جامعہ

سالانہ قیمت ۹ روپے | قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

جلد ۷۸ | بابت ماہ مئی ۱۹۸۱ء | شمارہ ۵

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ جمال پریس دہلی ۶ • ٹائیٹل : فائن پریس دہلی ۶

شذرات

اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے ۱۵ رمئی ۱۹۸۱ء کو مولانا حسرت موہانی کی یاد میں لکھنؤ میں اردو صحافت کے موضوع پر ایک سمینار منعقد ہوا جس کی صدارت فرنگی محل کے مفتی رضا انصاری صاحب نے فرمائی جو ایک تجربہ کار صحافی اور اس وقت شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں استاد ہیں۔ سمینار کا افتتاح حکومت اتر پردیش کے وزیر اطلاعات جناب عمار رضوی صاحب نے کیا۔ شروع میں پروفیسر محمود الٰہی صاحب نے جو اکادمی کی مجلس انتظامیہ کے چیرمین ہیں سمینار کے موضوع پر روشنی ڈالی اور مولانا حسرت موہانی مرحوم کی سیاسی و صحافتی و ادبی خدمات کا تذکرہ کیا اور آخر میں جناب علی جواد زیدی صاحب نے جو اکادمی کے صدر ہیں مقالہ نگاروں کا شکریہ ادا کیا، اردو صحافت کی موجودہ حالت کا ذکر کیا اور مستقبل کے لئے کچھ تجویزیں بھی پیش کیں۔ سمینار کے افتتاح سے قبل اکادمی کے نائب چیرمین جناب پروفیسر حکیم حیدر نیر صاحب نے مہمان خصوصی جناب عمار رضوی صاحب سے مولانا حسرت موہانی کی تصویر کو ہار پہنانے کی درخواست کی۔ سمینار میں جو مقالے پڑھے گئے انھیں سامعین نے پسند کیا۔ اس سمینار میں لکھنؤ کے ممتاز اردو صحافی، لکھنؤ یونیورسٹی کے دانشور اور ادیب اور شہر کے اربابِ ذوق سبھی موجود تھے۔

ابھی اُردو صحافت کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ یوں تو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور اودھ اخبار سے پہلے بھی اور ان کے دور میں بھی اردو اخباروں کی خاصی تعداد ملتی ہے، لیکن اودھ اخبار اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کو جو حیثیت حاصل تھی وہ اس وجہ سے تھی کہ انھوں نے مضامین اور اندازِ ترتیب کے لحاظ سے اردو صحافت کا ایک اچھا معیار قائم کر دیا تھا اور اگرچہ ان کا یہ معیار زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکا لیکن ان کا وجود نشانِ راہ ضرور ثابت ہوا۔ سرسید مرحوم جہاں علم و تمدن، علم و تہذیب اور اصلاح و تجدد کے مختلف گوشوں میں میر کارواں

تھے وہیں معیاری اردو صحافت کے فن کے امام بھی تھے ۔ انھوں نے اپنے اخبار میں مضامین کی ترتیب ، مباحث کے انتخاب اور تنقید و تبصرہ کا جو طریقہ اپنایا تھا وہ ہر لحاظ سے جدید اور ترقی یافتہ تھا۔ بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو ملک و قوم کے سامنے نت نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے ۔ اس وقت ساری دنیا میں ہمیں ایک ہنگامۂ دار و گیر نظر آتا ہے۔ سیاست ، تمدن ، علم و فکر اور تاریخ و ادب کی دنیا میں ایک ہلچل ملتی ہے۔ نئی ایجادات اور نئے انکشافات کی وجہ سے پرانے نظام کو نئے نئے چیلنج درپیش ہیں ، یوروپ کا سرمایہ دارانہ نظام اپنے شباب پر ہے اور استعمار کی یلغار ہر طرف ہے ۔ انگریزی تعلیم کے اثر سے ہماری قومی زندگی کا دھارا بھی تیز بہنے لگتا ہے جس میں مسلمانوں کی کشتی بھی موجوں کے تھپیڑے کھاتی ہے ، اُدھر دنیائے اسلام طوفانِ مغرب کی زد میں ہے جہاں نئے نئے واقعات و حوادث رونما ہوتے ہیں ۔ ہندوستان کا اردو داں طبقہ ، بالخصوص مسلمان ان امور و احوال سے متعلق جذبات و احساسات اور اپنے خیالات رکھتے ہیں ۔ ان حالات میں اردو صحافت اپنا شاندار رول ادا کرنے کے لئے آگے بڑھتی ہے اور چند ایسے ماہنامے اور ہفتہ وار ، سہ روزہ اور روزانہ اخبارات وجود میں آتے ہیں جن سے اردو صحافت کی تاریخ روشن ہو جاتی ہے ۔

تفصیل کا تو یہ موقع نہیں لیکن اتنا یاد دلانا ضروری ہے کہ ۱۹۰۳ء میں مولانا حسرت موہانی اردوئے معلّیٰ نکالتے ہیں اور سیاسی و ادبی صحافت میں ایک نئی طرح ڈالتے ہیں ۔ حسرت انگریزی راج کے دشمن اور حرّیت کے علمبردار تھے ۔ وہ امرِ حق کے اظہار میں بیباک تھے اور اس راہ کے سارے مصائب برداشت کرنے کے لیے خندہ پیشانی سے تیار ۔ اس وقت تک اردو صحافت معتدل مزاج تھی ۔ مولانا نے اردوئے معلّیٰ کے ذریعہ تیز اور گرم صحافت کا آغاز کیا ۔ اسی دور میں لکھنؤ کے اخبار مسلم گزٹ نے جس کی ادارت مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی کے سپرد تھی ، بقول مولانا آزاد لوگوں کے خیالات میں بڑا تغیر پیدا کیا اور خدا پرستانہ دلیری اور حق گویانہ آزادی کا ایک شاندار

ریکارڈ قائم کیا۔ ۱۹۰۹ء میں زمیندار کی باگ ڈور مولانا ظفر علی خاں نے سنبھالی اور انھوں نے اپنی خداداد صلاحیت سے اس اخبار کو بڑی ترقی دی۔ انھوں نے اپنے خاص رنگ میں اسے ڈھال کر 'پاپولر جرنلزم' کو فروغ دیا اور کم پڑھے لکھے لوگوں میں بھی اخبار بینی کا ذوق پیدا کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد مولانا آزاد کے الہلال اور مولانا محمد علی کے ہمدرد نے اردو صحافت کو بام عروج پر پہونچا دیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب یکم مئی ۱۹۱۲ء کو مدینہ اخبار نکلا جس نے جلد ہی اپنی ثقہ، سنجیدہ اور معیاری صحافت کا لوہا منوالیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ پرنٹنگ ٹکنولوجی کی بہت کچھ سہولتوں کے باوجود آج تک اُردو صحافت مذکورہ بالا اخباروں اور جریدوں کے قائم کئے ہوئے معیار سے آگے نہ بڑھ سکی۔

اُردو صحافت نے اپنے سفر کا آغاز پتھر کی سلوں سے کیا تھا اور اب یہ پاکستان میں کمپیوٹر کے عہد میں داخل ہو رہی ہے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان میں اردو پریس نے گذشتہ بیس پچیس سال میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ لکھنؤ کے سمینار میں جناب احمد سعید ملیح آبادی مدیر روزنامہ آزاد ہند (کلکتہ) نے جو مقالہ پڑھا اس میں انھوں نے اس سلسلے میں بڑی دلچسپ معلومات فراہم کی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ جدید ترین آفسیٹ مشینوں سے کام لینے پر بھی پاکستان کے اردو پریس کو کتابت کی بیڑیوں سے رہائی سے نہ مل سکی تو پاکستانیوں نے نستعلیق کتابت کا کمپیوٹر فوٹو سیٹر ایجاد کیا۔ ایم۔ ایچ۔ سید اور مرزا جمیل احمد کی ذہانت اور محنت کے طفیل نستعلیق خط میں کمپیوٹر یادداشت کے لئے ایک مکمل لغت تیار ہو گیا ہے اور ایک برٹش فرم نے ایک مکمل یونٹ تیار کیا ہے جس میں کمپیوٹر میموری، پنچنگ مشین، کریکٹر (تصحیح کار) اور فوٹو سیٹر وغیرہ شامل ہیں، اب نہ ٹائپ کا جھگڑا اور نہ نستعلیق کتابت کا جھمیلا، کمپیوٹر کو حکم دینے سے وہ پہلے سے تیار لغت کو اپنی میموری (حافظہ) سے نکال کر میٹر فوٹو سیٹ تیار کرتا جائے گا اور منٹوں میں کالم کے کالم تیار ہو جائیں گے، پھر اس سے چھپائی کی پلیٹیں بن جائیں گی۔ لیکن یہ طریقہ کار ابھی بہت مہنگا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ نستعلیق کمپیوٹر فوٹو ٹائپ سیٹر کے ایک یونٹ کی قیمت ساٹھ لاکھ روپے ہے۔

ہمارے ملک کی اردو دنیا ابھی ایک عرصہ تک اس کمپیوٹر یونٹ سے محروم ہی رہے گی،

لیکن ہم اپنی اُردو صحافت کو نیوز سروس اور صحافت ٹریننگ سنٹر قائم کرکے بہت کچھ ترقی دے سکتے ہیں۔ نیوز سروس ایک تو انگریزی کی ہے جس سے خبریں حاصل کرکے انھیں اردو میں منتقل کیا جاتا ہے، لیکن اب اچھے مترجم نہیں ملتے، اس لئے ضرورت ہے کہ اردو اکادمیاں اور ترقی اردو بورڈ اردو صحافت کے ٹریننگ سنٹر قائم کریں جہاں ترجمے کے علاوہ خبروں کے انتخاب، ترتیب، رپورٹنگ، کاپی سیٹنگ اور پروف ریڈنگ کی تربیت دی جائے۔ اس سلسلے میں احمد سعید صاحب نے بتایا کہ مغربی بنگال اردو اکادمی نے پہل کردی ہے اور کلکتے میں کتابت سنٹر کے علاوہ صحافت ٹریننگ سنٹر بھی قائم کیا جارہا ہے۔ دوسرے یہ کہ نیوز سروس اردو کی بھی ہوسکتی ہے، ضرورت ہے کہ اس سلسلے میں جلد از جلد اقدام کیا جائے اور اس کے لئے جو بھی صورت ہو وہ اختیار کی جائے۔ اب تک اردو اکادمیوں اور ترقی اردو بورڈ نے اس طرف توجہ نہیں کی ہے، لیکن اب جبکہ بہار اور مغربی بنگال میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل گیا ہے اور اترپردیش میں بھی غالباً اس سال کے آخر تک اردو کو یہ مرتبہ حاصل ہوجائے گا۔ کشمیر میں یہ سرکاری زبان بہت پہلے سے ہے اور کچھ عجب نہیں کہ پنجاب، دہلی، مہاراشٹرا اور آندھراپردیش وغیرہ میں بھی اردو کو یہی حیثیت ہوجائے۔ ایسی صورت میں اُردو صحافت کو اور بھی پھلنے کا موقع ملے گا۔ اُردو والوں کو چاہئے کہ وہ ابھی سے اخبار نویسی کے جدید طریقہ کار اور طباعت کی نئی ٹکنولوجی کو اپنا کر اس ملک میں اردو کے شاندار مستقبل کے خیر مقدم کے لئے تیار رہیں۔

ڈاکٹر عابد پشاوری

دریائے لطافت کا ایک قلمی نسخہ

شعبۂ اردو، جموں یونی ورسٹی، جموں میں دریائے لطافت مصنفہ انشا اللہ خاں انشا اور مرزا محمد حسن قتیل کے دو نسخے ہیں۔ ذیل میں ایک کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

نسخۂ مذکور چند سال پہلے کتاب نگر لکھنؤ سے خریدا گیا تھا۔ اس کا سائز "6 × 9" (تقریباً) اور سطر ۱۷ سطری ہے۔ خط نستعلیق رواں دواں، مائل بہ شکست ہے۔

کیفیت:

کاغذ باریک، جو کبھی سفید رہا ہوگا، اب زرد پڑ گیا ہے۔ نسخہ خاصا کرم خوردہ ہے لیکن کاغذ مضبوط ہے۔ کرم خوردگی سے متن کو نقصان پہنچا ہے تاہم عام طور سے پڑھ لیا جاتا ہے، البتہ ورق ۱۰۰ سے ۱۲۸ تک آخری چوتھائی حصے میں تقریباً پون انچ کا ٹکڑا دیمک نے پوری طرح چاٹ لیا ہے جس سے تقریباً چار سطروں کا حصہ ضائع ہوگیا ہے۔ اسی طرح ورق ۱۷۷ سے ۱۹۵ تک بائیں اوراق کا تقریباً ½ ۱" کا ٹکڑا دیمک کی نذر ہوگیا ہے۔ اس حصے پر بڑی بڑی چیپیاں لگی ہوئی ہیں اور اس سے عموماً آخری تین سطریں متاثر ہوئی ہیں۔ نسخے کے باقی حصے کا متن، کرم خوردگی

عابد پشاوری، قلمی نام، شیام لال کالڑا، اصلی نام، ریڈر شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں۔ ۱۸۰۰۰۱

کے باوجود، پڑھا جا سکتا ہے۔

اوراق :

شمارِ اوراق کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ہر ورق پر ترک کے التزام کے باوجود اوراق کے اوپری بائیں گوشے میں نمبر شمار بھی درج ہیں۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اعداد کاتبِ نسخہ ہی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں، اس لیے کہ:

(۱) متن اور اعداد کی سیاہی ایک ہے

(۲) ورق ۱۰۰ کے بعد اعداد اس طرح لکھے ہیں: ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۔۔۔۔ ۱۰۰۹، ۱۰۰۱۰ وغیرہ۔ یہ قدیم روش ہے۔ دو ایک اور نسخوں کے علاوہ اعداد کا یہ انداز داستانِ ہفت سیاح مصنفہ غلام غوث تشنہ شاگردِ قتیل، دیوانِ انشا مخطوطہ مخزونہ کتب خانۂ خاص، انجمن ترقیِ اردو، کراچی (پاکستان) میں بھی راقم کی نظر سے گزر چکا ہے۔ یہ دونوں نسخے بھی انیسویں صدی کے ربعِ اوّل کے لکھے ہوئے ہیں۔ بہرحال ۱۰۰۱۰ (۱۱۰) کے بعد کے اعداد موجودہ روش کے مطابق ہیں، لیکن ورق ۲۰۱ کے بعد ایک بار پھر وہی قدیم انداز ملتا ہے اور ورق ۲۰۹ تک یہی کیفیت ہے۔ اس کے بعد پھر موجودہ روش اختیار کر لی گئی ہے۔ بہرحال قدامت کی تصدیق کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔

تعدادِ اوراق ہی کے سلسلے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ نسخے کا آغاز ورق ۶۵ب سے ہوا ہے کہ دوسرے ہی صفحے کے اوپری بائیں گوشے میں ۶۶ لکھا ہوا ہے اور اس کے بعد اوراق مسلسل ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ۶۵ اوراق میں کوئی اور کتاب تھی، لیکن کون سی تھی، اب اس کا پتہ چلانا ممکن نہیں کہ یہ انشا ہی کی کوئی اور کتاب تھی یا کسی اور کی کوئی تصنیف۔ اغلب یہ ہے کہ وہ انشا کی تصنیف نہیں تھی۔ اس قیاس کا سبب یہ ہے کہ نسخۂ زیرِ تعارف پہلے سیّد مسعود حسن رضوی، ادیب کے کتب خانے کی زینت تھا۔ چند برس پیشتر شعبے کے لیے

آن سے کئی کتابیں خریدی گئی تھیں ۔ اگر نسخۂ زیرِ تعارف کے شروع میں آنشاہی کی کوئی تصنیف ہوتی تو اوّل تو اُسے الگ کرنے کی ضرورت نہ تھی، دوسرے یہ کہ اگر ایسا ہوتا تو وہ کتاب بھی شیعے ہی کے کتب خانے میں آتی، جو نہیں ہے۔

دریاے لطافت سے پہلے کوئی اور کتاب تھی اِس کی تصدیق اِن دو وجوہ سے بھی ہوتی ہے: ورق ۶۵ الف یعنی وہ سادہ صفحہ جسے اِس نسخے کا پہلا ورق کہنا چاہیے ۔ اس کے اوپری بائیں گوشے میں بخطِ شکستہ کچھ اس قسم کی عبارت کاتبِ نسخہ ہی کے خط میں موجود ہے:

۶۵ لطائف
دریای

میرے اندازے کے مطابق یہ "ورق ۶۵ دریاے لطافت" ہے۔ گویا یہاں سے دریاے لطافت شروع ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ نمبر شمارِ اوراق لکھتے لکھتے کاتب کو اس امر کا احساس ہو گیا ہے کہ شمارِ اوراق میں ۶۵ کا فرق ہے۔ چناں چہ اس نے جہاں ورق ۱۸۹ لکھا ہے (یہ اعداد پوری طرح پڑھنے میں نہیں آتے) اس کے نیچے سُرخ روشنائی میں ۲۴ بالکل صاف ہے اور (۱) غیر واضح ہے، (غالباً ۱ جلد بندی میں کٹ گیا ہے) لکھا ملتا ہے۔ دونوں اعداد کا فرق ۶۵ ہے۔ اسی طرح ورق ۱۹۳ پر کالی سیاہی میں درج نمبر شمار کے نیچے سُرخ روشنائی ۱۲۸، ورق ۲۰۰۲ (۲۰۲) کے نیچے ۱۳۷، ۲۱۰ کے نیچے ۱۴۵ درج ہے اور ورق ۲۱۲، ۲۱۷ اور ۲۲۲ پر سرخ روشنائی میں اعداد پہلے اعداد کے نیچے کی بجاے اوپر لکھے ہیں۔ فرق ہر جگہ ۶۵ ہی ہے۔ آخری ورق یعنی ۲۲۴ کے نیچے کچھ اس طرح لکھا ہے:

۲۲۴
۱۵۹
ـــہ
۲۰ہ
کم ورق

اغلب یہ ہے کہ کاتب نے شروع کے کم اوراق کی تفصیل لکھنا چاہی ہے یعنی ۹۴-۲۲۴
۱۵۹ = ۶۵ لیکن غلطی سے ۶۵ کی جگہ ۵۲ لکھ گیا ہے۔
مندرجہ بالا تصریحات سے ظاہر ہے کہ اوراق کی کُل تعداد ۱۵۹ ہے۔ خط کے لیے پہلے ہی لکھا جا چکا ہے کہ نستعلیق رواں دواں، خط شکست کی حدود کو چھوتا ہوا ہے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ اس نسخے کی کتابت میں کاتب نے کتنا وقت لیا لیکن سوادِ خط سے معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے نہایت عجلت اور رواروی میں لکھا ہے، اس لیے کتابت میں زیادہ مدت نہیں لگی ہوگی۔ اختتام کی تاریخ کے لیے البتہ متن کے خاتمے سے ملحق و مسلسل بہ صورت ترقیمہ یہ عبارت ملتی ہے:

تمت تمت تمت (سرخ) بمنہ و کرمہ نسخۂ دریائی لطافت از تالیفات
میر انشاء اللہ خان دمرزا محمد حسن قتیل دہلوی بتاریخ ۱۲ ذیقعدہ ۱۲۴۸ھ
ہجری

(نقل کالاصل)

یہ عبارت ورق کے اوپری ایک چوتھائی حصے میں ختم ہو گئی ہے۔ اس سے ذرا نیچے خالی جگہ پر ترچھی سطروں میں "انشا بزبان شہدہ (انشا بزبانِ شہدہ) کا عنوان دے کر مندرجہ ذیل شعر نقل کیا ہے:

اُکتی چکتی بہر کبھو چوک کے اب سیر رہے
خوش رہو دولہہ بہار رمیاں کی خیر رہے

(اُکتے چکتے بھی کبھو چوک کی اب سیر رہے ؎ خوش رہو دولہا بہادر میاں کی خیر رہے)
ترقیمے میں کاتب نے نہ تو اپنا نام ہی لکھا ہے اور نہ یہ ہی بتایا ہے کہ یہ نسخہ کہاں لکھا گیا۔ غالباً لکھنؤ میں لکھا گیا ہے۔ نسخے کا آغاز اِس طرح ہوتا ہے:

رب یسر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم و تمم بالخیر (کذا)

(دائیں بائیں سُرخ روشنائی اور درمیان میں کالی سیاہی استعمال کی گئی ہے۔
نیز اعراب میں سُرخ روشنائی استعمال کی گئی ہے)

ثنائی بی اندازه داوریرا (داورے را) سزاوار است کہ زبان آدمی را بلغت ہائی گوناگون بنطق آورد و مشت خاکی را بقدرت کاملہ گویا کرد قطعہ باشد این نہ طبق ارزق فام ؞ رشحہ از قلم قدرت او ؞ ہرچہ درعالم کون است ازان ؞ سکند جلوہ کری صورت او ؞ دکلہائی تروتازہ صلوات طیّبات پیشکش جناب رسول لیکہ خداوند قدیر در ہر زبانش شیرینی بیان عطا فرمود بعبارات معجز قرین سرقانیے (فرقانیے) زبان آوران عرب را ساکت نمود"

(نقل کالاصل)

اختتام

زیب و زینت ہر دو مترادف است لامحالہ یکی زیادہ بر مطلوب باشد لیکن از کثرت استعمال ہر دو لفظ باہم خوشنما بود مثال حشو متوسط شعر تو ہی بحر بیکران میں عاشق تفسیدہ لب ؞ ای جہان جود وہمت پیاس کو ۔ ی بوجھا ؞ ای جہان جود وہمت حشو است لیکن نہ باعث زینت کلام است نہ موجب قبح مثال حشو قبیح شوا کر تونے ستم مجھ پر کیا تو کیا ہوا پیاری ؞ جفا معشوق اور محبوب کا سنتے ہیں سب عاشق ؞ تمت ۔ تمت ۔۔۔ الخ

اس سے پہلے کہ نسخے کی خصوصیاتِ املا یا کتابت کی تفصیل درج کی جائے نمبر شمارِ اوراق سے متعلق ایک وضاحت کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا، نمبر شمارِ اوراق کے لحاظ سے درج کیے گئے ہیں یعنی ہر دوسرے صفحے کے اوپری بائیں کنارے پر نمبر پڑا ہوا ہے، اور یہ اعداد کاتبِ نسخہ ہی نے لکھے ہوں گے ۔ اِس کا مزید ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ ورق ۷۶ ب پر الواب کی تفصیل اس طرح لکھی ہے :

"... این دریاے لطافت مشتمل است بر یک صدف بر از گوہر سلطان
پسند و ہفت جزیرہ وسیع تفصیلش اینکہ صدف پنج دردانۂ یتیم دارد۔
دردانۂ[۶۸] اوّل دربیان کیفیت اردو، دردانۂ[۷۴] دوم متضمن ....
دردانۂ[۸۵] سیوم ... دردانۂ[۱۰۱] چہارم .... دردانۂ[۱۱۵] پنجم ....
جزیرۂ[۱۲۰] اول درصرف اردو کہ چار شہر معمور دراں گنجائش پذیرفتہ۔
شہر[۱۲۰] اول .. شہر[۱۲۷] دوم ... شہر[۱۳۰] سیوم .... شہر[۱۳۱] چہارم ..
جزیرۂ[۱۳۲] دوم ... الخ"

خط کشیدہ الفاظ سرخ روشنائی میں ہیں اور ان کے اوپر لکھے گئے اعداد کالی سیاہی میں۔ یہ اعداد ان صفحات کی نشاندہی کرتے ہیں جہاں سے ابواب متعلقہ شروع ہوتے ہیں۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ پوری کتاب میں اوراق کے نمبر کاتب نسخہ ہی نے لکھے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ترک کے التزام کے باوجود کاتب نے اعدادِ شمارِ اوراق کا التزام ابواب کی فہرست اور ان کا صفحہ درج کرنے کے لیے کیا ہے تاکہ قاری کو اپنے حسب ضرورت اور منشا باب ڈھونڈنے میں آسانی ہو۔ صفحات کی یہ نشاندہی اور فہرست سازی انگریزوں کی دین ہے۔ اِس سے اندازا ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کتابوں کی ترتیب پر بھی انگریزوں کا اثر پڑنا شروع ہوچکا تھا۔ اس سے پہلے راقم کی نظر سے سوائے ہفت سیّاح کے کوئی ایسا مخطوطہ نہیں گزرا جس میں ابواب کے ساتھ صفحے کا نمبر درج کیا گیا ہو۔ یہاں اس شُبہے کی گنجائش نہیں کہ ممکن ہے یہ نمبر کسی نے بعد میں لکھ دیے ہوں، اِس لیے کہ اِس شمار میں ورق ۱۰۱ کو ۱۰۰۱، ۲۰۲ کو ۲۰۰۲، ۲۰۳ کو ۲۰۰۳ وغیرہ لکھا گیا ہے جو ۱۹ویں صدی کے شروع تک ہی رائج تھا۔ بعد کی کسی تصنیف میں اعداد کا یہ انداز دیکھنے میں نہیں آیا۔ اب تک راقم کی نظر سے ایسے جتنے نسخے گزرے ہیں سب ۱۹ویں صدی کے رُبع اوّل کے لکھے ہوئے ہیں

خصوصیاتِ اِملا و کتابت :

۱۔ اسمارِ عنوانات شروع سے آخر تک سُرخ روشنائی میں لکھے گئے ہیں جہاں

ایسا نہیں کیا گیا وہاں بھی اُن کے اوپر سُرخ روشنائی میں — بنا دیا گیا جسے نئے فقرے کے آغاز کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے ۔

۲۔ یائے مجہول اور معروف میں امتیاز نہیں کیا گیا۔ مثلاً اوپر ترقیمے کی جو عبارت اور شعر نقل ہوا ہے اس کے پہلے مصرعے میں "کی" "کو" "کے" لکھا ہے لیکن "آگے چکے کو" "اکی چکی" لکھا گیا ہے۔

۳۔ ک اور گ دونوں پر ایک ہی مرکز بنا یا گیا ہے ۔

۴۔ نون غُنّہ میں بھی نقطہ ڈالا گیا ہے ۔

۵۔ کہیں کہیں الفاظ کو ملا کر لکھا گیا ہے مثلاً بلغت ہای ، بنطق ، بتاریکیش، عالیجنابے جوانمردی ، فصیحترین (فصیح ترین) وغیرہ ۔

۶۔ عموماً الفاظ میں نقطوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا لیکن کہیں کہیں نقطے حذف بھی کر دیئے گئے ہیں ۔

۷۔ عام طور سے اعراب کا خیال نہیں رکھا گیا لیکن کبھی کبھی تشدید، فتحہ یا کسرہ لکھا گیا ہے ۔

۸۔ اشعار نثر کے ساتھ مسلسل لکھے گئے ہیں ۔ کتاب کے شروع کے حصّے میں مصرعوں کو الگ کرنے کے لیے اُن کے درمیان تین سُرخ نقطے (∴) ڈال دیئے گئے ہیں ، بعد کے حصّے میں یہ اہتمام قائم نہیں رہ سکا ۔

۹۔ کہیں کہیں جہاں اِنشا نے مثالیں دی ہیں یا جس عبارت کو کاتب اہم سمجھتا ہے اس کے اُوپر سرخ خط (——) کھینچ دیتا ہے ، لیکن یہ التزام بھی شروع کے چند اوراق تک محدود ہے ۔

۱۰۔ منظوم مثالوں کے لیے حسبِ ضرورت قطعہ ، مثنوی ، شعر ، مطلع ، ٹپّہ وغیرہ سُرخ روشنائی میں لکھا گیا ہے ۔ کہیں کہیں علامتِ شعر (سـ) سے بھی کام چلایا گیا ہے ۔

۱۱۔ ہائے مخلوط کو ہمیشہ کھنی دار لکھا ہے ۔

۱۲۔ ٹ، ڑ، ڈ وغیرہ پر "ط" بنائی گئی ہے۔ کہیں کہیں "ٹ" کو "ٹ" بھی لکھا ہے جیسے "باٹ" بجائے باٹ (ورق ۱۱۳)

۱۳۔ کہیں کہیں جہاں الفاظ چھوٹ گئے ہیں یا غلط لکھے گئے ہیں وہاں حاشیے میں چھوٹا ہوا لفظ یا صحیح لفظ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود عُجلت کے سبب بعض عبارتیں چھوٹ گئی ہیں۔

اس کے علاوہ نسخے میں کوئی خاص بات نہیں۔ اس کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ کرم خوردگی کے باوجود یہ نسخہ تقریباً مکمل ہے اور انشا اور قتیل کی وفات کے قریبی زمانے (۱۲۴۰ھ[1]) میں لکھا گیا ہے۔ (انشا اور قتیل دونوں کا انتقال ۱۲۳۳ھ[2] میں ہوا ہے)۔ "تقریباً مکمل" اس لیے کہ شہرِ دوم دربیانِ بدائع معنوی کا آخری فقرہ کاتب نے چھوڑ دیا ہے۔ اس کے بعد مرشد آبادی اڈیشن میں ایک مختصر باب اقسام نظم کے بیان میں ہے، جس کا عنوان ہے:

"باغِ دل آرا بنا پذیرا ست بر تقسیم میوہ اقسام نظم وجُنبانیدن شاخ شگوفہ وفوائد دیگر" کاتب نے یہ باب نہیں لکھا۔ یہ باب ۱۳۔۱۴ صفحات پر محیط ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کاتب کا منقول عنہ نسخہ ہی ناقص الآخر تھا یا اُس نے عجلت زدگی کے سبب یہ حصّہ حذف کر دیا ہے۔

---

[1] ۲۵-۱۸۲۴ء [2] ۱۸-۱۸۱۷ء (مدیر معاون)

تصحیح: جامعہ کے پچھلے شمارے میں خان بہادر پروفیسر محمد محفوظ الحق کی علمی خدمات پر کمال جعفری صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس مضمون پر ان کا سابق پتہ درج تھا اور وہی حاشیے میں لکھ دیا گیا، وہ دراصل شانتی نکیتن میں نہیں، اب دہلی میں ہیں، آل انڈیا ریڈیو میں ملازم اور جامعہ ملیہ میں فارسی کے ریسرچ اسکالر ہیں ـــــ (ادارہ)

ایک مشاہد کے قلم سے

دہلی کا بین الاقوامی سمینار

چودھویں صدی ہجری کے اختتام کے موقع پر

حکومت ہند نے چودھویں صدی ہجری کے اختتام کے موقع پر کل ہند تقریبات کا ایک پروگرام بنایا ہے، اس پروگرام میں ۲۸ رجنوری تا ۳۱ رجنوری ۱۹۸۱ء کو دہلی کے وگیان بھون میں منعقدہ بین الاقوامی سمینار کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سمینار کا موضوع تھا: "ہندوستان کے خصوصی حوالے سے دنیا کی تہذیب وتمدن کی ترقی میں اسلام کا حصّہ" اس سمینار میں ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، آسٹریلیا، افغانستان اور ترکی کے نمائندوں نے شرکت کی اور مقالے پڑھے۔ اس کے لئے ٹیونس اور لبنان کے اسکالرز نے بھی مقالے لکھے تھے اور اُن کی آمد بھی متوقع تھی لیکن عین وقت پر وہ کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ ہندوستان کے طول وعرض میں قائم مختلف یونیورسٹیوں، علم وتحقیق کے مرکز اور آثارِ قدیمہ اور آرکائیوز کے محکموں کے عالموں اور محققین نے اس سمینار میں مقالے پیش کئے — ان مقالوں کی تعداد تقریباً پچپن تھی۔ چونکہ یہ تعداد وقت کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی اس لئے نہ تو مقالہ نگاروں کو اپنا پورا مقالہ پیش کرنے کا موقع تھا اور نہ مقالوں پر بحث ومباحثہ اور تبادلۂ خیال کی زیادہ گنجائش تھی۔ پھر بھی بعض مقالوں اور موضوعات پر اچھی بحث ہوئی۔

افتتاحی اور اختتامی نشستوں کے علاوہ مقالہ خوانی کی چار نشستیں ہوئیں۔ افتتاح ہندوستان کی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے فرمایا، اختتامی نشست کی صدارت جسٹس محمد حمید اللہ بیگ نے کی جس میں نائب صدر جمہوریۂ ہند جسٹس محمد ہدایت اللہ نے

اپنا خطبہ پڑھا۔ شکریہ کی تقریر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے کی۔ مقالہ خوانی کی چار نشستوں کی صدارت، علی الترتیب، حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی، جناب بدرالدین طیب جی، پروفیسر رشید الدین خاں اور جسٹس محمد حمید اللہ بیگ نے فرمائی۔ مقالوں کا معیار عام طور پر اچھا تھا اور جتنی کچھ بھی بحث ہوئی وہ بھی معیاری تھی۔ مندوبین اور مشاہدین کی تعداد ہر نشست میں کئی سو ہوتی تھی اور افتتاحی نشست میں تو تعداد اتنی زیادہ تھی کہ بہت سے بااثر لوگوں کو بھی پیچھے پورے وقت کھڑا ہی رہنا پڑا کیونکہ لوگ کافی پہلے سے آ کر کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ بہرحال جلسے کے ہال کے اس طرح بھر جانے سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ موقع بہت اہم ہے اور لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی ترقی میں واقعی اسلام کا کیا حصّہ رہا ہے۔

وزیراعظم کی افتتاحی تقریر

وزیراعظم مسز اندرا گاندھی تشریف لائیں تو پورے مجمع نے کھڑے ہو کر آن کا استقبال کیا جس کا جواب انھوں نے ایک جذبۂ تشکر کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے دیا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں انھوں نے فرمایا:

"جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، اس سمینار کا موضوع "ہندوستان کے خاص حوالے سے دنیا کی تہذیب و تمدن کی ترقی میں اسلام کا حصّہ" ہے، اس حیثیت سے مجھ پر ایک ایسی قوم کی حکومت کی ذمہ داری ہے جس میں دنیا کے مختلف ملکوں کی مسلم آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کی تعداد دوسرے نمبر پر ہے، اس سمینار میں شریک ہونے والے عظیم اسلامی تمدن کے تمام عالموں کو میں خوش آمدید کہتی ہوں۔ لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد سے قطع نظر ہمارے نزدیک اس کی اہمیت زیادہ ہے کہ انھوں نے گذشتہ کئی صدیوں میں اس ملک کی زندگی کی تعمیر میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ اس ملک کے دوسرے عناصر کے ساتھ اسلامی عناصر کا مختلف سطحوں پر ملاپ ہوا اور ان دونوں عناصر نے تقریباً انسانی عمل کے ہر صیغے میں ایک دوسرے کو متاثر کیا، فلسفہ اور روحانی

معاملات، طرزِ حکومت اور سماجی ادارے، ادب اور آرٹ، فنِ تعمیر اور موسیقی، ریاضی اور طب، صنعتیں، حرفے اور ٹکنولوجی، یہاں تک کہ ہمارے کھانے، ہمارے لباس اور ہماری زبانیں ـــــ ان سب پر اس تاریخی عمل کی چھاپ دیکھی جا سکتی ہے۔

"طلوعِ اسلام کے بعد گذشتہ چودہ سو برس میں وقت کے مختلف مرحلوں میں دہلی نے دنیائے اسلام کے بعض عظیم اسکالروں اور روحانی شخصیتوں کو اپنے یہاں بلایا اور انھیں اپنی آغوشِ محبت میں جگہ دی، اور آج بھی دہلی اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں اس کے سماعی اور بصری شواہد موجود ہیں۔

ہمیں فخر ہے کہ ہندوستانی تہذیب ایک ملی جلی اور مشترک تہذیب ہے جس میں بہت سے خطوط اور رنگ شامل ہیں، انجذاب، اثر اندازی اور اثر پذیری کے (تاریخی) عمل میں، ہندوستان کی اپنی مخصوص جینی اَس (genius) کی یہ کارفرمائی رہی ہے کہ اس نے اِس ملی جلی تہذیب کے ہر جزو کو اس کی اجازت دی کہ وہ اپنی منفرد خصوصیت اور اپنا مخصوص رنگ روپ باقی رکھے۔ بعض مصنفین نے استعارہ کی زبان میں یہ کہا ہے کہ ہندوستان کوئی ڈھالنے والا سانچہ نہیں بلکہ ایک موزئیک (mosaic) ہے۔"

اس کے بعد محترمہ مسز اندرا گاندھی نے پیغمبر اسلامؐ کی بعثت سے صدیوں قبل کے ان تہذیبی اور تجارتی روابط کا ذکر کیا جو ہندوستان اور مغربی ایشیا کے مابین قائم ہو چکے تھے اور کہا کہ جب اسلام نے جزیرہ نمائے عرب میں بسنے والے انسانوں کی زندگی اور ذہنی افق کو بدل دیا تو جلد ہی اس کے اثرات ہندوستان میں ظاہر ہونے لگے۔ انھوں نے ہندوستان کے محیر العقول کارناموں کو مسز اینی بسنٹ کے الفاظ میں بیان کیا کہ آٹھویں صدی سے لے کر چودھویں صدی تک مسلمانوں کے ہاتھوں میں علم کی شمع روشن رہی۔ جہاں کہیں بھی وہ گئے اپنے ساتھ علم وفن کی شمع لے کر گئے۔ وہ فاتح کی حیثیت سے گئے، لیکن جن علاقوں کو انھوں نے فتح کیا وہاں انھوں نے مدرسے اور یونیورسٹیاں قائم کیں۔ قاہرہ، بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیاں پیغمبر اسلامؐ کے

ظلِ ہمایونی میں پھلی پھولیں۔ عیسائی یوروپ نے اندلس کا رخ کیا کہ مسلمانوں سے قدیم علوم حاصل کرے۔ مسلمانوں نے ہیئت وفلکیات، کے علم کو عام کیا۔ انھوں نے ہندوستان کی سندھانت اور دوسری کتابوں کے ترجمے کئے۔ انھوں نے نئے نئے علوم وفنون ایجاد کئے۔ آسمان کے ستاروں سے لے کر زمین کی زراعت تک انھوں نے سب چیزوں کا علمی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا، اور نئی نئی ایجادات کیں۔ آرٹ اور موسیقی اور صنعت وحرفت کو انھوں نے معراجِ کمال تک پہونچا دیا، فلسفے میں تو وہ سب سے بازی لے گئے اور انھوں نے حقیقت کبریٰ کے وجود کی تہوں تک پہونچنے کی کوشش کی۔

اس کے بعد انھوں نے کہا:

"یہ آپ جیسے عالموں کا کام ہے کہ اسلامی فلسفے کے دقیق اور پیچیدہ مسئلوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میرے لئے تو بس یہی کافی ہے کہ میں پیغمبر اسلام کی تعلیمات کی غیر معمولی درخشانی، دردمندی اور ہر لحظہ نئی شکل میں نکھرتی معنویت کو خراجِ عقیدت پیش کروں۔ قرآن شریف میں کہا گیا ہے کہ تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے (خاص) شریعت اور (خاص) طریقت تجویز کی ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتے۔ لیکن (ایسا نہیں کیا) تاکہ جو کچھ (دین) تم کو دیا گیا ہے اس میں تم سب کا امتحان فرمائیں، لہٰذا نیک اور مفید باتوں کی طرف دوڑو۔ تم سب کو خدا ہی کے پاس جانا ہے، پھر وہ تم سب کو جتلا دے گا جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔" (سورۂ مائدہ : ۴۸)

"کیا (مذہبی) رواداری کا اس سے بہتر اور کوئی تصور ہو سکتا ہے؟ تاریخ کے اس نازک مرحلے میں یہی وہ نیکی ہے جس کی ہمیں انسان اور انسانوں کو بچانے کے لئے سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

"اسلام کے مقدس رسول کا یہ غیر معمولی انکسار تھا کہ انھوں نے اپنے آپ کو اُمی فرمایا۔ لیکن اُس شخص سے زیادہ اور کون دانشمند ہو سکتا ہے جس نے یہ اعلان کیا: 'علم کے ذریعہ انسان معروف اور منکر میں امتیاز کر سکتا ہے، علم

کی روشنی میں جنت کی راہ صاف نظر آتی ہے، صحرا میں یہ ہمارا رفیق ہے۔ تنہائی اس کے دم سے انجمن ہے، جب دوست ساتھ چھوڑ دیں تو یہ ہمارا مونس و دمساز ہے، دشمنوں کے مقابلے میں یہ انسان کی زرہ ہے۔"

"حصولِ علم، جدوجہد، دردمندی اور فرض شناسی کی انھیں تعلیمات کی بدولت اسلام نے ایک عالمگیر انقلاب برپا کیا، جس سے جمہوری اور اخوت کے اصولوں پر مبنی ایک جماعت وجود میں آئی، عورتوں اور مردوں کے مابین مساوات کا تصوّر اُبھرا اور بہت سے قبائل اور انسانی گروہوں نے انسانوں کے ایک مشترک مقدر کا وژن دیکھا۔"

اس کے بعد مسز اندرا گاندھی نے جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کے اولین قافلوں کی آمد اور دسویں صدی کے عرب سیّاح اصطخری کے حوالے سے راشٹر کٹا راج میں مسلمانوں اور ان کی مسجدوں کے موجود ہونے کا ذکر کیا اور کہا کہ جنوبی اور شمالی ہندوستان میں مسجدوں، بزرگوں کے مزار اور دوسرے آثار سے پتہ چلتا ہے کہ اس ملک سے مسلمانوں کے تہذیبی روابط مسلم فاتحین کی آمد سے بہت پہلے قائم ہو چکے تھے۔ بعد میں انھیں روابط نے تصوف اور بھکتی کی تحریکوں کو جنم دیا۔ اس سلسلے میں بھی انھوں نے دونوں قوموں پر ایک دوسرے کے اثرات کا ذکر کیا اور بتایا کہ یہ اثرات ہندوستانی سماج میں کتنی گہرائی تک پہونچے اور کس کس شکل میں رونما ہوئے۔ اُن اثرات کے علاوہ جو اسلام اور قدیم ہندوستانی سوسائٹی کے باہم قریب آنے سے روحانیات کی دنیا میں ظاہر ہوئے، ادب، فلسفہ، فن تعمیر، زبان، موسیقی اور آرٹ کے دوسرے شعبوں میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے بڑے دوررس نتیجے نکلے۔

اور آخر میں محترمہ وزیر اعظم نے فرمایا:

"اسلام کو ہم نے ہمیشہ اپنے ہی مذاہب میں سے ایک مذہب مانا ہے اور ہندوستان میں اسلام کی ترقی اور نشو و نما کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ہمارا موزئیک

ایسا ہے کہ اس کا ہر جزو اپنا رنگ روپ باقی رکھتے ہوئے ایک خوبصورت ڈیزائن کا اٹوٹ حصہ بنا رہے گا۔ ہندوستانی مسلمان ہندوستان کی قومی زندگی میں برابر کے شریک ہیں۔ .... ہم کسی بھی مذہب کے پیروؤں کے خلاف کوئی امتیاز نہیں برتتے۔ تمام مذاہب کو برابر کا تحفظ اور احترام حاصل ہے۔ اسی کو ہم "سیکولرزم" کہتے ہیں جس کی رو سے ہر ہندوستانی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے عقیدے پر آزادی کے ساتھ عمل کرے اور خود اپنے مذہب سے متعلق مزید علم حاصل کرتا رہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ "سیکولرزم" یہ بھی چاہتا ہے کہ ایک مذہب کے پیرو دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے اس حق کا بھی احترام کریں۔ ہندوستان کے تحقیقی مراکز اور تعلیمی اداروں میں ذکر اسلامی اور اسلام کے تہذیبی ذخیرہ کے مطالعے کے پورے پورے مواقع حاصل ہیں اور برابر حاصل رہیں گے۔ یہ جو بہت سے اسلامی ملکوں میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی ہے اور ان سے ہمارے روابط کی تجدید ہوئی ہے، تو اس سے بھی ہندوستان میں مطالعات اسلامی کو مزید فروغ حاصل ہوگا۔ آج جبکہ اسلام کی پندرہویں صدی کا آغاز ہو رہا ہے، میں ہندوستان کے اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو مبارکباد دیتی ہوں اور ان سب کے لئے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتی ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں اس سمینار کا افتتاح کر رہی ہوں .."

علی میاں کی تقریر

۲۸ جنوری کو افتتاحی تقریب کے بعد مقالہ خوانی کی نشست شروع ہوئی۔ اس کی صدارت دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے ناظم اور دنیائے اسلام کے نامور عالم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمائی۔ حضرت مولانا کچھ تاخیر سے پہونچے، میں نے محسوس کیا کہ پورا ہال مولانا کی آمد کا بے چینی سے منتظر تھا۔ حاضرین میں خاصی بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جنھوں نے اب تک مولانا علی میاں کو نہیں دیکھا تھا، اور ایسوں کی تعداد اور بھی زیادہ تھی جنھوں نے نام تو سنا تھا لیکن نہ تو دیکھا

تھا اور نہ کبھی ان کی تقریر سُنی تھی۔ مولانا تشریف لائے، اُن کا پُرجوش استقبال ہوا، اور جب اُن کی تقریر ہوئی تو پورا مجمع گوش بر آواز تھا۔ مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا:

"میں تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے آپ سب کو اسلامی کلینڈر کے دو پہلوؤں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ پہلو ایسے ہیں جو ہمارے فضلاء اور اسکالرز کے غور کرنے کے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ یہ محسوس کرتے ہوں گے کہ دنیا کے جتنے مشہور کلینڈر رہیں، جتنی مشہور تقویمیں ہیں، وہ کسی شخصیت کے نام سے، کسی اہم واقعہ سے، کسی بڑی فتوحات سے یا کسی سلطنت کے قیام سے منسوب ہیں،.... لیکن اسلامی تقویم، اسلامی کلینڈر کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا انتساب کسی شخصیت سے نہیں ہے۔ آپ سب جانتے ہیں، کم سے کم مسلمان تو جانتے ہی ہیں اور ان کا اس پر عقیدہ ہے کہ "بعد از خدا بزرگ توئی، قصہ مختصر"، لیکن انھوں نے یہ پسند نہیں کیا کہ اپنی تقویم کو اُس ذات گرامی کی طرف منسوب کریں اور اس کے نام سے مربوط کریں جس سے بڑھ کر کوئی محبوب اور محترم شخصیت ان کی نظر میں نہیں تھی، انھوں نے اس کو ہجرت کی طرف منسوب کیا اور خود اسلام کا اپنے نام کے بارے میں یہی رویہ رہا ہے....."

مولانا علی میاں نے فرمایا کہ مسلمانوں نے اسلامی تقویم کا انتساب اپنے محبوب پیغمبرؐ کے نام سے نہیں کیا، فتح بدر سے نہیں کیا کہ معرکۂ بدر تاریخ اسلام کا ایک فیصلہ کن معرکہ تھا، فتح مکّہ سے نہیں کیا جو مسلمانوں کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ انھوں نے اس کا انتساب "ہجرت کے واقعہ سے کیا جو کہ ایک مستقل پیغام ہے، ایک سوال ہے"۔

"تو ہجرت ایک سوال ہے، یعنی اتنی خوبصورتی کے ساتھ، اتنی خوبی کے ساتھ اور ایسے خاموش طریقے پر اسلام کے سمجھنے اور اسلام سے متعلق غور کرنے کی دعوت نہیں دی جاسکتی تھی، جتنی خوبصورتی، جتنی خوش اسلوبی، جتنی خاموشی، جیسی حکمت اور جیسی لطافت کے ساتھ اسلام کے پیغام پر غور کرنے کی دعوت ہجری تقویم کے ذریعہ دی گئی ہے۔

"جو شخص بھی اسلامی تقویم کی بات کرے گا، ہجری سنہ لکھے گا.... اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہونا ضروری ہے کہ یہ ہجرت کیوں تھی؟ یہ ایک دعوتِ فکر ہے عالمی پیمانے پر اور صرف عالمی پیمانے ہی پر نہیں بلکہ ابدی پیمانے پر، جب تک اسلام ہے، جب تک مسلمان نام کی کوئی قوم ہے، مسلم سوسائٹی ہے، اسلامی تہذیب ہے، اسلامی تاریخ ہے، اسلامی ثقافت ہے، ہمیشہ یہ سوال سوالیہ نشان کے ساتھ سامنے آتا رہے گا کہ اسلام کیا ہے اور اس کی تاریخ میں یہ ہجرت کا واقعہ کیا پیش آیا.... پھر میں نے یہ عرض کیا کہ اس میں ایک پیغام ہے۔ کیا کبھی مقصد ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آدمی ترک وطن پر مجبور ہو جائے اور ایسی مقدس ہستی، ایسی محترم ہستی جسے اس کی قوم کے لوگ 'صادق اور امین' کے لفظ کے علاوہ کسی اور لفظ سے یاد نہیں کرتے تھے، کیا اپنی قوم کے ایسے محبوب، ایسے معتمد علیہ، ایسے مثالی فرزند کو وہ لوگ مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ اپنا عزیز اور محبوب وطن چھوڑ کر چلا جائے؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔ اس میں ایک دعوتِ فکر ہے (اور پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ) جس دعوت کا، جس پیغام کا، جس مذہب کا، جس تاریخ کا اور جس عہد کا آغاز ہجرت سے ہوا تھا، اس کا انجام کیا ہوا؟

"جن مٹھی بھر انسانوں کو مکہ میں رہنے کا موقع نہیں تھا اور وہ مجبور تھے کہ اپنا وطن چھوڑ دیں وہ دنیا کے اتنے بڑے حصے کو اپنا وطن بنا سکتے ہیں۔ کیا تاریخ ایسا پلٹا کھائے گی، کیا زمانہ ایسی کروٹ لے گا، کیا آسمان ایسا رنگ بدلے گا کہ وہ جماعت جس کے لئے اس کے وطن، مکہ میں سانس لینے کی گنجائش نہ تھی وہ دنیا کے چپے چپے پر دنیا کے ہر گوشے میں پائی جائے گی۔ یہ اتنا بڑا تضاد ہے جس سے بڑھ کر تضاد ہمیں انسانی تاریخ میں نظر نہیں آتا.... میں نہیں سمجھتا کہ دنیا میں اس کی مثال آسانی سے ملے گی... تو جس تاریخ کا آغاز ایسی مجبوری، بے بسی اور بیکسی کا ہو، میں کہتا ہوں کہ ابھی اس کا انجام نہیں آیا... آپ مجھے معاف فرمائیں، میں اسلام کے ابدی پیغام ہونے کا قائل ہوں، میں اسلام کے انسانیت کی ضرورت ہونے کا قائل ہوں، میں کیسے کہہ دوں کہ اس کا انجام سامنے آگیا۔ نسل انسانی کا انجام ابھی نہیں آیا، تہذیب انسانی کا انجام

ابھی ہمارے سامنے نہیں آیا، لیکن اس کا درمیانی حصہ بھی کتنا شاندار ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں وہ پہونچا اور اس نے وہاں ایک نئی زندگی پیدا کی، اس نے ایک نئی روشنی عطا کی، اس نے عقل انسانی کو ایک نئی آزادی اور ایک نئی جرأت عطا کی، اس نے ضمیر انسانی کو ایک نئی بیداری عطا کی۔ وہ اسلام جس کے لئے مکہ میں گنجائش نہیں تھی... وہ اسلام ہم جیسے کمزور مسلمانوں کے ہوتے ہوئے بھی آج ساری دنیا پر سایہ فگن ہے...

"تو جس تقویم کا آغاز ہجرت سے ہوتا ہے اس تقویم کے ماننے والے اور اس تقویم سے اپنی تاریخ مرتب کرنے والے ایسے جرأت مند انسان پیدا کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ 'ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست'... ہندوستان میں مسلمانوں کا جو پہلا قافلہ آیا وہ بھی اسی اعتماد کے ساتھ آیا اور انھیں امنگوں کے ساتھ آیا، اور اس نے اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دکھایا کہ انھوں نے اس ملک کو اپنا ملک سمجھا۔ انھوں نے یہاں علوم و فنون کے دریا بہا دئے، انھوں نے یہاں کئی مستقل علوم ایجاد کئے، انھوں نے ہندوستان کی تہذیب میں، ہندوستان کی علمی دولت میں، ہندوستان کی ذہانت میں، ہندوستان کی ادبیات میں، ہندوستان کی شاعری میں، ہندوستان کے احساسات میں، ہندوستان کے دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلق میں، غرض ہر چیز میں اضافہ کیا۔

"تو جو تاریخ شروع ہوتی ہے ہجرت سے وہ تاریخ ہمیں یہ تصوّر دیتی ہے، ہمیں یہ طرزِ فکر دیتی ہے کہ 'ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست' اور میں تو یہ بھی کہوں گا کہ مسلمانوں کا عقیدہ صرف یہی نہیں تھا بلکہ ان کا اس پر بھی عقیدہ تھا کہ 'ہر علم، علمِ ماست کہ فیضِ خدائے ماست'، ہر علم ہمارا علم ہے، ہماری ملکیت ہے۔ ہمارا اس پر حق ہے اور وہ ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اس کی خدمت کریں، اس میں وسعت پیدا کریں... مسلمانوں نے ہمیشہ اس پر یقین رکھا کہ یہ ہمارا مذہبی فرض ہے کہ ہم دنیا کے تمام علوم سے واقفیت پیدا کریں اور ہر علوم میں صرف شاگردانہ نہیں بلکہ استادانہ، صرف مقلدانہ نہیں بلکہ مجتہدانہ اور موجدانہ حصہ لیں...

"حضرات! جب ہم اس وقت ساری دنیا میں پندرہویں صدی کی آمد آمد پر تقریبیں منا رہے ہیں، تو یہ بات خوشی کی ہے کہ ہمارا یہ ملک جس میں اس تقویم کے ماننے والوں اور اس تقویم سے کام لینے والوں کی تعداد کا ایک بہت بڑا حصّہ یہاں آباد ہے، یہاں بھی یہ تقریب اسی شان و شوکت اور اسی آن بان کے ساتھ منائی جائے لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ اس لئے منائی جائے کہ یہ ہمیں ایک پیغام فکر اور پیغام انصاف دیتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ تقویم اعلان کرتی ہے کہ کسی بات کا سچا ہونا کافی ہے اسے زندہ رہنے کے لئے، اس کے پھیلنے کے لئے، اسے مقبول ہونے کے لئے... اگر ایسا نہ ہوتا تو اس تقویم اسلامی کو ہرگز اس کا حق نہ تھا اور یہ بے رحم حوادث اور یہ سنگدل اور مادہ پرست دنیا کبھی اس کو موقع نہ دیتی۔ وہ اس طرح پھلے پھولے اور دنیا کے اتنے بڑے حصہ میں پھیلے۔ اس طرح یہ ہجری تقویم دنیا کے ہر اس انسان کو جس کو سچائی عزیز ہے اور ہر اس انسان کو جو سچائی کے لئے کوئی مصیبت جھیل رہا ہے، یہ پیغام دیتی ہے کہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، سچائی رنگ لائے گی... تقویم ہجری اس بات کا عالمگیر اعلان ہے اور ابدی اعلان ہے کہ آخر میں فتح سچائی ہی کی ہوتی ہے...

"پس میں سمجھتا ہوں کہ اس ملک کی نجات بھی اسی میں ہے کہ ہم سچائی کا راستہ اختیار کریں، ہم سچے خدا پرست بھی بنیں اور سچے محب وطن بھی اور ان دونوں میں میرے نزدیک تضاد نہیں، اور مسلمانوں کے جو قافلے یہاں آئے اور جن کے لئے اس ملک نے اپنی آغوش وا کر دی، اور ان کو اپنے سینے سے لگایا، انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ خدا پرستی اور وطن دوستی میں کوئی بیر نہیں، کوئی تضاد نہیں، بس اب ان الفاظ کے ساتھ میں آپ کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

نائب صدر جمہوریہ ہند کی تقریر

۱۲ جنوری کو سمینار کی اختتامی تقریب میں نائب صدر جمہوریۂ ہند جسٹس محمد ہدایت اللہ کی تقریر ہوئی، جسٹس ہدایت اللہ صاحب ہی کے مشورے سے درحقیقت یہ سمینار منعقد

ہوا اور انھیں کی رہنمائی میں پوری کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہونچا۔ انھوں نے اپنے اختتامی خطبے میں فرمایا:

"ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "درحقیقت روحانیت ہی ہندستان کی حقیقی جینی اَس ہے، اور رشیوں اور مُنیوں کی زندگیوں میں یہ روحانیت اپنے لطیف ترین اور پاکیزہ ترین رنگ روپ میں ملتی ہے" انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ مذہب تجربے کی چیز ہے اور اِسے نیکی، صداقت اور حُسن کی تلاش سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔

"ڈاکٹر رادھا کرشنن کی ان باتوں میں بہت کچھ صداقت ہے۔ آج کی دنیا میں ہم مادّیت کی بالادستی کے سبب بڑی حد تک روحانی زندگی کی لطافتوں سے محروم ہیں اور ہم نے اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ صداقت، حُسن اور نیکی کے کام ضروری نہیں ہیں کہ کسی خاص مذہب ہی سے وابستہ ہوں۔ یہ اقدار کسی بھی مذہب میں ہو سکتی ہیں، یہاں تک کہ یہ خود اپنی ذات سے مذہب کے سہارے کے بغیر بھی، زندہ اور موجود رہ سکتی ہیں۔

"افلاطون سے لے کر وہائٹ ہیڈ تک بہت سے فلسفیوں نے ان باتوں کو وضاحت سے بیان کیا ہے اور اگرچہ ہم میں سے سب لوگ روحانیت کے حامل اور عامل نہیں ہو سکتے لیکن عام طور پر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ اگر ہم مادیت سے دامن بچا کر روحانیت کی منزل کی طرف ترقی کرتے جائیں تو ہمیں کسی قدر الوہیت کا قرب حاصل ہو جائے گا۔ ورنہ ہماری زندگی جذبات و احساس، وہم و گمان اور ادراک محض کی زندگی ہوگی۔

"دنیا میں الوہیت کا کوئی ایسا تصور نہیں ہے جسے سب مانتے ہوں، اپنشدوں میں کہا گیا ہے کہ ذہن انسانی ذاتِ الٰہی کا مکمل ادراک نہیں کر سکتا، وہ ایسا نہیں ہے جسے موجودات میں سے کسی چیز سے تشبیہ دی جا سکے۔ ذاتِ الٰہی کو حواسِ انسانی سے نہیں جانا جا سکتا، جیسا کہ مشہور ہے کہ خدا کو دیکھا تو نہیں مگر عقل سے پہچانا

ضرور ہے۔ ہاں، ارباب بصیرت اس کے مظاہر اپنے گرد و پیش میں دیکھ سکتے ہیں:

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار"

اس کے بعد فاضل مقرر نے فرمایا کہ معرفت الٰہی عقل سے نہیں بلکہ روحانی زندگی گذارنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح ہندو مذہب میں الوہیت کا جو تصور ہے وہ کافی ہمہ گیر اور گہرا ہے اور اس تصور کی ہمہ گیری اور گہرائی ہی کی وجہ سے خود ہندوؤں میں عقائد کا بہت کچھ اختلاف اور کثرت پائی جاتی ہے۔ چونکہ عقائد اور ان عقائد پر مبنی ثقافتیں باطنی اور روحانی تجربوں کے مظاہر ہوتے ہیں، اس لئے ہندوستان میں ایسے مظاہر کی کثرت ہے اور یہی اس ملک کے باسیوں کا مشترک تہذیبی ورثہ ہے۔

"جب ہم نے اس سمینار کا منصوبہ تیار کیا تو یہ خیال تھا کہ چودھویں صدی ہجری کا اختتام مناسب موقع ہے کہ اس مشترک تہذیبی ورثے میں اسلام نے جو کچھ اضافہ کیا ہے اس کا جائزہ لیا جائے.... اس لئے ہم نے موضوعات کے تعین کے وقت تاریخی ترتیب کا بھی خیال رکھا تاکہ ہند اسلامی تہذیب کا ہر پہلو سامنے آجائے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہماری یہ کوشش کامیاب رہی....

"ابھی پرسوں وزیر اعظم صاحب نے اس سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے بڑی تفصیل سے علوم وفنون کی ترقی میں عربوں کی دین کا ذکر کیا تھا۔ اب اس کے تکرار کی ضرورت نہیں لیکن عربوں کو فرنیکس کے ہاتھوں شکست وہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، اور اناطول فرانس نے اپنی کتاب The Bloomy Life میں بالکل صحیح کہا ہے کہ 'پوائیتیئے کی جنگ تاریخ کا سب سے بڑا المیہ تھی کہ اسی جنگ میں عربوں کے علوم وفنون اور عرب تمدن نے فرنیکس کی وحشت وبربریت کے سامنے ہتھیار ڈال دئے'۔

"اگرچہ عرب دنیا اپنے قدیم حلقۂ اثر میں کمزور اور ناتواں ہوگئی، لیکن اس کا

اثر مختلف نشیب و فراز اور نوع بہ نوع تبدیلیوں اور ہنگامہ خیزیوں سے گذر کر ہندوستان پہونچا جہاں اسے ایک نئی زندگی ملی۔ دنیا اور خاص طور سے ہندوستان پر یہی اثر اس سمینار کا موضوع تھا۔۔۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ سمینار بہت کامیاب رہا۔ خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ اس کامیابی میں ملک کے مختلف مذاہب کو ماننے والے ہمارے اپنے بھائی اور دوسرے ملکوں کے بھائی برابر کے شریک ہیں۔"

اس کے بعد جناب محمد ہدایت اللہ صاحب نے بریفالٹ کی کتاب The Making of Humanity کے حوالہ سے عربوں کے تجربی تحقیق اور یورپ پر اس کے اثر کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ ان تمام باتوں کا نتیجہ یوروپ کی نشاۃ ثانیہ کی شکل میں ظاہر ہوا۔ مشرق اور مغرب کی اسی ملاقات سے آرٹ، ادب، دینیاتی علوم، نیچرل سائنسز اور لبرل آرٹس کی ہر شاخ میں بڑی ترقی ہوئی، رومی ماہرین قانون میں کئی ایسے تھے جو بیروت اور قسطنطنیہ میں بیٹھ کر کتابیں لکھتے تھے۔ کچھ اسی طرح کی صورتحال ہندوستان میں بھی پیدا ہوئی۔ ہندوستان میں زندگی اور تہذیب سیاسی ہنگامہ آرائیوں اور فوجی لڑائیوں سے دور، پہلے ہی کی طرح (اپنی فطری ڈگر پہ) چلتی رہی۔ مغلوں کے آنے کے بعد ہندوستان میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور اسی دور میں اسلام کے اثرات گہرے پڑے اور مختلف تہذیبوں میں باہم میل جول اور اختلاط زیادہ ہوا۔

"ہندو تہذیب کی جڑیں اتنی گہری اور مضبوط تھیں کہ اس نے راسخ العقیدگی کی ضربوں کو سہار لیا، یہی نہیں بلکہ اس نے مسلم تہذیب کو بھی ایک نیا روپ دیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہندوؤں کے طرز فکر میں بھی بڑی تبدیلی رونما ہوئی، پھر بھی ایران اور مصر کے برخلاف جہاں کہ مقامی تہذیبیں عرب تہذیب کے سامنے بالکل سرنگوں ہوگئی تھیں، یہاں تک عرب لہر انھیں بہالے گئی، ہندوستان میں اسلامی تہذیب اور ہندو تہذیب دونوں ساتھ ساتھ زندہ رہیں (اور بقائے باہم کی روشن مثال بن گئیں")۔

"ہندوستان میں ایک نئی نسل نے جنم لیا جو مختلف کمیونٹیز کے امتزاج (مذاہب میں راسخ العقیدگی کے معاملات اور مذہبی رسوم وارکان کے علاوہ) سے بنی تھی۔ ایک نئی زبان کا نشوونما ہوا جس میں تمام زبانوں کی خوبیاں شامل تھیں۔ یہ سنسکرت، عربی اور فارسی کا مرکب تھی اور اس مرکب سے ابلاغ و ترسیل کے لئے ایک نئے اظہارِ بیان نے جنم لیا جو آج بھی عام ہے، اگرچہ حالیہ برسوں میں اس کی کوششیں ہوتی رہی ہیں کہ اس میں رخنہ پڑ جائے۔۔۔۔

"آپ نے اس سمینار میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے مختلف پہلوؤں پر مقالے سُنے۔ ہم آہنگی اور یکجہتی کا یہ عمل جاری ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہر طرف سے راسخ العقیدگی کے حملوں کے باوجود، یہ عمل آگے بڑھ رہا ہے۔ ہمیں اس کی امید کرنی چاہیئے کہ کہ اس سمینار کے بعد آیندہ سو برس میں مختلف مذہبوں اور فرقوں کے اثرات اور بھی زیادہ ایک دوسرے پر پڑیں گے اور اس میں ایک نیا وسیع المشرب اور کشادہ خیال سماج پیدا ہوگا۔

"اب مجھے اپنی بات ختم کرنی چاہیئے۔ میں ان تمام لوگوں کا شکرگزار ہوں جنھوں نے اِس سمینار میں حصّہ لیا، خاص طور پر میں مولانا سید ابوالحسن ندوی صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس سمینار کی مقالہ خوانی کی پہلی نشست کی صدارت کے لئے سفر کی صعوبت برداشت کی، مجھے افسوس ہے کہ میں ان سے نہ مل سکا۔۔"

شکریے کی تقریر

اختتامی نشست کی آخری تقریر پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کی تھی۔ انھوں نے ایڈوائزری کمیٹی کے اراکین اور اپنی طرف سے تمام شرکاء سمینار کا شکریہ ادا کیا اور سمینار کے منعقد اور اس کا انتظام کرنے والوں کو سمینار کی کامیابی پر مبارکباد دی۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کا جنھوں نے سمینار کا افتتاح فرمایا اور جن کے پُرمغز اور عالمانہ خطبہ نے سمینار کو صحیح رُخ

عطا کیا، اور نائب صدر جمہوریۂ ہند جسٹس محمد ہدایت اللہ کا جن کی فعال دلچسپی اور برمحل مناسب اور بیش بہا مشوروں کے بغیر اتنا شاندار اور مفید سمینار منعقد نہیں ہو سکتا تھا، شکریہ ادا کرنے کے بعد انھوں نے جناب میر نصر اللہ صاحب کا اور جناب پروفیسر بی، آر، گروور صاحب (ڈائرکٹر انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ) کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا۔ میر نصر اللہ صاحب حکومت ہند کی وزارت تعلیم کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں، ان کی کوشش اور انتظامی صلاحیتوں کا اس سمینار کی کامیابی میں بہت زیادہ دخل تھا۔ گروور صاحب سمینار کے سکریٹری تھے اور درحقیقت اس سمینار کے روح رواں وہی تھے۔ مختلف نشستوں کے صدر صاحبان اور تمام متعلقہ حضرات کا شکریہ ادا کرنے کے بعد پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے سمینار میں شریک ہونے والے عالموں اور دانشوروں کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"آپ نے ہماری درخواست پر اس سمینار میں شریک ہونے کے لئے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں، ہم آپ سب کے خلوص و محبت کے گہرے جذبے کے ساتھ خاص طور پر شکر گزار ہیں۔ آپ اپنے اپنے شعبۂ علم میں ممتاز ہیں اور آپ نے اس سلسلے میں گہرا مطالعہ کیا ہے، آپ کی تشریف آوری سے ہی اسلامی تہذیب و تمدن کے رنگا رنگ جلوے ہم نے یہاں دیکھے، آپ نے اس شہر دہلی میں جس نے صدیوں خود اپنی آنکھوں سے قدیم ہندوستانی تہذیب اور اسلامی تہذیب کے میل جول سے جنم لینے والی اس گنگا جمنی تہذیب کو بنتے، اُبھرتے اور ترقی کرتے نہ صرف دیکھا ہے بلکہ جس کی تعمیر و تشکیل میں پورے طور پر شریک رہی ہے، اس عہد کی یاد تازہ کر دی جب مسلمانوں کا پہلا قافلہ جمنا کے کنارے اُترا تھا۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اُسی وقت سے ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے نئے وطن میں اپنے اُس عہد کے عرب۔ ایرانی۔ ترکی تمدن کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ایک نئی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کا آغاز کیا۔ اس زندگی کی کہانی بڑی دلچسپ، حسین اور رنگا رنگ ہے اس لئے کہ رفتہ رفتہ اس ملک کے قدیم تمدن کے ساتھ عرب۔ ایرانی۔ ترکی تمدن کے میل جول اور

محبت و یگانگت کے امکان روشن ہوئے ۔ اس طرح تہذیبی و معاشرتی سطح پر دونوں تمدنوں میں خیالات و افکار اور تمدنی روایات و خصوصیات کا جو لین دین ہوا، وہ مسلمانوں کی تاریخ میں ایک بالکل نیا تجربہ تھا اور تاریخی عمل کے ہاتھوں ایک بالکل نئے تمدّن یعنی عرب ۔ ایرانی ۔ ترکی ۔ ہندوستانی تمدّن کی تشکیل ایسے طرز پر ہو رہی تھی جس کے نمونے پہلے سے دنیائے اسلام میں کہیں موجود نہ تھے ۔ ہماری تاریخ میں جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا تھا اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے ایک نئے ہندوستان کو ڈھالنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس طرح ہماری صدیوں کی ملی جلی، مشترک تاریخ نے اس نئے ہندوستان کی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنی حسن کاری کے سامانوں سے بھر دیا، (اور بقول مولانا ابوالکلام آزاد) "ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں جس پر اس مشترک تہذیب کی چھاپ نہ لگ چکی ہو۔"

ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمان ویسے نہیں رہے جیسے کہ وہ صدیوں پہلے قافلہ در قافلہ یہاں آئے تھے۔ اور نہ ہندو ہی ویسے رہے جیسے کہ انھوں نے صدیوں پہلے مسلمانوں کا استقبال کیا تھا۔ دونوں اپنے اپنے عقائد کی خصوصیات، مذہبی رسوم و ارکان اور دینی اساس میں منفرد رہتے ہوئے ایک نئے تمدن کے نمائندہ بن گئے اور گزشتہ تقریباً دو صدیوں میں تو ایک نئی تہذیب، یعنی مغربی تہذیب جو اب عالمی تہذیب بنتی جا رہی ہے، وہ بھی ہندو مسلم تہذیب کے حصار کو توڑ کر در آئی ہے، اور پرسوں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے جس موزئیک کا ذکر کیا تھا، اس میں گویا ایک اور رنگ کا اضافہ ہو گیا ہے ۔ یہی موزئیک یعنی رنگا رنگ تمدن ہماری مشترک تاریخ کا مقدر بھی ہے اور ہمارے اس قدیم اور عظیم ملک کی وہ خصوصیت بھی جس کے حسن اور پُرکاری پر تمام دنیا جان دیتی ہے اور جس کے رنگا رنگ جلووں اور خوبصورت آثار کو دیکھنے کے لئے دنیا کے گوشے گوشے

سے لوگ کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے تمدن کی اس خصوصیت اور اپنے ملک کے اس حُسن کو برباد نہ ہونے دیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم تاریخ کا احترام کریں اور ہر قیمت پر، ضرورت ہو تو جان دے کر، اپنے وطن کی اُس عظمت کی جس کی تشکیل میں ہماری گنگا جمنی تہذیب کی حسین رنگارنگی کا بہت بڑا حصہ ہے، حفاظت کریں۔"

حکیم میرن دہلوی

تاریخ وفات محمد خلیق مرحوم

آج ہم سب سے جو بچھڑے ہیں خلیق با صفا و احترا
ایک مخلص دوست ہمدردِ اعزّا اور اقربا
قوتِ بازو برادر کے تھے اولاد کے مشفق پدر
سب کئے پورے فرائض مقدرت تھی جس قدر
سختیاں جھیلیں مرض کی اور رہے صابر سدا
ہو گئے رُخصت جہاں سے جب ہوا حکمِ خدا
صبر کی توفیق دے تو پسماندگاں کو اے کریم
بخش دے رحمت سے اپنی ان کو اے میرے رحیم
سنئے ہاتف سے یہ ہجری سالِ رحلت کا پیام
چل بسا دنیا سے اک مردِ خلیق اب، السلام

۱۴۰۱ھ

خلیق آج ہم سب سے رخصت ہوئے — بہت کاہشِ جانِ غم دے چلے
سنا غیب سے عیسوی سالِ رحلت یہ میرن — کہ باغِ جناں میں خلیق اب گئے

۱۹۸۱ء

عبداللطیف اعظمی

بجھ گیا چراغِ خانماں افروز

سید عبدالاحد آثر جلیلی

پاکستان کے اردو فارسی کے ایک ممتاز شاعر جناب سید عبدالاحد آثر جلیلی کا ۷ اپریل کو صبح سویرے لاہور میں انتقال ہوگیا۔ اس سلسلے میں روزنامہ "جنگ" (راولپنڈی) میں ایک مختصر خبر شائع ہوئی کہ: " انھیں کل [۶ اپریل کو] دل کا دورہ پڑا جو کہ آج جان لیوا ثابت ہوا، وہ کوئٹہ سے مختصر دورے پر لاہور گئے تھے۔ ان کی عمر ساٹھ برس تھی، انھوں نے ایک بیوہ، تین بیٹے اور ایک بیٹی سوگوار چھوڑی ہے، وہ ادبی اور مذہبی پروگراموں کے سلسلے میں ریڈیو اور ٹیلیویژن سے منسلک تھے، وہ ریڈیو کے مذہبی اور اسکول براڈ کاسٹ پروگرام کے انچارج تھے۔"

مرحومؒ کا اصلی وطن اجمیر تھا اور ان کے والد کا نام سید عبدالحمید تھا جو جونا گڑھ میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، غالباً دیوان تھے، تعلیم جونا گڑھ اور حیدر آباد دکن میں ہوئی، نواب فصاحت جنگ جلیلؔ مانکپوری (۱۸۶۹ – ۶ جنوری ۱۹۴۶ء) کے شاگرد تھے، اسی نسبت سے جلیلی لکھتے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں میر صغیر حسین آصغر انبالوی (انسپکٹر پولیس) کی صاحبزادی سے شادی ہوئی، تین لڑکے، عبدالماجد، محمد نوید، محمد فیصل اور ایک لڑکی شمامہ ان کی یادگار

؎ مرحوم کے بارے میں یہ تمام معلومات، ان کے اعزا سے معلوم کرکے جناب خورشید احمد خاں صاحب نے لاہور سے بھیجی ہیں۔

ہیں، سب سے بڑا لڑکا الیف۔ ایس۔ سی میں زیر تعلیم ہے۔

تقسیم سے قبل جامع مسجد کے سامنے آغا شاعر قزلباش کی کتابوں کی دوکان کے منتظم رہے۔ تقسیم کے بعد کراچی چلے آئے اور پھر کوئٹہ۔ اگرچہ خود سُنّی تھے مگر بہت اچھے مرثیے لکھتے اور بعض دفعہ شیعہ مجالس میں بھی پڑھتے۔ خاصی تعداد میں مرثیے لکھے۔ ان کی اشاعت کا انتظام ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ نعت، رباعی، مسدس، غزل اور نظم بھی لکھی۔ ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے۔ ایک نعت کے تین شعر ہیں:

کرتے رہیں سب تذکرۂ اوجِ ثریا
میں معتقدِ طرۂ دستارِ نبی ہوں
فردوس کی خاطر نہ اٹھا داورِ محشر
میں شیفتۂ سایۂ دیوارِ نبی ہوں
نسبت نہیں شاہی کو مرے بختِ رسا سے
کیا کم ہے آثر حاشیہ بردارِ نبی ہوں

ایک نجی کام سے لاہور آئے اور اپنی سسرال میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ۶ اپریل کو طبیعت خراب ہوئی۔ ڈاکٹر نے دیکھا تو دل کی تکلیف تشخیص کی۔ فوراً ہسپتال لے جائے گئے۔ اگلے روز ۷ اپریل کو صبح سات بجے طبیعت ٹھیک تھی کہ دل کا دوسرا دورہ ہوا اور آناً فاناً ختم ہو گئے۔ لاہور میں ہی دفن ہوئے۔ آخری بیماری سے قبل ایک مضمون لکھ رہے تھے وہ نامکمل رہ گیا، اس تحریر کا آخری فقرہ یہ آیت کریمہ تھی: "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم"۔

مولانا عبدالوحید صدیقی

اردو کے مشہور اور بزرگ صحافی، مولانا عبدالوحید صدیقی کا، ۱۹ اپریل کو اتوار کے دن صبح کے کوئی پونے دس بجے تقریباً ۸۳ سال کی عمر میں دہلی کے ایک ہسپتال میں

انتقال ہوگیا۔ میت گھر پر لائی گئی، شام کو ۵ بجے جنازہ اٹھا، عرس محل میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور بستی حضرت نظام الدین کے قبرستان میں ان کی اہلیہ کی بغل میں، سپرد خاک کیا گیا۔

مولانا مرحوم جب روزنامہ "الجمعیۃ" میں منیجر تھے اس وقت ان سے میری پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی، پھر اکثر ہوتی رہی، اِدھر چند سال سے کافی ضعیف ہوگئے تھے، زیادہ تر گھر ہی پر رہتے، اس زمانے میں بھی کئی مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا، وہ ہمیشہ بڑی محبت اور شفقت سے ملتے۔ آج سے تقریباً ۳ ½ سال پہلے ۱۷ نومبر ۷۷ ۱۹ء کو مرحوم کی اہلیہ کا انتقال ہوا تو تعزیت کے لیے گیا تو کافی نڈھال نظر آتے۔ ان کی زندگی میں بڑے نشیب و فراز تھے، کبھی کبھی بڑے صبر شکن اور ہمت شکن واقعات پیش آئے مگر ہمیشہ بڑی ہمت اور حوصلے سے کام لیا، بالآخر انھیں کامیابی نصیب ہوئی اور آخر میں اطمینان اور سکون سے زندگی بسر کی۔ اُن کی پوری زندگی بڑے اہم واقعات سے پُر ہے، اُن سے جب بھی ملاقات ہوتی میں ہمیشہ عرض کرتا کہ اپنی آپ بیتی لکھ ڈالئے اور اردو صحافت کے بارے میں اپنے تجربے اور صحافت نگاروں کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کر دیجئے تاکہ آنے والی نسل اس سے فائدہ اٹھا سکے، وہ فرماتے فرصت ملتی نہیں، لیکن ضروری باتیں نوٹ کروا رہا ہوں۔ خدا جانے انھیں اس کے لیے موقع ملا یا نہیں۔

مرحوم یوپی کے ایک چھوٹے سے شہر غازی پور کے رہنے والے تھے، ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے، دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، اس کے بعد محکمۂ نہر میں امین کی حیثیت سے ملازم ہوگئے، مگر تحریکِ خلافت کے زمانے میں سرکاری ملازمت چھوڑ دی اور "مہاجر" کے نام سے ایک اخبار نکالا، اخبار بند ہوگیا تو جامعہ ڈابھیل چلے گئے جہاں مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا انور شاہ کاشمیری جیسے جید علمار کی رفاقت حاصل ہوئی، اس کے بعد مشہور قومی روزنامہ "زمیندار" کے ادارۂ تحریر میں شامل ہوگئے جس کے ایک رکن جامعہ کے گریجویٹ اور اردو کے مشہور صحافی مولانا عبدالباقی بھی تھے، وہاں

سے الگ ہوئے تو دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور کچھ عرصہ اپنی مادرِ علمی کی خدمت کی۔ اس کے بعد مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی مرحوم کی خواہش پر روزنامہ "الجمعیۃ" کی انتظامی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

"الجمعیۃ" سے الگ ہوئے تو "نئی دنیا" کے نام سے ۱۸ رجولائی ۱۹۵۱ء کو دہلی سے اپنا ذاتی روزنامہ جاری کیا، اس میں انھیں طرح طرح کی مشکلات پیش آئیں، بالآخر ۱۹۶۴ء میں یہ اخبار بند ہوگیا، کچھ عرصہ پریشانیوں میں گذرا، مگر پریشانیوں اور گذشتہ ناخوشگوار اور تلخ تجربوں کے باوجود ۱۹۶۸ء میں "ہما" کے نام سے ایک ماہانہ ڈائجسٹ نکالا، یہاں سے حالات نے پلٹا کھایا اور حالات بدلے۔ "ہما" کی کامیابی کو دیکھ کر "ہدیٰ" کے نام سے ایک اسلامی ڈائجسٹ جاری کیا، اسی زمانے میں "ہدف" کے نام سے ایک تاریخی ڈائجسٹ اور "ہزار داستان" کے نام سے ایک ادبی ماہنامہ جاری کیا۔ ۱۹۷۱ء میں ایک پندرہ روزہ سیاسی اخبار "واقعات" نکالا، مگر بعض وجوہ سے اس کو بند کرنا پڑا مگر جلد ہی جولائی ۱۹۷۲ء میں ہفتہ وار "نئی دنیا" جاری کیا جو کامیابی سے اب تک نکل رہا ہے۔

مرحوم ایک کامیاب جرنلسٹ کے ساتھ ساتھ بہت اچھے اور تجربہ کار منتظم بھی تھے، اور ملکی حالات کو سمجھنے کا ان میں عجیب وغریب ملکہ تھا، جس کی وجہ سے محض اپنی ذاتی صلاحیتوں اور کوششوں سے انھیں شاندار کامیابی حاصل ہوئی، اردو کے حلقوں میں بمشکل کوئی اور مثال ملے گی جس نے تنہا اور محض اپنی ذاتی کوشش سے اتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہو۔ مرحوم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے لڑکوں کو اتنی اچھی تربیت دی ہے کہ وہ مرحوم کی ان یادگاروں کو جاری رکھنے میں انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔

ادبیات کا اسلامی تصوّر

ندوۃ العلماء کا تاریخی مذاکرہ

۱۷؍اپریل تا ۱۹؍اپریل ۱۹۸۱ء دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں "ادبیات کا اسلامی تصور" کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سمینار منعقد ہوا۔ سمینار کے سلسلے میں جو دعوت نامہ بھیجا گیا تھا اُس میں مولانا سید ابوالحسن ندوی نے اس مذاکرۂ ادبی کی غرض و غایت بیان کی تھی ـــ انھوں نے لکھا تھا کہ "کسی بھی ادب کی آزمائش اور ابتلاء یہ ہے کہ اس پر ایسے لوگ حاوی ہوجائیں جو ادب کو بطور فن اور پیشے کے اپناتے ہیں اور اس کو صرف اپنے ساتھ مخصوص اور محدود بنا لیتے ہیں، اس کو بنانے، سنوارنے اور عبارت آرائی کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں کہ اس طرح کمال و مہارت کا سکّہ جما کر اپنی مقصد براری کریں۔ یہ صورت حال مسلسل ترقی پذیر ہوتی ہے یہاں تک کہ ادب صرف ان ہی افراد کی میراث بن کر رہ جاتا ہے اور ایک ایسا وقت آتا ہے کہ ادب کا تصور ان ہی کی نگارشاتِ قلم تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے جو محض صنعت و فن کاری اور تقلیدی ادب کا مجموعہ ہوتا ہے، اس کے اندر زور ہوتا ہے نہ روح، جدّت و ندرت ہوتی ہے اور نہ دلچسپی کا سامان۔

"یہ مصنوعی اور تقلیدی ادب اس فطری، رواں اور سلیس ادب اور اس کی بلیغ تعبیرات پر، جن پر انسان جھوم اُٹھے اور اس کے ذہن و فکر کے اندر وسعت پیدا ہو جو اندھی تقلید سے روکے اور انسان کے اندر خود اعتمادی پیدا کرے، وہ ادب جس سے اس قوم کا کتب خانہ بھرا پڑا ہے، اس ادب پر یہ تقلیدی اور مصنوعی ادب

چھا جاتا ہے، حالانکہ اس رواں اور سلیس ادب میں اس کے سوا اور کوئی عیب یا نقص نہیں ہوتا کہ وہ ان افراد کے قلم سے نکلا ہوتا ہے جنھوں نے ادیبوں کی وردی نہیں پہنی اور انھوں نے ادب وانشاء کو پیشہ اور ذریعۂ معاش نہیں بنایا اور ان کی دلکش و دلنواز ادبی خوش بیانیوں کو کسی ادبی عنوان سے موسوم نہیں کیا گیا ہوتا ہے اور نہ اس کا ادب کے سیاق میں ذکر کیا گیا ہوتا ہے بلکہ کسی دینی بحث، علمی و فکری کتاب اور فلسفیانہ یا معاشرتی موضوع کے تحت ذکر آیا ہوتا ہے۔ یہ سب ادبی شہ پارے دینی و اخلاقی اور علمی کتابوں کے انبار میں دبے ہوئے ہیں۔ تقلیدی ادب نے خود پسندی کی بنا پر اپنی صف میں انھیں جگہ نہیں دی اور مورخین ادب نے اپنی فکر و نظر کی کوتاہی کے سبب اِدھر توجہ نہیں کی اور نہ انھیں وہ مقام دیا جس کے وہ شہ پارے بجا طور پر مستحق تھے ....

"میں ادب کی قدیم کتابوں کی جو رسائل و قصہ کہانیوں، نیز دیگر اصناف پر مشتمل ہیں، تحقیر نہیں کر رہا ہوں اور نہ ہی زبان و ادب اور ان کی فنی قدر و قیمت کو گھٹا رہا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ ادب اور زبان کے مختلف مراحل میں یہ ایک فطری مرحلہ ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ میرا یہ خیال بھی ہے کہ ادب صرف یہی نہیں ہے اور نہ یہ ہمارے ادبِ عالی کی صحیح نمایندگی کرتا ہے جو دنیا کا بہت وسیع اور بڑا دلآویز ادب ہے ... لہٰذا ہمارے لئے بہتر یہ ہے کہ ہم ادب اور ادباء کی صف میں اسے وہی مقام دیں جس کا وہ مستحق ہے اور اس پر وہ توجہ صرف کریں جو اس کا حق ہے ... اور اپنے نونہالوں اور نئی نسل کے سامنے قدیم کتابوں سے ادب کے نئے نمونے پیش کریں تاکہ وہ زبان کی چاشنی اور حلاوت سے لطف اٹھائے، اس کی نشو و نما اس طرح ہو کہ وہ صحیح اور بلیغ اسلوب میں مافی الضمیر کی ادائیگی پر قادر ہو ..."

ندوۃ العلماء کے اس مذاکرۂ ادبی میں متعدد عرب ممالک کے دورِ حاضر کے بلند پایہ مصنفین، فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین، شعراء اور ادباء نے حصہ لیا، اور پوری دلچسپی اور سرگرمی کے ساتھ مباحثات میں شریک ہوئے، عام طور پر عرب ممالک کے وفود نے

معیار کے ہوتے ہیں، ان سے ان ادباء کا علمی درجہ مختلف تھا، یہاں آنے والوں میں بیشتر وہ حضرات تھے جو یا تو کانفرنسوں میں شرکت کے لئے نہیں جایا کرتے، اور اگر ملک سے باہر کہیں جاتے ہیں تو بہت ہی بامقصد، متعین علمی موضوع پر مباحثہ میں شرکت کے لئے جاتے ہیں۔ حکومت قطر کے بزرگ عالم اور بڑے دینی منصب پر فائز شیخ عبداللہ ابراہیم الانصاری بھی شریک ہوئے جن کا اگرچہ کسی یونیورسٹی سے تعلق نہیں ہے، لیکن ادبی ذوق اور دینی و اسلامی ادب کے فروغ میں ان کا بڑا حصہ ہے، اس طرح عرب ممالک کے ادباء کی تعداد تین درجن سے زیادہ تھی، جن میں عالی مرتبت سید عبدالعزیز رفاعی سابق سکریٹری مجلس الوزراء (مملکت سعودیہ) بھی شامل تھے جنھوں نے عربی و تاریخ کے ذخیرے سے صحابۂ کرام کی ان شخصیتوں کے ادبی پہلو پر ایک سلسلۂ کتب تیار کردیا ہے جن کو صرف دینی شخصیتیں سمجھا جاتا ہے اور جن کو کبھی اس نظر سے دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ استاد عبدالرحمٰن رأفت الباشا بھی قابل ذکر ہیں جنھوں نے الشعر الاسلامی النثر الاسلامی اور ادب الدعوۃ کے موضوع پر بالواسطہ اور بلاواسطہ (اپنے قلم سے یا تحقیقی کام کرنے والے فضلاء کے ذریعہ جو ان کی زیر نگرانی کام کررہے تھے) ایک مستقل کتب خانہ تیار کردیا ہے جو بڑی ادبی قدر و قیمت کا حامل ہے، نیز جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ جامعۃ الملک عبدالعزیز (جدہ و مکہ) جامعۃ الامام محمد بن سعود، جامعۃ العین (امارات عربیہ) جامعہ قطر، جامعہ عمان (شرق اردن) کے عربی شعبوں کے سربراہ شریک تھے، مصر کا ایک ممتاز وفد جس کی قیادت مصر کے وزیر اوقاف ڈاکٹر زکریا البری اور نائب وزیر اوقاف ڈاکٹر عبداللہ عبدالشکور کامل کررہے تھے، ان کے علاوہ سارقہ، دبئی کے فضلاء و ادباء شامل تھے۔ جامعۃ الملک عبدالعزیز کی طرف سے شام کے مشہور فاضل اور کثیر التصانیف عالم استاد عبدالرحمٰن حسن جنبکہ شریک تھے جو ادیب و شاعر و نقاد اور بلند پایہ عالم دین ہیں، سلطنت عمان کے مفتی حمد بن الخلیلی بھی تشریف لائے تھے جو عمان کے بڑے ادیب و شاعر ہیں۔

دوسری طرف ہندوستان کی نامور جامعات (یونیورسٹیز) اور اسلامی درسگاہوں

کے اساتذہ شریک ہوئے ۔ اردو، انگریزی اور فارسی کے مقالات کی علیحدہ تنظیم تھی اور عربی کا علیحدہ سمینار رہا، اور دونوں بیک وقت دو مختلف ہالوں میں پوری سنجیدگی، علمی فضا اور شغف وانہماک کے ساتھ انجام پاتے رہے۔ عربی مذاکرہ کے ہال میں جائیے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آپ لکھنؤ میں نہیں بلکہ قاہرہ، دمشق یا حجاز کے کسی عظیم الشان علمی وادبی اجتماع یا کسی نامور خطیب و ادیب کے لکچر میں ہیں، بلکہ صحیح تر الفاظ میں عربی زبان وادب کا عہد ارتقا واپس آگیا ہے جب اس کا طوطی بولتا تھا، افتتاحی تقاریر میں عربی فیکلٹی امام محمد بن سعود یونیورسٹی، ریاض، کے ڈین ڈاکٹر فتحی عثمان کی نہایت موثر اور پرزور تقریر تھی جس کو حاضرین نے بہت تاثر و ذوق سے سنا۔

ندوہ کی خدمات اور اس کی اس فکر کو تمام علمائے ادب نے سراہا کہ ادبیات میں اسلامی تصورا ور اخلاقی قدروں کے جو مخفی خزانے ہیں ان کو منظر عام پر آنا چاہیے۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں بتایا کہ صرف قرآن کریم کا یہ احسان ہے کہ عربی زبان زندہ ہے اور اپنے مرکز سے ہزاروں میل کی دوری پر آج اس کے ادب پر مباحثہ ہو رہا ہے۔ مولانا نے تفصیل سے بتایا کہ اس ملک اور اس برصغیر میں عربی زبان وادب، تاریخ وسیر، حدیث وتفسیر پر کیا کام ہوئے ہیں، جن کی مثال دوسرے کسی عرب ملک میں مشکل سے ملے گی، نیز یہ کہ یہاں کے علماء نے ملک کے زبان وادب کی ترقی اور سرگرمی میں قائدانہ اور رہبرانہ حصہ لیا ہے (جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں ملنی مشکل ہے) اور وہ یہاں کی علمی وادبی زندگی میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ زبان وادب کا کوئی مورخ ان کا ذکر اور ان کی خدمات کا اعتراف کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا، مولانا نے اس پہلو کو بھی واضح کیا کہ ندوۃ العلماء کے بانیوں اور اس کے نامور فضلاء نے عربی ادب اور دین کو ہم آہنگ بنانے اور اسالیب تعلیم مرتب کرنے کی سب سے پہلے دعوت دی جس میں دین وادب پہلو بہ پہلو اور ایک دوسرے کے معاون نظر آئیں۔

ندوہ کا یہ سمینار اپنے حسن تنظیم، سنجیدہ علمی مقالات، اور ادباء ومصنفین کی دلچسپی سرگرمی کے لحاظ سے بے مثال سمجھا جارہا ہے، عرب وفود نے پوری وسعت قلبی سے اس کا اعتراف کیا اور نظم ونثر دونوں میں ندوہ کے فضلاء وادباء کو خراج عقیدت پیش کیا، جنھوں نے عربی نثر ومقالہ نگاری کا ایک ایسا اسلوب پیش کیا ہے جو عربی زبان وادب کی حلاوت و فصاحت اور دعوت کی روح وطاقت دونوں کا بیک وقت مظہر اور نمونہ ہے۔

اس مذاکرہ میں عربی کے ۴۸ مقالات پڑھے گئے اور ۱۰ قصیدے سنائے گئے۔ اردو سیکشن میں ۲۴ مقالات پیش ہوئے جن میں پانچ انگریزی، ایک فارسی اور بقیہ اردو کے تھے۔

مذاکرۂ ادبی کا اختتام ایک سفارش پر ہوا، جس میں ادبیات کے اندر اسلامی تصورات کی تلاش اور مزید ادبی کاموں میں اخلاقی ومذہبی عناصر کو اجاگر کرنے کی تدابیر شامل ہیں، نیز یہ کہ ایک مستقل سکریٹریٹ قائم کیا جائے جس کا صدر مقام دارالعلوم ندوۃ العلماء ہو، یہ سفارشات ایک کمیٹی نے مرتب کیں جو عرب اساتذۂ ادب پر مشتمل تھی، ندوۃ العلماء کی طرف سے اس کے رکن مولانا واضح رشید ندوی تھے، کمیٹی کے ایک معزز رکن ڈاکٹر فتحی عثمان نے سفارشات مرتب کرنے کا بنیادی رول انجام دیا اور انھوں نے ہی سفارشات سمینار کے جلسۂ عام میں پڑھ کر سنائیں اور منظور کرائیں۔

شیخ محمد المجذوب (جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ) نے اجلاس کے آغاز میں تجویز پیش کی کہ صدر میزبان ادارہ کے سربراہ کو ہونا چاہئے جیسا کہ عام بڑی مؤتمروں اور کانفرنسوں میں ہوتا ہے، اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ مہمانوں میں سے کسی کو صدر بنایا جائے تو دوسرے مہمانوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کو کم درجہ دیا گیا۔ اس لئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عربی سیکشن کے بالاتفاق صدر منتخب ہوئے، جلسوں کو کنڈکٹ کرنے کی خدمت علامۂ ادب استاد رآفت باشا نے انجام دی جو جامعہ امام محمد بن سعود میں (جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے) ایک قدیم تجربہ کار استاد ہیں، اور ان کی سرکردگی میں متعدد طلبہ نے اسلامی ادبیات پر ایم اے اور پی، ایچ، ڈی کیا ہے اور

جن کے محققانہ مقالات کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

اردو سیکشن کی صدارت جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دار المصنفین اعظم گڈھ نے کی، ان کے مددگار اور شریک کار پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی (جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) تھے، اور کنڈکٹ کرنے کے فرائض ڈاکٹر محمد اقبال انصاری (علی گڈھ مسلم یونیورسٹی) نے انجام دئے۔

پورے سمینار کے لیے دعوت، منصوبہ بندی اور اس کی علمی وعملی تنظیم کی ذمہ داری شروع سے آخر تک مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (صدر شعبۂ ادب عربی، دار العلوم ندوۃ العلماء) کے سپرد تھی، جنھوں نے بڑی خوش اسلوبی، باریک بینی، جانفشانی اور لگن کے ساتھ اس کو انجام دیا۔

انتظامات اور مشوروں میں ڈاکٹر مولانا عبد اللہ عباس ندوی (استاد جامعۃ الملک عبد العزیز مکہ مکرمہ و استاد زائر ندوۃ العلماء)، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی (مدیر "البعث الاسلامی" و استاد اعلیٰ ادب عربی دار العلوم) مولانا سید واضح رشید ندوی (مدیر عربی جریدہ "الرائد" و استاد ادب عربی ندوۃ العلماء) اور مولانا ابو العرفان ندوی استاد دار العلوم ندوۃ العلماء پیش پیش تھے۔ سمینار کے انعقاد سے کئی روز پیشتر مولانا محمد شبیر ندوی (جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) دار العلوم میں آگئے تھے جن کا ۱۹۷۵ء کے ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن کے کامیاب بنانے میں خاص حصہ تھا۔ سمینار کی کامیابی میں ان کی کوششوں، تجربہ اور تنظیمی و انتظامی صلاحیت کو بھی خاص دخل تھا، اس تاریخی اور نازک موقع پر دار العلوم کے ہر عمر کے طلباء نے جس سعادت وصلاحیت اور سرگرمی وجانفشانی کا مظاہرہ کیا وہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے۔

اس سمینار کا انعقاد اور اس کی غیر معمولی کامیابی (جو محض تائید الٰہی اور توفیق خداوندی کا کرشمہ تھا) نہ صرف ندوۃ العلماء، لکھنؤ، بلکہ پورے ہندوستان کے لیے موجب شکر اور سرمایۂ فخر ہے۔ سبھی شرکاء کا یہ تاثر تھا کہ یہ مذاکرۂ علمی ایک نشان راہ اور ایک عظیم سفر کا آغاز ہوگا۔

قرأت کا قومی اور عالمی مقابلہ

حکومت ہند نے ایک وسیع پیمانے پر چودھویں صدی ہجری تقریبات منانے کے لیے
یک مشاورتی کمیٹی مقرر کی تھی جس کے چیرمین نائب صدر جمہوریہ ہند جناب محمد ہدایت اللہ
احب ہیں۔ اس کمیٹی کے مشورے کے مطابق ہجری ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا، ایک
ین اقوامی سمینار منعقد ہوا، جس کی ایک مختصر رپورٹ "جامعہ" کے اسی شمارے میں شامل
ہے اور قرآن حکیم کی قرأت کے مقابلے کا انتظام کیا گیا۔ اس مقابلے کے دو حصّے تھے،
یک آل انڈیا پیمانے پر تھا اور دوسرا بین اقوامی پیمانے پر۔ قرأت قرآن حکیم کمیٹی کے چیرمین
امعہ کے وائس چانسلر، جناب انور جمال قدوائی صاحب تھے اور اس کا انتظام جامعہ ملیہ
کے اساتذہ نے انجام دیا۔ قومی مقابلہ ۲۸ر اور ۲۹ر اپریل کو جامعہ ملیہ میں منعقد ہوا اور
المی مقابلہ یکم تا ۳ر مئی وگیان بھون نئی دہلی میں، ان دونوں مواقع پر شیخ الجامعہ صاحب
نے چیرمین کی حیثیت سے خطبہ پڑھا تھا۔ جامعہ میں اردو میں اور نئی دہلی میں انگریزی
یں۔ نئی دہلی میں جو جلسہ منعقد ہوا، اس کے افتتاحی اور اختتامی اجلاس کی صدارت
ئب صدر جمہوریہ جناب محمد ہدایت اللہ صاحب (امیر جامعہ) نے فرمائی اور وزیر
ارجہ جناب نرسمہا راؤ نے افتتاحی خطبہ دیا۔

شیخ الجامعہ صاحب نے جامعہ میں جو خطبہ دیا تھا، اسے قارئین جامعہ کی
لچسپی اور معلومات کے لیے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

خواتین و حضرات!

قرأت قرآن حکیم کے اس روح پرور اجتماع میں آپ سب حضرات کا

استقبال کرتے ہوئے مجھے بڑی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ حکومت ہند کی چودھویں صدی ہجری تقریبات کمیٹی نے بجا طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کو یہ سعادت بخشی ہے کہ وہ اس مقابلے کا اہتمام کرے۔ ہم نے سرکار کی یہ پیش کش یوں قبول کر لی کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک ایسا ادارہ ہے، جس نے ملک کی خدمت کے آدرش کو بھی اپنایا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اس ادارے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس نے تہذیبی معاملات میں سنگھرش کی راہ سے گریز کیا ہے اور سنگم کی راہ اپنائی ہے۔ توڑنے سے زیادہ جوڑنے کے کام کو اہمیت دی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ملک کے جلوۂ صد رنگ میں اسلام اور اسلامی تہذیب کا رنگ گہرا اور بامعنی ہے۔ یہ رنگ صدیوں سے ہمارے تہذیبی منظر نامے پر موجود ہے اور اسے روشن اور تابندہ بنائے ہوئے ہے۔ اس رنگ کو دوسرے رنگوں کے ہجوم میں دیکھنے اور دکھانے کا کام جامعہ کے دانشور ایک عرصے سے کر رہے ہیں کہ یہ کام کرنے کا ہے اور سلیقے سے کرنے کا ہے۔

خواتین و حضرات، مسلمان جہاں بھی ہیں اور جس حال میں بھی ہیں، قرآن ان کے لیے ایک عزیز ترین سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ جی جان سے اس سرمائے کی حفاظت کرتے ہیں۔ وہ اس سے اپنے فکر و عمل کی راہیں روشن کرتے ہیں اور اسے حکمت و دانش کا خزانہ جانتے ہیں۔ قرآن حکیم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کلام الٰہی ہے اور ہر طرح کی تبدیلی اور تحریف سے پاک ہے۔ چنانچہ وہ قرآن جو ہمارے پاس ہے، وہ بالکل وہی ہے جو رسول خدا پر نازل ہوا تھا وہ اسی ترتیب اور صورت میں محفوظ ہے جس میں کہ آں حضرت نے اپنے سامنے اس کو لکھوایا اور صحابہ کرام کو حفظ کرایا تھا۔

قرآن حکیم دو شکلوں میں محفوظ کیا گیا۔ ایک شکل تو یہ تھی کہ کاغذ کی عدم موجودگی میں اسے مختلف چیزوں پر لکھا گیا۔ کبھی کھجور کے پتوں پر، کبھی اونٹ کی چوڑی ہڈیوں پر اور کبھی باریک اور بہتر چمڑے پر۔ بعض شہادتیں اس بات کی بھی ملتی ہیں کہ قرآن

کی آیتوں کو مختلف قسم کی لکڑیوں اور پتھروں پر بھی لکھا گیا۔ حضرت عمر کے زمانے میں جب خطۂ حجاز میں کاغذ کا رواج ہوا تو انھوں نے پورا قرآن کاغذ پر تحریر کرایا اور اس بات کا پورا خیال رکھا کہ کتابت میں کوئی ایسی تبدیلی راہ نہ پا سکے جس سے قرآن کے معنی میں فرق آجائے۔ یہ شکل مکتوب قرآن کی تھی۔ مگر ایسا لگتا ہے جیسے اس دور کے مسلمان صرف مکتوب قرآن سے مطمئن نہ ہوں۔ ان کے دلوں میں غالباً یہ خوف تھا کہ تحریر گم ہوسکتی ہے، برباد کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے قرآن کو بڑے پیمانے پر یاد کر کے پڑھنے کی روایت قائم کی اور اسے اس خیال سے آگے بڑھایا کہ انسانوں کے ذہن میں محفوظ لفظ زیادہ طاقتور ہوتا ہے اور کوئی بڑے سے بڑا جابر بھی اسے فنا نہیں کرسکتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب میں مکتوب قرآن سے کہیں زیادہ اہم روایت ملفوظ (MALFUZ) قرآن کی ہے۔ قرآن بلاشبہ "زبانی روایت" (ORAL TRADITION) کا عظیم شاہکار ہے۔ جبریل امین کے ذریعہ قرآن جن لفظوں اور لب ولہجے میں آں حضرتؐ صلعم پر نازل ہوا، وہی لب ولہجہ خود انھوں نے اپنایا اور اس لب ولہجے میں انھوں نے صحابۂ کرام کو پڑھنے کی تاکید کی۔ صحابۂ کرام کی مقدس جماعت میں سات قاریوں کی بڑی شہرت تھی۔ ان میں حضرت علی اور حضرت عثمان شامل تھے۔ قرآن، رسول اللہؐ نے شروع سے آخر تک ایک ہی قرأت میں پڑھا۔ صحابۂ کرام نے اسی طرح سنا اور اسی قرأت کو آگے بڑھایا۔ قرون اولیٰ کے مسلمان، قرآن کو الفاظ اور حروف کی سطح پر ہی نہیں بلکہ صوت وآواز اور لب ولہجہ کی سطح پر بھی محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی یہ کوشش تہذیب وزبان کی تاریخ میں سب سے اہم اور کامیاب کوشش ہے۔ قرأت اور تجوید کی ایجاد کے پیچھے تحفظ قرآن کا یہی جذبہ کارفرما تھا۔

حضرت عثمانؓ کا یہ کارنامہ بھلایا نہیں جاسکتا کہ انھوں نے لوگوں کو ایک رسم خط اور ایک انداز قرأت پر جمع کیا اور یہ ضرورت یوں پیش آئی

کہ اسلامی پھیلاؤ کے بعد قرآن ان دوسرے لسانی گروہوں تک پہنچ چکا تھا، جن کی اپنی زبانیں اور بولیاں تھیں اور اب اس بات کا اندیشہ تھا کہ ان کے اپنے لب و لہجے میں اصل اور بنیادی انداز قرأت گم ہو کر نہ رہ جائے۔ چنانچہ قرأت قرآن جس کی معیار بندی حضرت عثمانؓ نے کی تھی، وہی قرأت کا سب سے زیادہ معیاری اور مستند اسلوب قرار پایا۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے قرآن حکیم کا وہ نسخہ جس پر تمام صحابہ کرام کو اتفاق تھا، دوسرے ملکوں کو بھجوایا تو انھوں نے اس بات کا بھی اہتمام کیا کہ اس نسخے کو لے جانے والے وہ لوگ ہوں جو ایک طرف بنیادی اور اصل انداز قرأت سے اچھی طرح واقف ہوں، وہیں دوسری طرف وہ ان علاقوں کے لوگوں کے لب و لہجہ سے بھی باخبر ہوں جن تک قرآن حکیم کا یہ نسخہ بھجوایا جا رہا تھا۔ یہ اس بات کی کوشش تھی کہ لسانی فرق کے باوجود قرأت قرآن کا معیاری اسلوب سارے عالم اسلام میں ایک ہی رہے۔

اس کے بعد پھر ہوا یہ کہ رفتہ رفتہ قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا ایک مستقل فن بن گیا۔ اس فن کے اصول اور ضابطے بنائے گئے۔ قرأت کا مطلب یہ ہے کہ حروف قرآن کو تمام صفات کے ساتھ صحیح طور پر ادا کیا جائے اور اس ادائیگی میں مخارج کا پورا پورا اہتمام کیا جائے۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ اس فن کے بڑے بڑے ماہر اور امام پیدا ہوئے جن میں قرائے سبعہ اور قرائے عشرہ نے خاص طور پر بڑی شہرت حاصل کی۔ صحیفۂ عثمانی قرأت کی بنیاد ہے۔ فن قرأت کے سارے ماہرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرأت کو اس کے مخصوص دائرے میں رکھا جائے اور حرفوں کے ادا کرنے میں کسی ایسے تکلف کی اجازت نہ دی جائے جس سے قرآن کے معنی میں تبدیلی کا اندیشہ ہو۔ ابو عمارہ حمزہ جو کوفے کے رہنے والے تھے اور قرائے سبعہ میں چھٹے قاری ہیں، قرأت میں افراط سے منع کرتے تھے اور جو شخص اس معاملے میں افراط سے کام لیتا، اس سے کہا کرتے تھے کہ تم نہیں جانتے کہ سفید

رنگ سے معاملہ آگے بڑھ جائے تو برص ہو جاتا ہے۔ یعنی سفید داغ کی بیماری ہو جاتی ہے اور گھنگھریالے بالوں کو اور گھنگھریالا بنانے کی کوشش کی جائے تو سخت ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح قرأت میں افراط کی جائے تو قرأت نہیں رہتی۔

اگرچہ قرآت کا بنیادی اسلوب حجازی ہے، مگر اس اسلوب میں تہ داری اور وسعت ان لوگوں نے پیدا کی جن کا تعلق حجاز سے نہیں تھا۔ قرائے سبعہ میں الکسائی ایرانی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ابوعمارہ حمزہ کوفے کے رہنے والے تھے۔ قالون رومی نسل کے تھے۔ ان کے جدا علیٰ حضرت عمر کے دورِ خلافت میں اسیرانِ روم کے ساتھ آئے تھے۔ وہ سخت بہرے تھے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے سامنے تلاوت کی جاتی تو وہ پڑھنے والے کے ہونٹوں کی حرکت سے معلوم کر لیتے کہ قاری سے کہاں غلطی ہوئی ہے۔ فن قرآت کو مکے اور مدینے سے زیادہ دمشق، بصرہ اور اصفہان میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان شہروں کی خاک سے اس فن کا ایک سے ایک نامور اٹھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر اہل زبان، اہل زبان سے زبان کے معاملے میں زیادہ چوکس ہوتے ہیں اور انھیں اہل زبان کے حقیقی لب و لہجے کو جاننے اور برتنے کا شوق ہوتا ہے۔ ہندوستان کی سرزمین بھی قرآت کے معاملے میں اسی شوق کا ایک اہم مرکز رہی ہے۔ لوگ تجوید اور قرآت کا فن بڑے ذوق و شوق سے سیکھتے رہے ہیں۔ یہاں کی دینی محفلوں میں صوت و صدا کی کبھی پرانی نہ ہونے والی کائنات بنتی اور سنورتی رہی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں نے جہاں فنونِ لطیفہ کے مختلف شعبوں میں ایک نئی جمالیات کی تخلیق کی، وہیں دوسری جانب انھوں نے قرآت کے فن کو بھی کچھ اس طرح اپنایا کہ اس میں ایک حقیقی مذہبی تجربے کی وسعت اور گہرائی پیدا ہو گئی۔ غالباً کسی ایسے ہی تجربے نے اقبال سے یہ شعر کہلوایا تھا:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآں

ہندوستان کی طرف سے رسول اکرم صلعم کو ٹھنڈی ہوائیں آتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ اس سرزمین پر اسلام کا تجربہ بلاشبہ تہذیب کی ہر سطح پر، ایک کامیاب اور خوش گوار تجربہ تھا۔ اس تجربے کی معنویت وقت کے ساتھ اور نمایاں ہوتی جائے گی۔

خواتین وحضرات! ان الفاظ کے ساتھ قرأت قرآن حکیم کی اس محفل میں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور قرأت سب کمیٹی کی طرف سے آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔"

قرأت قرآن حکیم کے ان قومی اور عالمی مقابلوں کے دونوں مواقع پر نظامت کے فرائض جناب نذیر الدین مینائی صاحب نے انجام دئے۔ مقابلہ شروع ہونے سے قبل طریق کار، قواعد وضوابط اور مقابلے کے پس منظر پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے فرمایا کہ:

"جیسا کہ آپ کو علم ہے کہ سارے عالم اسلام میں چودھویں صدی ہجری تقریبات عقیدت اور ولولے کے ساتھ منعقد کی جارہی ہیں۔ ہندوستان مسلم آبادی کے اعتبار سے دنیا میں دوسرا بڑا ملک ہے جہاں مسلمان صدیوں سے آباد ہیں اور ملک کی تہذیبی زندگی کو بنانے اور سنوارنے کے کام میں مصروف ہیں۔ یہ ملک سدا سے اپنی کشادہ نظری اور وسیع المشربی کے لیے مشہور رہا ہے۔ یہاں کا بنیادی نقطۂ نظر اثباتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں جیسی تہذیبی رنگارنگی کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتی۔ یہاں کے رنگ ایک دوسرے کو کاٹتے نہیں، بہار کا اثبات کرتے ہیں۔ اسی تہذیبی تصور کا فیض ہے کہ مسلمان اس ملک میں اپنی تہذیبی شناخت کے ساتھ زندہ بھی ہیں اور اس ملک کی مشترک تہذیب کا حصہ بھی ہیں۔ انھوں نے اس ملک کو بہت کچھ دیا ہے اور اس سے بہت کچھ حاصل بھی کیا ہے۔ داد وستد کا یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ تہذیبی کشادہ نظری کا دوسرا نام سیکولرزم بھی ہے جو ہماری ریاست کی اساس ہے۔"

آگے چل کر مینائی صاحب نے مزید فرمایا: "یوں تو نزول قرآن کے بعد سے ہی فن تجوید وقرأت کی ابتدا ہوگئی تھی مگر بعد کے زمانوں میں اس فن کے بڑے بڑے

ماہرین پیدا ہوئے جنھوں نے اس فن کو نقطۂ کمال تک پہونچایا۔ دراصل اس فن کے پس پشت تحفظ قرآن کا جذبہ کارفرما رہا ہے ۔ وہ قرآن جو خدا اور اس کے محبوب ترین بندے کے درمیان ایک گہرے روحانی تعلق کی لازوال یادگار ہے جس کے الفاظ تجریدنہیں ، ایک زندہ اور محسوس حقیقت ہیں ۔ اُن کا آہنگ اور ان کی بازگشت بھی اتنی ہی بڑی سچائی ہے کہ جتنی بڑی سچائی وہ پیام ہے جو ان لفظوں کے سہارے انسانوں تک پہنچا ہے ۔ قرآن حکیم کو اس کے پورے محسوس آہنگ کے ساتھ محفوظ رکھنا مسلمانوں کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے ۔ بعثتِ نبوی سے لے کر آج تک الوہی الفاظ کا اپنے مخصوص آہنگ کے ساتھ محفوظ رہنا اور مستقبل میں اس کے تحفظ کی ضمانت انسانیت کے لیے ایک روشن امید ہے اور تابندہ بشارت ۔"

آخر میں مینائی صاحب نے فرمایا : "ہندوستان ہر دور میں اس شوق کی جولانگاہ رہا ہے ، مگر ادھر چند برسوں سے عالم اسلام میں قرآت کے فن میں دلچسپی کی خاصے بڑے پیمانے پر تجدید ہوئی ہے ۔ اور اسے فروغ دینے کی خاطر ملیشیا ، لیبیا ، مراقش اور دوسرے اسلامی ممالک میں عالمی مقابلے منعقد کئے جا رہے ہیں ۔ اسلامی ممالک کے علاوہ ہندوستان وہ پہلا ملک ہے ، جہاں قرأت قرآن حکیم کا یہ عالمی مقابلہ پہلی بار منعقد ہو رہا ہے ۔"

قومی مقابلے میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ۳۰ قاریوں نے شرکت کی ، جن کی ریاست وار تفصیل حسب ذیل ہے :

(۱) اندھرا پردیش ۱۲ (۲) اتر پردیش ۸ (۳) مہاراشٹر ۳
(۴) گجرات ۱ (۵) تامل ناڈو ۱ (۶) کرناٹک ۲
(۷) منی پور ۱ (۸) دہلی ۱

پانچ ہزار کا پہلا انعام لکھنؤ (یو پی) کے قاری محمد وسیم صاحب کو ، ۳ ہزار کا دوسرا انعام سکندر آباد (اندھرا پردیش) کے قاری محمد اقبال صاحب اور ۲ ہزار کا تیسرا انعام حیدر آباد (اندھرا پردیش) کے قاری محمد علی خاں صاحب کو ملا ۔ شیخ الجامعہ صاحب کے

ارشاد پر، مولانا مفتی عتیق الرحمان عثمانی صاحب نے، جو چھ ججوں میں سب سے بزرگ تھے، انعامات مرحمت فرمائے اور اس موقع پر ایک مختصر سی تقریر بھی کی۔ جن محترم قاریوں کو پہلا اور دوسرا انعام ملا ہے، حسب قاعدہ انھوں نے عالمی مقابلے میں ہندوستان کی نمایندگی کی۔

عالمی مقابلے میں حسب ذیل ۱۳ ممالک کے ۴۲ قاریوں نے شرکت کی:

تھائی لینڈ، لیبیا، ہندوستان، مالدیو، سری لنکا، جارڈن، بنگلادیش، افغانستان، ایران، پاکستان، ترکی، شام اور ملیشیا۔

انعامات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

اول: شیخ محمد عربی القبانی	(شام)	۱۵ ہزار
دوم: شیخ علی اسمار وغلو	(ترکی)	۱۰ ہزار

۵ ہزار کا تیسرا انعام صرف ایک تھا، مگر لیبیا اور پاکستان کے نمایندوں کے نمبر مساوی تھے اس لیے حسب ذیل دونوں قاریوں کو پانچ پانچ ہزار کے دو انعامات دئے گئے:

الشیخ قاری احمد القرلیو (لیبیا) اور قاری محمد یعقوب نقشبندی (پاکستان)

یہ انعامات نائب صدر جمہوریہ ہند جناب محمد ہدایت اللہ صاحب (امیر جامعہ) نے مرحمت فرمائے۔

دونوں مقابلوں میں ججوں کی تعداد چھ تھی اور نمبروں وغیرہ کے جوڑنے اور ریکارڈ رکھنے کا انتظام مدرسہ ثانوی کے پرنسپل جناب عبدالحق صاحب کی سرکردگی میں مدرسہ ثانوی کے اساتذہ اور کارکنوں نے انجام دیا تھا۔

شیخ الجامعہ صاحب ہندوستان سے باہر تشریف لے گئے ہیں

ابھی حال میں شیخ الجامعہ جناب انور جمال صاحب ہندوستان سے باہر تشریف لے گئے اور حسب قاعدہ سینیر ڈین پروفیسر گوپی چند نارنگ قائم مقام شیخ الجامعہ کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

تعارف ـــــ وتبصرہ

مذہب کی حقیقت

مصنف : خلیل شرف الدین مرحوم

مرتبہ : محمد طیب (جامعی)

سائز ۱۸×۲۲/۸ ، حجم ۳۶۰ صفحات ، کاغذ اچھا ، کتابت خوبصورت ، طباعت بذریعہ آف سٹ ، مجلد ، قیمت : تیس روپے ، تاریخ اشاعت : دسمبر ۱۹۸۰ء۔

ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، جامعہ نگر ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵ اور اس کی دیگر شاخیں

اس کتاب کے مصنف خلیل شرف الدین بڑے شریف اور نیک انسان تھے ، ان کی ملاقات میں خلوص اور گفتگو میں جاذبیت تھی ، ان کا خاندان علم وفضل ، خدمت خلق ، قرآن فہمی اور دین داری کی شاندار روایات کا حامل رہا ہے۔ وہ رہنے والے بھیمڑی (مہاراشٹر) کے تھے ، مگر عمر کا بڑا حصہ بمبئی میں گذرا ، وہاں ان کے والد کا عربی کی نادر کتابوں کا مشہور مکتبہ اور عربی ٹائپ کا ایک اچھا پریس تھا۔ والد کے انتقال کے بعد ، اندانی جائداد تقسیم ہوئی تو یہ پریس خلیل صاحب کے حصے میں آیا۔ طباعت بالخصوص اردو ٹائپ کی طباعت سے انھیں ذاتی طور پر دلچسپی تھی۔ عمر کے آخری حصے میں وہ ہجرت کر کے سعودی عرب چلے گئے اور جدہ میں قیام فرمایا جہاں ان کے متعدد اعزا پہلے سے موجود تھے۔ کچھ عرصے کے بعد جامعہ ملک عبدالعزیز کے شعبہ طباعت سے وابستہ ہو گئے جس سے انھیں طبعی طور پر دلچسپی تھی ، انھیں اس کام سے اس لیے بھی خوشی ہوتی کہ ان کے ذہن میں قرآن حکیم کی طباعت کی ایک مخصوص اسکیم تھی ، جس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہاں بڑی گنجائش تھی۔ مسلمانوں نے اپنی اس مقدس کتاب کی طباعت کی طرف ہمیشہ اور ہر دور میں خصوصی توجہ کی ہے ، مگر

موصوف ایک ایسا اڈیشن تیار کرنا چاہتے تھے جو اب تک کے تمام اڈیشنوں سے زیادہ خوبصورت ہو اور اعراب ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ پر لگائے جائیں تاکہ غلطی کا امکان بالکل نہ رہے۔ انھوں نے یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کے سامنے اپنی اسکیم پیش کی اور وہ منظور ہوگئی، اسی کام کے سلسلے میں مشین خریدنے اور مجوزہ اسکیم کو کامیاب بنانے کے لیے مزید معلومات اور واقفیت حاصل کرنے کے لیے وہ ۱۹۷۴ء کے اواخر میں لندن گئے۔ وہاں انھیں بڑی دوڑ دھوپ اور غیر معمولی محنت کرنی پڑی، ایک روز تھکے ماندے قیام گاہ پر واپس آئے تو دل کا دورہ پڑا اور چٹ پٹ اللہ کو پیارے ہوگئے۔

پیش نظر کتاب انھیں کے ۱۷ مضامین اور ۱۴ خطوط کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین اور خطوط کے علاوہ جامعہ کے ایک قدیم طالب علم اور پختہ کار جرنلسٹ جناب معین الدین حارث صاحب (بمبئی) کے قلم سے پیش لفظ اور مرحوم کے ایک بے تکلف اور مخلص دوست ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی (مکہ مکرمہ) کے قلم سے "مشاہدات اور تاثرات" کے عنوان سے ایک مختصر تحریر بھی شامل ہے۔ مرحوم کے مضامین کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

مذہب سلمٰیہ۔ گلاب کا پھول۔ ماہرین فن۔ مٹی کا پنکھا۔ جوڑ توڑ۔ لال بجھکڑ۔ آدم علیہ السلام۔ اللہ عزّ وجل۔ دنیا کا شجرِ ممنوعہ۔ تقویٰ۔ قیامت۔ نماز۔ زکوٰۃ۔ سیاست۔ ۱۳۹۰ھ کے حج کی سیر۔ عرفات۔ مزدلفہ۔

ان مضامین کے پس منظر کے بارے میں حارث صاحب نے لکھا ہے کہ: "۔۔ مرحوم اپنے قیام جدّہ کے زمانے میں لکھتے رہے اور وہیں سے بذریعہ ڈاک اپنے ایک عزیز کے نام بذریعہ ڈاک بھیجتے رہے۔ غالباً ان کی یہ خواہش تھی کہ ان کے اعزا اور احباب ان مضامین کو پڑھیں اور ان سے مستفید ہوں۔۔۔ یہ سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا۔ نہ معلوم خود خلیل مرحوم ان مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے یا نہیں، مگر ان کے انتقال کے بعد ان کی ہمشیرہ امۃ اللہ

نے ان مضامین کی اشاعت کا فیصلہ کیا تاکہ مختلف مذہبی مسائل پر مرحوم کے خیالات کا علم ان کے اعزا اور احباب تک محدود نہ رہے بلکہ وسیع حلقے کو ان مضامین سے استفادے کا موقع ملے۔" ان مضامین کی نوعیت اور مقصد کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: "ان کے تنوع کا اندازہ ان کے عنوانات سے ہوسکتا ہے گو بعض عنوانات بادی النظر میں ان کے متن یا موضوع سے پوری رہنمائی نہ بھی ہوتی ہو، مگر جہاں تک ان کی تحریر کے مقصد کا تعلق ہے اس میں یہ قدرِ مشترک ہے کہ قارئین کو جھنجھوڑا جائے اور ملّت اسلامی کی موجودہ پستی کی طرف توجہ دلاکر وہ سبق ان کو یاد دلا دئے جائیں جو قرآن حکیم نے پیش کئے ہیں۔"

فاضل مضمون نگار اور مضامین کے بارے میں حارث صاحب مزید فرماتے ہیں کہ: "ان مضامین کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک مردِ مسلم۔۔۔۔ جسے قرآن فہمی کا ذوق ورثے میں ملاہوا اور اسی کے ساتھ جس کا سینہ ملت کے درد سے گھرا [؟ بھرا] ہو اور جس کی اصلاح کی اُسے لگن ہو، وہ اپنے دل کی بات کتنے موثر انداز میں پیش کرسکتا ہے اور اپنے خیالات کی تائید میں کلام ربانی کی آیات کے حوالے کس برجستہ طریقے سے پیش کرسکتا ہے۔۔۔۔ قرآن کریم پر خلیل مرحوم کی گہری نظر کا یہ مضامین بیّن ثبوت ہیں اور ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ اللہ کی اس کتاب کو صرف رسمی طور پر یا محض حصولِ ثواب کی خاطر تلاوت کی چیز سمجھنے کی بجائے اس کا مطالعہ، دعوت عمل سمجھ کر کیا جائے جو اس کی تنزیل کا اصل مقصد ہے۔ جس ذاتِ قدسی صفات کے ذریعے اللہ کا یہ آخری پیام، انسانیت کو حاصل ہوا، اس کی سیرت طیبہ کی روشنی میں یہ مطالعہ آج کی دُکھی انسانیت کے امراض کا صحیح علاج ثابت ہوسکتا ہے۔"

خاکسار تبصرہ نگار کو ان مضامین اور خطوط کی جو بات سب سے زیادہ پسند آئی وہ فاضل مضمون نگار کا خلوص اور ان کی دردمندی اور ان کی تحریر کی سلاست اور سادگی ہے، ان کے خیالات سے کسی کو چاہے اتفاق نہ ہو مگر اسلام اور اسلامی تعلیمات سے جو انھیں غیر معمولی شغف اور لگاؤ ہے اور مسلمانوں کی موجودہ پستی

اور انتشار پر جو انھیں دکھ اور درد ہے، اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے، پھر وہ اپنی بات کو اس سادگی اور خوبصورتی سے کہتے ہیں کہ دل میں گھر کر جاتی ہے۔ نمونے کے طور پر پہلے مضمون "مذہب سلمہٗ" کے ابتدائی دو پیرے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

"مذہب بہت خوددار اور گریز پا ہے۔ وہ بوجھ بن کر کہیں رہنا پسند نہیں کرتا۔ اس کی آؤ بھگت کی جائے تو وہ خوشی سے رہتا ہے اور میزبان کو اپنی بہار دکھاتا ہے۔ میزبان اگر خندہ پیشانی سے پیش آتا ہے اور اس کی مختصر سی ضروریات پوری کرتا رہے تو وہ اس قدر بے مروّت نہیں کہ رخصت ہوجائے۔ وہ تو ایسے میزبان پر دل وجان نچھاور کرتا ہے، ایسے میزبان کا جی تخت وتاج کے کھلونوں سے بہلاتا ہے۔"

"لیکن جس دن وہ میزبان کی پیشانی پر کوئی شکن دیکھ لیتا ہے تو وہ اپنا بوریا بستر چھوڑ کر اس خوبصورتی سے نکل جاتا ہے کہ میزبان کو اس کی روانگی کی آہٹ تک نہیں ملتی۔ میزبان کو مذہب سلمہٗ کی گریز پائی کا علم نہیں ہوتا، اس لیے وہ اس کی ضروریات پوری نہ کرنے کے باوجود یہی سمجھتا رہتا ہے کہ وہ موجود ہے۔ یہ دھوکہ وہ اس لیے کھاتا ہے کہ مہمان کی لائی ہوئی نعمتیں اس کے سامنے ہوتی ہیں اور اس کا بوریا بستر بھی موجود رہتا ہے۔"

افسوس زیادہ گنجائش نہیں۔ ورنہ کچھ نمونے اور پیش کئے جاتے۔ ہم مصنف کی بہن امۃ اللہ شرف الدین صاحبہ اور اس کے مرتب محمد طیب صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں، جن کی توجہ اور کوشش سے یہ دلکش اور مفید کتاب ہمیں میسر ہوئی۔ امید کہ یہ کتاب حسنِ قبول حاصل کرے گی۔

ابلاغ (ششماہی) مدیر: ڈاکٹر احمد سجاد
مدیر معاون: مظفر مہدی

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۲۴۰ صفحات، جلد ۱، شمارہ ۱، ۱۹۸۱ء، کتابت،

طباعت، کاغذ عمدہ۔ سالانہ چندہ پچیس روپے، قیمت فی شمارہ : پندرہ روپے
پتہ : ڈاکٹر احمد سجاد۔ طارق منزل، بریاتو ہاؤسنگ کالونی۔ رانچی (بہار) ۸۳۴۰۰۹

ریاست بہار کا اردو زبان و ادب کی خدمت اور ترقی میں بڑا شاندار حصہ رہا ہے اور اس وقت یہ پہلی ریاست ہے جہاں اردو کو سرکاری طور پہ ثانوی حیثیت حاصل ہے، مگر رسالوں کے لیے اس کی زمین بڑی سنگ لاخ ہے، اچھے اچھے رسالے نکلتے ہیں اور کچھ عرصے کے بعد بند ہوجاتے ہیں۔ امسال زیر تبصرہ رسالہ "ابلاغ"، جو فی الحال ششماہی ہے اور اگر حالات نے اجازت اور ملک نے مناسب پذیرائی کی تو اسے سہ ماہی کرنے کا ارادہ ہے، اس کے بیشتر مضامین محنت سے لکھے گئے ہیں اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے مجلات میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

اس شمارے کے چند اہم مضامین میں ایک مضمون پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کا ہے جس کا عنوان ہے : "غالب صدی سے اقبال و پریم چند صدی تک اردو میں تحقیق"۔ غالب صدی ۱۹۶۹ء میں منائی گئی تھی اور پریم چند صدی کا سلسلہ ابھی جاری ہے، اس لحاظ سے اس مضمون کا دائرہ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۸۰ء تک ہونا چاہیئے، گویا پچھلے دس سال کی مدت پر حاوی ہے۔ موضوع کا حق ادا کرنے کے لیے ایک مضمون کے لیے یہ مدت بہت زیادہ ہے، اس لیے اس کو محدود کرنے کی ضرورت تھی۔ اس مضمون میں جو خامیاں ہیں، میرے خیال میں اگر اس کا دائرہ صرف ہندوستان تک محدود ہوتا تو شاید یہ خامیاں نہ ہوتیں، لیکن مزید ستم یہ ہوا ہے کہ موضوع سے کسی قدر ہٹ کر، فاضل مضمون نگار نے اپنی ذمہ داریاں اور بڑھالی ہیں، یعنی بجائے اس کے کہ وہ اپنے قلم کو صرف تحقیقی ادب تک محدود رکھتے، اردو رسائل کے خصوصی شماروں کو بھی شامل کرلیا ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ "گوشوں" کا بھی اضافہ کرلیا گیا ہے، جبکہ یہ عام طور پر بہت ہی سطحی ہیں۔

ادب کے کسی پہلو کا جائزہ ہو یا اشاریہ سازی یا فہرست سازی، یہ بڑی محنت چاہتا ہے اور اس کے لیے ایک خاص قسم کے ذوق کی ضرورت ہے۔ فاضل مضمون نگار

ان چند لوگوں میں سے ہیں جن کو نہ صرف یہ کہ اس کا پورا ذوق ہے بلکہ وسیع تجربے کے مالک بھی ہیں اور موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے ان کے پاس وسائل بھی ہیں، اس لیے اس مضمون میں جو خامیاں ہیں اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ اس تبصرے میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ان خامیوں پر زیادہ تفصیل سے لکھا جائے، اس لیے چند موٹی موٹی خامیوں کی طرف صرف اشارے پر اکتفا کیا جائے گا، اور صرف اپنے حلقے تک اپنے آپ کو محدود رکھوں گا۔

(۱) صفحات ۸۸ اور ۸۹ پر غالب سے متعلق ان کتابوں کی فہرست شائع کی گئی ہے جو ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۹ء تک شائع ہوتی ہیں، اسی مدت میں پروفیسر محمد مجیب صاحب کی ایک کتاب انگریزی اور اردو میں شائع ہوئی ہے، اس کا ذکر نہیں ہے (۲) صفحات ۹۰ اور ۹۱ پر برصغیر ہند و پاک کے ۱۴ رسالوں کے غالب نمبروں کی فہرست شائع کی گئی ہے، فروری و مارچ ۱۹۶۹ء میں ماہنامہ جامعہ کا ایک غالب نمبر شائع ہوا تھا جس کا یہاں ذکر نہیں ہے۔ (۳) صفحہ ۹۹ پر اہم مضامین کے مجموعوں کی فہرست درج ہے، ان میں راقم الحروف کی مرتبہ کتاب: "مولانا محمد علی ـــ ایک مطالعہ" کا ذکر نہیں ہے جو ستمبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی ہے۔ اگر خطوط کے مجموعوں کا ذکر کیا جا سکتا ہو تو دسمبر ۱۹۷۵ء میں خاکسار کی کتاب: "مشاہیر کے خطوط اور ان کے مختصر حالات" شائع ہوئی ہے۔ (۴) صفحات ۱۰۰ تا ۱۰۳ پر برصغیر کے ان رسالوں کے خصوصی نمبروں کی تفصیل درج ہے جو ۱۹۶۹ء سے ۱۹۸۰ء تک شائع ہوئے ہیں۔ اسی عرصے میں ماہنامہ جامعہ کا گاندھی نمبر، ذاکر نمبر، سرسید نمبر اور مولانا محمد علی نمبر کے دو حصے شائع ہوئے ہیں جن کا اس مضمون میں ذکر نہیں ہے۔ سہ ماہی اردو ادب (علی گڑھ) کا بھی پروفیسر آل احمد سرور صاحب کی ادارت میں ذاکر نمبر شائع ہوا تھا۔

(۵) صفحہ ۱۰۷ پر ان کتابوں کی فہرست دی گئی ہے جو زیر تبصرہ سال میں اقبال پر شائع ہوئی ہیں۔ اسی مدت میں راقم الحروف کی ایک کتاب: "اقبال دانائے راز" جولائی ۱۹۷۸ء میں اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مرتبہ کتاب: "اقبال ـ جامعہ کے مصنفین کی نظر میں" فروری ۱۹۷۹ء میں شائع ہوتی ہیں، مگر یہ دونوں کتابیں فاضل مضمون نگار کی

توجہ سے محروم ہیں۔ (۶) صفحہ ۱۱۰ پر فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے کہ: "غالب اور اقبال کے علاوہ پچھلے دس برسوں میں انیس و دبیر اور پریم چند کا بھی جشنِ ولادت منایا گیا۔" اسی زمانے میں مولانا محمد علی اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا بھی جشن ولادت منایا گیا ہے، مگر نہ جانے کیوں ان کا ذکر مناسب نہیں سمجھا گیا۔ چھوٹے پیمانے پر دیسے فانی بدایونی اور حسرت موہانی اور آغا حشر کا بھی یوم ولادت منایا گیا ہے، جن کا ذکر بہرحال مناسب ہوتا۔

ان خامیوں کے ذکر کرنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ اگر موصوف اس مضمون کو دوبارہ شائع کریں تو نظر ثانی فرمالیں۔

آخر میں ہم اپنے معاصر ششماہی "ابلاغ" کا کھلے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے طویل عمر عطا فرمائے۔

سالانہ قیمت
۹ روپے

جامعہ

اس شمارے کی قیمت
۳ روپیہ

ڈاکٹر انصاری کی یاد میں

جلد ۷۸	بابت جون و جولائی ۱۹۸۱ء	شمارہ ۶ و ۷

فہرست مضامین

مجلس ادارت

پروفیسر محمد مجیب | پروفیسر مسعود حسین
ڈاکٹر سلامت اللہ | ضیاء الحسن فاروقی

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: جمال پریس دہلی ۶ • ٹائیٹل: نائن پریس دہلی ۶

شذرات

جون اور جولائی کا یہ شمارہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کی یاد میں شائع ہو رہا ہے۔ اس میں تین مضمون ایسے ہیں جن کے لکھنے والوں نے ڈاکٹر انصاری کو قریب سے دیکھا تھا یا اُن کے ساتھ ایک رفیق کی حیثیت سے برسوں کام کیا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اُن کی شخصیت، اور ان کی زندگی کی بعض خصوصیات سے متاثر بھی ہوئے اور انھوں نے ڈاکٹر انصاری کی وفات کے بعد عمر بھر اُن کی یاد کو زندہ رکھا۔ اپنی بیٹی (گودلی ہوئی) کو انھوں نے یوروپ سے خطوط لکھے تھے، انھیں پڑھئے تو زندگی، تعلیم و تربیت اور انسان دوستی سے متعلق اُن کے عملی و فکری رحجانات کا اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے REGENERATION IN MAN کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی جس سے طبی تحقیقات سے متعلق ان کی کاوشوں کی قدر و قیمت کا پتہ چلتا ہے اور اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ ملکی سیاست اور اپنے پیشے کی مصروفیات کے باوجود وہ فن طب میں جدید تحقیقات سے نہ صرف باخبر تھے بلکہ ان سے متعلق اپنی رائے اور اپنا نقطۂ نظر بھی رکھتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری کی سیاسی مصروفیات اور دہلی میں ان کی رہائش گاہ کی گہما گہمی اور شب و روز کی مہماں نوازی کا حال سنئے یا پڑھئے تو یہ خیال گذرتا ہے کہ سیاست ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھی، مطب اور پیشے کی دوسری سرگرمیوں کو دیکھئے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ فن طب، مطب، مرض اور مریض ہی اُن کی پوری زندگی پر چھائے ہوئے تھے، غم خواری، دلداری، انسانیت، شرافت اور مروّت کے واقعات سنئے تو ایسا لگتا ہے کہ ان کا پورا وقت انھیں اقدار کی خدمت ہی میں گذرتا ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر انصاری ایک ہی تھے، ایک ہی شخص اور ایک ہی انسان، ایک ہی شمع اور ایک ہی چراغ جس کے پرتو سے علم و سیاست، طب و طبابت، انسانیت و شرافت، غرض زندگی کے ہر شعبے میں ایک انجمن قائم تھی، وہ اِس دنیا سے رخصت ہوئے تو لوگوں نے محسوس کیا کہ ایک ہی انجمن نہیں، بہت سی انجمنوں کی بساط الٹ گئی۔ مجاز مرحوم جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ڈاکٹر انصاری کے مزار پر حاضر ہوئے تو اُن کے اشعار صاحب مزار کے بے شمار جاننے والوں اور اس سے محبت کرنے والوں کے احساسات و جذبات کے ترجمان بن گئے:

سنیں اربابِ دل، اہلِ نظر بھی — نہاں ہے سنگ پاروں میں گہر بھی
جمالِ قوم بھی، صاحب نظر بھی — مسافر بھی، خضر بھی، چارہ گر بھی
خنک اور مرمریں مدفن میں پنہاں — خروش برق و طوفانِ شرر بھی
سکونِ دیر و تقدیس کلیسا — گدازِ امتِ خیر البشر بھی

یہ تربت ہے امیرِ کارواں کی
یہ منزل بھی ہے شمعِ رہ گزر بھی

آج ہر طرف پھیلے ہوئے اندھیرے میں ڈاکٹر انصاری کی نورانی اور بھرپور زندگی کے متعلق سوچیئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قندیلیں روشن ہوگئی ہوں۔ ۲۴ر دسمبر ۱۹۸۰ء کو مرحوم کی پیدائش پر سو سال پورے ہوئے اور اس تقریب میں سمیناروں اور دیگر تقریبات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر انصاری جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں میں تھے، پھر اس کے بعد مدتوں مختلف حیثیتوں سے اور آخر میں حکیم اجمل خاں مرحوم کی وفات کے بعد امیر جامعہ کی حیثیت سے تقریباً آٹھ برس تک اس نخل آرزو کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی تھی۔ اس لئے جامعہ ملیہ والوں کی کوششوں سے کئی ایسے پروگرام ہوئے جو مرحوم کی قومی و ملی خدمات کے شایان شان تھے۔ اس سلسلے میں جامعہ میں ایک سمینار منعقد ہوا، حکومت ہند کی طرف سے ایک خصوصی ٹکٹ جاری کیا گیا، نمائشیں لگائی گئیں، ماہنامہ آجکل نے خصوصی نمبر نکالا، ملک کے مختلف حصوں میں جلسے کئے گئے، تقریریں ہوئیں اور مضامین لکھے گئے، ماہنامہ جامعہ کا یہ شمارہ بھی انھیں کی یاد میں ہے۔ ۲۶ر مارچ ۱۹۸۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک عظیم الشان اجتماع میں انصاری صدی تقریبات کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ڈاکٹر انصاری کی محبوب شخصیت اور ان کی قومی خدمات سے متعلق جو کچھ کہا تھا، مذکورہ بالا ساری تقریبات درحقیقت اسی کا ہمہ جہتی اعتراف ہیں۔

وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے فرمایا تھا:

"میرے لئے یہ فخر کی بات ہے کہ مجھے اس تقریب میں شریک ہوکر ملک کی جدوجہد آزادی کے ایک درخشندہ ستارے کو خراج عقیدت پیش کرنے کا موقع ملا۔ اس کا ایک اور سبب بھی ہے جو ذاتی نوعیت کا ہے۔ ڈاکٹر انصاری، میرے دادا اور میرے والد کے بہت قریبی

دوست اور رفیق تھے ۔ ایک طرح سے وہ ہمارے خاندان کے فرد تھے، وہ میرے بچپن کی یادوں کا ایک حصہ ہیں ....

"ڈاکٹر انصاری صفِ اول کے رہنماؤں میں تھے .... اپنی جوانی ہی میں انھوں نے اپنے طبی پیشے میں انتہائی ممتاز مقام حاصل کرلیا تھا .. کانگرس کے اندرونی حلقوں میں ان کے مشوروں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ انڈین نیشنل کانگرس کے صدر بنائے گئے ۔۔ اس طرح قوم نے، اُس دور میں جب یہاں بدیسی راج تھا، انھیں وہ اعلیٰ ترین اعزاز بخشا جو اس کے بس میں تھا۔

"ان کی شخصیت بے داغ تھی ۔ اپنی زندگی میں وہ ہندوؤں مسلمانوں، روایت اور جدت. قدیم اور جدید کے درمیان ایک پُل تھے ....

"ڈاکٹر انصاری ہر طرح کی تنگ نظری سے پاک تھے اور ان کی مہمان نوازی ضرب المثل بن گئی تھی ۔ وہ بڑوں اور چھوٹوں کو یکساں عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے ۔ ہر سچا قومی کارکن ان کا معزز مہمان تھا ..

"حالیہ برسوں میں ہم نے بہت سی صد سالہ تقریبیں منعقد کی ہیں ... صد سالہ تقریبوں کا اہتمام ان عظیم ہستیوں کو کوئی نیا اعزاز دینا نہیں ہے ۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کام کیا ... اور ہمارے لئے ایک بیش قیمت ورثہ چھوڑ گئے ۔ یہ صد سالہ تقریبیں ان کے لئے نہیں بلکہ ہمارے لئے ہیں ۔ یہ اس لئے ہیں کہ ہم ان سے فیضان حاصل کرسکیں ۔۔ ایسے موقعوں پر اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور باطنی قوت حاصل کریں ...

"آج ہمیں ایک بار پھر ڈاکٹر انصاری کی خدا ترسی، انسان دوستی، قومی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کردینے کے جذبے، مذہبی جنون سے احتراز، مختلف مذاہب اور پیشوں کے لوگوں کے لئے محبت اور احترام اور نیک دلی کے رویے کی ضرورت ہے، اپنی گفتار و کردار میں وہ اِن خوبیوں کے مظہر تھے ۔"

ڈاکٹر انصاری اس ملک میں نیشنلسٹ مسلمانوں کے سرخیل تھے ۔ نیشنلسٹ مسلمان سچے مسلمان تھے اور پکّے محب وطن ۔ یہ وہ مسلک تھا جو فرقہ پرستوں کو خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان پسند نہ تھا، لیکن ہندوستان جیسے ملک میں جو مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کا گہوارہ ہے اور جس کا

تمدن ایک ایسا موزئیک ہے جس میں ہر رنگ نمایاں ہے ۔ یہی مسلک پہلے بھی صحیح تھا اور آج بھی صحیح ہے ۔ ڈاکٹر انصاری اپنے فکر وعمل میں اس مسلک کے بہترین ترجمان تھے، وہ سچے مسلمان تھے، دیوبند کے سیاسی و مذہبی موقف کے حامی تھے ۔ وہ آزادی کے ایک بہت بڑے مجاہد شیخ الہند مولانا محمود حسن سے بیعت تھے ، ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (دہلی) میں ان کا خطبۂ استقبالیہ ان کی اسلامیت اور وطنیت دونوں کا شاہد ہے ۔ کانگریس کے اجلاس منعقدہ مدراس (دسمبر ۱۹۲۷ء) میں انھوں نے حقیقت پسندانہ جرأت کے ساتھ اعلان کیا تھا کہ "کچھ بنیادی حقائق ایسے ہیں جنھیں یاد رکھنا ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے مفید رہے گا ۔ انھیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ ہندوستانی ہیں ۔ انھیں ایک ساتھ ہندوستان میں رہنا اور ہندوستان میں مرنا ہے ۔ قدرت نے ان کی قسمتوں کو ناقابل تحلیل حد تک مربوط کر دیا ہے ۔ اگر میرا کوئی ہندو بھائی یہ سوچتا ہو کہ وہ سات کروڑ مسلمانوں سے نجات حاصل کر سکتا ہے تو وہ ایک بھاری فریب میں مبتلا ہے اور جس قدر جلد اس فریب کا طلسم ٹوٹ جائے بہتر ہے ۔ اسی طرح اگر میرا کوئی مسلمان بھائی یہ خواب دیکھ رہا ہے کہ وہ ۲۵ کروڑ ہندوؤں پر غالب آجائے گا تو وہ احمقوں کی جنت کا باسی ہے اور جس قدر جلد وہ اپنی آنکھیں کھول لے مسلمانوں اور ہندوستان کے لئے بہتر ہے ۔" ان الفاظ کے ساتھ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کو ہندوستان کی آزادی اور آزادی کے بعد اس کی ترقی کے لئے ناگزیر قرار دیا تھا ۔ ہندو مسلم اتحاد ان کی زندگی کا مشن تھا ۔ گاندھی جی نے ان کی موت کی خبر سن کر کہا تھا کہ "ڈاکٹر انصاری کی موت میرے لئے ایک صدمۂ جانکاہ ہے ... وہ ہندو مسلم سوال پر میرے سب سے بڑے رہنما تھے ۔" اور مفتی کفایت اللہؒ نے لکھا تھا کہ "انصاری کا وجود خلق اللہ کے لئے مجسمۂ رحمت اور پیکر خلوص تھا ۔ وہ اپنے آباؤ اجداد یعنی انصار رسولؐ کا سچا جانشین اور نمونہ تھا ۔" ـــــ اس لئے ڈاکٹر انصاری کو ہم یاد کریں تو ہمیں ان کی صداقت و شرافت، سچی مذہبیت و وطنیت، لطف و محبت، سنجیدگی و متانت اور عزم واستقامت کو یاد کرنا چاہیئے اور یہ سوچنا چاہیئے کہ آج یہ اقدار عالیہ کہانیاں بن کر کہاں کھو گئی ہیں ۔ آئیے ہم سب مل کر انہیں تلاش کریں ۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

[دوسرے امیر جامعہ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا، مسوری سے دہلی واپس آتے ہوئے، ۹ اور ۱۰ مئی ۱۹۳۶ء کی درمیانی شب میں، تقریباً ایک بجے، دل کا دورہ پڑنے پر، دہرہ دون ایکسپریس میں انتقال ہوگیا۔ اس حادثے کی اطلاع ۱۰ مئی کی صبح کو جامعہ پہنچی، اسی دن سہ پہر میں مرحوم کی میت جامعہ کی نئی بستی جامعہ نگر میں سپردِ خاک کی گئی اور اسی دن رات کو اُس وقت کے شیخ الجامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے آل انڈیا ریڈیو دلی اسٹیشن سے مرحوم کے بارے میں ایک تقریر فرمائی جو ذیل میں درج ہے۔]

کل رات کو کوئی ڈیڑھ بجے ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر مختار احمد انصاری دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ابھی پرسوں کسی کام سے مسوری تشریف لے گئے تھے، وہاں سے واپس آرہے تھے کہ راستے میں دل کی حرکت بند ہوگئی اور یہ بے شمار کاموں اور ان گنت قدردانوں کو، اس دیس کو جس کی خدمت میں ساری عمر گذار کر ان کا بُرا ہی شنا، ان ہندو مسلمانوں کو جن میں میل ملاپ اور محبت پیدا کرنے کے لیے خون پسینہ ایک کیا، ان مریضوں کو جن کی آخری امیدوں کا سہارا ان کا مطب تھا، اس جامعہ ملیہ کو جس کے بچوں کو دیکھ کر ان کا خون چلوؤں بڑھتا تھا اور جن سے ایسی یہ امید تھی کہ ان کی زندگی میں وہ آرزوئیں پوری ہوسکیں گی جو اس وقت بس ارمان ہی ارمان ہیں۔ ہاں گھر بار کو، بال بچوں کو، عزیزوں کو، دوستوں کو، سب کو چھوڑ کر نہ جانے جی میں کیا آئی کہ آدھی رات گئے اس راہ پر چل پڑے جس پر چلنے والے پھر منہ موڑ کر نہیں دیکھتے۔ ان کی زندگی کا

چراغ گل ہونے سے ایک ان کے اپنے گھر میں اندھیرا نہیں ہوا، اس دیس کے ہر بچے کے دل میں اس غم کی اندھیاری چھائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذات فیض کا ایک چشمہ تھی اور یہ اپنے پرائے سب کے لیے بہتا تھا، ان کی شخصیت ایک سہارا تھی جو وقت پڑے سب کے کام آتا تھا، ان کا دل ایک ٹھکانا تھا جہاں پر دکھی دل کو پناہ ملتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جس دن سے دنیا کے میدانِ عمل میں قدم رکھا ان کی شخصیت نے سب کا من موہ لیا، اس لیے کہ وہ نیک تھے، سچے تھے، مخلص تھے، فیاض تھے، ساتھیوں کی خوشی کو اپنی خوشی اور ان کے غم کو اپنا غم جانتے تھے۔ اس سے پہلے کہ ان کی سیاسی خدمات انھیں مشہور کریں، ہزاروں آدمی انھیں اپنا سمجھنے لگے تھے۔ ان کی سوجھ بوجھ، تدبر، خلوص اور ایثار نے بہتیروں کو اپنا گرویدہ بنایا، لیکن ان کی محبت اور ہمدردی نے کہیں زیادہ لوگوں پر اپنا جادو کیا۔ اس وقت ان سب کی نظروں میں ان کی پریم بھری آنکھیں، ان کا مسکراتا ہوا چہرہ پھر رہا ہوگا اور ان کی محبت کی یاد سے دل میں رہ رہ کر درد اٹھتا ہوگا۔ پھر سوچیے کہ اس سانحہ سے ان لوگوں کے دلوں پر کیسی چوٹ لگی ہوگی جو ڈاکٹر صاحب کے خاندان یا جامعہ ملیہ کے بچوں اور استادوں کی طرح خاص ان کے سایہ میں رہتے تھے۔ موت کی گھڑی سب کے لیے آتی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب تو ابھی چھپن سال کے تھے، ان کے لیے تو وہ زمانہ آرہا تھا کہ اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودوں کو پھلتے پھولتے دیکھتے اور جب وہ نہ مٹنے والی گھڑی آتی تو انھیں کچھ نصیحت، کچھ وصیت کرکے اطمینان سے آنکھیں موند لیتے۔ پر یہ سب خدا کو منظور نہ تھا اور ہوتا تو وہی ہے جو اسے منظور ہو۔ وہ اکیلے چل دئے اور ہمیں اکیلا چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر صاحب کی ساری زندگی میں سچ پوچھیے تو ان کے خاندان کی روایتوں کا رنگ جھلکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے وطن یوسف پور کے انصار حضرت ایوب انصاری کی اولاد ہیں جن کے گھر مکہ سے مدینہ ہجرت کرکے قافلے کے سردار نے جاکر قیام فرمایا تھا۔ اس وقت جب مخالف اس کی حق کی پکار کو اپنے شور سے دبا دینا اور اس کی تعلیم کے چراغ کو اپنی پھونکوں سے بجھا دینا چاہتے تھے، پر جس کی للکار سے سوتی دنیا چونک اٹھی اور دکھیا انسانیت نے بڑی ہی راحت

پائی، اسی وقت سے سچائی کی مدد، مہماں نوازی، فیاضی اس خاندان کا حصہ رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے تو ان کے خاندان کا ستارہ ذرا گردش میں تھا، لیکن بچپن ہی سے ان کی طبیعت میں بلندی کے آثار نمایاں تھے۔ ۱۸۹۶ء میں جب انھوں نے اپنے وطن کا مڈل اسکول چھوڑا اس وقت تک جب وہ انگلستان میں تعلیم سے فارغ ہو کر ہندوستان واپس آئے یہ اپنی محنت اور ذہانت سے ہمیشہ تعلیمی وظیفے حاصل کرتے رہے اور ان وظیفوں سے اکثر چھپ چھپ کر اپنے کسی عزیز کو تعلیم دلاتے رہے۔ کامیابی کے ساتھ ساتھ ان کا یہ مبارک شوق بھی بڑھتا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں جب انھوں نے دہلی میں فتحپوری پر اپنا مطب کھولا تو ان کی غیر معمولی طبی لیاقت کے ساتھ ان کی مہمان نوازی اور دریا دلی بھی مشہور ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ٹرکش میڈیکل مشن کی رہبری کے لیے اپنی پریکٹس چھوڑ دی، گھر میں جو کچھ بک سکتا تھا بیچ ڈالا اور زخمی ترکوں کی مرہم پٹی کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں سے واپس ہوئے تو خالی ہاتھ۔ پھر پریکٹس شروع کی۔ ذرا اطمینان ہو چلا تھا کہ خلافت کی تحریک شروع ہوئی اور ڈاکٹر صاحب نے پھر اپنا وقت اور روپیہ قوم پر نثار کر ڈالا۔ ۱۹۲۰ء میں جب وہ خلافت کا ڈیپوٹیشن لے کر انگلستان گئے تو موٹر بیچ کر، جب واپس آئے تو ملک میں ایک تہلکہ تھا، اس وقت کوئی خدمت ایسی نہ تھی جسے انجام دینے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم جھجکے ہوں، وہ کونسا سودا تھا جو اس سر میں نہ تھا، نہ دن چین سے گذرتے اور نہ راتیں، ان کا حوصلہ تھا کہ بڑھائے جاتا تھا اور ہمت تھی کہ مہمیز لگائے جاتی تھی۔

۱۹۲۲ء کے بعد ملک میں کچھ سکون سا تھا پر اس سکون میں وہ کچھ اور بے چین تھے، کیونکہ مسلمانوں میں میل جسے وہ جان سے عزیز رکھتے تھے اس وقت فنا ہوتا نظر آتا تھا اور وطن کے دونوں بیٹوں میں پریم اور محبت کا رشتہ قائم کرنے کی خاطر کم لوگ ہیں جو ڈاکٹر صاحب مرحوم کی طرح اپنی عزت، شہرت، اپنے سکھ اپنے چین کو داؤں پر لگایا ہو۔ اس پاک کوشش میں انھیں جو دکھ پہنچے، ان کا ذکر اس وقت کیا کروں، انھوں نے اس پاک طینت، نیک نفس انسان کا دل چھلنی کر دیا تھا۔ آج جب وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا، ہم سب کو ہندو مسلمانوں کو اس پاک

کوشش میں اس کی ناکامی پر شرم سے سر اٹھانے کا موقع نہیں ہے اور اس شرم کو بس آنسوؤں کی دو بوندیں نہیں دھو سکتیں، اس کے لیے ساری عمر اسی کام میں سر کا پسینہ ایڑیوں تک بہانا ہوگا جب بھی شاید نہ دھلے گی۔ اسی کام کی خاطر ہاں جاننے والے جانتے ہیں کہ اسی کام کی خاطر انھوں نے اپنی تمام پریشانیوں اور دشواریوں کو بھلا کر کانگریس کی صدارت ۱۹۲۷ء میں منظور کرلی، اسی کی خاطر جامعہ ملیہ کے کمزور پودے کی آبیاری اپنے ذمہ لی[1] اس لیے کہ ملک کا رنگ اور ملک والوں کا ڈھنگ دیکھ کر ان کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ نئے ہندوستان کے لیے نئے آدمیوں کی ضرورت ہے، ایسے آدمیوں کی جو اپنی اچھی چیزوں پر بھروسہ رکھیں، انھیں برتیں، انھیں ترقی دیں، تاکہ دوسروں کی اچھی باتوں کو سمجھیں اور ان کی عزت کریں، خود مضبوط ہوں اور دوسروں کی مضبوطی سے ڈریں نہیں، مانگیں ہی نہیں دینے کو کچھ رکھتے ہوں اور دینے کی کچھ ہمت بھی رکھتے ہوں۔ مسلمانوں میں ایسے آدمی پیدا کرنے کے لیے انھوں نے اپنی امیدیں اس تعلیم گاہ سے باندھی تھیں اور اس کی ترقی کو وہ ملک کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے تھے۔ آج سہ پہر کے وقت جامعہ ملیہ والوں نے اپنے سرپرست کو اپنی نئی بستی کے پہلو میں جاکر دفنایا ہے۔ خدا انھیں توفیق دے کہ وہ اس آرزو کو بھی پورا کرسکیں جو ڈاکٹر صاحب کا دکھا ہوا زخمی دل اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ اب اس مدرسے کے بچوں کے سر پر ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ نہ پھرے گا، اُس کے کام کرنے والوں سے کوئی آ آکر شرما شرما کر یہ نہ کہے گا کہ وہ تمھارے لیے کچھ کام نہیں کرسکا، تم سے آنکھیں ملانے کی مجھ میں ہمت نہیں، وہ اپنے لڑکپن میں اب کس سے روٹھیں گے اور کون انھیں آکر منائے گا۔ ہاں کوئی نہیں پر اُس کے دُکھی دل کا دُکھ ہمیں یاد رہے گا اور ہم میں کچھ ہے تو ہم سے کرائے گا بھی۔ ہمارا کام بڑھے گا، پھیلے گا، ہمیں ہزاروں دولتیں ملیں گی پر ڈاکٹر انصاری کا سا دل نہیں ملے گا۔

---

[1] ۲۹ر اپریل ۱۹۲۸ء کو ڈاکٹر صاحب جامعہ کی مجلس امناء کے صدر منتخب ہوئے۔

قاضی عبدالغفار (مرحوم)

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

محترم قاضی عبدالغفار مرحوم نے یہ مضمون ۱۹۴۲ء کے اواخر میں حیدرآباد میں تحریر فرمایا تھا جو اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ یہ مضمون قاضی صاحب سے متعلق میرے کاغذات میں محفوظ تھا۔ خلافت وفد ۱۹۲۲ء میں وزیر اعظم برطانیہ کی دعوت پر لندن گیا تھا۔ قاضی عبدالغفار اس وفد کے معتمد تھے۔ اس وفد میں سرآغاخاں کے علاوہ سیٹھ چھوٹانی (صدر خلافت کمیٹی)، ڈاکٹر انصاری، مشیر حسین قدوائی اور سید حسن امام بھی شامل تھے ——— اس وفد کی روئداد قاضی صاحب نے "نقش فرنگ" کے نام سے تحریر فرمائی تھی جو مئی ۱۹۲۳ء میں کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے اور اب نایاب ہے، لیکن "نقش فرنگ" کی اشاعت کے انیس سال بعد انھوں نے اس کتاب پر ایک دیباچہ تحریر فرمایا ہے جو اب تک غیر مطبوعہ ہے، اس لئے کہ "نقش فرنگ" کی مطبوعہ کاپی قاضی صاحب کو اس وقت دستیاب نہیں ہو سکی اسی لئے یہ دیباچہ بھی شائع ہونے سے رہ گیا۔ یہ مضمون اسی دیباچے کا ایک حصہ ہے جو جامعہ کے پڑھنے والوں کی نذر کیا جا رہا ہے۔ اگر قارئین جامعہ کو یہ مضمون یا خاکہ پسند آئے تو پھر وفد کے دوسرے اراکین کے خاکے بھی اُن کی

خدمت میں پیش کئے جائیں گے ——— سری نواس لاہوٹی [۱]

[خلافت] "وفد" کے پانچویں رکن اور فی الاصل "وفد" کے روحِ رواں مرحوم ڈاکٹر انصاری تھے ——— انصاری ! ان کی یاد آتے ہی خیالات کی دنیا بدل جاتی ہے ! ایک گذری ہوئی شامِ محبّت کی محفل، اس بزم کی شمعِ فروزاں جس کا نور نظروں سے دور ہے مگر چند ٹوٹے ہوئے دلوں کے خون میں اس نور کے ذرات ابھی تک چمک رہے ہیں ؎

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں مئے سے اور میخانہ خالی ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جوبلی ہل [حیدرآباد کے اونچے طبقے کا ایک رہائشی علاقہ جہاں قاضی صاحب مرحوم رہا کرتے تھے۔] کے اس کمرہ میں جہاں بیٹھا ہوا میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں میرے سامنے کھڑے مسکرا رہے ہیں !

وہ دلفریب تبسّم ، وہ دلنواز نظر

انصاری اپنے زمانے میں قوم کے بہت بڑے لیڈر تھے، اپنی قوم کے محبوب تھے، اپنے رفقاء کا بہت بڑا سہارا تھے، لیکن اس کے علاوہ وہ کیسے پیارے انسان تھے. وہ کیسے دردمند دوست تھے، وہ کیسے سدا بہار چمنستانِ محبت تھے ——— اس حقیقت کو تو ان کے صرف وہی چند ہم نفس بتا سکیں گے جنھوں نے خلوت و جلوت میں انصاری کی روحِ انسانیت کو دیکھا تھا ——— وہ روح جس کے جلوے ان کے متبسم لبوں پر کھلا کرتے تھے ! پہلے دن سے انصاری کی عمومی اور شخصی زندگی کو دیکھا، دہلی کے فتح پوری بازار میں ان کا مطب تھا۔ اس مطب کے کمروں کا وہ ہجوم اور ہنگامہ یاد ہے جو وہاں جنگ بلقان کے زمانے میں طبی مشن کی روانگی سے ہفتوں پہلے صبح سے شام تک

۱۔ ہم جناب سری نیواس لاہوٹی صاحب کے ممنون احسان ہیں کہ اُن کی عنایت سے ہمیں قاضی صاحب مرحوم کا یہ غیر مطبوعہ مضمون ملا۔

برپا رہا کرتا تھا۔ اس زمانے میں ایک قابل ڈاکٹر کی حیثیت سے انصاری اپنی شہرت قائم کر چکے تھے لیکن ایک سچے وطن پرست اور سیاسی لیڈر کی حیثیت سے محمد علی کے شانہ بشانہ ان کا یہ پہلا قدم اٹھ رہا تھا۔ میں اس زمانے میں "ہمدرد" (اخبار) کے اسٹاف میں تھا اور ہنوز ان سے اتنا قریب نہ آیا تھا، جتنا کہ بعد کو آیا۔ پھر بھی وہ ایک کشش جو ان کے اندر تھی، مجھ جیسے چند نوجوان دیوانوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی ——— پھر وہ زمانہ آیا کہ دہلی میں تمام ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک مثلث قائم ہو گیا ——— جس کا ایک زاویہ محمد علی، ایک انصاری اور ایک اجمل خاں تھے ——— یہ وہ زمانہ تھا جب زندگی کا آفتاب بہت گرم تھا، ہمارے دلوں کے آتش خانے بھی گرم تھے، حتیٰ کہ گویا اندھیری راتوں میں ہم سورج دیکھتے تھے ——— خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیں زور پر تھیں، مسلم لیگ کا وہ اجلاس دہلی میں ہونے والا تھا جس میں انھوں نے اپنا مشہور خطبۂ استقبالیہ پڑھا ——— وہی خطبہ جو ضبط کر لیا گیا ——— جاڑوں کی رات اور ؎ دریا گنج کے ایک کمرہ کے فرش پر ہم تین چار آدمی کمبل اوڑھے پڑے ہوتے ہیں، مجھے ۱۰۳ بخار ہے۔ تین تین گھنٹے بعد ڈاکٹر صاحب دوا کی خوراکیں پلاتے جاتے ہیں اور اس خطبہ کے مسودہ پر بحث ہوتی جاتی ہے۔ ہر ہر فقرہ پر گفتگو ہوتی ہے، اسے یوں لکھتے تو بہتر تھا، اس لفظ کے بجائے یہ لفظ ہوتا تو عبارت کے زور میں اضافہ ہو جاتا، اس حدیث کے الفاظ کی صحت ذرا مشتبہ ہے، دیکھنا بھئی قاضی، ذرا تم مولانا کفایت اللہ صاحب سے دریافت کر کے آؤ ——— اور اب آدھی رات گزر چکی ہے، صبح یہ مسودہ طباعت کے لئے جائے گا، پرسوں وہ لیگ کے اجلاس میں پڑھا جائے گا۔ ایسا نہ ہو کہ پڑھے جانے سے پہلے ہی وہ ضبط ہو جائے، اس لئے اس کے مضامین کا راز ہر طرح سے محفوظ کیا جا رہا ہے۔ صبح ہوتی ہے، اس محفل نیم شبی کا تھکا ہارا "قاضی" ——— وہ مجھے ہمیشہ اسی نام سے پکارتے تھے ——— مسودہ کو پریس لے کر جاتا ہے۔ دوا کی

شیشی ساتھ ہے !! ـــــ یہ حال تھا ـــــ یہ عالم تھا ـــــ انصاری کی اس نوجوان فوج کا! ہم لوگ اشاروں پر دوڑتے تھے اور نگاہوں سے ارادوں کا پتہ پاتے تھے ـــــ ہماری جوانی کا وہ قافلہ اس زمانے میں کس قدر تیز رفتار تھا! ـــــ

ـــــ جب وفد کے لئے لندن کے حریم وزارتِ عظمیٰ سے دعوت آئی اور بہت ہی عاجلانہ یہ مشورے ہونے لگے کہ کون جائے اور کون نہ جائے۔ میں دہلی میں تھا۔ سہ پہر کو تین بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، کسی نے کہا "ڈاکٹر صاحب ابھی بلاتے ہیں"۔ گیا تو دیکھا کہ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر صاحب بیٹھے ہوئے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مختصراً اس دعوت کا حال سنایا اور آخر میں کہا "تمھیں بھی چلنا ہے"۔ میں نے جواب دینے سے پہلے حکیم صاحب کی طرف دیکھا۔ پہلے اس سے کہ حکیم صاحب کچھ کہیں، وہ کہنے لگے، اُدھر کیا دیکھ رہے ہو۔ پہلے تو ان ہی کی رائے ہے کہ تم ضرور جاؤ! بھئی خدا جانے اس مرکب قافلے میں کیسے کیسے لوگوں سے واسطہ پڑے، تھوڑا سا تیزاب بھی ساتھ رہنا چاہیئے! میں نے کہا کب؟ کہنے لگے کل صبح! کل صبح! ـــــ اور لندن کا سفر! جی ہاں! ـــــ فرمانے لگے ـــــ آپ کچھ سیر و سیاحت کے لئے تو نہیں جا رہے ہیں کہ اس کے لئے کچھ ساز و سامان مہیا کریں! تمھیں چلنا تو ہے قاضی! پھر صبح اور شام کی بحث کیا؟ ـــــ اس طرح وہ اور حکیم صاحب چند گھنٹے پہلے بمبئی پہنچے اور ان کے سات آٹھ گھنٹے بعد میں پہنچا۔ صبح جہاز پر سوار ہونا ہے۔ شب بھر خلافت کے دفتر میں حکیم صاحب اور وہ اور مولانا شوکت علی اور میں، ـــــ اور چند لوگ بیٹھے ہوئے منصوبہ بندی کر رہے ہیں ـــــ وہ یہ کہیں گے تو ہم یہ جواب دیں گے، ہم مطالبہ کریں گے، وہ جب عذر کریں گے تو ہم اس کو یوں رد کر دیں گے۔ کس کس سے وہاں ملیں گے، ترکوں سے کیا باتیں کریں گے، آغا خاں سے کس طرح گذرے گی، سیٹھ (چھوٹانی) کو یہ باتیں کس طرح سمجھائی جائیں، قدوائی کو اس معجون مرکب میں کس طرح کھپایا جائے! غرض وہ رات آنکھوں میں گذری اور باتوں میں! ـــــ دیارِ مغرب کی طرف میرا یہ پہلا سفر تھا اور

بڑا شاندار سفر تھا، دو جوڑے کھدر کے کپڑے لیکر جہاز پر سوار ہوا۔ مجھے خوب یاد ہے وہ واقعہ جو یورپ کی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد پہلے ہی دن پیش آیا۔۔۔۔ اس واقعہ میں دولت کی خود غرضی کے خلاف میری بغاوت اور انصاری کی شیریں اور سبھی کے ساتھ بسر کر لینے کی فطرت نمایاں ہوئی۔ ہوا یہ کہ مارسیلز پہنچ کر ٹامس کک کے نمائندے نے ہمیں بتایا کہ اس رات کو پیرس جانے والی ٹرین میں شب خوابی کے ڈبے خالی نہیں، اس لئے رات بھر کا سفر بیٹھ کر طے کرنا پڑے گا۔ میری رائے تھی کہ ایسی حالت میں ایک شب مارسیلز میں گذار دیں اور صبح کو دن کی گاڑی سے روانہ ہوں۔ یہ بحث ہو رہی تھی کہ ٹامس کک کا نمائندہ پھر آیا اور اس نے اطلاع دی کہ شب خوابی کے ڈبے میں دو بستر مل سکتے ہیں اس لئے کہ وہ کسی راجہ کے لئے محفوظ تھے جنھوں نے آج شب میں اپنا سفر ملتوی کر دیا ہے۔ یہ سنتے ہی سیٹھ صاحب نے کہا کہ فوراً روانہ ہو جانا چاہئے اور اسی وقت اپنے آدمی کو کک کے دفتر میں بھیج کر وہ دونوں بستر اپنے اور اپنے ملازم کے لئے محفوظ کرا لئے، سیٹھ جی کی یہ ادا مجھے بہت ناگوار گذری، خصوصاً اس لئے کہ سیٹھ صاحب نے ڈاکٹر انصاری کی آسائش کا بھی خیال نہ کیا اور محض اپنی اور اپنے نوکر کی آسائش کا انتظام کر کے وفد کی روانگی کا فیصلہ کر دیا۔ بہت ہی غصہ کی حالت میں، میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ ہرگز نہ جائیے، اس وقت ان ہی کو جانے دیجئے۔ یہ وقت تھا جب میں نے انصاری کے کردار کی رفعت کا پتہ پایا، فرمانے لگے: قاضی! اس قسم کی چیزوں کے لئے تیار رہ کر کام کرنا ہے، سیٹھ کو اپنے آرام کا اس قدر خیال ہے تو یہ مت بھولو کہ وہ "سیٹھ" ہیں اور اس سے زیادہ کی کوئی توقع ان سے کرنا ہی نہیں چاہئے، مگر میں اور تم سپاہی ہیں اور سپاہیوں ہی کی طرح ہمیں آرام و آسائش کے معاملات سے قطع نظر کرنی چاہئے۔ میں نے کہا۔ یہ آپ کی توہین ہے۔ کہنے لگے: توہین ایک اضافی اصطلاح ہے۔ سیٹھ بیچارے میری کیا توہین کر سکتے ہیں، میں خود ہی اپنی توہین کروں گا اگر اس ذرا سی بات کو وجہ شکایت بنالوں، خاموش رہو، ابھی تو آغاز کار ہے۔۔۔۔ یہ فطرت تھی

انصاری کی، یہ وسعت تھی اس فطرت کی ! ـــــ اس وسعت میں دوست اور دشمن سب سمیٹ لئے جاتے تھے۔ اس رات کو میں اور انصاری ایک بھرے ہوئے ڈبے میں بیٹھے ہوئے اور جاگتے ہوئے پیرس تک آئے ـــــ میں چائے کی کیتلی کے پانی کی طرح کھول رہا تھا اور وہ مسکرا رہے تھے !!! ـــــ تقریباً پچیس سال کی دوستی میں انصاری کو غصہ آتے میں نے صرف اسی وقت دیکھا جب کوئی شخص ان کے عقائد اور اصولوں پر ناروا حملہ کرتا تھا یا کوئی شخص ان کے مسلک سے غداری کرتا تھا یا ان کا کوئی ساتھی کسی ایسی اخلاقی کمزوری کا ارتکاب کرتا تھا جو "تحریک" کو متاثر کرتی ہو ـــــ ورنہ وہ وسیع میدان ـــــ جو اُن کا دل تھا ـــــ ایک سخی کا دسترخوان تھا کہ :

بران خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

اچھے اور بُرے سب ہی ان کی ہمہ گیر محبّت سے اپنا حصہ پاتے تھے ، حتیٰ کہ سی۔آئی۔ڈی کے خفیہ نویس بھی جن کی حقیقت سے انصاری واقف ہوتے تھے اور جو پھر بھی نیاز مند بن کر ان کے ساتھ رہتے تھے اور ان کی رواداری اور محبّت کے اس خزانے سے اپنا حصّہ پاتے تھے۔ ایک زمانے میں ان کے مطب کا ایک چوکیدار بڑا ہی محنتی اور مخلص ملازم تھا، وہ اسے بہت پسند کرتے تھے اور اکثر اس کو انعام و اکرام سے بھی نوازتے تھے۔ اس نے ایک دفعہ بیمار ہوکر لمبی رخصت لی، عرصہ تک اس کا پتہ نہ چلا ـــــ اس زمانے میں کسی طرح ان کو معلوم ہوگیا کہ وہ سی۔آئی۔ڈی کا آدمی ہے اور اپنے متعلق اس کے ہاتھ کی لکھی رپورٹیں بھی انھوں نے خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیں۔ چند روز بعد ایک دن مطب میں اس کی بیوی روتی ہوئی آئی اور اس نے کہا کہ اس کا شوہر اس قدر سخت بیمار ہے کہ تمام ڈاکٹروں نے جواب دیدیا ہے۔ یہ سن کر وہ فوراً ہی اس کے گھر پہنچے، دیکھا تو وہ لبِ گور تھا اور کم بخت آتشک کے مرض میں سڑ چکا تھا۔ اس کے لئے زندگی کا امکان سوحصے میں سے ایک حصہ بھی نہ تھا مگر ڈاکٹر صاحب نے ہمت کی، اسی وقت اپنا سامان منگوایا،

ڈاکٹر بلوائے اور ایسا کامیاب عمل جراحی کیا کہ چند روز بعد وہ اچھا ہوگیا۔ صحت یاب ہو کر وہ جس دن مطب میں آیا تو میں موجود تھا۔ آتے ہی قدموں میں گر پڑا اور رو رو کر اس نے اپنی غداری کی تمام داستان ڈاکٹر صاحب کو سنائی اور یہ بھی کہا کہ وہ اب اس ملازمت سے استعفیٰ دے چکا ہے۔ وہ بیٹھے ہنستے رہے اور سنتے رہے۔ اس کے بعد اس کی پنشن مقرر کر دی جو وہ عمر بھر پاتا رہا —— یہ وہ ڈاکٹر انصاری تھے جو اس شب میں مارسیلز ایکسپریس کے ایک بھرے ہوئے ڈبے کے ایک گوشے میں رات بھر بیٹھے ہوئے مجھ سے مزے مزے کی باتیں کرتے رہے اور میں اس خیال سے کڑھتا رہا کہ یہ آرام سے سو سکتے تھے اگر سیٹھ صاحب کے نوکر کو بھی شب بھر سفر کرنے کے لیے ایک نرم اور گرم بستر کی ضرورت نہ ہوتی !!

ایک دن میں لندن کے "سوائے ہوٹل" میں ترکی وفد کو لنچ دینے کا انتظام کر رہا تھا، میز کی نشستوں کا تختہ بنایا جا رہا تھا، اتنے میں ڈاکٹر صاحب اور مشیر حسین قدوائی آ گئے۔ قدوائی صاحب نے نشستوں کو اس طرح بدلنا چاہا کہ ڈاکٹر صاحب کی نشست صدر سے دور ہو جاتی تھی۔ مجھے غصہ آ گیا، وہ قدوائی کو ہٹا کر لے گئے، رات کو مجھ سے کہنے لگے: تم کو غصہ کیوں آیا تھا؟ میں نے کہا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کی نشست کو قدوائی کی نشست سے بھی نیچا کر دیا جاتا! کہنے لگے یہ فضول بات ہے تمھاری! نشستوں کی تقدیم و تاخیر سے کیا ہوتا ہے۔ ناحق تم لڑ پڑے قدوائی سے !! آج جو میں قائدین ملت کو جلوس کی ترتیب میں اور جلسوں کے پلیٹ فارموں کی نشستوں میں اگلی صف تلاش کرتے دیکھتا ہوں تو اپنے دل سے کہتا ہوں کہ کہاں گئے وہ انسان جو نشستوں کو تلاش نہ کرتے بلکہ نشستیں ان کو تلاش کرتی تھیں؟ کہاں گئے وہ مردانِ میدان جو بہت قیمت دے کر قوم سے عزت و اعتماد حاصل کرتے تھے؟

برخلاف عہدِ حاضر کے قائدین ملت کے جو یہ سودا مفت خرید لیتے ہیں!!!

صرف باتوں ہی باتوں میں ! میں نے انصاری کو جیل خانے کی کوٹھریوں میں دیکھا اور بڑے بڑے راجوں اور نوابوں کے عشرت کدوں میں بھی ! وہی ایک انصاری تھا جو وہاں بھی تھا اور یہاں بھی ! ۔۔۔ زندگی کی سختیوں اور صعوبتوں میں بھی اور آسانیوں اور آسائشوں میں بھی ! شرم سے میری گردن جھک جاتی ہے جب سوچتا ہوں کہ نہ میں خود آج تک اس شخص کی سوانح نگاری کا فرض انجام دے سکا اور نہ کسی اور کو اس کے عقیدت مندوں میں سے یہ توفیق نیک حاصل ہوئی ۔۔۔ غلاموں کے اس ملک میں ہم اپنے محسنوں کو کس قدر جلد بھول سکتے ہیں ۔

یہ چند سطریں محض خراج عقیدت نہیں ۔ ۔۔۔ وہ خراج تو میں اگر عمر بھر لکھتا رہوں تو ادا نہیں کر سکتا ۔

ہمارا جہاز بمبئی کے ساحل پر آ چکا ہے ۔۔۔۔ جتنا روپیہ پاس تھا یورپ کی سیاحت میں خرچ کر آئے ، اب فکر ہے کہ جہاز کے طعام خانے کا بل کیوں کر ادا کریں ؟ اور بمبئی سے اپنے گھروں تک ریل کا کرایہ کہاں سے آئے ! بہت سے دوست ہمارے استقبال کے لئے ساحل پر جمع ہیں ، ڈاکٹر صاحب ایک دوست کو آواز دیتے ہیں ۔ وہ جہاز پر آتے ہیں ، گلے ملنے کے بعد پہلا سوال یہ ہوتا ہے ، ارے تمھاری جیب میں کچھ دام ہیں ، نہیں ہیں تو منگاؤ گھر سے ! ۔۔۔ اس طرح چند سو روپیہ قرض لے کر ہم ریل کا ٹکٹ خریدتے ہیں اور وطن آتے ہیں ! ۔۔۔ چند سال بعد ان کی زندگی کا جہاز اس نامعلوم ساحل پر پہنچ گیا جو ہم سے اتنا قریب بھی ہے کہ ہم سب کی زندگی کی موجیں ہر لمحہ اس سے ٹکراتی رہتی ہیں اور اتنا دور بھی ہے کہ اس کا پتہ نہیں پاتے ۔

چھ افراد کے اس قافلے میں سے جو آج سے تئیس ۲۳ سال پہلے ہندوستان سے انگلستان گیا تھا اب صرف دو اس دنیا میں باقی ہیں ۔۔۔ ایک

آغا خاں جو نہ پہلے ہندوستان کی دنیا سے تعلق رکھنے تھے ——— سوائے اس کے کہ یہاں ان کے مریدوں کا حلقہ وسیع ہے ——— اور ایک "میں" جو وفد کے اراکین میں سب سے کم عمر تھا اور اس لیے ابھی تک اپنے دوستوں اور پیاروں کی عزا داری کے مراسم انجام دے رہا ہے۔[1]

---

[1] افسوس کہ اس مضمون کی اشاعت کے وقت یہ دونوں بزرگ بھی اس دنیا میں نہیں رہے۔ فاضل مضمون نگار کا ۱۷ جنوری ۱۹۵۶ء کو انتقال ہو گیا اور آغا خاں کا ۱۹۵۸ء میں۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی وفات پر، گاندھی جی نے، اس وقت کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو لکھا کہ:

"بہت کم لوگوں کی موت سے مجھے اتنی بے چینی ہوئی جتنی ڈاکٹر انصاری کی وفات سے۔ میں غلطی سے یہ خیال کر بیٹھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ایک سو سال زندہ رہیں گے، اس لیے جب ان کی وفات کی خبر مجھے ملی تو یقین نہیں آیا۔ وہ ہم میں بہت سے لوگوں کی زندگی کا ایک اہم عنصر بن گئے تھے، لیکن خدا کی قدرت زبردست ہے، وہی دیتا ہے اور وہی واپس لے لیتا ہے، ہم خدا کی مشیت میں کوئی دخل نہیں دے سکتے۔ میں جانتا ہوں کہ ان کی وفات سے جامعہ ملیہ کو کس قدر نقصان پہنچا ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں۔"

(سہ روزہ "مدینہ" بجنور ۲۸ مئی ۱۹۳۶ء صفحہ ۵)

محمود علی خاں جامعی مرحوم

"اپنے آقا کی یاد میں"

ڈاکٹر انصاری کی ہمہ جہت شخصیت

جناب محمود علی خاں جامعی (۱۹۰۰ - ۹ اگست ۱۹۷۳ء) کا اردو کے مشہور ترجمہ نگاروں میں شمار ہوتا ہے، موصوف ڈاکٹر انصاری کی وفات سے سات سال پہلے تک، ان کے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔ یہ مضمون ڈاکٹر انصاری کی وفات کے فوراً بعد، تین قسطوں میں — ۱۷ سے ۲۵ مئی ۱۹۳۶ء تک مسلسل سہ روزہ "مدینہ" (بجنور) میں شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان ہے: "اپنے آقا کی یاد میں۔"

ڈاکٹر انصاری مرحوم کی وفات کے بعد، اب تک جو مضامین شائع ہوئے تھے، ان میں یہ مضمون معلومات کے لحاظ سے سب سے اچھا ہے۔ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے براہ راست اور ذاتی واقفیت کی بنیاد پر لکھا گیا ہے اور شخصیت اور روزمرہ زندگی کی اہم باتیں آگئی ہیں۔ خود فاضل مضمون نگار نے مضمون کے آخر میں لکھا ہے: "اس مضمون میں میں نے یہ خیال ضرور رکھا ہے کہ ان کی زندگی کے وہ نمایاں واقعات جو ہر کوئی لکھ سکتا ہے اور جو عام طور پر سب کو معلوم ہیں، وہ نہ لکھوں بلکہ ان کی زندگی کے ہر پہلو کی خصوصیات پیش کردوں"۔

نہ جانے ہمارے ملک کی کیا بدقسمتی ہے کہ ایک سے ایک چنے ہوئے لیڈر یکے بعد دیگرے اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ لوکمانیہ تلک جیسا زبردست مدبر، سی آر داس جیسا آزاد خیال اور اولوالعزم رہنما، لاجپت رائے جیسا مستقل مزاج پیش رو، حکیم اجمل خاں جیسا سنجیدہ اور باوقار ہادی، مولانا محمد علی جیسا اعلیٰ دماغ اور اعلیٰ تقریر کا دھنی: قائد، پریسیڈنٹ، پٹیل جیسا قابل اور بے خوف صدر اور پنڈت موتی لال نہرو جیسا بے مثل قانون داں سب ایک ایک کرکے اللہ کو پیارے ہوئے۔ اب ڈاکٹر انصاری بھی ان ساتھیوں سے جا ملے اور سارے ملک کو اپنی یاد میں تڑپتا چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر انصاری کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ زیادہ بہتر اور ماہرِ فن ڈاکٹر تھے یا زیادہ محترم اور مخلص لیڈر، یا زیادہ ہر دلعزیز اور شریف انسان اور ان کی اچانک موت سے ان تینوں میں سے کس کو زیادہ نقصان پہنچا ہے؟ وہ پھولوں میں گلاب کا پھول، جواہرات میں ہیرا اور انسانوں میں فرشتہ تھے، یہی وجہ تھی کہ اگر ایک طرف وہ عوام میں ہر دلعزیز تھے، تو دوسری طرف ملک کے والیانِ ریاست اور رؤسا ان کی انتہائی قدر و منزلت کرتے تھے اور تیسری طرف حکومت اور اس کے اعلیٰ سے اعلیٰ افسران ان کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آتے تھے۔

آج دنیا اگر ان کو بھولنے کی کوشش بھی کرے تو یقین کیجئے کہ ایک صدی تک کامیاب نہیں ہوسکتی۔ وہ مریض ان کو یاد کرتے رہیں گے اور کراہ کراہ کر یاد کرتے رہیں گے، جن کے مرض کا نصف حصہ محض ان کی جادو بھری مسکراہٹ سے زائل ہو جاتا تھا، وہ قوم ان کو یاد کرتی رہے گی جس کے آڑے وقت کے وہ شریک تھے، جس کی خاطر انھوں نے دن رات ایک کر دیا، اپنی تندرستی خراب کرلی، قلب کو آزار لگا لیا اور آج اسی آزار کی بدولت اپنی جانِ عزیز بھی موت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دی۔ ہاں وہ عزیز و اقارب اور وہ دوست و احباب ان کو یاد کرتے رہیں گے جن سے وہ بلا استثناء ایک شفیق باپ کی طرح پیش آتے تھے۔ جس وقت کوئی شخص ڈاکٹر انصاری کے پاس کھڑا باتیں کرتا ہوتا تھا، وہ اس

کے شانے پر ہاتھ رکھ کر یا کمر میں ہاتھ ڈال کر محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ شفقت کا ایک دریا امڈتا چلا آ رہا ہے اور مخاطب اس میں بہا جا رہا ہے، کھویا جا رہا ہے۔ اس وقت اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنا سب کچھ ان کے قدموں پر نثار کر دے اور ان کے ارشاد کی تعمیل میں دل و جان حاضر کر دے۔ پھر وہ والیانِ ریاست اور سرکاری افسران ان کو یاد کرتے رہیں گے جن کے وہ علاج معالجے کے علاوہ سینکڑوں بگڑے ہوئے کام بناتے تھے اور اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے کام لیکر یہاں سے لندن تک ان کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے اور سب سے زیادہ ان کو جامعہ والے، اس کے استاد اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے جن کے کھیلوں میں وہ اپنے انتقال سے دس روز پہلے بھی شریک ہوئے اور جن کی نو آبادی[1] کو بسانے سب سے پہلے وہ اوکھلا تشریف لے گئے ہیں اور ایک درخت کے سایے میں جامعہ کی زیر تعمیر عمارت کے سامنے چھوٹے سے ٹیلے پر آرام فرما رہے ہیں، ہمیشہ یاد کرتے رہیں گے۔

ڈاکٹر انصاری بحیثیت ڈاکٹر

ڈاکٹر انصاری ہندوستان کی طبّی دنیا کے پیشوا تھے۔ دس سال تک انگلستان میں رہ کر انھوں نے اعلیٰ سے اعلیٰ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔ ایک عرصے تک لندن کے سب سے بڑے شفاخانے چیرنگ کراس ہاسپٹل کے ہاؤس سرجن رہے، پھر ہندوستان آکر دلی میں پریکٹس شروع کی، ابھی مطب کرتے ہوئے چھ ماہ بھی نہ گذرے تھے کہ طبّی وفد لیکر ترکی گئے اور دو سال[2] تک

---

[1] جامعہ نگر، اس مستقل آبادی کے لیے جگہ کے انتخاب میں خود ڈاکٹر انصاری کا مشورہ بھی شامل تھا۔

[2] دو سال کی مدت صحیح نہیں ہے۔ اس وفد نے زیادہ سے زیادہ ساڑھے چھ ماہ ترکی میں قیام کیا، ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو بمبئی سے وفد روانہ ہوا اور ۴ر جولائی ۱۹۱۳ء کو ہندوستان واپس آیا۔

وہاں قیام کرنے کے بعد واپس ہوئے۔

ڈاکٹر انصاری صبح سے شام تک اوسطاً ۱۳ مریض روزانہ دیکھتے تھے، دو مریضوں کو صبح اور دو کو شام کو ان کے گھر پر جاکر دیکھتے تھے اور فی مریض ایک گھنٹہ صرف کرتے تھے اور دس مریض اپنے مطب میں دیکھتے تھے اور اوسطاً آدھ گھنٹہ فی مریض صرف کرتے تھے اس طرح ۹ گھنٹے مسلسل مصروف رہتے تھے۔ لوگ دور دور سے انھیں دکھانے آتے تھے اور آٹھ آٹھ دن انتظار کیا کرتے تھے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ایک مریض اپنے نمبر کے انتظار میں صبح سے بیٹھا ہے، تکلیف سے بے چین ہے، ہم سب کو اور ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب کو بھی بُرا بھلا کہہ رہا ہے، لیکن جب اس کا نمبر آتا ہے اور معائنے کے کمرے میں جاتا ہے تو ڈاکٹر صاحب اس کا تفصیلی معائنہ کرتے ہیں۔ ہمدردی کے ساتھ اس کا حال پوچھتے ہیں، نسخہ تجویز کرتے ہیں، ضروری ہدایات کرتے ہیں اور اس کے مہمل سے مہمل سوالوں کا ذراسی ناراضگی کا اظہار کئے بغیر برابر جواب دیتے رہتے ہیں۔ اپنی زبان سے کبھی یہ نہیں کہتے کہ اچھا اب جاؤ۔ جب وہ مطمئن ہو کر ہنستا ہوا باہر نکلتا ہے تو اس کا آدھا مرض کافور ہو چکا ہوتا ہے اور اسی وقت سے چہرے پر صحت کے آثار جھلکنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان کی تشخیص، تجویز درست، طریقۂ علاج اتنا مکمل اور ہاتھ میں ایسی شفا تھی کہ ۹۰ فیصدی مریض ان کے یہاں سے شفایاب ہو کر جاتے تھے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب بخار میں مبتلا، زنان خانے میں لیٹے ہوئے تھے۔ مطب بند تھا کہ اتنے میں میرٹھ سے ایک موٹر آئی، جس پر ایک پلنگ بندھا ہوا تھا اور اس پر ایک نوجوان عورت جو سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی اور گویا بالکل لب دم تھی، تمام جسم دھلے کپڑے کی طرح سفید تھا، خون کے قطرے کا نام بھی نہ رہا تھا، بے حس وحرکت لیٹی ہوئی تھی، ساتھ ہی کئی آدمی تھے، ان لوگوں نے اصرار کرنا شروع کیا کہ ڈاکٹر صاحب صرف ایک نظر دور سے کھڑے ہو کر دیکھ لیں، ہمیں یقین ہے کہ یہ اچھی ہو جائے گی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کی علالت کا بہت کچھ عذر کیا، مگر وہ کسی طرح نہ مانے۔ آخر

مجبور ہوکر میں نے اندر جا کر ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا، ڈاکٹر صاحب فوراً باہر تشریف لائے مریضہ کا معائنہ کیا اور نسخہ تجویز کر دیا۔ اس کے ساتھی اسی طرح اسے پلنگ پر ڈال کر موٹر میں واپس لے گئے۔ آپ یقین کیجئے، میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کر رہا ہوں، آٹھویں روز کوٹھی کے سامنے ایک تانگہ آکر رکا، اس میں سے ایک خاوند، بیوی اترے، عورت نہایت ہشاش بشاش، خون سے سرخ سفید ہو رہی تھی، جسم بھی اس کے حسن کے اعتبار سے کافی گداز تھا، دونوں میرے پاس آئے اور تپاک سے ملے، لیکن میں انھیں پہچان نہ سکا۔ بالآخر خاوند نے کہا: آپ نے پہچانا نہیں، یہ وہی عورت ہے جو موٹر پر پلنگ پر لیٹی ہوئی آئی تھی، میں یہ سنکر حیرت میں رہ گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے علاج نہیں کوئی جادو کر دیا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ان کے مریضوں کو غیر معمولی عقیدت تھی۔ وہ صحیح معنوں میں انھیں زندگی بخشنے والا سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب کہیں باہر تشریف لے گئے تھے، دہلی کے ایک ہندو رئیس کا ٹیلیفون آیا کہ میرا لڑکا سخت بیمار ہے، کیا ڈاکٹر صاحب تشریف لاکر اسے دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے معذرت کی اور بتایا کہ ڈاکٹر صاحب یہاں تشریف نہیں رکھتے ہیں۔ اس کے بعد ٹیلیفون پر ایک "ہائے" کرنے کی آواز آئی اور پھر کچھ سنائی نہ دیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ مطب میں تشریف لائے تو میں نے لڑکے کا حال دریافت کیا، انھوں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: "افسوس کہ وہ چل بسا، اگر ڈاکٹر انصاری یہاں موجود ہوتے تو وہ ہرگز نہ مرتا۔"

لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ دوسروں کو زندگی بخشنے والا بھی ایک دن چل بسے گا اور کمبخت موت کا علاج خود اس کے پاس بھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر انصاری کو روپے کا ذرا لالچ نہ تھا، وہ اسے بُری طرح سے ٹھکراتے تھے اور جتنا وہ ٹھکراتے تھے اتنی ہی زیادہ روپے کی ان پر بارش ہوتی تھی۔ بلا مبالغہ چاروں طرف سے ان پر روپیہ برستا تھا، اسی طرح دونوں ہاتھوں سے وہ غریبوں پر، طالب علموں پر، اپنے عزیزوں اور دوستوں پر، قوم اور ملک پر نچھاور کرتے تھے، وہ تقدیر کے سکندر

سکندر تھے، قسمت کے دھنی تھے، لاکھوں روپیہ ماہوار کمایا اور لاکھوں روپیہ ماہوار اٹھایا، لیکن کبھی روپیہ جمع کرنے کا خیال نہ کیا۔ اب سے سات سال پہلے جب مجھے ان کی خدمت کا فخر حاصل تھا اور ان کی بینک کی پاس بک میرے پاس رہتی تھی، مجھے معلوم تھا کہ چند ہزار روپے سے زیادہ کبھی ان کی تحویل نہ ہوتی تھی۔ ایک ایسے شاہانہ مزاج رکھنے والے شخص کے لیے جو ہر روز ہزاروں روپے حاصل کرتا ہو اور ہزاروں خرچ کر دیتا ہو، چند ہزار کی تحویل کیا بڑی چیز ہے۔

ڈاکٹر انصاری جس قدر علاج معالجے میں بے مثل اور لاثانی تھے اسی طرح آپریشن میں بھی اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے اور اس معاملے میں اتنے سبک دست تھے کہ بڑے سے بڑے آپریشن میں چند منٹ سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے معرکہ آرا آپریشن کئے، گویا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ معجزے کر دکھائے، اسی لیے دنیا ہمیشہ ان کے متعلق یہ طے نہ کرسکی کہ وہ اچھے سرجن ہیں یا فرشتہ [؟ فیزلشین]۔ ان میں اپنے معاصرین سے حسد کا مادّہ بھی نہ تھا، دوسرے ڈاکٹروں کی نہ صرف قابلیت کا اعتراف کرتے تھے، بلکہ اکثر اپنے مریض بھی خاص خاص علاج کے لئے ان کے ہاں بھیج دیتے تھے۔ آج دہلی اور اس کے باہر کتنے ہی ڈاکٹر ایسے ہوں گے جو اپنی جگہ پر نام آور اور کامیاب ہیں۔ چوٹی کے معالجوں میں ان کا شمار ہوتا ہے یا مختلف عہدوں پر بڑی بڑی تنخواہیں پا رہے ہیں لیکن وہ سب ان کے خوشہ چیں ہیں۔ ان کے مطب میں انھوں نے زانوئے ادب تہہ کیا ہے اور کتابیں پڑھ لینے کے بعد جدید طریقۂ علاج کی تعلیم ان ہی سے حاصل کی ہے۔

غرضیکہ ڈاکٹر انصاری کے انتقال سے طبی دنیا میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے وہ شاید صدیوں تک پورا نہ ہوسکے، اگر حکیم اجمل خاں صاحب طب یونانی کا کمال اور اس کی شان اپنے ساتھ لے گئے تو آج ڈاکٹر انصاری طب انگریزی سے حیرت انگیز استفادے سے ہمیں محروم کر گئے۔ ہندوستان میں ڈاکٹر بہت ہیں اور ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے لیکن ایسا شفیق ڈاکٹر جس کی صورت دیکھنے سے صحت حاصل ہوتی تھی، اب دنیا

کا ہے کو پیدا کرے گی۔[۳۱]

ڈاکٹر انصاری بحیثیت معالج قوم

ڈاکٹر انصاری صرف افراد کے ڈاکٹر نہیں بلکہ قوم کے بھی معالج تھے، مریض قوم کو ان پر بھروسہ تھا، اعتماد تھا، خلوص ان کا طرۂ امتیاز تھا اور عمل ان کا مسلک تھا۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ صرف ایک چیز رہی اور وہ اتحاد تھا۔ ہندو اور مسلمانوں کا اتحاد، انتہا پسندوں اور اعتدال پسندوں کا اتحاد، کانگریس والوں اور سوشلسٹوں کا اتحاد، کونسلوں کے حامیوں اور کونسلوں کے مخالفوں کا اتحاد' اتحاد ان کی زندگی تھی اور وہ خود اتحاد کا مجسمہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سارا ملک کانگریس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائے اور سب ایک ساتھ قدم ملا کر آزادی کے مندر [؟ کی منزل] کی طرف بڑھیں

۱۹۲۸ء کی آل پارٹیز کانفرنس، ڈاکٹر انصاری اور تنہا ڈاکٹر انصاری کے خیال کا نتیجہ تھی۔ آپ ہی نے اپنے مدراس کانگریس کے خطبۂ صدارت میں اس کی تحریک کی تھی، پھر کانگریس کے کھلے اجلاس میں اس کی حمایت میں تجویز منظور کرائی اور خود اس [؟ اپنی] کوٹھی پر اس کا ابتدائی جلسہ طلب کیا، اس کے بعد رفتہ رفتہ آل پارٹیز کانفرنس نے مختلف مدارج طے کئے۔ پنڈت نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی بنی جس نے نہرو رپورٹ ترتیب دی، پھر کلکتہ کے اجلاس میں یہ کانفرنس مع اپنی رپورٹ کے دفن ہوگئی۔ یہ ڈاکٹر انصاری ہی کا کام تھا کہ انھوں نے مسلم لیگ کے نمایندوں کو اس کانفرنس کی شرکت پر آمادہ کر لیا، لیکن پھر یہ کیونکر ناکام رہی، اس کی داستان میں اپنے اس مضمون میں مفصل لکھ چکا ہوں جو روزانہ "تیج"

---

[۳۱] پہلی قسط، مدینہ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۳۶ء، صفحہ ۴

سے کانگریس جوبلی نمبر میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر انصاری کو اس حادثہ سے جو زبردست صدمہ پہنچا ہے، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ خوب کر سکتے ہیں جن کا لاڈلا پیارا بچہ اس وقت انھیں داغِ مفارقت دے گیا ہو، جبکہ اس کا عین عالمِ شباب ہو اور جب وہ اس سے بڑی بڑی امیدیں باندھنے لگے ہوں۔ میں نے اپنی چند سالہ خدمت کے دوران میں کبھی ڈاکٹر انصاری کی آنکھوں کو نم نہیں دیکھا ان کا ضبط و صبر کبھی اس کی اجازت نہ دیتا تھا لیکن تین مرتبہ ان کی آنکھیں بھی چھلک اٹھیں اور باوجود انتہائی کوشش کے ان کی پلکیں بھی بے اختیارانہ نم ہوگئیں۔ ایک تو اس وقت جبکہ کلکتہ کی آل پارٹیز کانفرنس نے مسلم لیگ کے تمام مطالبات کو ٹھکرا دیا اور ہر شخص کو یقین ہوگیا کہ یہ کانفرنس اور اس کی رپورٹ اب ہمیشہ کے لیے بالکل ختم ہوگئی۔ پھر جب ڈاکٹر انصاری اجلاس سے اپنے کمرے پر واپس آئے تو بہت سے ہندو مسلم لیڈر ان کے ہمراہ تھے، سب اظہار افسوس کر رہے تھے، مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر رائے زنی کر رہے تھے، لیکن ڈاکٹر صاحب بالکل چپ تھے۔ چہرہ ضبط کی وجہ سے تمتما رہا تھا، آنکھیں اشک آلود تھیں اور ایک حرف بھی زبان سے نہ نکل رہا تھا۔

دوسرا موقع جب ڈاکٹر انصاری غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔ وہ تھا جب حکیم اجمل خاں صاحب کی موت کی خبر انھوں نے سنی۔ مدراس کانگریس میں ایک تاریخ ان کے نمائش کے معائنہ کی مقرر تھی۔ وہ تمام دوکانوں کو دیکھ رہے تھے اور ان کی ہمت افزائی کے لیے کچھ نہ کچھ خرید بھی رہے تھے۔ مجھے کسی ضرورت سے قیام گاہ پر جانا پڑا، وہاں دیکھا تو حکیم صاحب کے انتقال کا تار موجود تھا، دیکھ کر دھک سے رہ گیا اور سوچا کہ آیا فوراً ڈاکٹر صاحب کو اطلاع کرنا چاہیئے یا کچھ انتظار کرنا چاہیئے۔ بالآخر میں تار لیکر نمائش میں پہنچا اور ڈاکٹر صاحب کو ایک طرف لے جاکر یہ خبر بد انھیں سنا دی، ڈاکٹر صاحب کی زبان سے آہ بھی نہ نکلی، آنکھیں کھولے

بجھنے تک رہے تھے اور سر سے پیر تک کانپ رہے تھے، تھوڑی دیر کے بعد پھر آنسو جاری ہو گئے۔ جب اس سے ذرا سکون ہوا تو خاموش موٹر کی طرف چل دئے۔ اس کے بعد ہی سب جکٹ کمیٹی کا جلسہ تھا، سیدھے وہاں تشریف لے گئے، سب لوگ جمع تھے، ان کی حالتِ زار دیکھ کر گھبرا اٹھے اور دریافت حال کرنے لگے، لیکن ڈاکٹر صاحب کچھ نہ بتا سکے، میں نے انھیں حقیقت سے مطلع کیا۔

ایک تیسرا موقع بھی مجھے یاد ہے۔ جب ڈاکٹر انصاری اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ جامعہ کو حکیم صاحب کے بعد انھوں نے اپنے خون سے سینچا ہے، اس سے انتہائی محبت تھی۔ جامعہ میں روپیہ کی اتنی قلت رہتی ہے کہ اکثر دو دو چار چار مہینے تک استادوں کو تنخواہیں نہیں ملتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے عزیزوں میں سے ایک لڑکا یہاں پڑھتا تھا۔ ایک دن چھٹی میں وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا اور باتوں باتوں میں اس نے یہ واقعہ بیان کیا کہ میں اپنے ایک استاد کے گھر میں گیا تو دیکھا کہ ان کی بیوی صرف مرچ سے سوکھی روٹی کھا رہی تھیں۔ یہ سننا تھا کہ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے پٹرول کو دیا سلائی دکھا دی، ڈاکٹر صاحب کی آنکھیں نم ہو گئیں، آواز تھرا گئی اور انتہائی جوش کے ساتھ چیخ چیخ کر فرمانے لگے: "میرے بچے بھوکے مر رہے ہیں اور مجھے خبر تک نہیں، تف ہے میرے کھانے اور ناشتے پر، جب تک روپیہ نہ فراہم کر لوں چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔" اسی دن شام کو ڈاکٹر صاحب باہر کے لیے روانہ ہو گئے اور ایک ہفتے کے اندر ہی مسکراتے ہوئے ریل سے اترے، کیونکہ جامعہ کے لیے ۲۵ ہزار روپیہ ان کے پاس تھا۔

بہرحال پہلے واقعہ سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ آل پارٹیز کانفرنس کی ناکامی اور اپنے اتحاد کی کوششوں کی خرابی دیکھ کر ڈاکٹر انصاری کو کتنا صدمہ ہوا، لیکن ہمت والے ان مشکلات اور ناکامیوں سے ہمتیں نہیں ہارا کرتے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ڈاکٹر انصاری اس کے بعد بھی مسلسل اپنے مشن میں لگے رہے اور

ہندوستان میں ہمہ گیر اتحاد پیدا کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب سیاسی معاملات میں خود رائے نہیں تھے، وہ مشورے کی اہمیت کے بہت قائل تھے اور ہمیشہ اسی پر عمل کرتے تھے۔ جہاں کوئی نیا سیاسی معاملہ سامنے آیا فوراً تمام رفقائے کار کو جمع کیا ان سے مشورہ کیا، جو رائے قرار پائی اس سے ان حضرات کو بذریعہ تار یا بذریعہ پیغام بر مطلع کیا جو باہر ہوئے، پھر ان کی رائے معلوم ہو جانے کے بعد، اس کا اعلان کیا۔ کانگریس کی سیاسیات میں وہ عموماً پیش قدمی نہیں کرتے تھے، سپہ سالاری کے مقابلے میں وہ ایک سچے وفادار سپاہی بننا زیادہ پسند کرتے تھے، البتہ یہ کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کا سب سے پہلا اور آخری موقع تھا کہ وہ خود ایک رائے لیکر کھڑے ہوئے اور سارے ملک سے اسے کس طرح منوایا اس کا ثبوت انتخابات کے نتیجے سے ظاہر ہے۔

ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی ان کی قیام گاہ نہیں ایک سیاسی اکھاڑہ تھی، ایک مہمان سرائے تھی۔ جس زمانے میں دہلی میں کوئی جلسہ ہو، پھر ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر جاکر دیکھئے، چپہ چپہ زمین پر لیڈروں اور کانگریسی کارکنوں کے بستر ہوتے، دعوتیں اور چائے کی پارٹیاں ہوتی تھیں اور کچھ سیاسی حضرات پر ہی منحصر نہیں، تمام احباب کے لیے، مریضوں کے لیے، والیان ریاست اور ان کے اسٹاف کے لیے، سرکاری افسروں کے لیے، غیر ملکی سیاحوں کے لیے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی ایک خانۂ بے تکلف تھی، کسی اطلاع کی ضرورت نہ تھی، مراسم کی کوئی پابندیاں نہ تھیں، ہر وقت اور ہر طرح ڈاکٹر صاحب اور ان کی کوٹھی حاضر تھی۔

ڈاکٹر صاحب کے نظام الاوقات پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ آپ صبح ۶ بجے بیدار ہوتے تھے، فوراً باہر برآمد ہوتے اور سیدھے باتھ روم میں تشریف لے جاتے، ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد غسل کر کے کپڑے بدلتے، ایک دن بیچ کر کے شیو کرتے، اس کے بعد مونچھوں کو درست کرتے، مونچھوں کا ڈاکٹر صاحب کو بہت خیال رہتا اور سچ یہ ہے کہ ان کے چہرے پر دو چیزیں ہی ممتاز تھیں، ایک تو ان کی گھنی اور

جڑی ہوئی بھنویں اور دوسری خاص قسم کی مونچھیں۔ اگر کوئی مصور کوئی ملتی جلتی شکل بھی بنا کر اس میں ان دونوں چیزوں کا اضافہ کر دے تو اس میں ڈاکٹر انصاری کی شباہت آجائے گی اور ان کا شک ہونے لگے گا۔ بہرحال اس کے بعد ناشتہ کرتے اور شیروانی جوتہ وغیرہ پہن کر تیار ہو جاتے۔ اس تمام اثنا میں مختلف معاملوں کے متعلق ضروری ہدایات دیتے جاتے۔ تار سنتے۔ ان کے جوابات لکھاتے، مریضوں کے وقت مقرر کرتے، سیاسی مسائل میں مشورہ کرتے، غرضیکہ دو گھنٹے میں تیاری کے علاوہ سینکڑوں کام انجام دیتے، ڈاکٹر انصاری کے مزاج میں بے انتہا سکون تھا۔ جو کام کرتے، آہستہ آہستہ اطمینان سے کرتے۔ آہستہ آہستہ چلتے، ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ بات کرتے، آہستہ آہستہ لکھتے، حتیٰ کہ شیروانی کے بٹن بھی نہایت آہستہ آہستہ لگاتے۔ کچھ تو ان کی اس عادت کی وجہ سے اور کچھ دوسرے ضمنی کاموں کی وجہ سے، صبح کی اس تیاری میں تقریباً پونے دو گھنٹے لگ جاتے۔ عموماً آٹھ بجے صبح وہ مریضوں کو دیکھنے روانہ ہوتے، تقریباً ۱ بجے واپس آتے اور سیدھے مطب میں بیٹھ جاتے۔ درمیان میں ایک بجے کے قریب کھانا کھانے اٹھتے، پھر ۵ بجے تک مطب کرتے۔ پانچ بجے چائے پی کر پھر مریضوں کو دیکھنے روانہ ہو جاتے اور ۸ بجے واپس تشریف لاتے۔ لوگوں سے ملاقات کرتے، مجھے ضروری ہدایات دیتے، خطوط دیکھتے اور ان کے جوابات لکھاتے، پھر پلنگ پر لیٹ کر بارہ ایک بجے رات تک اخبارات پڑھتے، جب کہیں سوتے۔ اس اس درمیان میں جب کوئی جلسہ ہوتا یا سیاسی کام ہوتا تو اس وقت مطب یا علاج معالجے کا کام منسوخ کر دیا جاتا۔ گویا ڈاکٹر انصاری جب کسی سیاسی کام میں شریک ہوتے، کچھ نہ کچھ روپے کے نقصان کے ساتھ شریک ہوتے۔

بہ ظاہر یہ نظام الاوقات نہایت باضابطہ معلوم ہوتا تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ انھیں اس طرح کی مختلف النوع مصروفیتیں رہتی تھیں کہ صبح سے آدھی رات تک وہ مجنونانہ انداز سے کام میں لگے رہتے، گویا انسان نہیں ایک مشین ہے،

آرام ان کے نصیب میں نہ تھا۔سفر کو وہ بسا اوقات غنیمت سمجھتے تھے، خواہ میل دو میل موٹر[کا] سفر ہو یا طویل طویل ریل کا سفر ہو۔ فرماتے تھے کہ بس یہی وقت میرا ہے، باقی دوسروں کا ہے اور اتفاق دیکھیے کہ سفر ہی میں انھوں نے دنیا سے سفر کیا، اپنے ہی وقت میں ہمیشہ کے لیے آرام کی نیند سو گئے۔

خطوں اور تاروں کے معاملے میں انھوں نے مجھے کامل اختیار دے رکھا تھا کہ میں انھیں کھول کر مناسب جواب دیدیا کروں، لیکن اس کے باوجود بہت سے خطوط ایسے ہوتے کہ ان کے مشورے کی ضرورت پڑتی۔ میں اس تاک میں رہتا کہ کسی نہ کسی طرح موقع نکال کر ان سے استصواب رائے کروں، لیکن کئی کئی روز نوبت نہ آتی، اکثر ایسا ہوتا کہ وہ تھکے ماندے مطب سے آرہے ہیں میں نے کوئی ضروری کاغذ سنبھالا کہ بڑھ کر دریافت کرلوں۔ انھوں نے میرے تیور سمجھ لیے اور کترا کر دوسری طرف سے نکل گئے۔ غرضیکہ اس معاملے میں ایک مستقل کشمکش رہتی تھی۔ اکثر وہ مریض کو دیکھنے کے لیے موٹر میں سوار ہوئے۔ میں بھی ساتھ بیٹھ گیا، اگر پوچھا کہاں جارہے ہو تو کسی جگہ کو کہہ دیا۔ جب موٹر چل دی تو آہستہ آہستہ جیب سے خط نکال کر سنانا شروع کیے۔ پھر جب وہ میری یہ ترکیب سمجھ گئے تو جہاں میں موٹر کے قریب آیا فوراً کہتے، بس جائیے؛ ذرا میں راستے میں آنکھ جھپکا لوں گا۔ اس کے بعد اور طرح طرح کی صورتیں میں نکالتا، کبھی کبھی ان کی میز کے آئینے پر خط چپکا دیتا، یہ ان کی خاص عادت تھی کہ جو چیز سامنے آجائے پھر اسے پوری طرح دیکھتے، قطعی رائے دیتے۔

غرضیکہ ۲۴ گھنٹے میں مسلسل ۱۸ گھنٹے وہ اس طرح مصروف رہتے کہ ہم لوگ کہا کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب کو کھانے، سونے اور بیت الخلا جانے کا کبھی اطمینان سے موقع نہیں ملتا، اکثر میں نے دیکھا کہ وہ بیت الخلا جارہے ہیں کہ کوئی نہ کوئی شخص ان کے پیچھے لگا باتیں کرتا جارہا ہے۔ ان کا قدم تیز تر ہوتا جاتا ہے، حتیٰ کہ باتھ روم کے دروازے پر پہنچ کر وہ محبت آمیز جھڑکی کے ساتھ کہتے، ٹھہرو بھئی۔ میں ذرا استنجے کو ہو آؤں۔ اسی طرح کھانا بھی انھیں ہمیشہ دیر سے کھانے کو ملتا اور سوتے بھی

بہت تھوڑی دیر کے لیے تھے، گویا کہ سارا وقت قوم اور ملک کی نذر تھا اور اسی انتہائی مصروفیت کا نتیجہ تھا کہ ان کی صحت نے جواب دیدیا۔

ڈاکٹر صاحب کی سیاسی زندگی کی ابتدا ترکی کے طبی وفد سے ہوئی، اس کے بعد وہ ہوم رول لیگ میں شریک ہوئے اور پھر کانگریس میں۔ ۱۹۱۸ء میں جب دہلی میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس ہوئے تو ڈاکٹر انصاری مسلم لیگ کی استقبالیہ کمیٹی کے اور حکیم اجمل خاں صاحب کانگریس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس حیثیت سے جو خطبۂ استقبالیہ پڑھا وہ بعد میں ضبط ہوگیا، لیکن یہ وہ پہلی چیز تھی جس نے تحریک خلافت کے پہلے تخیل کو پیش کیا، اس کے بعد انھیں کی تجاویز کے مطابق خلافت کمیٹی قائم ہوئی اور تحریک خلافت نے وہ زور پکڑا جو سیاستداں حضرات سے پوشیدہ نہیں ہے۔

اس کے بعد سے صدر ہونے تک ڈاکٹر صاحب برابر کانگریس کے سکریٹری رہے۔ جب سورگیہ سی۔ آر۔ داس اور پنڈت موتی لال نہرو نے کونسلوں میں جانے کا سوال اٹھایا تو ڈاکٹر صاحب اس کے مخالف تھے، سول نافرمانی کی کمیٹی کے ممبر تھے اور اس کی رپورٹ میں بھی اپنے داخلۂ کونسل کے خلاف دستخط کئے تھے۔ لیکن کون جانتا تھا کہ حالات ایسے بدل جائیں گے کہ ڈاکٹر صاحب خود داخلۂ کونسل کا علم لے کر کھڑے ہوں گے اور فتحمندانہ ظفریاب ہو کر رہیں گے۔ غرضیکہ ڈاکٹر صاحب کا وقت، ان کا روپیہ، ان کی تمام ہستی ملک و قوم کے لیے وقف تھی اور اب انھوں نے اپنی جان بھی اس کی نذر کر دی۔ قوم ان کے لیے آج کیا ہمیشہ ہمیشہ ماتم کرے گی، لیڈر تو بہت ملیں گے لیکن ایسا جامع صفات مشکل سے پیدا ہوگا۔[۴]

ڈاکٹر انصاری، مکمل انسان

میرا خیال ہے اور غالباً اسے تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ ہندوستان میں

۴۔ دوسری قسط، "مدینہ" مورخہ ۲۱ مئی ۱۹۳۶ء، صفحات ۴ اور ۶

بہت بڑے بڑے لیڈر گذرے ہیں ۔ بفضلہ اب بھی موجود ہیں اور آئندہ [بھی] ہوتے رہیں گے ۔ اسی طرح ڈاکٹروں کی بھی کمی نہیں ہے اور جیسے جیسے جدید تعلیم کی ترقی ہوتی جائے گی، بہتر سے بہتر ڈاکٹر پیدا ہوں گے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر انصاری کی عظمت کا راز ان کی ڈاکٹری میں نہیں، ان کی لیڈری میں نہیں بلکہ ان کی مکمل ترین انسانیت میں تھا ۔ وہ اگر ڈاکٹر نہ بھی ہوتے، لیڈر نہ بھی ہوتے پھر بھی ان کی ہستی اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ عظیم الشان ہوتی ۔ ان کی انسانیت چمکے بغیر نہ رہ سکتی ۔

ڈاکٹر انصاری بے انتہا خلیق اور بلکہ شفیق تھے، مروت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، ان کا حلقۂ احباب اتنا وسیع تھا کہ دوستوں کی تعداد بلا مبالغہ سینکڑوں نہیں ہزاروں تک پہنچتی ہے اور لطف یہ کہ ان میں سے ہر ایک کو ان کی دوستی اور محبت پر اعتماد بھی تھا اور یہ یقین رکھتا تھا کہ میرے لیے جو میں چاہتا ہوں وہ کرنے کو تیار ہوں گے ۔ پھر ان کا حلقۂ احباب کانگریسیوں ہی تک محدود نہ تھا بلکہ اکثر بڑے بڑے سرکاری افسروں سے بھی انتہائی خلوص و محبت کا سلوک تھا اور عقائد کے اس تضاد کے باوجود جانبین کو ایک دوسرے پر غیر معمولی اعتماد بھی تھا ۔ یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن اس کے باوجود میرا اندازہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے بہترین اور قریب ترین دوست وہ تھے جو ان کے ساتھ ترکی کے طبی وفد میں گئے تھے یا اس سلسلے میں ان کی امداد کی اور کام آئے ۔ اس نظریے میں اگر کوئی استثناء ہوسکتا ہے تو وہ چند منتخب کانگریسی رفقائے کار کا ہے، ورنہ یوں وہ ہر ملنے والے سے ریاکاری سے نہیں بلکہ سچی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے ۔

ڈاکٹر صاحب بے انتہا بذلہ سنج بھی تھے، جس وقت موج میں ہوتے تو ایسے ایسے لطیفے سناتے، ایسی ایسی لطیف اور پُرمذاق باتیں کرتے کہ سننے والوں کے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ۔ ویسے بھی ان کے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک دلآویز مسکراہٹ

کھیلتی رہتی تھی لیکن اس بذلہ سنجی اور شگفتگیِ مزاج کے باوجود ان کے تمام انداز اور رویے سے، رفتار و گفتار سے، نشست و برخاست سے ایک ایسا وقار ٹپکتا تھا کہ ہر شخص خواہ بڑا ہوتا یا چھوٹا ان کا ادب کرنے پر مجبور ہوتا تھا اور کبھی ان کی منشا کے خلاف کوئی حرکت کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

ان کا نصیحت کرنے کا انداز بھی عجیب و غریب تھا۔ زبان سے کچھ نہ کہتے تھے کہ مخاطب کو ہمیشہ کے لیے تادیب ہو جاتی تھی۔ میری عادت ہے کہ عموماً شیروانی کے بٹن نہیں لگاتا، اس سے کچھ جی گھبراتا ہے اور کسا بندھا سا معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں کے آداب کے لحاظ سے یہ قطعی نامناسب تھا، وہ خود جب سونے کے کمرے سے برآمد ہوتے تو ہمیشہ پورا لباس پہنے ہوتے۔ میں نے کبھی انھیں سونے کے کمرے کے باہر بلا شیروانی اور ٹوپی کے نہیں دیکھا اس لیے نظرتاً وہ چاہتے تھے کہ ہر شخص ان کے یہاں سلیقے سے رہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ انھوں نے میری شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے دیکھے، مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھے، میں کچھ نہ سمجھا، خاموش کھڑا رہا، وہ میرے قریب آئے اور اپنے ہاتھ سے میری شیروانی کے بٹن لگا دیئے۔ اس کے بعد میں نے کان پکڑا اور جب تک وہاں رہا، ہمیشہ شیروانی کے بٹن لگائے رہنے کا خیال رکھا۔

ہنسی اور غصے پر ڈاکٹر صاحب کو حیرت انگیز طریقے پر قدرت حاصل تھی۔ اس معاملے میں وہ ماہرینِ نفسیات کے لیے ایک مطالعہ تھے۔ جب چاہتے غصہ کرنے لگتے اور فوراً ہنس دیتے۔ پھر یکایک چہرہ بگڑ جاتا اور دیکھتے دیکھتے پھر مسکرانے لگتے۔ اپنے دروازے کے قریب کھڑے ہیں، چہرے پر غصے کے تمام آثار موجود ہیں، کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آئے تو چہرہ نہایت ہشاش بشاش تھا اور کوئی یہ شک بھی نہ کر سکتا تھا کہ گذشتہ دو چار گھنٹے میں انھیں کبھی غصہ آیا بھی تھا۔

صبر و تحمل اور بُردباری کی ان میں انتہا تھی، زبردست سے زبردست حادثہ

پیش آجاتا، کوئی شخص ان سے سخت سے سخت بات کہہ جاتا، کسی سے کیسی ہی ناروا حرکت سرزد ہوجاتی اور ڈاکٹر صاحب پر ان سب باتوں کا اثر بھی ہوتا، لیکن اس کے باوجود ان کے چہرے سے، اندازِ گفتگو سے، عام رویے سے کسی طرح یہ ظاہر نہ ہوتا کہ انھیں کچھ رنج اور صدمہ پہنچا ہے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ میں، غالب صاحب اور ان کے کئی نوجوان عزیز جمع تھے اور تفریحاً مختلف لوگوں کی چاروں نقل اتار رہے تھے، اتفاق سے ٹھیک اس وقت جبکہ ڈاکٹر صاحب کی نقل اتاری جارہی تھی، ڈاکٹر صاحب اندر سے برآمد ہوگئے، لیکن محض اس خیال سے کہ کہیں ہماری تفریح میں خلل نہ پڑے، وہیں کے وہیں رک گئے، ہم میں سے کسی کی نظر جو اُن پر پڑی تو دیکھا کہ کھڑے مسکرا رہے ہیں، پھر کیا تھا کوئی دبک گیا، کوئی بھاگ کھڑا ہوا اور کوئی اٹینشن کی حالت میں ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور کبھی اشارتاً و کنایتاً بھی اس واقعے کا تذکرہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر صاحب کی شگفتگیِ مزاج کے سلسلے میں مجھے ان کی خدمت کا پہلا دن یاد ہے۔ جس دن ڈاکٹر ذاکر صاحب کی معرفت انھوں نے پہلے پہل طلب کیا، اسی روز ڈاکٹر رحمٰن[^1] دہلی کی سکونت ترک کرکے بھوپال جارہے تھے اور ڈاکٹر صاحب کے یہاں ان کی الوداعی پارٹی کا انتظام درپیش تھا۔ چنانچہ صبح انھوں نے مجھے بلاکر تمام ہدایات دیں۔ میری ناک پر ایک بہت بڑی پھنسی نکلی تھی جس کی وجہ سے سردرد کے مارے پھٹا جارہا تھا، لیکن اس کے باوجود میں نے تمام انتظامات مکمل کرکے انھیں رپورٹ دی، وہ مطب میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یکایک میرا ہاتھ پکڑا اور آپریشن روم میں لے آئے، حکم ہوا کہ آپریشن کی

---

[^1]: ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ماموں زاد بھائی، جن کو بقول محترمہ زہرہ انصاری صاحبہ، ڈاکٹر صاحب نے زخم دھونے، پلاسٹر چڑھانے اور زخم کو خشک کرنے کے لیے خصوصی مشق کرائی تھی۔ "آجکل" انصاری نمبر (جنوری ۱۹۸۱ء) صفحہ ۱۵)

بیڈ پر لیٹ جاؤ۔ بھاگنے کی کوئی صورت نہ تھی، چپ چاپ لیٹ گئے، ڈاکٹر صاحب نے اپنا نشتر سنبھالا اور دو منٹ بعد جیسے میری آنکھیں کھل گئیں۔ یہ معلوم ہوا کہ سن دو من کا بوجھ سر سے ہٹ گیا، غرضیکہ ڈاکٹر صاحب نے ڈریسنگ وغیرہ کرکے پٹی باندھی اور کہا، اچھا اب جاؤ۔ شام کو پارٹی تھی، میں شرم کی وجہ سے سب کے سامنے نہ آنا چاہتا تھا، اس لیے ایک کمرے میں بیٹھا نوکروں سے کام لے رہا تھا کہ یکایک ڈاکٹر صاحب کو مذاق سوجھا، اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا، خاں صاحب کہاں ہیں؟ پھر ڈھونڈتے ہوئے کمرے میں آ پہنچے اور میرا ہاتھ پکڑ کر سب کے سامنے لے گئے اور سب کو مخاطب کرکے اور میری مجروح ناک کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: "ملاحظہ کیجئے، آپ ہمارے نئے پرائیویٹ سکریٹری ہیں"، اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا اور میرا حجاب بھی ٹوٹ گیا۔ باہر نکل کر کام کرنے لگا۔

ڈاکٹر صاحب انتہائی با مروت تھے اور عفو ان کے خمیر میں تھا۔ ان کا مخالف سے مخالف ان کے پاس آتا، لیکن وہ اس سے بڑے اخلاق سے پیش آتے۔ ہم لوگ جانتے تھے کہ یہ وہ شخص ہے جس نے ڈاکٹر صاحب کی فلاں موقع پر سخت مخالفت کی، یا ے کوئی برائی کی اور انھیں کسی طرح نقصان پہنچانے کی کوشش کی، لیکن ہے کہ جس کام کو اس نے کہا ڈاکٹر صاحب نے کبھی انکار نہ کیا۔ ہمیشہ خندہ پیشانی سے اس کے لیے تیار ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے بڑے سے بڑے مخالف ان کے سامنے آکر بے دست و پا ہو جاتے تھے اور ان کی عظمت اور اپنی حرکات کا احساس کرنے لگتے تھے۔ خود میں نے اکثر ڈاکٹر صاحب کے قصور کیے اور مجھے معلوم ہے کہ انھوں نے عفو سے کام لیا اور زیادہ سے زیادہ مجھ پر احسان کیا۔ سچ ہے یہ وہ ہتھیار ہے جس کی کاٹ کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ نواب صاحب رام پور مرحوم کے وزیر ابنّ میاں نواب صاحب بھوپال کو مدعو کرنے کے لیے دہلی آئے، لیکن نواب صاحب بھوپال یہاں موجود نہ تھے، اس لیے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کر گئے کہ جب نواب صاحب بھوپال دہلی تشریف

لائیں تو مجھے اطلاع دیدینا۔ چند روز بعد نواب صاحب بھوپال کا تار ڈاکٹر انصاری کے پاس آیا، کل صبح وہ دہلی پہنچیں گے، چنانچہ ڈاکٹر انصاری صاحب نے مجھے حکم دیا کہ رام پور اطلاع کر دوں۔ رمضان کا زمانہ تھا اور بالکل توڑ کا وقت تھا، میں نے حسب ذیل تار روانہ کر دیا:

H.H. BHOPAL REACHING TOMORROW

دوسرے دن ڈاکٹر صاحب نواب صاحب بھوپال کی قیام گاہ پر گئے ہوئے تھے، اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا کہ ایک ٹیلیفون آیا۔ میں نے رسیور اٹھا کر بات کرنا شروع کی، کوئی صاحب مراد آباد سے بول رہے تھے، انھوں نے فرمایا کہ آپ نے تار دیا تھا کہ نواب صاحب بھوپال یہاں کل آرہے ہیں، لیکن وہ اب تک نہیں پہنچے، نواب صاحب رام پور انتظار فرمارہے ہیں اور ناشتہ بھی نہیں تناول فرمایا ہے۔ میں نے گھبرا کر کہا: "میں نے یہ تار کب دیا، میں نے یہاں ان کے پہنچنے کی اطلاع دی تھی، اس پر وہ صاحب بگڑ کر بولے تو آپ کو یہ لکھنا چاہئے تھا کہ: REACHING DELHI ۔ زمین میرے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ واقعی ذرا سی غلطی نے طوفان برپا کر دیا، وہ صاحب برابر فرمارہے تھے۔ علی الصبح سے اسٹیشن پر استقبال کا انتظام کیا گیا، جب ٹرین سے نہیں آئے تو خیال ہوا موٹر سے آئیں گے۔ لہذا سڑک پر انتظام کیا گیا۔ نواب صاحب رام پور صبح استراحت فرماتے ہیں، ان کو بیدار کیا گیا، انھوں نے یہ خیال فرمایا کہ ڈاکٹر انصاری نے ہماری طرف سے دعوت دیدی ہوگی۔" میں اس سے زیادہ نہ سن سکا، ٹیلیفون میرے ہاتھ سے چھوٹ پڑا اور میں جا کر کرسی پر گر گیا۔ اب کیا کرنا چاہیئے، کیسی بری بات ہوئی، ڈاکٹر صاحب کتنے خفا ہوں گے اور نواب صاحب بھوپال اور رام پور کیا خیال کریں گے۔ بالآخر حواس درست کئے اور موٹر لے کر سیدھا ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا، انھیں ایک ضروری کام کی اطلاع کرا کے باہر بلوایا اور تمام واقعہ سچ سچ [؟ سچ سچ] عرض کر دیا،

لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ڈاکٹر صاحب نے ایک قہقہہ لگایا اور میرا ہاتھ پکڑے ہوئے نواب صاحب بھوپال کے روبرو لے گئے اور ہنس ہنس کر فرمایا: "دیکھئے ہمارے خاں صاحب نے کیا شگوفہ کھلایا ہے۔" پھر سب واقعہ بیان کیا، سب لوگ ہنستے رہے۔ اس کے بعد ایک تار ڈاکٹر صاحب کی طرف سے رام پور معذرت کے طور پر روانہ کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب اس واقعہ کا حوالہ دے کر ہمیشہ مجھے چھیڑا کرتے تھے، لیکن کبھی اس پر رنج کا اظہار نہیں فرمایا۔

آج کل ہندوستان میں ایک جماعت ایسی ہے جو مغربی تہذیب کی رو میں بہی چلی جارہی ہے۔ مغرب کی ہر چیز کو اچھا اور مشرق کی ہر چیز کو بُرا سمجھتی ہے۔ دوسری جماعت ایسی ہے جو اسی شدت کے ساتھ قدامت پرست ہے اور مغرب کی ہر بات کو کفر سمجھتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں تہذیبوں کو ہندوستان کی ضروریات کے مطابق سمو دیا تھا۔ ان کی ذات مشرق و مغرب کی تہذیب کا ایک متوازن نمونہ تھی، اس لیے اس پیچیدہ مسئلے کو طے کرنے کے لیے لوگوں کو ڈاکٹر صاحب کی زندگی سے سبق لینا چاہیئے۔

ڈاکٹر صاحب تعلیم کے زبردست حامی تھے اور طلباء کی بڑی امداد کرتے تھے۔ ہر مہینہ کسی نہ کسی طالب علم کا ان کے پاس خط آتا، جسے وہ جانتے بھی نہ تھے، اس میں کتابوں یا فیس وغیرہ کے لیے روپے کی ضرورت یا اپنی مجبوریاں بیان کی جاتیں، ڈاکٹر صاحب چپکے سے روپیہ نکال کر اسے منی آرڈر کرا دیتے اور کبھی یہ بھی معلوم نہ کرتے کہ یہ کہاں تک سچا ہے۔ مختلف کالجوں اور اسکولوں میں، ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر متعدد ایسے طالب علم تھے جن کا خرچ ڈاکٹر صاحب برداشت کرتے تھے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ تعلیم کے اسی انہماک کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے انصاری ٹرسٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم کر دیا تھا جس میں کافی رقم جمع کر دی تھی اور یہ ہدایت کر دی تھی کہ اس رقم سے میرے خاندان کے تمام بچوں کو تعلیم دلائی جائے۔

ان کے تعلیمی شوق کا ایک اور واقعہ سن لیجئے۔ جب وہ لندن میں خود زیر تعلیم تھے تو نظام حیدر آباد نے ان کا کافی وظیفہ مقرر کر دیا تھا، گھر سے بھی اچھی خاصی رقم ماہوار جاتی تھی، لیکن وہ سب روپیہ ہندوستانی طالب علموں پر صرف کر دیتے تھے اور خود فرماتے تھے کہ میں ہفتوں صرف اُبلے ہوئے آلوؤں پر گزر کیا کرتا تھا۔

اس سلسلے میں ان کی پریکٹس کا ابتدائی زمانہ بھی قابل ذکر ہے اور نوجوانوں کے لیے ہمت افزا ہے۔ اکثر جب وہ اپنے نوجوان عزیزوں کو نصیحت کرتے تھے تو فرمایا کرتے تھے کہ جب میں شروع شروع میں دہلی آیا ہوں تو تھوڑا سا روپیہ میرے پاس جمع تھا جس سے میں نے مسجد فتحپوری پر ایک مطب کا کمرہ کرایے پر لیا، ایک ماہ کا کرایہ ادا کیا اور ضروری سامان اس میں رکھ دیا۔ اسی طرح موری گیٹ میں ایک کوٹھی "بہشت" نامی کرایے پر لی، اس میں ضروری سامان اور ایک ماہ کی جنس خرید کر ڈال دی اور بس۔ اگر میں ہمت اور استقلال سے کام نہ لیتا، محنت نہ کرتا اور خدا میری مدد نہ فرماتا تو دوسرے ماہ کے خرچ کے لیے میرے پاس کچھ باقی نہ رہا تھا۔ اسی طرح تمھیں بھی محنت کرنا چاہیئے اور ہمت سے کام لینا چاہیئے۔ اب ڈاکٹر صاحب کی قوم پرستی کا غیر معمولی جذبہ ملاحظہ ہو کہ وہ ان حالات سے نہ سنبھلنے پائے تھے، ابھی پریکٹس اچھی طرح جمی بھی نہ تھی، صرف چھ ماہ دہلی آئے ہوئے تھے کہ کہ دو ڈھائی سال[۵] کے لیے ترکی کے طبی وفد میں روانہ ہو گئے، لیکن نیت کا دیکھنے والا ضرور انصاف کرتا ہے، اس نے ڈاکٹر انصاری کو مالا مال کر دیا، ایسا کہ سینکڑوں سوکھے ہوئے کھیت اس بحر بیکراں سے سیراب ہوئے اور بیسیوں قومی و ملی اور سماجی تحریکیں صرف ان کے دم سے چلیں۔ ابھی کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کے قیام کے زمانے ہی کا واقعہ ہے کہ یورپ سے واپسی پر آپ کو بمبئی میں مطلع کیا گیا کہ ہزار روپیہ آپ کے نام لکھا گیا ہے، آپ نے فوراً اس کی پہلی قسط وہیں سے ادا کی اور باقی رقم پھر انتظام کر کے بھیج دی۔

---

۵ اس مدت کے بارے میں حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ ہو۔

ڈاکٹر صاحب کو مطالعہ کرنے یا سلسلۂ تحریر کو جاری رکھنے کا بہت کم موقع ملتا تھا، جو کچھ پڑھتے تھے وہ سفر میں۔ اس مرتبہ جب آپ یورپ تشریف لے گئے تو ایک عرصے کے لیے وہاں کچھ اطمینان نصیب ہوا، اس موقع کو آپ نے غنیمت جانا اور ایک مستقل اور وقیع طبی کتاب تصنیف کی، یہ نظریۂ تجدید شباب سے متعلق ہے اور اس کا نام ہے:

REGENERATION IN MAN

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا ایک اور واقعہ دلچسپ ہے۔ جب آپ حیدرآباد میں وزیر تعلیم[۵۷] تھے، اسی زمانے میں مدراس میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ قومی معاملات سے شروع ہی سے دلچسپی تھی، اس لیے آپ بھی مدراس تشریف لے گئے۔ اس کے بعد سے کانگریس سے آپ کی دلچسپی اور شغف برابر بڑھتا رہا، لیکن اتفاق دیکھئے کہ جہاں آپ پہلے پہل کانگریس میں شریک ہوئے تھے، وہیں جاکر پھر کانگریس کے صدر ہوئے، کون جانتا تھا کہ جو نوجوان آج یہاں تماشہ دیکھنے آیا ہے، وہ چند سال بعد اسی قومی پارلیمنٹ کی صدارت کرے گا اور اس کے سر پر یہیں تاج رکھا جائے گا۔

مضمون بہت طویل ہوگیا ہے، اس لیے اب اسے ختم کرتا ہوں، یوں تو اگر چاہوں تو مہینوں ڈاکٹر صاحب کے حالات لکھ سکتا ہوں، لیکن فی الحال اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس مضمون میں میں نے یہ خیال ضرور رکھا ہے کہ ان کی زندگی کے وہ نمایاں واقعات جو ہر کوئی لکھ سکتا ہے، اور جو عام طور پر سب کو معلوم ہیں، وہ نہ لکھوں، بلکہ ان کی زندگی کے ہر پہلو کی خصوصیات پیش کردوں[۵۸]

---

۵۷ اب تک جو معلومات حاصل ہوسکی ہیں، ان کے مطابق وزارت تو درکنار ڈاکٹر صاحب نے حیدرآباد میں کسی عہدے پر کام نہیں کیا ہے۔ اجلاس کانگریس منعقدہ مدراس میں شرکت بھی محتاج تحقیق ہے [illegible] ۔

۵۸ تیسری قسط، مدینہ مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۲۶ء، صفحہ ۴

عبداللطیف اعظمی

ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں

حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم، ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم سے تقریباً ۱۲ سال بڑے تھے۔ حکیم صاحب ۱۷ شوال ۱۲۸۴ھ (مطابق ۱۱ فروری ۱۸۶۸ء) کو پیدا ہوئے اور ڈاکٹر انصاری ۲۵ دسمبر ۱۸۸۰ء کو۔ ڈاکٹر انصاری جب لندن میں میڈیکل تعلیم حاصل کر رہے تھے، اس وقت حکیم صاحب کی شہرت طبی دنیا میں مسلم ہو چکی تھی اور جب ڈاکٹر صاحب نے دلی میں اپنا مطب (کلینک) کھولا تو اس وقت حکیم صاحب کا شمار دلی کے مشہور سیاستدانوں میں ہوتا تھا۔ عمر، تجربے اور شہرت کے اس فرق کے باوجود دونوں ماہرین فن میں خلوص، محبت اور رفاقت کے ایسے گہرے روابط پیدا ہوئے جس کی مثال طبی اور سیاسی دنیا میں مشکل سے ملے گی۔

ڈاکٹر انصاری مرحوم نے حکیم صاحب کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں ایک یادداشت[1] لکھ کر دی تھی جس سے قاضی عبدالغفار مرحوم (۱۸۸۸ء - ۱۷ جنوری ۱۹۵۶ء) نے "حیات اجمل" میں بڑی

---

[1] قیاس ہے کہ یہ یادداشت آخر تک قاضی صاحب کے پاس تھی، مگر اب تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آیا ان کے کاغذات محفوظ ہیں یا نہیں اور اگر محفوظ ہیں تو کس کے پاس ہیں؟ عام خیال یہی ہے کہ یہ یادداشت، جو بڑی اہم تھی، ضائع ہو گئی۔

کثرت سے اقتباسات دیئے ہیں۔ ان اقتباسات اور "حیات اجمل" کی مدد سے ذیل کا مضمون مرتب کیا گیا ہے، جس سے دونوں رہنماؤں کی قومی خدمات پر کسی حد تک اور دونوں دوستوں کے باہمی تعلقات پر بڑی حد تک روشنی پڑتی ہے۔

حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری میں بہت سی خصوصیات مشترک تھیں، دونوں اپنے فن میں یگانہ اور منفرد تھے، دونوں جامعہ کے بانیوں میں سے تھے، دونوں قومی سیاست میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے اور دونوں کے سیاسی خیالات اور عمل میں مکمل یکجہتی اور ہم آہنگی تھی۔ اس لحاظ سے اس مضمون کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا ــــــ

ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم اجمل خاں کی پہلی ملاقات لندن میں ہوئی جب ڈاکٹر صاحب چیرنگ کراس ہسپتال میں ہاؤس سرجن تھے اور حکیم صاحب پہلی مرتبہ مئی ۱۹۱۰ء میں یورپ کے دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ اس ملاقات کی تفصیلات خود ڈاکٹر انصاری مرحوم کی زبانی سنیئے، وہ اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں: "حکیم صاحب سے میری پہلی ملاقات لندن میں جب میں چیرنگ کراس ہسپتال میں ہاؤس سرجن تھا۔ بوساطت ڈاکٹر صاحبزادہ سعید الظفر خاں ہوئی تھی۔ حکیم صاحب بغرض سیر و سیاحت لندن تشریف لے گئے تھے۔ ان کو لندن کے مشہور ہسپتالوں کے معائنے کا شوق تھا۔ چیرنگ کراس ہسپتال کا معائنہ بہت چھان بین اور ہر شعبے کی تحقیقات کے ساتھ میرے ہمراہ کیا۔ سب سے پہلی چیز جو اُن کے متعلق مجھے محسوس ہوئی وہ یہ کہ ان کی نگاہ نہایت نکتہ سنج اور عمیق تھی اور ہر بنیادی اور فروعی چیز پر واقفیت حاصل کئے بغیر نہ رہتے تھے۔ ہسپتال کے ہر شعبے کو انھوں نے اسی طریقے پر ملاحظہ کیا۔ اسٹین لے بائیڈ چیرنگ کراس کے مشہور اور سینیر سرجن تھے اور بادشاہ کے بھی وہ آنریری سرجن تھے۔ تشخیص امراض اور

فن سرجری میں یہ مسلّم استاد سمجھے جاتے تھے، میں ان ہی کا ہاؤس سرجن تھا۔ حکیم صاحب سے ان کی ملاقات میں نے کرائی۔ انھوں نے حکیم صاحب کو ایک روز ہسپتال میں اپنے کلینیکل سرجری کلاس میں، جو کہ ہر دوشنبہ اور پنجشنبہ کو چیرنگ کراس ہسپتال کے کسی ایک وارڈ میں طلبا کو عملی تعلیم دینے کے لیے ہوا کرتے تھے، دعوت دی۔ ایک مریض کے مرض کے متعلق مسٹر بائیڈ طلبا کو سمجھا رہے تھے۔ حکیم صاحب سے بھی انھوں نے مریض کو دیکھنے اور تشخیص کرنے کی خواہش کی۔ بعد معائنہ حکیم صاحب نے یہ تشخیص کی کہ مریض کی آنتوں کے ابتدائی حصے میں کہنہ زخم ہے۔ جس کے باعث درد کی تکلیف، یرقان اور حرارت تھی۔ ڈاکٹر بائیڈ کی رائے میں وہ پتہ کی تھیلی کا ورم تھا۔ انھوں نے حکیم صاحب کو نہایت خلق اور اصرار سے دوسرے روز صبح کو اس مریض کے آپریشن کے وقت بلایا اور ہنس کر کہا کہ یہ طب یونانی اور انگریزی طب کا امتحان ہے۔ آپریشن سے پتہ چل جائے گا کہ کونسی طب صحیح ہے۔ مجھ کو کسی قدر اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری دیسی طب کی بے عزتی ہو جائے۔ آپریشن کے وقت میں کسی قدر تشویش میں تھا، لیکن شکم چاک کرنے پر حکیم صاحب کی تشخیص صحیح نکلی اور ڈاکٹر بائیڈ نے نہایت فیاضی اور کشادہ پیشانی کے ساتھ حکیم صاحب کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دی۔ حکیم صاحب کو اور مجھ کو اپنے گھر پر ڈنر کے لیے اور اس کے بعد ان کے ہمراہ تھیٹر جانے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر بائیڈ کی بیوی لندن کے مشہور زمانہ [؟ زنانہ] ہسپتال کی سینیر سرجن تھیں، ان سے حکیم صاحب کا تعارف کراتے وقت بائیڈ نے کہا کہ ڈاکٹر انصاری کے جن ہم وطن پہلوان نے مجھے سرجیکل کشتی میں شکست دی ہے وہ یہ صاحب ہیں۔ حکیم صاحب پر اور مجھ پر بائیڈ کی اس علم شناسی، قدردانی، اعلیٰ حوصلگی اور خوش خلقی کا بہت اثر ہوا۔“ (صفحہ ۱۰۰)

حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری کی یہ اتفاقیہ ملاقات آیندہ چل کر پرخلوص محبت اور دیرپا رفاقت کا باعث ہوئی۔ قاضی عبد الغفار مرحوم کے الفاظ میں: ”کون جانتا

جانتا تھا کہ یہ سرسری ملاقات آیندہ ایک سچی دوستی اور خالص محبت میں منتقل ہوکر تاریخ ہندوستان کے صفحات پر لکھی جائے گی۔" (صفحہ ۹۷)

ڈاکٹر انصاری تقریباً دس سال یورپ میں تعلیم حاصل کرکے اور مکمل ڈاکٹر بن کر ۱۹۱۰ء میں ہندوستان واپس آئے کوئی دو سال اپنے وطن یوسف پور (یو پی) اور حیدر آباد دکن میں گذارے اور ۱۹۱۲ء میں دہلی میں اپنا مطب کھولا اور پھر ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ حکیم صاحب سے لندن کی ملاقات میں اچھی خاصی بے تکلفی پیدا ہوچکی تھی، اب جب ڈاکٹر انصاری نے دہلی میں اپنا مطب کھول لیا تو اب ملاقات کی ایک مستقل صورت پیدا ہوگئی اور رفتہ رفتہ پرخلوص دوستی اور مستقل رفاقت کی بنیاد پڑگئی۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کو ملکی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا اور حکیم صاحب بھی قومی سیاست سے بالکل الگ تھلگ تھے بلکہ یہ کہنا بیجا نہیں ہوگا کہ بڑی حد تک حکومت کے وفاداروں میں ان کا شمار ہوتا تھا' یہ ضرور ہے کہ دوسرے وفاداروں اور حکومت پرستوں سے مختلف تھے، ان کی شخصیت اور زندگی میں ایک وقار اور انفرادیت تھی۔ ڈاکٹر صاحب اپنی یادداشت میں دلی کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "۱۹۱۰ء میں جبکہ ہندوستان واپس آکر میں نے دلی میں مستقل قیام کیا اور مطب شروع کیا، حکیم صاحب کی اور میری ایک جہتی اور مراسم ارتباط و محبت قائم ہوئے۔ اس زمانے میں حکیم صاحب کی سیاسیات کا رنگ، حریت و آزادی کی طرف بہت زیادہ میلان نہ رکھتا تھا۔ دلی میں ان کے اکثر احباب اور ہم جلیس صاف طور پر حکومت کے دامن سے وابستہ تھے، ان میں سے صرف حکیم صاحب ہی میں خودداری، آزادی اور تمکنت تھی۔" (صفحہ ۱۱۱)

ڈاکٹر صاحب کو مطب شروع کئے ہوئے، بہ مشکل ابھی چھ ماہ گذرے تھے کہ بلقان کی جنگ میں شدت پیدا ہوگئی۔ اس جنگ نے ڈاکٹر صاحب کو ان کے گوشۂ عافیت سے کھینچ کر سیاست کے میدان میں پہنچا دیا۔ ملک و

قوم کی متفقہ خواہش پر ایک طبی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے، ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو بمبئی سے ترکی کے لیے روانہ ہوئے۔ ان کی بے لوث خدمات نے ان کو قوم کا محبوب ترین لیڈر بنا دیا۔ اگلے سال (۱۹۱۳ء) ۴ر جولائی کو واپس آئے تو ملک ایک اور ہلچل سے دوچار تھا، کانپور کی ایک مسجد کا ایک حصہ گرا دیا گیا تھا اور بہت سے مسلمان شہید کردئے گئے تھے۔ اس عرصے میں حکیم صاحب بھی پورے طور پر سیاست میں شریک ہوچکے تھے۔ بقول قاضی عبدالغفار مرحوم: "اب تک تو دہلی میں اجمل خاں اپنے خاندانی مطب اور اپنے فنی کمالات کی وجہ سے اور نیز مدرسہ طبیہ کے بانی ہونے اور اپنی [؟ اپنے] اعلیٰ کردار کی وجہ سے ایک معزز اور با اثر ہستی تھے، لیکن جنگ بلقان کے زمانے میں ان کی اسلامی ہمدردیوں نے ان کے میدان عمل کو پہلے سے زیادہ وسیع کر دیا اور اب دنیا کی نظریں ان پر نہ صرف طبیب حاذق اور رئیس دہلی کی حیثیت سے بلکہ اسلامی تحریک کے ایک بڑے لیڈر کی حیثیت سے بھی پڑنے لگیں۔" (صفحہ ۱۲۳)

چنانچہ جب ڈاکٹر انصاری عالمی شہرت حاصل کرنے اور عظیم الشان خدمت انجام دینے کے بعد تشریف لائے تو حکیم صاحب کو مظلومین کانپور کی خدمت میں مصروف پایا۔ حکیم صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے ساتھ اس اہم کام میں شریک کرلیا۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں: ۱۹۱۳ء میں جب ہم ترکی سے لوٹ کر ہندوستان پہنچے تو ہندوستان کے مسلمان ایک طرف تو دول یورپ اور خصوصاً انگلستان کی اینٹی ترک پالیسی سے ناراض تھے اور اُدھر مسلم یونیورسٹی کے دستور اساسی اور کانپور کی مسجد کا قضیہ بھی چھڑ گیا جس سے مسلمان بہت مشتعل ہوگئے تھے اور تمام ملک میں سخت ایجی ٹیشن ہورہا تھا۔ کانپور کے مقامی افسروں کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے مسلمانوں کے مجمع کو خلاف قانون قرار دیکر وہاں گولی بھی چلادی گئی تھی اور بہت سے مسلمان زخمی ہوگئے تھے۔ ایک فنڈ قائم ہوا جس سے اس مقدمے کی پیروی اور مجروحین کی دیکھ بھال اور ان کی اعانت مقصود تھی۔ اس فنڈ کی فراہمی میں حکیم اجمل خاں صاحب

نے منجملہ اور سربر آوردہ مسلمانوں کے نمایاں حصہ لیا۔ وہ قریب قریب ہر ہفتہ مجھ کو اپنے ہمراہ لیکر دلّی سے کانپور جایا کرتے تھے۔ ایک روز زخمیوں کے دیکھنے میں ہسپتال کے ڈاکٹروں نے کچھ مزاحمت کی اور اسسٹنٹ سول سرجن باوجود ہندوستانی اور مسلمان ہونے کے حکیم صاحب اور مجھ سے سخت کلامی سے پیش آیا۔ میں غصے سے لبریز تھا اور قریب تھا کہ درشتی سے کچھ جواب دوں، لیکن حکیم صاحب نے ہنس کر میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور کہا، گو کہ یہ ہمارے ہندوستانی بھائی اور مسلمان ہیں لیکن گورنمنٹ کے غلام ہونے کی وجہ سے معذور ہیں، ان کی بدسلوکی پر ہمیں خیال نہ کرنا چاہیئے اور جس کام کے لیے ہم آئے ہیں اسے کرنا چاہیئے۔" (صفحہ ۱۲۵)

اسی سال (۱۹۱۳ء) ۳۰ اور ۳۱ دسمبر کو سر ابراہیم رحمت اللہ کی صدارت میں آگرہ میں مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا، جس میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی اور حکیم اجمل خاں اور دوسرے قوم پرور مسلمانوں کے ساتھ ڈاکٹر انصاری نے بھی شرکت کی۔ ایک سیاسی جلسے میں یہ ان کی شاید پہلی شرکت تھی۔ اس کے بعد مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے لیے دستور اساسی تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس کے ایک رکن ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ ۱۹۱۵ء کے اواخر میں مولانا مظہر الحق کی صدارت میں بمبئی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا، اس اجلاس کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ صدر جلسہ نے بڑے سخت الفاظ میں حکومت پر اعتراضات کیئے۔ اس اجلاس میں کانگریس سے گفت وشنید کے لیے جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی اس کے ایک رکن ڈاکٹر انصاری بھی تھے۔ قاضی عبدالغفار مرحوم کے الفاظ میں: "یہ پہلا قدم تھا جو لیگ نے مشترکہ اور متحدہ قومی سیاست کے نصب العین کی طرف اٹھایا۔" (صفحہ ۱۵۲) اسی اقدام کا نتیجہ تھا کہ اگلے سال دسمبر ۱۹۱۶ء میں ہندو مسلم رہنماؤں کے اتفاق رائے سے ایک معاہدہ منظور ہوا جسے میثاق لکھنؤ کہا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کی منظوری میں حکیم صاحب کے علاوہ ڈاکٹر انصاری کا بھی ممتاز حصہ تھا۔

۱۹۱۷ء میں مسز اینی بیسینٹ کی صدارت میں کانگریس کا اجلاس کلکتہ میں منعقد

منعقد ہوا تو اس موقع پر ڈاکٹر انصاری کی مہاتما گاندھی سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی اور حکیم اجمل خاں گاندھی جی اور زیادہ قریب آ گئے۔ ڈاکٹر انصاری لکھتے ہیں: "اس سال آرہ میں ہندو مسلمانوں کے درمیان نہایت سنگین جھگڑا ہوا تھا اور ہندوؤں کے ایک مجمع نے آرہ میں بہت خونریز تباہی مسلمانوں کے اوپر عائد کی تھی۔ مسلمانوں کے دلوں میں اس واقعے کی وجہ سے بیحد تلخی پیدا ہو گئی تھی اور کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی میں ایک رزولیوشن اس جور و تشدد کے خلاف اور مقتولین اور مجروحین سے اظہار ہمدردی کرنے کا کانگریسی اصحاب کی طرف سے پیش کیا جانے والا تھا۔ مسز اینی بسنٹ کے مکان پر حکیم صاحب کے اور میرے ایما سے ایک مختصر میٹنگ مشورے کے لیے بلائی گئی جس میں قریب قریب تمام سربرآوردہ ہندو لیڈر موجود تھے۔ مہاتما گاندھی بھی، جو اس وقت تک ہندوستان میں زیادہ مشہور نہ تھے اور نہ کانگریسی حلقوں میں کچھ زیادہ اثر رکھتے تھے، وہاں موجود تھے اور پہلی مرتبہ اس جلسے میں ان سے ہماری ملاقات ہوئی۔"

"جب آرہ کے مسئلے پر گفتگو ہوئی تو بجز مسٹر مظہر الحق اور مسٹر محمد علی جناح کے جو اُس وقت کانگریس کے سربرآوردہ اصحاب میں سے تھے، ہر شخص نے اس قسم کا ریزولیوشن پیش کرنے کی مخالفت کی لیکن ہندوؤں میں مسٹر گاندھی اور مسٹر سی آر داس نے جو اُس وقت کانگریس کے حلقوں میں زیادہ اثر نہ رکھتے تھے، بہت زور سے اس تجویز کی تائید کی .... حکیم صاحب جب اس صحبت سے لوٹ کر مکان آئے تو مہاتما جی کے متعلق ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا کہ: "یہ شخص نہایت سچا، بلند حوصلہ اور اعلیٰ انسان ہے اور اگر زندہ رہا تو ایک روز کانگریس بلکہ تمام ہندوستان کو ایک بڑے مرتبے تک پہنچائے گا۔" (صفحہ ۱۷۲)

دسمبر ۱۹۱۸ء میں دہلی میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس ہونے والے تھے۔ لیگ کی مجلس استقبالیہ کے صدر ڈاکٹر انصاری تھے اور کانگریس کی مجلس استقبالیہ کے صدر حکیم صاحب۔ قاضی عبدالغفار مرحوم لکھتے ہیں کہ: "ستمبر سے آخر دسمبر تک اُن کا

تمام وقت لیگ و کانگریس کے اجلاسوں کی تیاری کے کام [میں] صرف ہوا، حتیٰ کہ جس کام کو وہ کسی حالت میں ترک نہ کرتے تھے یعنی مطب وہ بھی ترک ہوگیا۔" (صفحہ ۱۸۴) اُس وقت تک ان دونوں مسلم رہنماؤں کا شمار چوٹی کے سیاستدانوں میں ہونے لگا تھا اور ان کی شخصیت ملکی سیاست پر گہرا اثر ڈالنے لگی تھی۔ اس کا اثر تھا کہ ملک کے سیاسی مسائل اور مسلمانوں کے مذہبی مسائل پر ایک ہی پلیٹ فارم پر بحث و گفتگو ہونے لگی۔ بقول قاضی عبدالغفار: "حقیقت مذہب اور سیاست کے امتزاج کا سارا نقشہ حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری کا بنایا ہوا تھا۔ اس نقشے کے ہر خانے میں انگریز کے قدیم اصول "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی شکست لکھی ہوئی تھی۔ اب کانگریس کا رُخ بھی بدلا۔ ایک طرف تو اس کے پلیٹ فارم پر حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری کی وجہ سے مسلمانوں کے مذہبی مسائل نے اہمیت حاصل کی اور دوسری طرف آئینی اصلاحات، سیلف گورنمنٹ، رولٹ کمیٹی، "حقِ انتخاب حکومت" اور ایسے تمام ملکی مسائل کے متعلق اس کے پلیٹ فارم پر مسلمانوں کی آواز بلند ہونے لگی۔" (صفحہ ۱۹۰)

۱۹۲۲ء کے بالکل شروع میں پورے ملک میں سول نافرمانی کی تحریک زوروں پر تھی، حکیم صاحب، ڈاکٹر انصاری اور سوامی شردھانند کی کوششوں سے ۲۵ ہزار والنیٹر عدم تشدد کا حلف لیکر سول نافرمانی کے لیے بھرتی ہو چکے تھے اور پچاس پچاس سو سو کی تعداد میں اپنی گرفتاریاں دے رہے تھے، دوسری طرف عدم ادائیگی ٹیکس کی تحریک کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور گاندھی جی وائسرائے کو اس کی اطلاع کر چکے تھے کہ یکایک چورا چوری کے واقعہ کی خبر ملی اور گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک بند کر دی۔ حکیم صاحب اس وقت کانگریس کے صدر اور ڈاکٹر انصاری جنرل سکریٹری تھے۔ ان دونوں کو اس فیصلے سے بڑی تکلیف پہنچی، ان لوگوں کو خاص طور پر بڑی مایوسی ہوئی جو اس تحریک کی کامیابی پر پورا الیقین رکھتے تھے۔ دہلی کے لوگ سب سے زیادہ ناخوش تھے، کیونکہ انھوں نے پرنس آف ویلز کے بائیکاٹ کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ چند مہینوں کے بعد جون میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا لکھنؤ میں ایک جلسہ منعقد ہوا

جس میں "پنڈت موتی لال نہرو اور وٹھل بھائی پٹیل کی تحریک پر یہ تجویز منظور ہوئی کہ سول نافرمانی کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی تمام ملک کا دورہ کرے اور معلوم کرے کہ ہندوستان اب سول نافرمانی یا کسی اور پروگرام کے لیے تیار ہے یا نہیں۔ اس کمیٹی کے صدر حکیم صاحب اور سکریٹری ڈاکٹر انصاری مقرر ہوئے۔" (صفحہ ۲۷۰)

طب یونانی اور طب مغربی کی ان بن اور باہمی چشمک بہت مشہور ہے، مگر حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری کے گہرے روابط اور خوشگوار تعلقات کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ فروری ۱۹۲۳ء کے اواخر میں دہلی میں طبی کانفرنس منعقد ہوئی تو حکیم صاحب کی تحریک اور تجویز پر ڈاکٹر انصاری اس کے صدر منتخب کیے گئے۔ قاضی عبدالغفار مرحوم کے الفاظ میں: "حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری کی پبلک اور پرائیوٹ اور فنی زندگی کے دھارے ایک دوسرے سے اس قدر قریب بہتے رہے کہ حکیم صاحب جس انداز میں ڈاکٹر انصاری کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کیا کرتے تھے، اسی طرح ڈاکٹر انصاری حکیم صاحب کے ساتھ اپنی محبت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔" (صفحہ ۲۸۵)

دونوں بزرگوں کی باہمی محبت اور مخلصانہ تعلقات کی بہترین مثال یہ ہے کہ ۱۹۲۵ء میں جب حکیم صاحب اپنی صحت کی خاطر، تیسری اور آخری مرتبہ یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے تو ڈاکٹر انصاری نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں: "یہ تیسرا سفر دماغ و اعصاب کو، جن کی حالت برسوں کی متواتر تکان کی وجہ سے واقعی طور پر قابلِ رحم ہو گئی تھی، آرام و سکون پہنچانے اور اس وجہ سے جو صدمہ عام صحت کو پہنچ گیا تھا، اسے دور کرنے کی غرض سے ناگزیر طور پر اختیار کیا گیا۔ میرے محترم بھائی ڈاکٹر صاحب نے ایک روز مجھ سے کہا کہ اگر تم آرام لینے کے خیال سے سفر کرنا چاہتے ہو تو میں تمھارا ہم سفر رہوں گا۔ ان کی اس برادرانہ محبت اور ہمدردی نے مجھے اس سفر پہ آمادہ کر دیا۔" (صفحہ ۳۳۳)

حکیم صاحب کی وفات ہوئی (۲۸ اور ۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کی درمیانی شب میں)

تو ڈاکٹر صاحب کانگریس کے سالانہ اجلاس کے سلسلے میں مدراس میں تھے، جب انھیں اس حادثے کی اطلاع ہوئی اور اس کا ان پر جو اثر ہوا، اس کی ایک جھلک ان کے سابق سکریٹری محمود علی خاں مرحوم کے مضمون میں ملے گی جو اس خصوصی نمبر میں شامل ہے۔ محمود علی خاں صاحب نے رام پور کے جس تار کا صفحہ ۲۷ پر ذکر کیا ہے وہ حسب ذیل ہے جو چیف سکریٹری ریاست رام پور کی طرف سے دیا گیا تھا اور کانگریس کیمپ (مدراس) میں ۲۹ر دسمبر کو صبح کے پونے بارہ بجے موصول ہوا تھا:

"دلی صدمے کے ساتھ آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ حکیم اجمل خاں صاحب کا آج علی الصباح حرکت قلب بند ہو جانے سے یکایک انتقال ہو گیا۔ نعش بذریعہ موٹر دلی بھیجی جا رہی ہے۔ ہندوستان کے اس محسن اور بے نظیر رہنما کی وفات سے تمام ملک کا نا قابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ خدا ان کو جوار رحمت میں جگہ دے"۔

(ہمدرد، ۲ر جنوری ۱۹۲۸ء صفحہ ۷)

شام کو تقریباً ۴ بجے ڈاکٹر صاحب نے ایسوسی ایٹڈ پریس کے نمایندے کو حسب ذیل بیان دیا:

"میں اس وقت جبکہ کانگریس کی کامیابی پر میں توقعات اور خوشی سے لبریز ہو کر مدراس سے روانہ ہونے کو تھا، مجھے حکیم اجمل خاں صاحب کی وفات کے حادثہ جانکاہ کی خبر موصول ہوئی، اس دردناک قومی مصیبت اور نا قابل تلافی ذاتی نقصان کے صدمے سے میرا دل پاش پاش ہو گیا ہے۔ ہندوستان کا ایک جلیل ترین فرزند دنیا سے اٹھ گیا، وہ ذات اب نہیں رہی جس کا عزم راسخ مذبذب یلوں کو ڈھارس بندھانے والا تھا اور جس کی دانشمندانہ صلاح و مشورے غیر ذمہ دارانہ جوش و خروش کی بیتابی کو قابو میں رکھتے تھے۔ ..." (حوالۂ سابق)

ڈاکٹر صاحب اسی سال کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تھے اور حکیم صاحب کے انتقال کے بعد جامعہ ملیہ کے امیر جامعہ منتخب ہوئے، حکیم صاحب نے قومی تعلیم اور ملکی سیاست کی خدمت میں جو شاندار روایات چھوڑی تھیں، انھیں ڈاکٹر انصاری نے اپنی زندگی میں زندہ و پایندہ رکھا۔

عظیم الشان صدیقی

ڈاکٹر مختار احمد انصاری
— عابد صاحب کی نظر میں

ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے ڈاکٹر سید عابد حسین (عابد صاحب) کا ذہنی رشتہ بچپن ہی سے قائم ہوگیا تھا، آخر میں دونوں نے اپنے اپنے طریقے سے ملک وملت کی خدمت کی جو راہ اختیار کی وہ بنیادی طور پر ایک ہی تھی۔ ایک موقع پر عابد صاحب نے لکھا تھا:

> "میں بچپن سے سنا کرتا تھا کہ دلی میں ایک بہت بڑے ڈاکٹر رہتے ہیں۔ جن کے علاج کی سارے ہندوستان میں دھوم ہے۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ان کو پہلی بار علی گڑھ میں [دیکھا] اور اس کے بعد کئی سال تک ان کا ذکر سیاسی لیڈر کی حیثیت سنتا رہا۔"

لندن کے تربیت یافتہ ڈاکٹر کی حیثیت سے شہرت اور سیاسی قائد کی حیثیت سے ان کا مرتبہ ڈاکٹر انصاری کی شخصیت کے ایسے پہلو تھے جس نے انھیں نئی نسل کی نظروں میں محبوب بنا دیا تھا۔ تحریک آزادی اور تعلیمی عدم تعاون سے متعلق تحریک کا نتیجہ تھا جس نے کچھ دنوں کے لیے علی گڑھ کو ہندوستانی سیاست کا مرکز بنا دیا تھا۔ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی حیثیت سے ایک نئے تعلیمی ادارے کو ظہور میں لانے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ ان سارے مبارک ہنگاموں میں حکیم اجمل خاں اور دوسرے قومی رہنماؤں کے ساتھ ڈاکٹر انصاری کو کو بھی نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ ان تمام واقعات میں عابد صاحب اپنے حالات کے جبر کے

کے باعث اگرچہ دور کے تماشائی رہے تھے لیکن انھوں نے اس حد تک اثرات ضرور قبول کیے تھے کہ علی گڑھ کو چھوڑ کر الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا اور جب وہاں بھی حالات ناساز گار پائے تو پھر علی گڑھ کی طرف مراجعت کرنے کے لیے مجبور ہو گئے لیکن اس مرتبہ وہ زیادہ دنوں تک یہاں ٹھہر نہیں سکے بلکہ ڈاکٹر انصاری کی طرح انھیں بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے ریاست کی امداد پر یورپ کے لیے رختِ سفر باندھنا پڑا، جس نے انھیں ڈاکٹر انصاری سے نظریاتی ہم آہنگی اور تعاون کے ایسے مواقع فراہم کر دیے جس میں ماضی کی تلافی کے ساتھ مستقبل کے امکانات بھی پوشیدہ تھے۔ ہندوستان کے نشاۃ ثانیہ اور تحریک آزادی کا ایک دلچسپ اور نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے بیشتر قائدین وہ لوگ تھے جنھوں نے تکمیل علم کے منازل اگرچہ انگلستان اور یورپ میں طے کیے تھے لیکن علمی اور سائنسی انداز فکر و نظر کے ساتھ ذلت و غلامی کا شدید احساس اور حب الوطنی نیز قومیت کے گہرے جذبات لے کر ہندوستان لوٹے تھے۔ عابد صاحب کو ان جذبات اور خیالات کے اظہار کا موقع ڈاکٹر انصاری ہی کی وساطت سے حاصل ہوا تھا۔ علی گڑھ کے بعد جس کے ابتدائی رشتوں کی استواری میں وی آنا (آسٹریا) کو اہمیت حاصل ہے۔ یہ وہ زمانہ جبکہ ذاکر صاحب، عابد صاحب اور پروفیسر محمد مجیب صاحب وغیرہ برلن میں زیر تعلیم تھے اور حکیم اجمل خاں نے بسلسلۂ علاج ڈاکٹر انصاری کی معیت میں یورپ کا سفر اختیار کیا تھا اور پیرس سے چند دن کے لیے وی آنا بھی پہنچے تھے۔ یہاں ہی جولائی ۱۹۲۵ء میں عابد صاحب اور ان کے دیگر ساتھیوں نے مذکورہ اصحاب سے نہ صرف ملاقات کی تھی بلکہ ان کے ساتھ چند دن قیام بھی کیا تھا۔ اس موقع پر یہ بھی طے پایا تھا کہ یہ تینوں ساتھی اپنے وطن واپس پہنچنے کے بعد جامعہ ملیہ کی خدمت کریں گے۔ اس چند دن کی پہلی ملاقات میں عابد صاحب نے ڈاکٹر انصاری کی شخصیت اور کردار سے جو گہرے اثرات قبول کیے تھے اس کا اظہار انھوں نے حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"۱۹۲۵ء کا ذکر ہے ہم چند ہندوستانی نوجوان برلن یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے اور ہم نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ جب اپنے دلیس کو لوٹ کر جائیں گے

توحکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کی رہنمائی میں جامعہ ملیہ کی خدمت کریں گے۔ جب ہمیں معلوم ہوا کہ یہ دونوں بزرگ یورپ آئے ہوئے ہیں اور ویئنا پہنچنے والے ہیں تو جی چاہا کہ چل کر ان سے ملیں۔ ان کی تعریف بچپن سے سنتے آئے تھے۔ اور انھیں پلیٹ فارم پر دیکھ چکے تھے لیکن پاس سے دیکھنے اور ساتھ رہنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بڑے آدمی دور سے بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ قریب جاکر دیکھو تو بالکل بونے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر یہ دونوں ہمیں پاس سے اور بھی بڑے معلوم ہوئے۔ یوں تو ان کی قابلیت کا بھی ہم پر اچھا خاصا اثر پڑا۔ لیکن جن چیزوں نے ہمارے دلوں پر بہت گہرا اثر ڈالا وہ حکیم صاحب کی خودداری اور متانت اور ڈاکٹر صاحب کی خوش مزاجی، زندہ دلی اور محبت تھی۔ ڈاکٹر صاحب ان دنوں پچاس کے لگ بھگ تھے۔ حکیم صاحب کو جو اُن سے عمر میں چند سال بڑے تھے بوڑھا اور اپنے آپ کو جوان کہتے تھے۔ سچ مچ وہ ہم لوگوں میں اس طرح گھل مل گئے۔ جیسے ہماری ہی عمر کے ہوں۔ ہمارے ساتھ بے تکلف ہنستے بولتے، جی کھول کر قہقہے لگاتے۔ حکیم صاحب کی طرف اشارہ کرکے کہتے لو بھئی بڑے میاں کو تو آرام کرنے دو۔ آؤ ہم سیر سپاٹے کو چلیں۔"

(ان کی زندگی کے دلچسپ پہلو۔ ڈاکٹر انصاری۔ غیر مطبوعہ)

اس ملاقات کے وقت ڈاکٹر انصاری کی عمر پینتالیس سال تھی لیکن سیاسی جدوجہد میں غیر معمولی مصروفیات کے باعث وہ اپنی عمر سے کچھ زیادہ ہی بڑے نظر آتے تھے، جس کا اندازہ وی آنا کی اس یادگار تصویر سے بھی لگایا جاسکتا ہے جو آج کل جون ۱۹۸۰ء کے عابد نمبر اور ڈاکٹر انصاری نمبر جنوری ۱۹۸۱ء میں شائع ہو چکی ہے جس کے وسط میں حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری نیز حکیم صاحب کے بائیں جانب پروفیسر

محمد مجیب اور ڈاکٹر انصاری کے دائیں جانب عابد صاحب کھڑے ہیں ۔ اس تصویر کی ایک اہم خصوصیت مجیب صاحب کا کسی قدر بڑھا ہوا دایاں پیر اور عابد صاحب کا زیادہ بڑھا ہوا بایاں پیر ہے جس سے ان نوجوان طبیعتوں کی اس شدت پسندی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو آسانی سے کسی نقش کو قبول نہیں کرتا ہے لیکن وہی آنا کی اس ملاقات نے ڈاکٹر انصاری کی لیاقت ، شخصیت ، خوش مزاجی ، زندہ دلی اور ظاہر و باطن کی یکسانیت کے جو نقش عابد صاحب کے دل و دماغ پر ثبت کیے تھے وہ وقت گزرنے کے ساتھ دھندلے پڑنے کے بجائے اس طرح گہرے ہوتے گئے کہ یہ خوبیاں خود عابد صاحب کی شخصیت اور کردار کا جز بن گئیں ۔

عابد صاحب ، مجیب صاحب اور ذاکر صاحب ۱۹۲۶ء کے اوائل میں ایک ساتھ برلن سے ہندوستان واپس آئے تھے اور اسی سال فروری میں یہ تینوں حضرات ایک ساتھ ہی جامعہ کی برادری میں شریک ہوئے ۔ جامعہ میں عابد صاحب کو مسجل (رجسٹرار) رسالہ جامعہ کی ادارت، کالج میں فلسفہ اور اسکول میں درجہ پنجم کے طلبا کو اردو پڑھانے کی ذمہ داریاں سپرد کی گئی تھیں ۔ ڈاکٹر انصاری اس زمانے میں جامعہ کے منتظم تھے لیکن حکیم اجمل خاں کے انتقال ۱۹۲۷ء کے بعد مجلس امناء کے صدر اور ۱۹۲۸ء میں امیر جامعہ بن گئے تو عابد صاحب کو ایک نئے انداز سے ڈاکٹر انصاری کو دیکھنے کا موقع ملا جس کو مزید تقویت جامعہ کی مجلس تعلیم ملّی کے قیام سے حاصل ہوئی جس کے صدر بھی ڈاکٹر انصاری ہی تھے ۔ اگرچہ جامعہ سے متعلق اُمور کو انجام دینے کی زیادہ تر ذمہ داری اس مجلس کے دیگر اراکین کے سپرد تھی لیکن یہ تمام کام ڈاکٹر انصاری کی رہنمائی ہی میں طے ہوتے تھے جس نے ڈاکٹر انصاری اور جامعہ کے کارکنان و طلبا کے درمیان ایسے ربط و اتحاد کو فروغ دیا تھا کہ یہ سب ایک ہی خاندان معلوم ہوتا تھا ۔ عابد صاحب کو بھی ان تعلقات کی شدت اور گہرائی کا پوری طرح احساس تھا ۔ عابد صاحب کی درج ذیل تحریر سے نہ صرف ان تعلقات کے بارے میں روشنی ملتی ہے بلکہ یہ سلوک ان کی نظر میں ڈاکٹر انصاری کی عظمت کی ایک دلیل بھی تھا :

"دلّی آنے کے بعد ہم لوگوں کا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میل جول بہت

بڑھ گیا تھا۔ جامعہ ملیہ کے استادوں سے وہ بھائیوں کا سا اور لڑکوں سے اپنے بچوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ جب کوئی زیادہ بیمار ہوتا تو سب کام چھوڑ کر اسے دیکھنے کو آتے اور علاج سے پہلے اس خوش مزاجی اور محبت سے اس کا آدھا مرض کھو دیتے۔ ایک بار کا قصہ سنئے۔ ایک ماسٹر صاحب کے دو جڑواں بچے تھے۔ جن کی صورت ہوبہو ایک دوسرے سے ملتی تھی۔ قد بھی برابر تھا۔ اور کپڑے بھی ایک سے پہنتے تھے۔ اور تو اور ماں باپ بھی ان میں مشکل سے فرق کر سکتے تھے۔ ان میں سے ایک بچہ بہت بیمار ہوگیا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کو خبر ہوئی تو اسی وقت پہنچ گئے۔ ماسٹر صاحب بچارے جنم کے بدحواس تھے۔ اور اس وقت تو بچے کی بیماری سے ان کے حواس بالکل جاتے رہے تھے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب ہنستا ہوا چہرہ لئے ہوئے آئے اور آتے ہی ماسٹر صاحب سے کہا "واہ بھئی ذرا سے بخار میں گھبرا گئے۔ ذرا اپنی صورت تو دیکھو تم خود بیمار معلوم ہوتے ہو۔ پہلے تمھارا علاج کروں یا بچے کا۔ اچھا چلو ذرا اسے دیکھ لوں۔" ماسٹر صاحب نے کہا تشریف رکھئے میں اُسے لے آتا ہوں۔ آپ اندر گئے اور تھوڑی دیر میں ایک بچے کو گود میں لئے ہوئے برآمد ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے تعجب سے پوچھا۔ "بیمار بچہ یہی ہے"۔ ماسٹر صاحب نے روتی ہوئی آواز میں کہا۔ جی ہاں ڈاکٹر صاحب! آٹھ روز سے بخار دم بھر کو بھی نہیں اُترا۔ ڈاکٹر صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ "اُسے تو بخار نام کو بھی نہیں ہے۔" ماسٹر صاحب چونکے اور لاحول پڑھتے ہوئے بچے کو اٹھا کر بھاگے۔ معلوم ہوا کہ دھوکے میں جڑواں بھائیوں میں سے دوسرے کو لے کر

آگئے تھے جو تندرست تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر فرمایا۔
"دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ بچے سے پہلے ان حضرت کا علاج کرنے کی
ضرورت ہے۔" (ان کی زندگی کے دلچسپ پہلو۔ ڈاکٹر انصاری غیر مطبوعہ)

اس زمانے میں جامعہ قرول باغ میں تھی اور ڈاکٹر انصاری فتح پوری کے علاقہ میں مطب کرتے تھے۔ جہاں سے جامعہ کچھ زیادہ دور نہیں تھی اس لیے ڈاکٹر انصاری اور اہل جامعہ دونوں ہی کو یہ مواقع حاصل تھے کہ ایک دوسرے کو قریب سے دیکھ سکیں۔ عابد صاحب کو بھی یہ سہولت حاصل تھی کہ اس زمانے میں جبکہ ہندوستان میں طب جدید کو فروغ حاصل نہ ہوا تھا اور چند ڈاکٹروں کو مطب چلانے اور مریضوں کے توہمات و تعصبات کو رفع کر کے اعتماد حاصل کرنے میں صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑتا تھا، وہ ڈاکٹر انصاری کی دشواریوں، طرز مطب اور عام مریضوں کے ساتھ ان کے سلوک کا مشاہدہ کر سکیں۔ عابد صاحب کا درج ذیل بیان ایسے ہی مشاہدات پر مبنی ہے جو نہ صرف ڈاکٹر انصاری کی پیشہ ورانہ زندگی کے ایک اہم پہلو کو سامنے لاتا ہے بلکہ اس عہد کی سماجی زندگی کی ایک جھلک بھی پیش کرتا ہے:

"ڈاکٹر صاحب کے مطب میں کبھی ایک اور کبھی دو نوجوان ڈاکٹر اسسٹنٹ کے طور پر کام کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا تعلق ان سے افسر ماتحت کا سا نہیں، استاد شاگرد بلکہ باپ بیٹے کا سا تھا۔ ہر طرح ان کی مدد کرتے اور ہمت بڑھاتے۔ ایک بار اُن میں سے ایک نے شکایت کی کہ ڈاکٹر صاحب جو مریض آتے ہیں، ان میں سے اکثر فیس نہیں دیتے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا فیس کیسی۔ ان کا یہ احسان کیا کم ہے کہ اپنی جان جوکھم میں ڈال کر تمہارے تختۂ مشق بنتے ہیں۔ پھر سنجیدگی سے سمجھایا کہ بھئی نئے ڈاکٹر کو فیس کی فکر نہیں کرنی چاہیے، تمھیں مفت علاج کا موقع ملے تو اسے بھی غنیمت سمجھو۔ پھر اپنا ذکر کرنے لگے کہ میں نے

جب نیا نیا مطب شروع کیا تھا تو مطب میں فیس دینے کا کیا ذکر
ہے، لوگ گھر پر بھی بلاتے تو سو کھا ٹال دیتے اور مجھے فیس کا
نام لیتے ہوئے شرم آتی تھی اور بعض کو میں نے پینے کو دوا اور لگانے
کو مرہم بتایا۔ اس نے کہا۔ خیر دوا تو میں آپ کی لے لوں گا۔ مرہم نہیں
لگاؤں گا۔ میرے محلے میں ایک بڑے ماہر جرّاح رہتے ہیں ان سے پوچھوں
گا اگر انھوں نے پاس کر دیا تو لگا لوں گا۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ جو شخص لندن
کے چیرنگ کراس ہاسپٹل میں ہاؤس سرجن رہ چکا ہو اس پر یہ سن کر کیا
گزری ہوگی کہ مرہم کے معاملے میں جرّاح کی رائے کو اس کی رائے پر
ترجیح دی جاتی ہے۔ مگر میں نے اپنے جذبات کو ظاہر نہیں ہونے
دیا اور اس شخص سے یہی کہا۔ اچھا بھئی تم ہر طرح اپنا اطمینان کر لو۔
اس کے بعد میرا علاج کرنا۔" (ان کی زندگی کے دلچسپ پہلو۔ غیر مطبوعہ)

اپنی تجویز اور تشخیص کے مقابلے میں مریض کے اطمینان اور اعتماد کو صرف وہی ڈاکٹر یا حکیم ترجیح دے سکتا ہے جسے اپنے فن اور ذات پر پوری طرح اعتماد ہوتا ہے۔ پیشہ ورانہ ضرورت کے علاوہ حکیم اجمل خاں کی طرح ڈاکٹر انصاری بھی در اصل ان مشرقی روایات کے حامل نظر آتے ہیں جہاں علم اور مہارت حصول زر کے بجائے خدمتِ خلق کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ عابد صاحب کو ڈاکٹر انصاری کی شخصیت بھی ایسی ہی اقدار کی حامل نظر آتی ہے جہاں انفرادی نفع و نقصان اجتماعی مفادات کے مقابلے میں ہیچ قرار پاتا ہے اور شخصی نیز پیشہ ورانہ زندگی کے تقاضے حسن اخلاق، استقلال و استقامت اور خوش مزاجی ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے طرزِ فکر و عمل کو اختیار کرنے کی صورت میں مالی دشواریوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے، ڈاکٹر انصاری کو بھی اس کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن یہ ان کی وضع داری کے منافی تھا کہ انھوں نے ایک مرتبہ جس طریقۂ کار کا انتخاب کیا تھا اسے بغیر کسی خاص دشواری کے بدل سکیں۔ خدمتِ خلق کے سلسلے میں اس کا دائرہ جس قدر وسیع تھا اس کا اندازہ عابد صاحب کے درج ذیل بیان سے لگایا جا سکتا ہے جس سے عابد صاحب کی نظر میں ڈاکٹر انصاری کی شخصیت

کے نمایاں پہلو اور اثر پذیری کی بھی توثیق ہوتی ہے۔

"فیس کے معاملے میں کچھ ابتدا ہی موقوف نہیں ڈاکٹر صاحب سیر چشمی اور مروت کی وجہ سے ہمیشہ گھاٹے میں رہے چونکہ وہ ہر مریض کو بڑی توجہ سے دیکھتے اور اس کی دلجوئی کے لیے اس سے خوب گھل مل کر باتیں کرتے۔ اس لیے دن میں مشکل سے دس بارہ مریضوں کو دیکھ پاتے تھے مگر دس بارہ میں بھی مشکل سے آدھے فیس دیتے۔ کانگریس میں کام کرنے والے، جامعہ ملیہ کے استاد اور بچے، دوسرے قومی اداروں کے کارکن، ڈاکٹر صاحب کے کنبے برادری کے لوگ، دوست، ملاقاتی اور غریب لوگ جو کسی کی سفارش لے کر پہنچ جائیں سب کو ڈاکٹر صاحب بے فیس کے دیکھتے تھے۔ سچ پوچھئے تو جو کچھ فیس ملتی تھی وہ غالب صاحب کی وجہ سے۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب تو کسی سے ایک پیسہ بھی نہ لے سکتے۔ غالب صاحب ڈاکٹر صاحب کے عزیز اور اسپتال کے منیجر تھے۔ بڑے بھاری بھرکم۔ رعب دار چہرہ۔ کڑک دار آواز۔ ان کا ایک بار کہنا کہ فیس عنایت کیجئے۔ بلکہ گھور کر دیکھ لینا کافی تھا۔ لوگ چپکے سے فیس کے روپے رکھ دیتے تھے۔ لیکن اکثر ڈاکٹر صاحب کے حکم سے یہ روپے واپس کرنے پڑتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ ایک صاحب نے ریل میں دو دیہاتیوں کو باتیں کرتے ہوئے سنا۔ ایک دوسرے سے یہ کہہ رہا تھا کہ میں بہت دن سے بیمار تھا۔ اب دلی میں ڈاکٹر انصاری کو دکھا کر آ رہا ہوں۔ دوسرا گنوار تھا۔ اس نے پوچھا۔ ڈاکٹر انصاری کون ہیں۔ پہلے نے جواب دیا۔ ارے وہی جو ڈاکٹر غالب کے اسپتال میں نوکر ہیں۔ بیچارے نے دیکھا تھا کہ پہلے مریض غالب صاحب کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ وہ جس سے چاہتے ہیں فیس کا روپیہ لیتے ہیں۔ جسے چاہتے ہیں معاف

کر دیتے ہیں پھر ان کے حکم سے مریض ڈاکٹر انصاری کے پاس بھیجا جاتا ہے۔
اس کے علاوہ غالب صاحب کے کڑے تیوروں کو مریض افسری کی اور
ڈاکٹر صاحب کی نرمی اور اخلاق کو ماتحتی کی نشانی سمجھتا تھا۔"
(ان کی زندگی کے دلچسپ پہلو۔ غیر مطبوعہ)

مذکورہ اقتباس نہ صرف عابد صاحب کی قوت مشاہدہ اور اپنے ممدوح کے بارے میں گہری واقفیت کا ثبوت پیش کرتا ہے بلکہ یہ ڈاکٹر انصاری کی شخصیت کے ایسے پہلوؤں کو بھی سامنے لاتا ہے جس میں اپنے پیشہ سے غیر معمولی لگاؤ بھی شامل ہے۔ ہر پیشہ اپنے ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی لاتا ہے اور ہر ماہر فن کو سماج اور ہم پیشہ افراد میں ایک جگہ بھی خود بنانی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر انصاری کی ابتدا ہی سے پیشہ کی نزاکت، دشواریوں اور ذمہ داریوں کا احساس تھا۔ عوام و خواص میں ان کی مقبولیت اور شہرت کا صرف یہی سبب نہیں تھا کہ وہ مریضوں کو نہایت توجہ سے دیکھتے تھے ان کے ساتھ اخلاق سے پیش آتے تھے، روپیہ پیسہ کے معاملے میں حریص نہیں تھے بلکہ ان کی غیر معمولی کامیابی کے اسباب میں فن طبابت کے مختلف پہلوؤں اور رموز سے گہری واقفیت اور فروغ سے متعلق مساعی کو بھی دخل تھا۔ شخصیت اور فن کی تکمیل میں عابد صاحب کا درج ذیل اقتباس ایسی اہمیت کا حامل ہے:

"ڈاکٹر انصاری نے عام طور پر شمالی ہند کے لوگوں اور خاص طور پر اہل دہلی کی جدید سائنٹیفک طب اور جراحی سے مانوس کرنے میں بھی بڑی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ جن دنوں انھوں نے دہلی میں اپنا مطب شروع کیا۔ لوگ ڈاکٹروں کے علاج سے بھڑکتے تھے۔ اور آپریشن کے تو نام سے ڈرتے تھے۔ مدتوں تک ہمارے ڈاکٹر صاحب کو حکیموں کی طرح بغیر کسی فیس کے علاج کرنا پڑا۔ اس پر بھی مریض جب تک کسی بڑے حکیم سے صلاح نہ لے لیتے۔ ان کی دوا نہ کرتے اور جب تک اپنے محلّے کے جرّاح سے نہ پوچھ لیتے ان سے آپریشن نہ کراتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب عالی ظرفی سے یہ سبکی برداشت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اپنے کمالِ فن اور اس سے بھی زیادہ اپنے حسنِ اخلاق، خوش مزاجی، ہمدردی اور دلسوزی

سے انھوں نے دلوں کو مسخر کرلیا اور ان لوگوں کو جو حکیم صاحب کو نبض اور قارورہ دکھا کر نسخہ لکھا لیا کرتے تھے اس کا عادی بنایا کہ طرح طرح کے معائنوں کی زحمت اور مصارف برداشت کر کے اور معقول فیس دے کر ان سے علاج یا آپریشن کرائیں ۔ پھر تو یہ حال ہو گیا کہ ڈاکٹر انصاری کا نام شفا کا تعویذ سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ ان کو دکھانے کے لیے امیدواروں کا ایک سلسلہ بندھا رہتا تھا۔ اور سوا ان مریضوں کے جن کا مرض بہت شدید ہو ہر شخص کی باری کئی کئی روز کے انتظار کے بعد آتی تھی ۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ریڈیالوجی اور پیتھالوجی کے معائنوں کے نجی ادارے دہلی میں ڈاکٹر انصاری کی تحریک اور ہمت افزائی سے قائم ہوئے اور ایک مدت تک انھیں کی سرپرستی میں چلتے رہے ۔" (ڈاکٹر انصاری ۔ غیر مطبوعہ)

ڈاکٹر انصاری صرف کامیاب ڈاکٹر، مخلص سماجی کارکن اور جدید تعلیم کے مؤید ہی نہیں تھے بلکہ سیاسی مدبّر اور اچھے منتظم بھی تھے ۔ عام طور پر ناکام وکیل یا ناکام ڈاکٹر اور حکیم اپنے پیشوں کے تقاضوں سے مجبور ہو کر سیاست کی طرف مراجعت کرتے ہیں، ڈاکٹر انصاری کو ان کے پیشہ کی کامیابی نے ملک و قوم کی خدمت کے لیے آمادہ کیا تھا اور بقول عابد صاحب :

"انھوں نے جب انڈین نیشنل کانگریس کے جھنڈے کے نیچے جنگ آزادی میں حصہ لینا شروع کیا، اس وقت وہ طب جدید کے میدان میں اپنا جھنڈا گاڑ چکے تھے اور ان کی شہرت فزیشن اور سرجن کی حیثیت سے نہ صرف سارے ہندوستان میں اس سرے سے اُس سرے تک پھیل چکی تھی بلکہ باہر کے ملکوں میں بھی پہنچ گئی تھی خصوصًا اس وقت سے جب جنگ طرابلس کے دوران میں ترکی مجروحین کی دیکھ بھال کے لئے ہندوستان سے طبی وفد ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں بھیجا گیا تھا ۔ اسلامی ملکوں میں ان کا نام بہت مشہور ہو گیا تھا اور بڑی محبت اور عزت کے ساتھ لیا جاتا تھا ۔" (ڈاکٹر انصاری ـــــ غیر مطبوعہ)

لیکن ڈاکٹر انصاری نے سیاست میں اس شہرت اور محبت کا کبھی کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، بلکہ بے لوث خدمت کا وہ جذبہ جس سے مجبور ہو کر انھوں نے سیاسی جدوجہد میں شرکت کی

تھی، تحریکِ آزادی کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے اور مختلف فرقوں اور جماعتوں کے مابین مشترکہ لائحہ عمل تلاش کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوا۔ ڈاکٹر انصاری کی شخصیت اور سیاست میں ان کی اہمیت کا یہ پہلو بھی عابد صاحب کی نظر سے پوشیدہ نہیں تھا۔ جس کا ذکر انھوں نے اپنے مضمون میں نہایت دلسوزی کے ساتھ کیا ہے :

"وہ مدتوں تک کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے اور ایک مرتبہ صدر کانگریس کے منصب پر فائز ہوئے۔ نہرو کمیٹی کی رپورٹ جس میں پہلی بار برطانوی دولت مشترکہ کے ایک ڈومینین کی حیثیت سے ہندوستان کے نظام حکومت کا ایک خاکہ مرتب ہوا تھا۔ انھیں کی صدارت میں ایک مسلم لیگ کو چھوڑکر اور سب سیاسی پارٹیوں کے اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ جب سول نافرمانی کی تحریک ۱۹۳۰ء میں شروع ہوئی اور قومی آزادی کے ہزاروں لاکھوں پرستار گرفتار ہوکر قیدِ فرنگ کی کڑیاں جھیلنے لگے تو ڈاکٹر انصاری بھی جو ان دنوں اپنے منجھلے بھائی کی تیمارداری کر رہے تھے۔ جیل جانے کے لئے تیار ہوگئے۔ لیکن جنگ آزادی کے سپہ سالار مہاتما گاندھی نے حکم دیا کہ تمھارے لئے بیمار بھائی کی خدمت مقدم ہے تم جیل جانے کا خیال چھوڑ دو۔ اس حکم کی تعمیل ڈاکٹر انصاری کے لیے آسان نہ تھی۔ اس زمانے میں جیل یاترا کرنا ہر قومی کارکن کا فرض سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر انصاری کو برابر طنز آمیز خطوط موصول ہو رہے تھے۔ بلکہ ایک ستم ظریف نے تو انھیں چوڑیوں کا ایک پارسل بھیج دیا تھا۔ مگر ایک وفادار سپاہی کی طرح ڈاکٹر انصاری نے سپہ سالار کے حکم کی تعمیل کی اور گھر کے محاذ پر اپنی ڈیوٹی انجام دیتے رہے۔ تین سال بعد جب حکومت برطانیہ سے صلح کی گفتگو دو گول میز کانفرنسوں کے باوجود ناکام رہی اور سول نافرمانی کی لڑائی ازسرِ نو چھڑ گئی تو ڈاکٹر انصاری نے اس میں بڑی ہمت اور ذوق و شوق سے حصہ لیا یہاں تک کہ انھیں جیل یاترا کا تمغائے امتیاز حاصل ہوگیا۔" (ڈاکٹر انصاری ـــــ غیر مطبوعہ)

ڈاکٹر انصاری کے لیے سیاست میں شرکت اپنی تمام تر مقبولیت اور تعلقات کے باوجود پھولوں کا تاج نہیں تھی۔ ان کے والد عبدالرحمٰن نے اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی خدمت انجام دی تھی اور بلیا میں صدر امین رہے تھے، لیکن ڈاکٹر انصاری نے تحریک آزادی میں حصّہ لے کر نہ صرف ماضی کا کفارہ ادا کر دیا بلکہ انھیں مالی اور ذہنی الجھنوں کی شکل میں اس کا تاوان بھی دینا پڑا۔ لیکن ان تمام تر دشواریوں کے باوجود ڈاکٹر انصاری کی شخصیت و کردار اور وضع داری میں کمزوری نہیں آئی جو ان کی شخصیت کے کھرے پن کی دلیل ہے۔ اس سیاسی قید و بند اور اس کے اثرات کے پس منظر میں ڈاکٹر انصاری کے بارے میں کسی علینی شاہد اور مبصر کا بیان مشکل ہی سے ملتا ہے البتہ عابد حسن منٹو کو یہ شرف ضرور حاصل تھا کہ وہ اس صورت حال اور اس کے دور رس نتائج اور رد عمل سے پردہ اٹھا سکیں۔ درج ذیل اقتباس ایسی ہی اہمیت کا حامل ہے:

"ڈاکٹر انصاری کے لئے قید فرنگ میں رہنے کے معنی صرف یہی نہیں تھے کہ انھیں کچھ دن تک اسیری کی سختیاں اٹھانی پڑیں۔ بلکہ زبردست مالی قربانی بھی جس کی بدولت انھیں اپنی بقیہ عمر میں اس امیرانہ زندگی کے مقابلے میں، جو اب تک بسر کرتے چلے آئے تھے خاصی تنگ دستی کی زندگی بسر کرنی پڑی۔ ان کی میعاد قید کے دوران حکومت نے انکم ٹیکس کے مطالبے کے سلسلہ میں ان کی موٹر کار تک ضبط کر لی اور ان کے گھر والوں کی بسر اوقات قرض پر ہوتی رہی۔ رہائی کے بعد ان کا مطب پھر جم گیا۔ بلکہ مریضوں کا ہجوم اور زیادہ ہو گیا مگر اس سے ان کی آمدنی میں اضافہ ہونے کے بجائے اور الٹا خرچ بڑھ گیا۔ اس لئے کہ عام مریضوں میں سے اکثر سے وہ خصوصاً قومی کارکنان سے فیس نہیں لیتے تھے بلکہ بعض اوقات انھیں دوا اور غذا کے لئے مالی امداد بھی دیا کرتے تھے۔ ان کی آمدنی زیادہ تر والیان ریاست سے تھی۔ جن سے وہ بھرپور فیس لیتے تھے۔ مگر ان کے جیل جانے کے بعد وہ رئیس جو اداروں کے مقابلے میں برطانوی حکومت کے

زیادہ وفادار تھے یا اس کے عتاب سے زیادہ ڈرتے تھے ان سے پہلو بچانے لگے ۔ صرف رام پور اور بھوپال کی دو ریاستوں سے ان کا تعلق باقی رہا جن سے انھیں اتنا مل جاتا تھا کہ اگر صرف اپنا خرچ چلانا ہوتا تو بہت کافی تھا۔ لیکن ڈاکٹر انصاری جیسے دریا دل کے لئے جن کا دستِ کرم قومی اداروں، دوستوں، عزیزوں بلکہ غیروں تک کے لئے ہر وقت کھُلا رہتا تھا اور جس کا وسیع دسترخوان ہر قسم کے مہمانوں کے لئے دن رات بچھا رہتا تھا یہ آمدنی قطعی ناکافی تھی۔ چنانچہ اپنی عمر کے آخری چند سال انھیں شدید مالی پریشانیوں میں گزارنے پڑے ۔"

(ڈاکٹر انصاری ــــ غیر مطبوعہ)

شخصیت و کردار کے یہی وہ پہلو بھی تھے جس نے ڈاکٹر انصاری کو نہ صرف عابد صاحب کی نظر میں بلکہ عوام و خواص کی نظر میں اس طرح محترم بنا دیا تھا کہ تاریخ کے صفحات بھی ان کے نام سے مزین نظر آتے ہیں۔ "ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں" بھی عابد صاحب نے ڈاکٹر انصاری کا ذکر نہایت احترام سے کیا ہے جس سے نہ صرف ڈاکٹر انصاری کے بلکہ عابد صاحب کے بھی سلجھے ہوئے منطقی ذہن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ مثال کے طور پر مذکورہ تصنیف میں صفحہ ۱۲۰ پر عابد صاحب نے ڈاکٹر انصاری کو مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ قوم پرور مسلمانوں کے گروہ میں شامل کیا ہے اور ڈاکٹر انصاری کو ان چند قائدین میں شمار کیا ہے جن کے خیالات مذہب اور علم کے بارے میں ترقی پسندانہ تھے اور جو جدید و قدیم کی آمیزش سے ایک نئے اور صحت مند راستے کے متلاشی تھے ۔ چنانچہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے عابد صاحب لکھتے ہیں :

"اُسی طرح مسلمانوں کی تعلیم کو جو قدیم اور جدید، دینی اور دنیوی تعلیم کے متوازی خطوط پر چل رہی تھی ایک مشترک راستے پر ڈالنے اور اس کے اندر آزادی کی روح پھونکنے میں انھوں

نے (مولانا محمود حسن) نے مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر
انصاری اور دوسرے لیڈروں کی دست گیری کی۔"

(ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں، ص ۱۲۲)

وسیع تر سیاسی پس منظر میں ڈاکٹر انصاری کے بارے میں عابد صاحب کے خیالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ وہ ڈاکٹر انصاری کو متحدہ قومیت اور خالص سیکولر قوم پروری کا علم بردار تصور کرتے ہیں جو اس زمانے میں خال خال ہی نظر آتے تھے۔ اس کی تصدیق ان کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے:

"خالص سیکولر قوم پروری کا رجحان اس دور میں مسلمانوں اور
سچ پوچھئے تو ہندوؤں میں بھی بہت کم نظر آتا ہے۔ تاہم متعدد
مسلمان رہنما مثلاً مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر
انصاری، حکیم اجمل خاں متحدہ قومیت اور آزادی کے ان
مقاصد کے جن کی علمبردار نیشنل کانگریس تھی، دل و جان سے
حامی تھے۔"

(ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں، ص ۱۲۴)

عابد صاحب نے اپنے دو مختصر سے مضامین اور ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں ڈاکٹر انصاری کا جس طرح جائزہ لیا ہے اس سے ان دونوں کے مابین روابط اور ڈاکٹر انصاری کی شخصیت و کردار کے بنیادی خدوخال کافی حد تک نمایاں ہو جاتے ہیں۔

نوٹ: عابد صاحب کے ان دو غیر مطبوعہ مضامین کے لیے میں ڈاکٹر صغرا مہدی کا شکر گزار ہوں۔

شہاب الدین انصاری

ڈاکٹر انصاری کی کتاب

"ریجنریشن اِن مین"

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قومی اور ملی خدمات پر اکثر ارباب فکر نے روشنی ڈالی ہے وہ ایک خدا ترس انسان اور عظیم سیاسی رہنما ہونے کے ساتھ ہی ایک باکمال سرجن بھی تھے۔ ان کے ہم عصر ان کی مسیحائی کے بہت سے قصے بیان کرتے ہیں، لیکن ان کی اس مسیحائی کا راز کیا تھا اس پر بہت کم لوگوں نے غور کیا ہے۔ یہ راز ان کی خداداد ذہانت کے ساتھ ساتھ اپنے پیشے سے سچی لگن، اور ان کے اندر سائنسی جستجو، علمی دیانت داری اور سان کے تحقیق کے جذبے میں مضمر تھا۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ان کی زندگی کے اس پہلو پر اب تک بہت کم توجہ کی گئی ہے۔

ڈاکٹر انصاری نے اپنے سیاسی کاموں اور پیشے کی بے پناہ مصروفیت کے باوجود خود کو طبی تحقیق کی عالمی پیش رفت سے غافل نہیں رکھا۔ اپنی دلچسپی کے علمی موضوعات کے مطالعے کے ساتھ ساتھ انھوں نے انسان کی عام صحت کے بارے میں مغربی دنیا میں طب اور سرجری سے متعلق ہونے والے تجربات کے نتائج کی روشنی میں خود بھی تجربات کئے۔ ان کی زندگی کے اس پہلو کی جھلک ہمیں ان کی انگریزی تصنیف "REGENERATION IN MAN" میں ملتی ہے۔ یہ کتاب جسم انسانی پر بڑھاپے کے اثرات کی کی رفتار میں تاخیر پیدا کرنے سے متعلق ڈاکٹر انصاری کے طبی تجربات کا خلاصہ ہے۔ کتاب پر ویانا کے مشہور جرمن سرجن ڈاکٹر رابرٹ لاشٹنسٹرن کا پیش لفظ ہے۔ اپنے پیش لفظ میں ڈاکٹر انصاری کی اس علمی کوشش کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر لاشٹنسٹرن رقم طراز ہیں:

"انسانی جسم میں رونما ہونے والے انحطاطی عمل کے دوران مختلف تبدیلیوں پر

ؕ۱ یہ کتاب ڈی، بی تاراپوروالا، بمبئی نے ۱۹۳۵ء میں شائع کی۔

سیکڑوں تجربات سے حاصل یہ نتائج نہایت اطمینان بخش ہیں۔خاص طور پر ان کے تجربات کی قطعیت، طبی مشاہدہ کی باریک نظری اور فکر کی گہرائی سے حاصل نتائج سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ان کی یہ تصنیف اس موضوع کا مطالعہ کرنے والے ہر شخص کے لیے بیش قیمت اور مفید معلومات بہم پہنچائے گی۔"

کتاب کے شروع میں اپنے تجربات کی ابتدا کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر انصاری لکھتے ہیں کہ انھوں نے اس موضوع پر اپنی تحقیق کا کام ۱۹۱۵ سے شروع کیا اور اپنے تجربات کے نتائج دہلی میڈیکل اسوسی ایشن کے دو مختلف اجلاسوں میں پیش کیے۔ اپنے خیالات کو کتابی شکل دینے کا محرک ان کی دیانا میں مشہور سرجن ڈاکٹر یوجین اسٹائی ناخ سے ملاقات تھی۔ ڈاکٹر اسٹائی ناخ نے انھیں بتایا کہ دنیا کے تمام ملکوں کے ڈاکٹروں نے بڑھاپے کے عمل میں تاخیر پیدا کرنے والے سرجری کے اپنے تجربات پیش کیے ہیں لیکن ہندوستان کا نام اس فہرست میں نہیں ہے۔ اس کتاب کی طباعت میں تعاون کے لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر انصاری نے لکھا ہے کہ پروفیسر محمد مجیب نے مسودہ کو نہایت دیدہ ریزی اور احتیاط کے ساتھ درست کیا ہے۔

کتاب بارہ ابواب میں تقسیم ہے پہلے باب میں بڑھاپے کے مرض سے بچنے کی قدیم زمانے کی کوششوں کا تاریخی جائزہ ہے۔قدیم ہندو فلسفہ میں راج یوگ جسمانی قوت میں اضافہ کرنے کے علاوہ قوت فکر پر قابو کے ذریعہ انسان کی اس کے اندر کی مخفی قوت کو بروئے کار لانے میں معاون ہوتا تھا اسی طرح بدھ فلسفہ کے اندر زندہ رہنے کی قوت ارادی ہی تخلیق کی بنیادی وجہ تھی۔ڈاکٹر انصاری نے اس موضوع پر قدیم مصری اور عبرانی خیالات و عقائد کا بھی جائزہ لیا ہے۔

کتاب کے دوسرے باب میں زندگی اور جسم کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے یورپ اور امریکہ میں کئے گئے تجربات اور ان کے نتائج کا تفصیلی جائزہ ہے۔ اپنے مطالعہ کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر انصاری کہتے ہیں: "زندہ جسم میں خلیات کو فرسودہ کرنے والے عناصر بیرونی ہوتے ہیں۔یہ عناصر خلیوں کے بجائے پلازمہ میں ہوتے ہیں۔جب غذا کے جزو بدن ہونے کے عمل میں سستی آجاتی ہے اور ایسے مادے جمع ہونے لگتے ہیں جنھیں خلیے حیات نو کے عمل میں اس طرح استعمال نہیں کر پاتے جیسے کہ نوزائیدہ خلیے کرتے ہیں تو خلیوں میں بڑھاپے کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں۔"

تیسرا باب یورپ میں بڑھاپے کے عمل کو رد کرنے کے لئے یورپ میں جانوروں پر کئے گئے تجربات پر تبصرہ ہے۔ اس باب کے مطالعہ سے ہمیں ان کی اپنے پیشہ میں ہونے والی مغربی ممالک کی پیش رفت سے مکمل واقفیت اور اُن کے وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اس باب کو جان ہنٹر کے ۱۷۷۰ء میں کتوں پر کئے گئے تجربے سے شروع کرتے ہیں اور جرمن ڈاکٹر برتھولڈ، کلاڈ برنارڈ اور فرانسیسی سائنسداں چارلس براون سیکوارڈ وغیرہ کے تجربات بیان کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آخرالذکر فرانسیسی سائنسداں کے تجربات نے اب لوگوں کو اس بات پر متفق کر دیا ہے کہ بڑھاپے کے آثار پیدا ہونے کی اصل وجہ جسم کے اندر موجود گلینڈوں میں سے مادہ کے اخراج کے عمل کا ختم ہو جانا ہے۔ اس کے بعد وہ تھائی رائڈ گلینڈوں پر کوشر، منکوسکی اور گریوز کے تجربات بیان کرتے ہیں۔ ان تجربات نے لوگوں کی توجہ جسم میں رطوبت پیدا کرنے والے اعضا یا پیٹیوٹری باڈی کی جانب مرکوز کر دی۔ اس موضوع پر بانڈل، کشنگ، الیشنز، اسمتھ، اینگل اشٹائی ناخ، ذودنڈیک، ایشیم اور لانگ اور سلیواں جیسے ماہر علم حیاتیات نے تجربات کئے۔ ڈاکٹر انصاری نے اشٹائی ناخ کے تجربات کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان تجربات کا خلاصہ پہلی بار ۱۹۲۹ء میں جرمن زبان میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر انصاری بعد کے اس موضوع پر جملہ تجربات کی اساس ڈاکٹر اشٹائی ناخ کے اس تجربہ کو بتاتے ہیں۔

کتاب کا چوتھا باب تحقیق کے کارواں کو مزید آگے بڑھانے کی کوششوں کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ اب یہ تجربات جانوروں کے بجائے انسانوں پر کئے جانے لگے۔ اپنے تجربات سے حاصل نتائج کی روشنی میں ڈاکٹر اشٹائی ناخ نے ویانا کے مشہور سرجن لائشٹنسٹرن کو انسانوں پر تجربہ کرنے کی صلاح دی۔ ڈاکٹر انصاری یہاں لائشٹنسٹرن کے آپریشن کے طریقہ کی مکمل تفصیل پیش کرتے ہیں۔ تجربات کے سلسلہ کی دوسری کڑی ورونوف کے تجربات ہیں جنھوں نے فرانس میں انسانی جسم پر تجربے کی پابندی کے پیش نظر اپنی تحقیقات کے لئے بندروں پر تجربات کئے۔ آپریشن کی مکمل تفصیل بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر انصاری تجربے سے حاصل ہونے والے نتائج پیش کرتے ہیں اور باب کو ختم کرنے سے پہلے اس موضوع پر شائع مواد کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہیں۔ اسی باب میں جرمنی کے ڈاکٹر پیٹر شمڈ کی تصنیف "بڑھاپے پر فتح" اور اس میں درج نتائج پر بھی تبصرہ ہے۔

باب پنجم سے باب دہم تک ڈاکٹر انصاری نے بڑھاپے کے عمل میں تاخیر پیدا کرنے کے لئے کئے گئے

ف عمل جراحی کا ذکر کیا ہے ۔ اس میں عمل منبندی سے خود کار حیات نو کا طریقہ، اور ہومو ریجنریشن
ہیٹرو ریجنریشن کے مختلف طریقوں کی عمل جراحت کی تفصیل ہے ۔ ان ابواب میں انھوں نے خود اپنے
ات کی جزئی تفصیلات کو بیان کیا ہے اور ان کے مریضوں پر آپریشن کے بعد جو اثرات مرتب ہوئے
ان کو مختلف تاریخوں میں دیکھ کر ان کی تفصیل بیان کی ہے ۔ ان کے مشاہدات کی تفصیل پر ایک
ہری نظر ہی ہمیں ان کی اپنے پیشے میں اعلیٰ لیاقت، فن جراحی میں ان کی مہارت اور ان کے سائنسی انداز
کا معترف بنا دیتی ہے ۔

گیارھواں باب ڈاکٹر انصاری کے اپنے تجربات کے تجزیہ پر مشتمل ہے ۔ لکھتے ہیں: "اگرچہ میں نے
سات سو مریضوں کا علاج کیا ہے لیکن ان سے صرف ۳۴۰ افراد سے اپنا رابطہ قائم رکھ سکا ہوں ۔" ان
خیال ہے کہ اس میدان میں تحقیق کرنے والوں میں کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں ہے جس نے اپنے مشاہدے
بنیاد پیوندکاری کے مریضوں کی اتنی بڑی تعداد کو بنایا ہو ۔ اپنے نتائج حاصل کرنے کی غرض سے
ندکاری کے مختلف طریقوں میں سے پانچ پانچ فی صد کیسوں کو منتخب کیا ہے ۔ احتیاط کا یہ عالم ہے کہ "میرا
دعویٰ ہرگز نہیں کہ ان تمام مریضوں کو جو میرے زیر علاج رہے اسی طرح کا فائدہ ہوا جتنا فائدہ نمونہ کے
منتخب مریضوں کو ہوا ۔" ڈاکٹر انصاری محدود سطح پر کئے گئے مشاہدات سے اخبار نویسوں کی عام نتائج
کرنے کی عادت کے بہت شاکی ہیں اور اخبار نویسوں میں وہ طبی رسائل کے مدیران کو بھی شامل کرتے
۔ ان کے خیال کے مطابق "سچ یہ ہے کہ..... ریجنریشن کے مختلف طریقے بہت محدود منفعت رکھتے ہیں اور
انسانی کے انحطاط کے چند واضح اور پہلے سے معلوم حالات کا ہی تدارک کر سکتے ہیں ۔" اپنے اس تمہیدی نوٹ
روہ آپریشن کے بعد پیدا ہونے والی مختلف تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہیں ۔ ان تبدیلیوں میں بھوک میں اضافہ،
میں اضافہ، جلد کی تبدیلی کے آثار، بالوں کی دوبارہ نمود، پٹھوں میں توانائی کا عود کرنا، خون کے
میں کمی، تنفس اور رفتار نبض میں تیزی، بصارت، دماغی حالت اور نظام اعصاب میں بہتری، آواز، جنسی
اور غدہ مثانہ میں بہتری وغیرہ شامل ہیں ۔

اپنی اس کتاب کے خاتمہ پر انھوں نے امید ظاہر کی ہے کہ تحقیق کے جن خطوط کی نشان دہی کی گئی ہے
تقبل میں ان پر مزید کام ہوگا ۔ ہندستان میں علم طب کی یہ بڑی بدنصیبی تھی کہ ڈاکٹر انصاری اپنی تحقیق کو
گے بڑھانے سے پہلے ہی اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے ۔

عبداللطیف اعظمی

ڈاکٹر انصاری اور میڈیکل مشن

ڈاکٹر مختار احمد انصاری یورپ سے سرجری اور ڈاکٹری (طبابت) کی اعلیٰ تعلیم اور تجربہ حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۰ء میں ہندوستان واپس آئے۔ ایک طویل عرصے کے بعد آئے تھے، اس لئے قدرتی طور پر کچھ وقت اپنے وطن، یوسف پور (ضلع غازی پور، یوپی) میں اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ گزارا، اس کے بعد حیدرآباد تشریف لے گئے، جس کے وظیفے پر اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ تشریف لے گئے تھے۔ ریاست کے محکمہ صحت کے افسر اعلیٰ سے ملے اور باقاعدہ اطلاع کی کہ وہ تعلیم اور ٹریننگ حاصل کرکے آگئے ہیں اور حسب معاہدہ وہ ریاست کی خدمت کے لیے تیار ہیں۔ اس افسر اعلیٰ نے، جو ایک انگریز تھا، ڈاکٹر صاحب کے کاغذات دیکھ کر مخلصانہ مشورہ دیا کہ آپ جیسے ماہر فن اور تجربہ کار کے لیے ایک دیسی ریاست کا ماحول مناسب نہیں ہے، بہتر ہے برطانوی ہندوستان کے کسی بڑے اور مرکزی شہر میں پریکٹس شروع کیجیے۔ ڈاکٹر صاحب نے معاہدہ کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ مسئلہ تو کچھ مشکل نہیں ہے۔ ملازمت دینے نہ دینے کا اختیار تو مجھے ہے، آپ نے حسب وعدہ اپنی خدمات پیش کردی ہیں، اب اگر چھ ماہ تک آپ کو ملازمت نہ ملے تو اس کے بعد آپ آزاد ہیں۔ یہ مدت گزر گئی اور ریاست نے ڈاکٹر صاحب کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ اب سوال پیدا ہوا کہ کام کی داغ بیل کہاں ڈالیں۔ اس وقت کلکتہ ملک کی راجدھانی تھا، اس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے نظر اس طرف اٹھی، مگر قبل اس کے کہ کوئی فیصلہ کریں یہ راجدھانی دلّی منتقل ہوگئی، اب دلی کو دو وجہوں سے ترجیح حاصل تھی، ایک دارالخلافت کی وجہ سے، دوسرے حکیم اجمل خاں کی وجہ سے، جن سے لندن میں ملاقات ہوچکی تھی اور ان کی تشخیص کا کمال اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے[۱] اس لیے بالآخر قرعۂ فال دلّی کے حق میں نکلا اور ۱۹۱۲ء کے وسط میں دلّی آگئے، کشمیری گیٹ میں

۱۔ اس شمارے کا مضمون: "ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں" صفحہ ۳۳

موری گیٹ کے قریب رہائش کے لیے ایک شاندار کوٹھی لی اور مسجد فتح پوری کے اوپری حصے میں اپنا مطلب کھولا۔ ۱۹۲۵ء کے وسط اگست تک یہی دونوں جگہیں ان کی طبی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز رہیں، دریا گنج میں جب ان کی اپنی کوٹھی مکمل ہوگئی تو وہ یہاں اٹھ آئے اور ۱۶ اگست ۱۹۲۸ء سے یہیں مطب بھی کرنے لگے۔ اب ان کی جملہ سرگرمیوں کا مرکز ان کی یہی کوٹھی "دارالسلام" تھی۔

ڈاکٹر صاحب کو دہلی میں مطب شروع کیے ہوئے ابھی بہ مشکل چھ ماہ[۴۲] ہوئے تھے کہ بلقان کے زخمی مجاہدین کی آہ و بکا اور چیخ و پکار ہندوستان تک پہنچی اور یہاں کے مسلمان تڑپ اٹھے۔ فوراً مالی امداد کے لیے گھر گھر چندے شروع ہوگئے اور مجروحین کی مرہم پٹی اور علاج معالجے کے لیے ایک آل انڈیا میڈیکل مشن ترتیب دیا گیا اور ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ۱۵ دسمبر ۱۹۱۲ء کو بمبئی کے ساحل سمندر سے روانہ ہوا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت اور انفرادیت یہ تھی کہ: "انگریزی حکومت کے دور میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی اجتماعی حیثیت سے ہندوستان کے باہر کے مسلمانوں کی اعانت کے لیے ایک وفد روانہ کیا تھا"[۴۳]

ڈاکٹر انصاری ایک ماہر سرجن اور تجربہ کار فیزیشین ضرور تھے، مگر ایک وفد کی سربراہی اور ایک دوسرے ملک میں جس کی زبان اور کلچر سے واقفیت نہ ہو، فوجی مجروحین کی دیکھ بھال اور علاج معالجہ، ان کی زندگی کا اولین تجربہ تھا، مگر ان کے اور ان کے ساتھیوں کے خلوص اور دن و رات کی محنت کی وجہ سے ان کی خدمات کو ہندوستان اور عالم اسلام میں بڑی شہرت اور عزت حاصل ہوئی۔ جس طرح ترکی مجاہدین کی مالی امداد کے لیے ہندوستان میں مختلف ادارے اور اخبارات چندے جمع کرتے تھے اور اپنے طور پر ترکی بھیجتے تھے، جس کی وجہ سے یہ شکایت پیدا ہوئی کہ کبھی کبھی مستحق لوگوں کو یہ امداد نہیں پہنچی، اسی طرح ڈاکٹر انصاری کے وفد کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی وہاں پہنچ گئے تھے، جنھوں نے وہاں عجیب و غریب فضا پیدا کر دی۔ ڈاکٹر انصاری نے اپنے ایک خط میں ان لوگوں کے بارے میں لکھا ہے: "اس کا اظہار کرتے ہوئے مجھے سخت رنج ہوتا ہے کہ بمبئی کے وفد

---

[۴۲] اس شمارے کا مضمون: "اپنے آقا کی یاد میں" صفحہ ۲۲

[۴۳] یادداشت ڈاکٹر انصاری بحوالہ حیات اجمل صفحہ ۲۳

کے اراکین اپنی تمام قوتوں کو خانگی جھگڑوں میں ضائع کر رہے ہیں اور بمبئی کے غریب مسلمانوں نے جو فرائض انھیں تفویض کئے ہیں ان کی انجام دہی میں پوری کوشش نہیں کرتے"۔[۵۳] اسی طرح یورپ سے بھی کچھ لوگ پہنچے تھے مگر ان کے رویے اور طریق کار سے ترکوں میں بڑی غلط فہمیاں اور شکایات پیدا ہوئیں۔ اس کے برعکس آل انڈیا میڈیکل مشن کے اراکین نے، جس کے سربراہ ڈاکٹر انصاری تھے، اپنے خلوص اور اپنی بے لوث خدمت کے ذریعہ ترکی مجاہدین کے دلوں میں گھر کر لیا۔ ڈاکٹر انصاری نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے: "میں بلا پس و پیش کہتا ہوں کہ ہمارا شفا خانہ یہاں کے سب شفا خانوں سے بہتر ہے، ہمارے عمل جراحی اور مرہم پٹی کے کروں کی بلحاظ عمدگی آلات و ترتیب ادویات ان ارباب نے جو گاہے ماہے بطور تفریح یا بغرض معائنہ تشریف لاتے ہیں، بے حد تعریف کی ہے"۔[۵۴] ڈاکٹر ظہیر حسین جو شفا خانہ عمرلی کے انچارج تھے اپنے ایک خط میں جلیل القدر ترکی فوجی افسروں کی رائیں لکھ کر بھیجی ہیں، جن میں آل انڈیا میڈیکل مشن کے انتظام اور کام کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔[۵۵] ان رایوں میں سپہ سالار اعظم عساکر سلطانی، احمد عزت پاشا کی رائے بھی شامل ہے۔[۵۶] ۱۷ رجون ۱۹۱۳ء کو جب وفد واپسی کی تیاری میں مشغول تھا، ڈاکٹر انصاری نے تار کے ذریعہ اطلاع دی کہ: "ہز امپیریل مجسٹی خلیفۃ المسلمین نے ازراہ مرحمت خسروانہ آل انڈیا میڈیکل مشن کو شرف حضوری بخشا"۔[۵۷] یہ وہ کارنامے ہیں جس نے ڈاکٹر انصاری کی عظمت و شہرت میں چار چاند لگا دیے اور ترکی سے ہندوستان کا مستحکم اور پائیدار تعلق قائم ہوا۔

بالآخر چھ ساڑھے چھ ماہ کے بعد، ڈاکٹر انصاری اور ان کے ساتھی ہندوستان واپس آئے۔ ۴ر جولائی کو جمعہ کے مبارک دن وہ بمبئی کے ساحل پر اترے اور مولانا محمد علی اور بہت سے لوگوں نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔

جب ابتدائی مراسم، علیک سلیک، مزاج پرسی اور معانقے سے لوگ فارغ ہوئے تو مولانا محمد علی نے وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری کا ایک تار پڑھ کر سنایا جس میں ہز ایکسیلنسی کی جانب سے مشن کا عنایت آمیز خیر مقدم کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر انصاری نے اس کے جواب میں اپنی وفادارانہ احسان مندی کا اظہار کیا اور

---

[۵۳] روزانہ "ہمدرد" دہلی ۷ر اپریل ۱۹۱۳ء صفحہ ۲ [۵۴] ایضاً۔ [۵۵] ایضاً مورخہ ۱۶ر اپریل ۱۹۱۳ء
[۵۶] ایضاً مورخہ ۱۸ر جون ۱۹۱۳ء صفحہ ۳

ہز ایکسیلنسی کی اس بیش بہا امداد کا شکریہ ادا کیا جو وائسرائے ہر وقت اور ہمیشہ دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔[8]

اسی دن وفد کے استقبال اور خیر مقدم کے لئے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا، جس میں وفد کے سربراہ ڈاکٹر انصاری نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ: "ہمیں اس پر فخر ہے کہ ہم نے نہ صرف اپنے ترکی بھائیوں کے المناک مصائب کے وقت ان کی مدد کی بلکہ ہم نے مسلمانان ہندوترکی کے درمیان باہمی رشتۂ اخوت کو زیادہ مضبوط اور مستحکم کر دیا ہے۔ مسلمانانِ ہند کا یہ خیال کہ ترکی کو میڈیکل مشن بھیجا جائے، نہایت مناسب اور اعلیٰ خیال تھا اور میں اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ مشن کو اپنے مقصد میں پوری کامیابی ہوئی، اراکین مشن نے بڑے صبر اور مستقل مزاجی کے ساتھ فوجی مجروحین کی بے لوث خدمت کی جس کا ترکی حکام نے اعتراف کیا اور انھوں نے بہت خلوص اور شاندار طریقے سے ہمیں الوداع کہا"[9]

اتفاق سے اُس زمانے میں مولانا شبلی نعمانی بھی بمبئی میں موجود تھے، انھوں نے ڈاکٹر انصاری کے خیر مقدم میں ایک طویل اور پُر درد نظم اس جلسہ میں پڑھ کر سنائی جو روزنامہ "ہمدرد" مورخہ ۱۲ر جولائی ۱۹۱۳ء میں صفحہ ۳ پر شائع ہوئی، اس کے چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں:

ادا کرتے ہیں ہم شکرِ جناب حضرتِ باری — کہ آئے خیریت سے ممبرانِ وفدِ انصاری
ہزاروں کوس جا کر بھائیوں کی تم نے خدمت کی — یہی تھا دردِ اسلامی، یہی تھی رسمِ غم خواری
جو سچ پوچھو تو تم انصار بھی ہو اور مہاجر بھی — کہ سب اہلِ وطن کو چھوڑ کر پہنچے پئے یاری

جب یہ میڈیکل مشن ترکی کے لئے لکھنؤ سے دہلی کے لئے روانہ ہوا تھا تو لکھنؤ ریلوے اسٹیشن پر جو لوگ مشن کو رخصت کرنے کے لیے آئے تھے، ان میں مولانا شبلی بھی تھے، جب گاڑی کی روانگی کا وقت آیا تو ڈاکٹر انصاری ڈبے کے دروازے پر کھڑے ہو گئے اور وداعی سلام لینے لگے، دفعتاً فرط محبت و جوش میں مولانا شبلی ڈاکٹر انصاری کے قدموں پر جھک گئے اور بوٹوں کے بوسے لے لئے[10]۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ اس مرتبہ بھی ساحل سمندر پر خیر مقدم کرتے وقت مولانا شبلی نے ڈاکٹر صاحب کے پاؤں چومنے کی کوشش کی،[11] مگر شاید ڈاکٹر صاحب پہلے سے چوکنے رہے ہوں گے، اس لئے انھوں نے اس کا موقع نہیں دیا۔

---

[8]۔ ہمدرد، ۶ر جولائی ۱۹۱۳ء صفحہ ۵ — [9] ایضاً

[10]۔ مولانا سید سلیمان ندوی: حیات شبلی صفحہ ۵۹۷ — [11] ایضاً صفحہ ۵۹۸

سالانہ قیمت
۹ روپے

جامعہ

قیمت فی پرچہ
۷۵ پیسے

جلد ۷۸	بابت ماہ اگست ۱۹۸۱ء	شمارہ ۸

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: جمال پریس دہلی ۶ • ٹائٹل: فائن پریس دہلی ۶

شذرات

جامعہ کے اسی شمارے میں، مضامین کے بعد ایک مراسلہ شائع ہو رہا ہے جس میں ایک مخلصانہ تجویز پیش کی گئی ہے۔ فاضل مراسلہ نگار مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کے عقیدت مندوں میں سے ہیں اور طبابت کا علمی اور عملی تجربہ رکھتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب نے طبی دنیا میں جو علمی اور فنی شاندار کارنامے انجام دئے ہیں اور جو قیمتی تجربات کئے ہیں، ضرورت ہے کہ نہ صرف ان کو جاری رکھا جائے بلکہ زمانے کی ترقی اور ضرورت کے مطابق ان میں توسیع کی جائے، مگر سوال صرف یہ ہے کہ کیا یہ اہم اور مفید کام جامعہ ملیہ میں شروع کیا جائے یا ان اداروں میں جو طب جدید و قدیم کی خدمات ایک طویل عرصے سے انجام دے رہے ہیں۔

فاضل مراسلہ نگار اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ حکیم صاحب کی دو یادگاریں ہیں، ایک طبیہ کالج اور دوسری جامعہ ملیہ، دونوں کے مقاصد اور نصب العین الگ الگ تھے اور ہیں۔ ڈاکٹر انصاری بھی طبیہ کالج کے لیے کچھ وقت دیتے تھے اور سرجری کا کام وہاں بھی کیا کرتے تھے، یہ دونوں بزرگ ـــ حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب، چاہتے تھے کہ یہ دونوں ادارے ـــ جامعہ ملیہ اور طبیہ کالج، اپنے اپنے خطوط پر قائم رہیں اور ترقی کریں۔

طبیہ کالج کا آغاز ایک مدرسہ طبیہ کی صورت میں ہوا تھا، اس کا قیام ۱۸۸۳ء میں ہوا اور باقاعدہ افتتاح ۲۲ جولائی ۱۸۸۹ء کو، اور حکیم صاحب کی کوششوں سے بیسویں صدی کے اوائل میں، اس مدرسے نے ترقی کرکے کالج کی حیثیت حاصل کر لی، اس کی بنیادوں کو مستحکم کرنے اور عام چندوں سے بے نیاز کرنے کے لیے دوا خانے کو جو مختلف حصہ داروں کے مشترکہ سرمائے سے قائم کیا گیا تھا اور جو شریفی خاندان کی مستقل اور پائدار آمدنی کا ذریعہ تھا، کالج کے لیے وقف کر دیا اور بقول قاضی عبدالغفار مرحوم "اس زمانے کے

اعتبار سے یہ ایک عظیم الشان جائداد تھی جو حکیم صاحب نے اپنی اور اپنے خاندان کی ملکیت سے نکال کر طب یونانی کی عزیز تحریک کے حوالہ کر دی، ان کی وفات کے وقت اس جائداد کا خالص منافع دو لاکھ روپیہ سالانہ کے قریب تھا جو سب طبیہ کالج پر صرف کیا جاتا تھا۔" چنانچہ حکیم صاحب کی زندگی میں اس نے بڑی ترقی اور شہرت حاصل کی، مگر افسوس کہ بعد میں شریفی خاندان کے زوال کے ساتھ ساتھ کالج بھی زوال کا شکار ہو گیا اور اب آزادی کے بعد اس کی حالت بہت ہی مایوس کن ہے۔ قوم اگر اب بھی توجہ کرے تو اس کی حالت بہتر ہو سکتی ہے اور وہ اسکیم جو زیر تذکرہ مراسلے میں پیش کی گئی ہے، وہاں شروع کی جا سکتی ہے جس سے طب قدیم و جدید دونوں کی خدمت ہو سکتی ہے اور نتیجۃً حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب دونوں کا نام روشن ہوگا۔

خود فاضل مراسلہ نگار جس طبی ادارے سے تعلق رکھتے ہیں، اس میں طب قدیم کے ساتھ ساتھ طب جدید کی بھی تعلیم دی جاتی ہے اور حکیم صاحب کی خدمات کے اعتراف میں، اس ادارے کا قدیم نام بدل کر "اجمل خاں طبیہ کالج" رکھا گیا ہے، اس لحاظ سے ہمارے خیال میں، مجوزہ اسکیم کے لیے یہ ادارہ زیادہ مناسب اور موزوں ہو سکتا ہے۔

یہ سبھی کو معلوم ہے کہ جامعہ ملیہ ایک ترقی پذیر ادارہ ہے، ایک مکمل اور بھرپور یونیورسٹی بننے کے لیے ابھی وقت لگے گا، متعدد مضامین ہیں جن میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم اور ریسرچ کا ابھی انتظام نہیں ہے، تعلیم اور ہوسٹل کے لیے عمارتوں کی بہت کمی ہے، سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لیے موجودہ تجربہ گاہیں ناکافی ہیں، ان حالات میں ایک طویل عرصے تک کوئی ایسی اسکیم یہاں کیونکر شروع کی جا سکتی ہے، جس کے لیے یہاں نہ اسٹاف ہے اور نہ کسی کو کوئی تجربہ ہے، اس کے علاوہ اس وقت دلی میں تین طبی ادارے کام کر رہے ہیں، ایک حکیم صاحب کا طبیہ کالج (قرول باغ)، دوسرا جامعہ طبیہ ~~کالج~~ (بلّی ماران) اور تیسرا حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی کا قائم کردہ طبّی کالج (ہمدرد نگر تغلق آباد)، کیا ان تین اداروں کی موجودگی میں ایک چوتھے طبّی ادارے کی ضرورت بھی ہے اور اگر ہے تو کیا حکومت اس کے لیے معقول امداد دے گی جس سے مجوزہ اسکیم کامیابی کے ساتھ جاری رکھی جا سکے؟! ویسے ہم عرض کر دیں کہ ڈاکٹر انصاری کی

یاد میں جامعہ میں انصاری ہلتھ سنٹر قائم ہے ، اگر حالات نے اجازت دی تو اس کے ماتحت بہت کچھ کام ہو سکتا ہے۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ خدا نخواستہ ہم اس تجویز کو مفید اور کارآمد نہیں سمجھتے یا اس کے مخالف ہیں . ہم نے یہ تفصیل صرف اس لیے پیش کی ہے کہ صحیح صورت حالات اور راہ کی مشکلات کا اندازہ کیا جا سکے اور ہم میں سے کوئی شخص کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ پھر بھی یہ تجویز جناب شیخ الجامعہ صاحب کی خدمت میں پیش کر دی جائے گی اور جناب حکیم عبدالحمید صاحب کو بھی بھیجدی جائے گی جو اس سلسلے میں بڑی مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔

جو لوگ آئے دن جامعہ پر تنقید کرتے رہتے ہیں اور اس سے نت نئی توقعات کا اظہار کرتے ہیں ، وہ عام طور پر جامعہ کی مشکلات اور اس کے حالات کو سامنے نہیں رکھتے ۔ کسی زمانے میں کچھ حضرات فرمایا کرتے تھے کہ جامعہ کے ارباب حل وعقد مولانا محمد علی کو قصداً نظر انداز کرتے ہیں ، مگر جب ہم نے ان کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر کامیاب کل ہند سیمینار کیئے اور ماہنامہ جامعہ کے دو شاندار نمبر نکالے تو انھوں نے اپنی غلط فہمی اور جامعہ کی نیک نیتی کا اعتراف کیا۔ اب جب ڈاکٹر انصاری مرحوم کی صدی کا زمانہ آیا تو ایک صاحب نے یہ الزام لگانے میں بڑی عجلت سے کام لیا کہ جامعہ والے مرحوم کی مفصل اور مبسوط سوانح عمری کی طرف کوئی توجہ نہیں کر رہے ہیں ، حالانکہ جامعہ نے ان کی صد سالہ تقریب کے سلسلے میں دو جلسے کیئے جو بہت کامیاب تھے اور ماہنامہ جامعہ کی ایک اشاعت ان کی یاد کے لیے مخصوص کی اور ایک مستند سوانح عمری لکھنے کے لیے اپنے ایک استاد کو آمادہ کیا ۔ اس طرح کے اعتراضات کرنے والے اس کو بھول جاتے ہیں کہ جامعہ ملیہ کے معزز بانیوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہے اور ایسے لوگوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے جنھوں نے اپنی پوری زندگی ایک قلیل تنخواہ پر وقف کر دی تھی ۔ جامعہ ہر سال یوم تاسیس کے موقع پر اپنے تمام بانیوں ، معماروں اور محسنوں کو مناسب طور

یہ یاد کرتی ہے اور جب کوئی خاص موقع آئے گا تو مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری کی طرح ان کی یاد میں مناسب تقاریب کا انتظام کرے گی۔

جامعہ ملیہ کا نیا تعلیمی سال شروع ہو رہا ہے، اس موقع پر نامناسب نہ ہوگا اگر اس کے اساتذہ اور طلبہ کو یہ یاد دلادیا جائے کہ یہ ادارہ دوسری یونیورسٹیوں سے بڑی حد تک مختلف ہے اور یہ کہ یہ مخصوص حالات میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ ادارہ کبھی کا ختم ہوگیا ہوتا اگر اس کے عہدہ داروں، استادوں اور کارکنوں نے بڑی جاں فشانی اور غیر معمولی ایثار و قربانی سے کام نہ لیا ہوتا۔ اب مالی قربانیوں کی ضرورت نہیں رہی، کیونکہ اس کے جملہ اخراجات کی ذمہ داری حکومت پر ہے، مگر وقت کی قربانی کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔ جامعہ کی منفرد خصوصیات اور اعلیٰ روایات کو برقرار رکھنے کے لیے، صرف منصبی فرائض ادا کر دینا کافی نہیں ہے، اس کے لیے خاص جذبے اور خاص توجہ کی ضرورت ہے اور اسی کے ساتھ ایسی بے لوث خدمت کی جس میں وقت کی قید نہ ہو، جس طرح دور اول میں تھا کہ اساتذہ اور کارکنوں کا پورا وقت جامعہ کے لیے وقف تھا۔

آجکل طالب علموں کا مقصد حیات صرف ڈگریاں حاصل کرنا اور نوکریاں کرنا ہے، جامعہ نے ان دونوں مقاصد کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی ہے، اس کی نظر میں تعلیم کا مقصد علم کا حصول ہے اور یہ کہ اعلیٰ قدروں کو اپنی عملی زندگی میں بلند اور ممتاز مقام دیا جائے۔ جامعہ کے مخصوص مقاصد کے پیش نظر اس کے نصاب تعلیم میں اسلامیات/ ہند و اخلاقیات اور اردو ہندی کی تعلیم کو خصوصی جگہ دی گئی ہے، جنھیں آجکل کے طلبہ عام طور پر غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ طلبہ کے ذہن میں ان کی اہمیت کو جاگزیں کریں اور انھیں سمجھائیں کہ یہ کافی نہیں ہے کہ ان مضامین میں کسی نہ کسی طرح امتحان پاس کرلیا جائے۔ جامعہ اس وقت اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگی جب طلبہ اور اساتذہ دونوں مل کر کوشش کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ نئے تعلیمی سال کے آغاز ہی سے اس طرف پوری توجہ کی جائے گی۔

پروفیسر مشیر الحق

ہندوستان کا اسلامی معاشرہ

ہندوستان کے اسلامی معاشرہ کی تاریخ، ظاہر ہے، یہاں پر مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوتی ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس ملک میں آنے والے مسلمان اپنے ساتھ جو طرز معاشرت لے کر آئے تھے اسی کی تفصیلات کا دوسرا نام ہندوستان کا اسلامی معاشرہ ہوگا۔ اس منطق میں کچھ سچائی تو ضرور ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سے حقیقت کی پوری پوری عکاسی نہیں ہوتی۔

اگر ہم کسی قومی یا ملکی تہذیب کی بات کر رہے ہوتے تو پھر کسی نہ کسی حد تک یہ کہنے میں حق بجانب ہوتے کہ مسلمان باہر سے ایک ڈھلی ڈھلائی تہذیب اپنے ساتھ لے کر ہندوستان آئے اور اسی تہذیب نے اسلامی معاشرہ کا نام پایا۔ مگر ایسا ہوا نہیں۔ یہاں آنے والے مسلمان کسی ایک خاص علاقے سے نہیں آئے تھے۔ جنوبی ہندوستان میں اسلامی معاشرہ کی داغ بیل ڈالنے والے خالص عرب تاجر تھے۔ سندھ اور ملتان میں اسلامی تہذیب کا تعارف بھی اگرچہ عربوں ہی کے ذریعہ ہوا، لیکن وہ لوگ شام و عراق کی راہ سے آئے تھے جہاں ایک زمانے تک بازنطینی تہذیب کے جھنڈے لہرا چکے تھے۔ شمالی ہندوستان کو اسلامی تہذیب سے روشناس کرانے والے مغل تھے، خلجی تھے، اور ان کے دوسرے بھائی بند تھے۔ یہ لوگ وسط ایشیا سے وارد ہوئے تھے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو خود ان مسلمانوں

پروفیسر مشیر الحق، صدر شعبۂ اسلامک اینڈ عرب ایرینین اسٹڈیز، جامعہ ملیہ دہلی

میں نسلی، علاقائی، لسانی اختلافات موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان عناصر کی بنیاد پر وجود میں آنے والی تہذیبی زندگی میں وہ لوگ ایک دوسرے سے بہت حد تک مختلف تھے لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان مختلف العناصر اکائیوں نے اس ملک کو اپنا لینے کے بعد ایک ایسی تہذیب دنیا کو دی جو نہ مغل تہذیب تھی نہ خلجی تہذیب۔ اسے نہ تو عرب معاشرت کہہ سکتے ہیں اور نہ وسط ایشیائی طرزِ حیات۔ اس کا اگر کوئی نام ہو سکتا ہے تو وہ ہے ہندی اسلامی تہذیب۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تہذیبوں کا تعلق مذہب سے نہیں ہوتا، بلکہ ہر علاقے کی اپنی تہذیب ہوتی ہے اور ہر سماج کا ایک خاص طرزِ معاشرت ہوتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ بات صد فی صد درست نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کسی بھی تہذیب پر اس علاقہ کے مخصوص جغرافیائی اور تاریخی اثرات کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ انسان اگر کسی مذہب کو تسلیم کرتا ہے اور اسی کے ساتھ ایک معاشرہ کی بھی تشکیل کرتا ہے تو ناممکن ہے کہ اس کے معاشرہ پر اس کے مذہب کی چھاپ نہ پڑے۔

اسلام کسی خاص قوم کا مذہب نہیں ہے، یہ کسی خاص علاقے کی جاگیر نہیں ہے، یہ کسی خاص گروہ کی ملکیت نہیں ہے۔ اسلام چند اصولوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اور یہ ہر اس شخص، قوم اور گروہ کا ہے جو ان اصولوں کو اپنا لے۔ اور ان اصولوں کی بنیاد پر جو تہذیبی زندگی وجود میں آتی ہے وہی حقیقی اسلامی معاشرہ ہے۔ قومی تہذیبیں ہمیں ایک بنا بنایا لباس دیتی ہیں۔ یہ لباس ہزاروں برس قبل مسیح کا بھی ہو سکتا ہے اور سیکڑوں سال بعد مسیح کا بھی۔ لیکن چونکہ اس کی حیثیت ایک قومی لباس کی ہوتی ہے اس لئے لوگ اسے کوشش کر کے زیب تن کرتے ہیں خواہ وہ بغل سے مسک چکا ہو یا کمر پر تنگ آ گیا ہو۔ مذہب ہمیں بنا بنایا لباس نہیں دیتا۔ ہاں وہ لباس کے اصول و شرائط ضرور متعین کرتا ہے۔ مذہب ہمیں کسی خاص ڈیزائن کی آستین، خاص شکل کا دامن، خاص نمونہ کی کلی، خاص طرز

کے نکلنے نہیں دیتا۔ وہ صرف یہ کہتا ہے کہ لباس پردہ پوش ہو۔ غرور پیدا کرنے والا نہ ہو، لباس پر بے جا خرچ نہ کیا جائے، وہ سادگی اور اعتدال کا مظہر ہو۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، مذہب کہتا ہے، کہ تمھیں ہر زمانہ، ہر ملک، ہر موسم اور ہر طرح کے حالات و ضروریات کے لئے لباس تیار کرانے کی پوری آزادی ہے۔ قومی تہذیبوں کا اصرار ہوتا ہے کہ کرتا فلاں نمونہ کا ہو، اور قمیص اس ڈھب کی، علاقائی تہذیبیں اس بات پہ دست گریباں ہوتی ہیں کہ ہم پائجامہ پہنیں یا دھوتی باندھیں؛ ملکی تہذیبیں اپنے اور غیر کی بحث میں سر کھپاتی ہیں اور ہر اس چیز کو شبہ کی نظر سے دیکھتی ہیں جو سرحد پار سے آئی ہو۔ مذہب ان باتوں سے بالاتر ہوتا ہے۔ اس کی نظروں میں قدیم و جدید، اپنے اور پرائے کی تقسیم بے معنی اور فضول ہوتی ہے۔ اس کے یہاں زندگی کے کچھ ہمہ گیر اصول ہوتے ہیں جو ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانے کے لئے عام ہوتے ہیں۔ وہ انسانوں سے یہ نہیں کہتا کہ یہ لباس تمھارے دیس کا ہے اور یہ پردیس کا، یہ تمھارے باپ دادا پہنتے تھے اور یہ نہیں پہنتے تھے۔ اس کے برعکس وہ یہ کہتا ہے کہ :

> اے آدم کی اولاد، ہم نے تمھارے لئے وہ لباس
> پیدا کیا ہے جو تمھارے تن کو ڈھانکے اور تمھارے
> جسم کے لئے حفاظت اور زیب و زینت کا
> ذریعہ بنے۔

مذہب کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ فلاں کھانا فلاں ملک کا ہے اور فلاں پھل کو فلاں قوم نے ترقی دی۔ اسے اس سے بھی غرض نہیں ہوتی کہ کسی مخصوص کھانے کی اس لئے سرپرستی کی جائے کہ وہ ہمارے ملک کا قدیم ترین کھانا ہے اور فلاں قسم کے آداب دسترخوان کا صرف اس لئے بائیکاٹ کیا جائے کہ وہ کسی دوسری قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ مذہب کا اصرار صرف اس

بات پر ہوتا ہے کہ "کھاؤ، پیو، مگر بے جا خرچ نہ کرو کہ تمھارے مالک کو بے جا خرچ کرنے والے پسند نہیں ہیں۔"

مذہب دراصل اصول عطا کرتا ہے۔ تہذیبیں بنے بنائے سانچے دیتی ہیں۔ نئے بھی اور پرانے بھی؛ ایسے سانچے بھی جو اپنی زندگی کھو چکے ہیں اور جگہ جگہ سے ٹوٹ چکے ہیں۔ علاقائی اور قومی تہذیبیں کہتی ہیں کہ آؤ اس زمانے کی طرف جس کے رسم و رواج ایسے تھے، جب کھانے پینے کا یہ طریقہ تھا، لباس کا یہ انداز تھا، کھانے کے یہ برتن تھے، سواری کے لئے رتھ تھے، یا بیل گاڑیاں تھیں، یا اونٹ تھے، آؤ شدھ سنسکرت کی طرف، لیکو خالص عربی کی طرف، دوڑو قدیم پہلوی کی طرف — مذہب کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کی نظر میں اہمیت، ذریعہ کی نہیں، مقصد کی ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک حیثیت اس ذہنیت کی ہے جس کے ساتھ انسان وسائل اور ذرائع کو کام میں لاتا ہے۔ بیل گاڑی، اونٹ گاڑی، یا ریل، یا موٹر کار، یا ہوائی جہاز، غرضیکہ سفر کے ہر ذریعہ کو ضرورت کے وقت استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مذہب اس سے نہیں روکتا، ہاں وہ یہ ضرور کہتا ہے کہ جب:

> "تم ان سواریوں پر سوار ہو تو پھر اللہ کے احسان کو یاد کرو۔ جب تم ان پر بیٹھ جاؤ تو کہو کہ پاک ہے وہ ذات جس نے ان سواریوں کو ہمارے قابو میں کیا ہے، ورنہ یہ تو ہمارے بس کی نہ تھیں۔"

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے یہاں کی تہذیبی اور سماجی زندگی میں نمایاں تبدیلیاں آئیں۔ اپنی روزمرہ کی زندگی اور رہن سہن میں نہ ہندو پہلے کا ہندو رہا اور نہ مسلمان، عرب و ایران کا مسلمان باقی رہ گیا۔ دونوں کے دونوں ہندوستانی ہو گئے اور ان کے سماجی میل جول سے ایک

ایسی گنگا جمنی تہذیب وجود میں آئی جو ہندو اور مسلمان دونوں کی تھی لیکن دونوں میں سے کوئی بھی اس پر اپنا حق ملکیت نہیں جتا سکتا تھا۔ ہندوستان کی قدیم سماجی زندگی نے اسلام سے انسانی برابری کا سبق لیا اور پیدائش اور نسلی امتیاز کی اہمیت ذہنوں سے کم ہونے لگی۔ یہاں کی مذہبی اور روحانی زندگی بھی ان اثرات سے نہ بچ سکی۔ بھگتی تحریک کے بیج کو بھلے ہی یہ کہا جائے کہ وہ یہاں کی زمین میں پہلے سے موجود تھا، بایں ہمہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام ہی کی بدولت اس بیج نے ایک پودے کی شکل اختیار کی اور اس کے پھول پتوں سے یہاں کی مذہبی زندگی میں بہار کی کیفیت پیدا ہوئی۔

دوسری طرف مسلمانوں کی سماجی اور روحانی زندگی بھی یہاں کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اگر آپ مسلمان گھرانوں میں رائج سماجی اور مذہبی رسموں کی ایک فہرست تیار کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اگر تمام رسمیں نہیں تو ان کا بہت بڑا حصہ ہندو گھروں میں پائی جانے والی رسموں کی نقل ثابت ہوگا۔ دراصل پیدائش سے لیکر موت تک ہندوستانی مسلمان گھروں میں برتی جانے والی بہت سی رسمیں ایسی ہیں جو خالص ہندوستان کا تحفہ ہیں۔ بہرحال ان رسموں کی تفصیلات میں پڑنے کی ہمیں ضرورت نہیں ہے سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ ان مشترکہ رسوم کی بنیاد پر جو سماج وجود میں آیا اُسے ہندوستان کا اسلامی معاشرہ کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ایک منٹ کے لئے فرض کیجئے کہ باہر سے آنے والے عرب، ایرانی اور تورانی اگر اسلام کے بجائے کسی دوسرے مذہب کے ماننے والے رہے ہوتے تو کیا پھر یہاں کی موجودہ گنگا جمنی تہذیب وجود میں نہ آتی! کیا وہ یہاں کی سماجی رسموں کو اپنانے سے انکار کر دیتے! بات یہ ہے کہ جس دن مسلمانوں نے یہ طے کیا کہ انھیں ہندوستان ہی میں جینا اور مرنا ہے تو وہ سماجی لین دین کے بیوہار سے اپنا دامن کسی طور بچا نہیں سکتے تھے۔

انگریزوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کم و بیش دو سو برس تک ہندوستان میں رہے لیکن اپنا الگ سماج بنا کر؛ درحقیقت یہ بیان بہت حد

تک مبالغہ پر مبنی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریزوں کی سماجی زندگی اُن کے ہندوستان کے پورے دوران قیام میں ہمیشہ یکساں نہیں رہی۔ نہر سوئز کے بننے سے پہلے جب انھیں براعظم افریقہ کا چکر لگا کر ہندوستان آنا پڑتا تھا تو انگلینڈ میں بیٹھے ہوئے ڈائرکٹروں کی نظروں میں ہندوستان بھلے ہی خام ملک کی ایک منڈی کی حیثیت رکھتا رہا ہو، لیکن یہاں پر متعین انگریز ملازمین اسی ملک میں اپنی موت کو برحق سمجھتے تھے۔ اس زمانے کی ہندوستانی "انگلش سوسائٹی" کا اگر آپ مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ بڑے بڑے صاحب بہادر چیرٹ کے ساتھ ساتھ حقے اور پیچوان سے بھی شوق کرنے لگے تھے۔ اپنی بے تکلف مجلسوں میں وہ "تھری پیس" تنگ سوٹوں کے بجائے کرتے پاجامے اور انگرکھے زیب تن کرنے لگے تھے۔ "POETRY RECITATION" کے بجائے انھیں مشاعروں میں غزل سنانے کی لت پڑنے لگی تھی۔ اس زمانے کے بعض انگریزوں اور ان کی میموں کے خطوط اور روزناچوں میں آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنی ایک ایک سطر میں اس بات پر شکوہ سنج ہیں کہ یہاں کے انگریز، انگریز نہیں رہ گئے، نہ ان کا مذہب باقی ہے، نہ ان کی تہذیب رہ گئی ہے۔ وہ عین مین ہندوستانی بنتے جا رہے ہیں۔ اور وہ دن دور نہیں جب یہاں کے انگریز انگلستان سے ناطہ توڑ کر ہندوستان کو اپنا وطن بنالیں گے۔ یہ شکایت مبالغہ پر بھلے ہی مبنی رہی ہو لیکن اسے حقیقت سے دور نہیں کہا جاسکتا۔ شکائتوں کے باوجود "انگریز ہندوستانی" تہذیبی لین دین جاری رہا اور شاید جاری رہتا اگر نہر سوئز وجود میں نہ آگئی ہوتی۔

بہرحال انگریزوں کی مثال بیچ میں صرف اس لئے آگئی کہ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ جب دو قوموں میں سماجی سطح پر لین دین کا معاملہ ہوتا ہے تو ایک نئی تہذیب وجود میں آکر رہتی ہے۔ اس لئے مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول سے اگر ایک نئی تہذیب وجود میں آئی تو اس میں نہ کوئی حیرت کی بات ہے اور نہ ہی

اسے تاریخ کا کوئی غیر معمولی واقعہ کہا جا سکتا ہے۔ ہاں اس موقع پر اگر کوئی بنیادی سوال پیدا ہو سکتا ہے تو یہ ہے ہندوستان کے اسلامی معاشرے اور یہاں کی مشترکہ تہذیبی زندگی میں بنیادی طور سے فرق کیا ہوگا۔ میں یہ بات پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہندوستان میں آنے والے عربوں، ایرانیوں اور تورانیوں کا مذہب اگر اتفاق سے اسلام نہ رہا ہوتا جب بھی اسی قسم کی ایک مشترکہ تہذیب وجود میں آکر رہتی۔ پھر آخر وہ کون سے حقائق ہیں جن پر انگلی رکھ کر اسلامی معاشرہ کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ ریڈیو کی بات ہونٹوں سے نکلتے ہی کوٹھوں پر چڑھنے کے بجائے اکثر و بیشتر ہوا میں غائب ہو جاتی ہے، اس لئے اگر آپ بھول گئے ہوں تو میں آپ کو یاد دلا دوں کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے کہا تھا کہ اسلام چند اصولوں کے مجموعے کا نام ہے اور ان اصولوں کی بنیاد پر جو تہذیبی زندگی وجود میں آتی ہے وہی حقیقی اسلامی معاشرہ ہے۔ گویا ہندوستان کے اسلامی معاشرہ کی تلاش ہمیں مشترکہ تہذیب کی رنگا رنگیوں میں کرنے کے بجائے ان اصولوں میں کرنی چاہیئے جنھیں مسلمان اپنے ساتھ ہندوستان لائے اور ان کی بنیاد پر ایک ایک اسلامی معاشرہ کی تشکیل کی۔

اسلام کے ان تشکیلی اصولوں میں ایک اصول یہ تھا کہ انصاف سب کے لئے ہے اور عدالت اور قانون کی نظروں میں چھوٹے اور بڑے کا کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام کا تصور ہر ملک اور ہر سماج میں رہا ہے لیکن اسلام نے ایک ایسی ٹھوس حقیقت بنا کر پیش کیا کہ اس کے بعد اپنے کاموں کا نتیجہ پانے کے لئے راجا اور پرجا دونوں ایک سطح پر آگئے۔ آپ میں سے اکثر لوگوں نے سہراب مودی نے مشہور فلم "پکار" ضرور دیکھی ہوگی جس میں ملکہ نورجہاں کے تیر سے ایک ہندو عورت بیوہ ہو جاتی ہے اور اس کی پکار کو سن کر ہندوستان کا مطلق العنان شہنشاہ اپنا سینہ کھول کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ ہندو بیوہ اپنا انصاف لے لے۔ اور جس طرح نورجہاں نے اسے بیوہ کیا ہے اسی طرح وہ نورجہاں کو بیوہ کردے۔

لیکن یہ اسلامی انصاف نہیں ہے کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔ اسلامی عدالت میں ہر شخص کو اپنی اپنی صلیب خود اٹھانی پڑتی ہے۔ اسلامی تصور انصاف کے تحت نور جہاں کے جرم کی سزا جہانگیر کو نہیں دی جا سکتی تھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جہانگیر نے یہ غیر اسلامی فیصلہ کیا بھی نہیں تھا۔ یہ تو سہراب مودی کا فیصلہ تھا۔ جہانگیر کے بارے میں تو یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے نور جہاں کو جلاد کے حوالہ کر دیا تھا۔ جو لوگ جانتے ہیں کہ جہانگیر کتنا متوالا تھا نور جہاں کا، وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کی یہ قربانی اپنی جان قربان کر دینے سے کہیں زیادہ اہم تھی۔

انصاف کے ساتھ ساتھ اسلام نے تصور دیا مذہبی رواداری کا، اور ہر فرد کو اپنے پسند کے مذہب کو اپنانے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی کا۔ فاتح سندھ محمد بن قاسم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک دن چند برہمن اس کے پاس یہ فریاد لے کر آئے کہ ان کے مندر مرمت طلب ہو رہے ہیں کیونکہ دیوتاؤں پر بھینٹ چڑھانے والوں کی کمی ہو گئی ہے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ محمد بن قاسم نے جس طرح دوسروں کے لئے انتظام کیا ہے اسی طرح وہ برہمنوں کی بھی فکر کرے اور لوگوں سے کہدے کہ وہ پہلے کی طرح چڑھاوے چڑھائیں۔ محمد بن قاسم اس عجیب و غریب درخواست کو سن کر گھبرا گئے کہ مسلمان ہوتے ہوئے وہ لوگوں کو بت پرستی کی طرف کیسے راغب کریں۔ آخر کار انھوں نے سارا واقعہ اپنے سرپرست اور خلیفۂ وقت کے گورنر حجاج کو لکھ بھیجا۔ حجاج نے جواب دیا کہ برہمنوں کی پرورش بھی ہمارا فرض ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھیں اپنے معبود کی عبادت کا پورا حق حاصل ہے۔ بیت المال سے ان کی مدد کرو اور اعلان کر دو کہ اپنے عبادت خانوں میں جس طرح جس کا جی چاہے عبادت کرے۔

اسلام نے دنیاوی علوم کے ساتھ ساتھ مذہبی علوم کا دروازہ بھی ہر ایک پر کھول دیا۔ اس طرح ہندوستان کے اسلامی معاشرہ نے انسانیت کو اس کا

یہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا کہ علم کسی خاص قوم، کسی خاص خاندان، کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا سورج ہے جس کی شعاعیں ہر ایک کے لئے ہیں۔ اب اس سے فائدہ اٹھانا ہر شخص کے اپنے اپنے ظرف پر منحصر ہے۔

اسلامی معاشرہ کی تشکیل ہوئی انسانی مساوات کے اصول پر۔ اسلام نے اعلان کیا کہ کالے گورے سب برابر ہیں، دنیا کا ہر انسان آدم کی اولاد ہے۔ اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ سب یکساں ہیں۔ ہاں اپنے اچھے اور برے کاموں کی بنیاد پر لوگ اونچے نیچے ہو سکتے ہیں۔

یہ تھے وہ چند اصول، جن پر ہندوستان کے اسلامی معاشرہ کی بنیاد قائم تھی۔ یہ اصول نہ عربوں کے پاس تھے، نہ ایرانیوں کے پاس؛ اور سچ پوچھئے تو نہ ہندوستانیوں کے پاس۔ ان کے اپنے اپنے مذہبوں کی تعلیمات میں ان اصولوں کی نشاندہی بھلے ہی ہوتی ہو کر خود اسلام یہ کہتا ہے کہ یہ اصول کچھ نئے نہیں ہیں۔ دنیا کا کوئی خطّہ ایسا نہیں ہے جہاں تاریخ کے کسی نہ کسی دور میں ان اصولوں کی نکرانی نہ رہی ہو۔ لیکن ہم جس وقت کی بات کر رہے ہیں اس وقت ان اصولوں کو عام طور انسانی زندگی سے دلیس نکالا مل چکا تھا۔ اسلام نے ان اصولوں کو ان کا جائز مقام عطا کیا اور مسلمان انھیں اصولوں کو لے کر ہندوستان میں آئے اور ان اصولوں کی بنیاد پر انھوں نے یہاں جس معاشرہ کی تشکیل کی وہی ہندوستان کا حقیقی اسلامی معاشرہ قرار پایا۔

(یہ مضمون آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر ہو چکا ہے)

ریاض الرحمن شروانی

پروفیسر ہارون خاں شروانی

پرفیسر ہارون خاں شروانی کا تعلق شمالی ہند کے مشہور شروانی خاندان سے تھا۔ یہ خاندان جاگیردارانہ نظام سے وابستہ تھا لیکن جاگیرداری کے ساتھ اس کی روایات میں مذہب اور علم کو بھی عرصے سے امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ ہارون خاں شروانی کی ولادت ۳۰ مارچ ۱۸۹۱ء کو ضلع علی گڑھ کے ایک موضع دتاولی میں ہوئی۔ دتاولی ایک مردم خیز مقام رہا ہے جہاں پروفیسر ہارون خاں شروانی کے بزرگوں میں کئی اہم شخصیتیں گزری ہیں۔ ان کے دادا نواب حاجی فیض احمد خاں کئی اعتبار سے اپنے دور کی نامور شخصیت تھے۔ ان کی ذات میں دولت، دین اور علم کا بہت خوش گوار امتزاج پایا جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جاگیرداروں کی ہم دردیاں عام طور سے انگریزوں کے ساتھ تھیں لیکن فیض احمد خاں صاحب کا حال اس سے مختلف تھا۔ چناں چہ جب اس معرکے میں انگریزوں کو کامیابی حاصل ہوئی تو فیض احمد خاں صاحب گرفتار کر لیے گئے۔ اگرچہ کچھ مدت کے بعد ان کی رہائی عمل میں آگئی تاہم وہ ہندوستان سے دل برداشتہ ہو گئے اور ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے۔ مکہ معظمہ میں یہ سعادت ان کے حصے میں آئی کہ "مدرسہ صولتیہ" کا قیام سب سے پہلے ان ہی کے مکان واقع محلہ شامیہ میں ہوا۔ ۱۸۷۴ء میں ترکی

ڈاکٹر ریاض الرحمن شروانی، ریڈر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اور روس کے درمیان جنگ چھڑ جانے کے موقع پر فیض احمد خاں صاحب نے ترکی کی مالی امداد فرمائی جس کے نتیجے میں سلطانِ ترکی نے ان کے لئے اپنی قلمرو میں آٹھ توپوں کی سلامی مقرر کردی۔ فیض احمد خاں صاحب کے بیٹے اور ہارون خاں صاحب کے نانا نواب حاجی اسماعیل خاں صاحب کا شمار سرسید مرحوم کے قریبی ساتھیوں میں ہوتا ہے، انھوں نے علی گڑھ تحریک میں عملی حصہ لیا اور بہت فیاضی سے اس کی مالی اعانت بھی فرمائی۔ سرسید کی وفات علی گڑھ میں اسماعیل خاں صاحب ہی کے مکان میں ہوئی۔ ہارون خاں صاحب کے والد ماجد حاجی موسیٰ خاں صاحب بھی قومی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ وہ ایم۔ اے۔ او کالج کے ٹرسٹی، مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر اور مسلم لیگ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اوّلین بانیوں میں سے تھے اور کئی مذہبی اور سیاسی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔

پروفیسر ہارون خاں شروانی کی ابتدائی تعلیم قدیم شرفاء کے رواج کے مطابق گھر پر ہوئی۔ ان کے سب سے پہلے استاد مولانا امان الرحمٰن دہلوی تھے جن سے ہارون خاں صاحب ہمیشہ بہت متاثر رہے اور جن کا ذکر وہ ہمیشہ بہت عقیدت اور احترام کے ساتھ کرتے تھے۔ ہارون خاں صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں خود ان کے اپنے الفاظ میں حسب ذیل "پہلو نمایاں تھے۔ صداقت، خود اعتمادی، خدا ترسی، اپنے مستقبل کے ظاہری اسباب خود فراہم کرنا"[1]

ان ابتدائی نقوش نے پروفیسر شروانی کا حقیقی کردار تعمیر کیا اور مدة العمر ان کی شخصیت کے اہم اجزا رہے۔

۱۸۹۹ء میں آٹھ سال کی عمر میں وہ ایم۔ اے۔ او کالجیٹ اسکول، علی گڑھ کی دوسری جماعت میں داخل ہوئے، اپنی جماعت میں ہمیشہ اعلیٰ نمبروں سے

۱۔ پروفیسر شروانی مرحوم کے ذاتی مکتوب بنام مضمون نگار سے اقتباس

کام یاب ہوتے رہے اور اکثر اوقات سال میں دو دو جماعتوں میں ترقی حاصل کی۔ آٹھویں جماعت کا امتحان نمایاں طور پر پاس کرنے کے بعد انھیں ایک سال گورنمنٹ ہائی اسکول مراد آباد میں داخل کر دیا گیا۔ ہارون خاں صاحب نے اپنی امتیازی حیثیت وہاں بھی قائم رکھی اور جماعت میں تیسری پوزیشن حاصل کرکے اپنے اساتذہ اور ساتھیوں سے خراج تحسین وصول کیا۔ دسویں جماعت میں وہ دوبارہ علی گڑھ آگئے اور ۱۹۰۶ء میں اسکول فائینل کا امتحان صرف ۱۵ برس کی عمر میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ ان کے اسکول کے اساتذہ کی نظر میں ان کی بہت وقعت تھی اور وہ ان کی قابلیت اور شرافت دونوں کے معترف تھے۔

اُس زمانے میں شروانی خاندان میں کسی نوعمر لڑکے کا ہندوستان سے باہر جاکر تعلیم حاصل کرنا قطعاً بعید از قیاس تھا لیکن ہارون خاں صاحب کے والد ماجد حاجی موسیٰ خاں صاحب کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے کہ انھوں نے یہ روایت توڑ کر اپنے ہونہار بیٹے کے لئے کام رانی اور ترقی کی ایسی راہیں کھول دیں جو ان سے پہلے (بلکہ بعد میں بھی) کسی اور کی نظر میں نہیں آئی تھیں۔ انھوں نے ہارون خاں صاحب کو ساڑھے پندرہ برس کی مختصر عمر میں حصول تعلیم کی غرض سے انگلستان بھیج دیا۔ پروفیسر شروانی جون ۱۹۱۴ء تک تقریباً ساڑھے سات سال انگلستان رہے۔ اس دوران میں انھوں نے اپنے وقت کو زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کی کوشش کی تمام امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کئے اور سوشل زندگی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نیز مختلف اوقات میں بعض دیگر ممالک مثلاً فرانس، جرمنی، بلجیم، سوئٹزرلینڈ، اٹلی، آسٹریا وغیرہ کی سیاحت کرکے اپنے علم و تجربے میں اضافہ فرمایا۔ انھوں نے اپنے دیگر تعلیمی مشغلوں کے ساتھ فرانسیسی اور جرمن زبانیں بھی سیکھیں۔ شروع میں وہ پیراڈائس ہاؤس اسکول

میں داخل ہوئے جہاں انھوں نے تقریباً ۹ مہینے گزارے۔ وہاں کے زمانۂ قیام میں صغرسنی کے باوجود نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کے سرگرم رکن رہے اور اکتوبر ۱۹۰۷ء میں کیمبرج پریویس کے امتحان میں کامیابی حاصل کرکے کرائسٹس کالج، کیمبرج میں داخل ہوگئے۔ یہاں ان کا خاص مضمون تاریخ تھا۔ مسٹر ناظر الدین حسن (بعد میں نواب ناظر یار جنگ)، مسٹر سیف الدین کچلو اور مسٹر عبدالمجید خواجہ کی مشارکت میں انھوں نے کیمبرج مسلم ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی اور اس کے پہلے سکریٹری منتخب ہوتے۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء میں غیر رسمی طور پر آکسفورڈ یونیورسٹی کے طالب علم رہے اور اکتوبر ۱۹۰۹ء میں جلیس کالج آکسفورڈ میں داخلہ لے کر وہاں کے باقاعدہ طالب علم ہوگئے۔ یہاں بھی ان کا خصوصی مضمون تاریخ ہی رہا۔ یہاں ان کے غیر تدریسی مشاغل بھی پوری طرح جاری رہے۔ وہ مختلف سوسائیٹیوں اور انجمنوں سے وابستہ رہے اور مسٹر سید محمد حسین، مسٹر مرزا محمد علی بیگ اور مسٹر (بعد میں سر) طارق امیر علی کی اعانت سے آکسفورڈ اسلامک سوسائیٹی کی تاسیس فرمائی اور اس کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے۔ اس زمانے میں مرحوم ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے اولڈ بوائز نے لندن میں ایک انجمن قائم کی تھی۔ پروفیسر شروانی اس کے سرگرم کارکن اور اس کی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں وہ آکسفورڈ یونیورسٹی انڈینس کلب کے صدر منتخب ہوئے اور اسی مہینے کے آخر میں انھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے تاریخ جدید اور سیاسیات میں بی۔ اے (آنرز) کی ڈگری حاصل کی۔ اس موقع پر ان کے بیشتر اساتذہ اور ممتحنین نے ان کے کام کی وقعت کا شاندار الفاظ میں اعتراف کیا۔ اسی زمانے میں ان کا انگریزی میں پہلا مضمون بعنوان "مجوزہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ" اس وقت کے ہندوستان کے موقر ترین جریدے "کامریڈ" میں شائع ہوا۔

بی۔ اے (آنرز) کرنے کے بعد پروفیسر شروانی آکسفورڈ سے لندن منتقل

ہوگئے اور وہاں کے ہندوستانی حلقوں میں نام پیدا کرنا شروع کر دیا ۔ وہ ۱۹۱۲ء میں لندن کی سب سے بڑی ہندوستانی انجمن "لندن انڈین ایسوسی ایشن" کے سکریٹری اور ۱۹۱۳ء میں اس کے صدر منتخب ہوئے ۔ انھوں نے ۱۹۱۴ء میں بیرسٹری کی سند حاصل کی اور وطن واپس آگئے ۔ ہندوستان پہنچ کر انھوں نے علی گڑھ میں بیرسٹری شروع کی لیکن یہ پیشہ انھیں اپنے علمی و ادبی رجحانات کے منافی نظر آیا ۔ علاوہ ازیں ان کے دل میں قومی خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہوا ۔ چناں چہ انھوں نے ۱۹۱۶ء میں اپنی خدمات مجوزہ سلطانیہ کالج ، دہرہ دون کو پیش فرما دیں ۔ کالج کمیٹی کے سکریٹری ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے ان کی پیش کش شکریئے کے ساتھ قبول کی اور انھیں لکھا : "قوم آپ کی ہمیشہ شکر گزار رہے گی کہ آپ نے ایسی عظیم الشان قربانی کرکے اس کی خدمت انجام دینے کا عزم فرمایا ہے ۔" پروفیسر شروانی کی زندگی کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا فطری رجحان عملی سیاست کی طرف نہیں تھا لیکن سیاسیات کے طالب علم کی حیثیت سے انھیں اس کے عملی مطالعے سے ضرور دلچسپی تھی ۔ چنانچہ انھوں نے دسمبر ۱۹۱۶ء میں انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں شرکت فرمائی اور واقعات کا بغور جائزہ لیا ۔ وہ ۱۹۱۷ء میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن علی گڑھ کے جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے ۔

۱۹۱۹ء سے پروفیسر شروانی کی زندگی کا نیا اور زیادہ شان دار دور شروع ہوتا ہے جب ان کا تعلق عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد سے بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ تاریخ و سیاسیات قائم ہوا ۔ شروانی صاحب نے اپنے فرائض منصبی اتنی قابلیت اور جاں فشانی سے انجام دیئے کہ دو سال کی قلیل مدت میں ترقی کرکے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہو گئے ۔ اسی سال وہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف انگلینڈ کے ممبر منتخب ہوئے ۔ حیدر آباد میں پروفیسر شروانی کے ذوقِ

مضمون نگاری کو مزید تحریک ہوتی اور ان کا فاضلانہ مضمون "اردو زبان اور جدید سائنٹیفک ضروریات" رسالہ "اردو" اورنگ آباد میں شائع ہوا۔ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے ایڈولف ہوم کی "تاریخ یونان" کا اردو میں ترجمہ شروع کیا جو ۱۹۲۴ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچا اور چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوا۔ ۱۹۲۵ء میں ان کا ایک اور مضمون "تاریخ ہند کے زریں اوراق" ماہنامہ "ہمایوں" لاہور میں چھپا۔ ۱۹۲۶ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے ان کی خدمت میں ایم۔ اے کی اعزازی ڈگری پیش کی جس کے وہ ہر طرح اہل تھے۔ اسی سال پروفیسر شروانی فریضۂ حج سے سبک دوش اور زیارت روضۂ اطہر سے مشرف ہوئے نیز طائف کا سفر کیا جہاں ان کے جدّ امجد نواب حاجی فیض احمد خاں مرحوم آسودۂ خاک ہیں۔ حجاز سے واپس آکر پروفیسر شروانی نے مزید دو مضمون

"A NEW THEORY OF SOVEREIGNTY" اور

"FIVE GREAT ORIENTAL POLITICAL PHILOSOPHERS"

تحریر فرمائے جو بالترتیب "عثمانیہ میگزین" اور "اسلامک کلچر" حیدرآباد میں شائع ہوئے۔

اکتوبر ۱۹۲۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے اربابِ حل وعقد نے ہارون خاں صاحب کی خدمت میں شعبۂ تاریخ وسیاسیات کی کرسیِ صدارت پیش کر کے اپنی مردم شناسی اور قدر دانی کا ثبوت دیا۔ پروفیسر شروانی کا ذوق تصنیف وتالیف برابر ترقی پذیر رہا جس کے نتیجے میں ان کی اہمیت اپنے معاصرین کی نگاہ میں بہت بلند ہو گئی۔ جنوری ۱۹۳۱ء میں ان کا ایک مضمون "درجۂ نوآبادیات" ماہنامہ "نیرنگِ خیال" لاہور میں چھپا۔ مئی ۱۹۳۲ء میں وہ رایل ہسٹاریکل سوسائٹی لندن کے ممبر اور ۱۹۳۴ء میں رایل سوسائٹی آف آرٹس کے فیلو منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں انھوں نے "مختصر تاریخ دکن" تصنیف فرمائی جس کے پانچ ایڈیشن تقسیم ہند سے قبل نکل چکے تھے اور جس کا مرہٹی اور تلگو میں ترجمہ

بھی ہوا تھا۔ پروفیسر شروانی نے مختلف زبانوں سے تراجم کے ذریعہ اردو کو مالا مال فرمایا نیز مختلف مواقع پر تاریخ اور سیاسیات کے اہم موضوعات پر تقریریں کر کے اور مقالات پڑھ کر خراجِ تحسین حاصل کیا۔ اس دوران شروانی صاحب مختلف تعلیمی اداروں کی رکنیت پر فائز ہوتے رہے مثلاً ۱۹۳۶ء میں انھیں سیکنڈری ایجوکیشنل بورڈ اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کا ممبر منتخب کیا گیا۔ ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے رکن منتخب ہوئے اور ۱۹۴۰ء میں علی گڑھ ہسٹاریکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل کیے گئے۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک انٹر یونیورسٹی بورڈ آف انڈیا کے سکریٹری رہے۔ انٹر یونیورسٹی اسپورٹس بورڈ کی سکریٹری شپ کے فرائض بھی نہایت قابلیت اور جانفشانی سے انجام دیئے۔ دونوں مذکورہ بالا اداروں نے جائزہ دیتے وقت شروانی صاحب کی خدمات کا شاندار الفاظ میں اعتراف کیا۔

پروفیسر شروانی کے مذہبی رجحانات نے اُن کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا۔ چناں چہ انھوں نے ایک بیش بہا رسالہ "حکومت قرآنی" کے زیرِ عنوان تحریر فرمایا جو مُجلس مرکز اشاعت قرآن حکیم" لاہور کی جانب سے کثیر تعداد میں چھپوا کر مُفت تقسیم کیا گیا۔ نیز ایک کتاب

" STUDIES IN ISLAMIC POLITICAL THOUGHT AND ADMINISTRATION لکھی جس کے کئی ایڈیشن شائع ہوتے اور جو بہت مقبول ہوئی۔ انھوں نے رینا ڈ (REINAUD) کی فرانسیسی کتاب، جو مسلمانوں کی فرانس اور سوئٹزر لینڈ پر حکومت سے متعلق ہے، کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا۔

پروفیسر شروانی کی دو قابلِ قدر تصانیف "مبادی سیاسیات" اور

" MAHMUD GAWAN., THE GREAT BAHMANI VIZIR

۱۹۴۱ء میں شائع ہوئیں اور انھوں نے ملک کے لائق علمائے تاریخ اور سیاسی رہنماؤں سے خراج تحسین وصول کیا۔ ثانی الذکر تصنیف پر مسز سروجنی نائیڈو کی درج ذیل رائے خاص طور سے لائق مطالعہ ہے :

> آپ کی دلچسپ کتاب .... تحقیق کے میدان میں آپ کی محنت شاقہ اور دیدہ ریزی کا شاندار نتیجہ ایک ایسا تاریخی مرقعہ ہے جیسا آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ عہد وسطیٰ کے دکن کی متواتر تغیر پذیر تاریخ میں جو شخصیتیں رونما ہوتی رہی ہیں ، ان میں آپ کا ہیرو بے حد نمایاں اور زندگی سے بھرپور ہے ، یہ آپ کے اسلوب نگارش کا رہین منت ہے ۔

پروفیسر شروانی کی ایک اور قیمتی کتاب " THE BAHAMANIS AND THEIR CULTURE " ہے ۔ دکن کی عہد وسطیٰ کی تاریخ پر پروفیسر موصوف کا کام برابر جاری رہا اور حصول آزادی کے بعد بھی انھوں نے اس میدان میں کئی قابلِ قدر علمی کارنامے انجام دیئے ۔ تاریخ دکن سے متعلق ان کی بعض دوسری تصانیف اور ان کے سنینِ اشاعت درجِ ذیل ہیں :

(1) THE BAHMANI KINGDOM (1947) : (2) THE BAHAMANIS OF THE DECCAN (1953) ; (3) THE REIGN OF SULTAN MOHD. QUTB SHAH (1962) . (4) MOHD QULI QUTB SHAH (1967) : (5) HISTORY OF THE QUTB SHAHI DYNASTY (1974)

لیکن تاریخ دکن پر ان کا سب سے عظیم کارنامہ ، جس کا منصوبہ انھوں نے کئی سال قبل بنایا تھا " HISTORY OF MEDIEVAL DECCAN " ہے جس کی پہلی جلد ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔ اس پر وہ اس وقت تک برابر کام کرتے رہے جب

تک ان کی صحت نے بالکل ہی جواب نہ دے دیا۔ راقم الحروف جون ۱۹۴۸ء میں ان کی خدمت میں حیدر آباد حاضر ہوا تھا۔ اس وقت وہ بعض اعصابی امراض میں مبتلا تھے اور سوائے ان کے داہنے ہاتھ کے جسم کے دیگر اعضا تقریبًا بالکل جواب دے چکے تھے۔ لیکن اُس وقت بھی اُن کا دماغ اسی طرح کام کر رہا تھا جیسے ایام صحت میں کرتا تھا۔ ان کے لٹریری اسسٹنٹ روز صبح کو ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور وہ مذکورہ بالا کتاب کی دوسری جلد کے نوٹس ان سے پڑھوا کر سنتے تھے اور ان میں ضروری ردّ و بدل تجویز فرماتے تھے۔ علم سے ان کا یہ شغف اور علمی مسائل میں ان کا یہ تبحر ایک ایسا تجربہ تھا جس کی کوئی دوسری مثال اس وقت تک نظر سے نہیں گزری ہے۔

پروفیسر شروانی کی ۱۸ ریڈیائی تقریروں کا ایک مجموعہ "نشریات" کے عنوان سے ۱۹۴۷ء سے قبل شائع ہوا تھا جس میں مذہبی، معاشی، معاشرتی، سیاسی اور علمی مباحث پر مفید اور دلچسپ تقریریں شامل تھیں۔ ۱۹۳۸ء میں انھوں نے

" INTERNATIONAL CONGRESS OF HISTORICAL SCIENCES "

منعقدہ زیورخ میں ہندوستان کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت فرمائی اور یورپ کے بعض دیگر ممالک انگلستان، فرانس، اٹلی، یونان، ترکی، بلغاریہ، یوگوسلاویہ کی سیاحت بھی کی۔ اس سیاحت کے حالات و تاثرات انھوں نے اپنے سفرنامے موسومہ "یوروپ جنگ سے پہلے" میں قلم بند فرمائے۔ اس کتاب کے مطالعے سے پروفیسر شروانی کی شخصیت کے کئی اہم پہلوؤں پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ کانگرس میں انھوں نے اپنا مقالہ بعنوان

" ISLAMIC POLITICAL THOUGHT, ITS PLACE IN THE SCHEME OF POLITICAL SCIENCE "

ارشاد فرمایا اور کانگرس کے غیر یوروپی تاریخی سیکشن (NON-EUROPEAN HISTORY SECTION) کی صدارت فرمائی۔ انھوں نے اپنے سفرنامے میں

جن امور کی نشان دہی فرمائی تھی ان پر عام طور سے بہت کم لوگوں کی نظر جاتی ہے۔ ساتھ ہی یہ سفرنامہ ان کی حب الوطنی اور اسلام دوستی کی بہت اچھی دستاویز بھی ہے لیکن ان کی حب الوطنی اور اسلام دوستی جذباتیت سے ماورا تھی۔ انھیں جس ملک میں جو خوبی نظر آئی ان کی خواہش تھی کہ وہ خوبی ہندوستان کو بھی حاصل ہو۔ اسی طرح اسلام دوستی کے باوصف مسلمانوں کی بے راہ روی کی نشان دہی کرنے میں بھی انھوں نے کوتاہی نہیں فرمائی۔ بایں ہمہ متعصب بالکل نہیں تھے بلکہ دوسرے ممالک اور وہاں کے باشندوں کے اوصاف حمیدہ کی داد انھوں نے بڑی فیاضی سے دی ہے۔ ترکی سے ہندوستانی مسلمانوں کو ہمیشہ جذباتی وابستگی رہی ہے۔ پروفیسر شروانی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ تاہم اس سفرنامے میں ترکی کے باب میں ان کا نقطۂ نظر بہت متوازن نظر آتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب مصطفیٰ کمال پاشا ابھی حیات تھے اگرچہ ان کا آخری دور حکومت تھا۔ پروفیسر شروانی کمال اتاترک کی خوبیوں کے مدّاح تھے لیکن ان کی کوتاہیوں کی طرف سے بھی انھوں نے اس سفرنامے میں صرفِ نظر نہیں کیا ہے۔ جب پروفیسر شروانی نے چار مہینے کے بعد ساحلِ ہند پر ایک مرتبہ پھر قدم رکھا تو یہاں کے افلاس، غلامانہ ذہنیت اور غیر ملکی حکومت کی بدانتظامی کو دیکھ کر اور اس کا آزاد ملکوں کی حالت سے موازنہ کرکے انھیں دلی صدمہ ہوا اور ان کی خواہش ہوئی کہ ہندوستان بھی آزاد ہو اور آزادی کی نعمتوں سے بہرہ ور۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کی یہ خواہش چند سال کے بعد پوری ہوئی اور وہ خاصی طویل مدت تک آزاد ہندوستان کی تعمیر جدید میں اپنے حدود کے اندر حصّہ لینے کے لئے حیات رہے۔

حصول آزادی سے قبل اور اس کے بعد پروفیسر شروانی کے علمی اعزازات کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ وہ حصول آزادی سے قبل آل انڈیا ہسٹری کانگریس کے شعبۂ تاریخ وسطیٰ کے صدر، آل انڈیا پولیٹیکل ایسوسی ایشن کے نائب صدر

اور دکن ہسٹری کانفرنس کے شعبۂ وسطیٰ کے صدر رہے۔ ۱۹۴۵ء میں ان کا تقرر نظام کالج حیدر آباد کے پرنسپل کے عہدے پر ہوا۔ اگرچہ یہ ان کے لئے نیا تجربہ تھا، تاہم انھوں نے اپنے اس عہدے کے فرائض منصبی بھی نہایت لیاقت، تدبر اور جاں فشانی سے انجام دیئے۔ ستمبر ۱۹۴۶ء میں پروفیسر شروانی اینگلو عربک (حال ذاکر حسین) کالج کے پرنسپل ہو کر دہلی تشریف لے آئے۔ لیکن ابھی انھیں وہاں آئے ہوئے ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ تقسیم ملک کا المیہ پیش آ گیا۔ اور اس کی زد میں پنجاب کے بعد سب سے زیادہ دہلی آئی۔ اینگلو عربک کالج پر بھی شرنارتھیوں کا حملہ اور قبضہ ہو گیا۔ پروفیسر شروانی نے اس وقت تک وہاں قیام فرمایا جب تک کالج کے پورے عملے کو بحفاظت وہاں سے منتقل نہیں کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ حیدر آباد تشریف لے گئے۔ جب کئی مہینے کے بعد دہلی کی صورت حال کسی قدر بہتر ہوئی تو وہ دوبارہ دہاں تشریف لائے لیکن ابھی تک کالج اور اس کے گردونواح پر بیشتر شرنارتھیوں کا قبضہ تھا اور کالج کے املاک کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچ چکا تھا۔ کالج کے دوبارہ جلدی کھلنے کا امکان بہت کم تھا۔ ان حالات میں پروفیسر شروانی نے اپنا وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور کالج کی پرنسپل شپ سے مستعفی ہو کر حیدر آباد واپس چلے گئے جہاں ان کا تقرر دوبارہ عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ سیاسیات کے پروفیسر اور صدر کی حیثیت سے ہو گیا۔ ۱۹۴۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ ہندوستان کے آئین کے مسودے کا اردو میں ترجمہ کرے۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ انھوں نے یہ خدمت نومبر ۱۹۴۷ء سے فروری ۱۹۴۸ء تک پوری جاں فشانی اور تن دہی سے انجام دی اور اس دوران ان کا قیام زیادہ تر دہلی ہی رہا۔ وہ ۱۹۵۱ء میں ملازمت سے سبک دوش ہو گئے لیکن علمی اور سماجی کاموں میں ان کا انہماک نہ صرف بدستور جاری رہا بلکہ اس میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ۱۹۵۲ء میں انڈین پولیٹیکل سائنس کانفرنس کے پندرھویں

سیشن منعقدہ علی گڑھ کی انھوں نے صدارت فرمائی ۔ اس موقع پر انھوں نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا اس میں ہندوستان کے ۶ ممتاز سیاسی رہنماؤں کے کارناموں کا جائزہ لیا گیا تھا اور ان کی قدر و قیمت متعین کی گئی تھی ۔ لاہور میں ۱۹۵۴ء میں کامن ویلتھ ریلیشنز کی غیر سرکاری کانفرنس منعقد ہوئی وہ اس میں ہندوستانی رکن کی حیثیت سے شریک ہوئے ۔ اسی طرح ۱۹۵۵ء میں ایشین سالیڈیریٹی کانفرنس منعقدہ نئی دہلی میں نہ صرف انھوں نے شرکت فرمائی بلکہ اس کے سیاسی کمیشن کی صدارت بھی کی ۔

پروفیسر شروانی کو ۱۹۵۸ء میں گورنر آندھرا پردیش نے ریاست کی قانون ساز کونسل کا رکن نامزد کیا اور وہ ۱۹۶۴ء تک اس کے رکن رہے ۔ کونسل کے چیرمین نے انھیں صدارتی پینل کا ممبر بھی مقرر کیا جس کے فرائض انھوں نے اپنے مزاج کے مطابق مضبوطی اور غیر جانب داری سے انجام دیتے ۔ کونسل کی رکنیت کے دوران ان کی توجہ کا مرکز تعلیمی مسائل کے علاوہ سب سے زیادہ اُردو کا مسئلہ رہا اور اردو کے حق میں انھوں نے ہمیشہ پوری جرأت اور قابلیت سے آواز بلند کی ۔ اس زمانے میں انھیں احساس ہوا کہ اپنے فرائض منصبی کماحقہ انجام دینے کے لئے تلیگو سے واقفیت ضروری ہے جو ریاست کی سرکاری زبان تھی ۔ چناں چہ انھوں نے ستر سال کی پختہ عمر میں یہ زبان سیکھ لی ۔

پروفیسر ہارون خاں شروانی نے انڈین ہسٹاریکل کانگریس کے جوبلی سیشن منعقدہ پونا کی ۱۹۶۳ء میں صدارت فرمائی ۔ ۱۹۶۴ء میں ہانگ کانگ میں ایشین اسٹڈیز کی انٹرنیشنل کانفرنس منعقد ہوئی جس میں وہ ہندوستانی وفد کے لیڈر کی حیثیت سے شریک ہوئے اور سینٹرل ایشین ہسٹری سیکشن کی صدارت کے فرائض انجام دیئے ۔ اسی سال عہد وسطیٰ کے دکن کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے ایک اسکیم وضع کی گئی جس کے وہ ایڈیٹر مقرر کیے گئے ۔ ۱۹۶۹ء میں ان کی علمی، ادبی اور سماجی خدمات کے اعتراف کے طور پر صدر جمہوریۂ ہند نے انھیں "پدم بھوشن" کے اعزاز سے

مفتخر فرمایا۔ جب اس وقت کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین (مرحوم) انھیں یہ اعزاز مرحمت فرما رہے تھے تو انھوں نے شروانی صاحب سے فرمایا کہ اس عمر میں آپ کی قوت کارکردگی دیکھ کر کام کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ ۱۹۷۵ء میں حکومت آندھرا پردیش نے ان کی خدمت میں ایک نذر ان گرنتھ پیش کیا جس کا عنوان

" STUDIES IN FOREIGN RELATIONS OF INDIA "

تھا۔ اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر پی۔ ایم۔ جوشی تھے جو عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر شروانی کے جونیر رہ چکے تھے اور اس مقصد سے جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ اس کے صدر اس وقت کے مہاراشٹر کے گورنر نواب علی یاور جنگ (مرحوم) تھے۔ علی یاور جنگ صاحب بھی عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر شروانی کے جونیر رہے تھے۔ انھوں نے کتاب کے مقدمے میں اعتراف کیا ہے کہ شروانی صاحب کے ساتھ کام کرکے انھوں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ موصوف کی خدمت میں حکومت آندھرا پردیش کی طرف سے یہ کتاب ریاست کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ شری جے، وینگل راؤ نے پیش کی۔ ۱۹۷۶ء میں پروفیسر شروانی کو ایک اور علمی اعزاز حاصل ہوا جو انھیں سب سے زیادہ عزیز تھا کیوں کہ وہ ان کی اوّلین مادر درس گاہ کی طرف سے پیش کیا گیا تھا جس کے ساتھ انھیں ہمیشہ قلبی لگاؤ رہا تھا۔ یہ اعزاز ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری تھی جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے پیش کی گئی۔ ۱۹۷۸ء میں وہ رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے فیلو منتخب ہوئے اور ۱۵ ستمبر ۱۹۸۰ء کو طویل اور تکلیف دہ علالت کے بعد (جسے انھوں نے نہایت صبر و شکر کے ساتھ انگیز فرمایا) ۸۹ سال کی عمر میں حیدر آباد میں (جو ان کا وطن ثانی تھا) وفات پائی اور اس طرح ایک بھرپور، کام یاب اور مفید زندگی کا خاتمہ ہو گیا جو ہر ذی روح کا یقینی انجام ہے۔

پروفیسر ہارون خاں شروانی کی زندگی پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک مقصد قرار دیا تھا اور آخر دم تک اُس

مقصد کے حصول کے لئے اپنی ساری توانائی اور ساری صلاحیتیں وقف رکھیں۔ ان کی زندگی کا مقصد خدمتِ علم تھا۔ انھوں نے علم اپنے وقت کی اعلیٰ ترین تعلیم گاہوں میں حاصل کیا اور ذاتی مطالعے سے اسے مزید وسعت دی۔ تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعے اپنے علم سے دوسروں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا اور زندگی کی آخری سانس تک اس پاکیزہ مشغلے میں منہمک رہے۔ وہ جاگیردار طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور انھیں کسب معاش کے لئے ملازمت کی بالکل ضرورت نہیں تھی۔ تاہم وہ گھر سے سینکڑوں میل دور دیارِ غیر میں اپنی دنیا آپ بسانے کی خاطر جا بسے جہاں رہ کر پوری یک سوئی اور تن دہی سے انھوں نے زندگی کے ہر میدان میں گھوڑے دوڑانے کی کوشش نہیں کی جیسا کہ ہم میں سے اکثر لوگ کرتے ہیں اور جس کے نتیجے میں ان کے ہاتھ بہت کم آتا ہے۔ بے شک ان کا سماجی شعور بیدار تھا اور انھوں نے اپنے کو اپنے گردوپیش سے الگ کر کے کسی خیالی گنبد میں بند کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کی نظر ہمیشہ اپنے مقصد پر رہی اور اس مقصد کو انھوں نے اپنی زندگی کے کاروبار میں اولین اہمیت دی۔ یہ واقعہ ہے کہ اپنے حصول مقصد کی خاطر انھوں نے اکثر مالی نقصان بھی اٹھایا اور اس کی ذرا پرواہ نہیں کی۔ گھر سے دور خدمتِ علم میں مصروف رہنے کی بنا پر وہ اپنی آبائی جائداد سے وہ فائدہ کبھی نہیں اٹھا سکے جو بصورتِ دیگر اٹھا سکتے تھے لیکن یہ نقصان انھوں نے خندہ پیشانی سے برداشت فرمایا اور اس کی گردِ ملال اِن کے روئے زیبا پر کسی نے نہیں دیکھی۔ پروفیسر شروانی کے قریبی بزرگ اور میرے جدِ امجد نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم اکثر فرماتے تھے کہ "اگر ہارون خاں میاں حیدرآباد نہ چلے جاتے اور یہیں رہتے تو خاندان کے دوسرے لوگوں کی مانند جائداد کے جھگڑوں میں پھنسے رہتے اور وہ علمی کام نہ کر سکتے جو کر رہے ہیں۔" خدمت علم کے ساتھ ساتھ پروفیسر ہارون خاں شروانی کے انکسار، خلوص، خوش مزاجی اور سادگی

کی ذات میں ایسی جاذبیت اور دل کشی پیدا کر دی تھی جس کا کوئی دوسرا
م سے کم میری نظر سے نہیں گزرا ــ زمانے کا جو رنگ ہے اور جس طرح
سبِ مال کو خدمت علم پر فوقیت حاصل ہو گئی ہے اس کے پیشِ نظر اس
قع کم ہی ہے کہ مستقبل قریب میں ان کی خالی کی ہوئی جگہ پُر ہو سکے گی۔

پروفیسر ہارون خاں شروانی کی کتاب "ہندوستان کا دستور اور اس کی مختصر شرح" کے پیش لفظ میں جو تلگو اردو اکاڈمی برائے سائنس و تاریخ، حیدرآباد سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی ہے، اندھرا پردیش لیجسلیٹو کونسل کے چیرمین جناب ماڈبنی ہنمنت راؤ نے لکھا ہے کہ:

"دستور حکومت بنا بر نقطۂ نظر سے ایک اہم دستاویز ہے جس کا صحیح اور عام فہم ترجمہ مع شرح ہندوستان کی ہر زبان میں مہیا ہونے کی ضرورت ہے۔ میں نے کئی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ بزبان اردو ایسی کتاب شائع ہونا نہایت ضروری ہے۔ مجھے خوشی ہوتی ہے کہ پروفیسر شروانی صاحب نے اس کمی کو بڑی قابلیت کے ساتھ نہایت تیزی سے دور کر دیا ہے۔ ایک دقت جو ایسی کتاب کو کسی ملکی زبان میں لکھتے وقت پیش آتی ہے، یہ ہے کہ الفاظ اصطلاحی موزوں طریقے پر دستیاب نہیں ہوتے اور جب ایک انگریزی لفظ کے لیے کسی زبان میں ایک سے زیادہ الفاظ نظر آتے ہوں تو صحیح اور موزوں لفظ کے چننے میں صواب دید کا استعمال مشکل ہو جاتا ہے، اس دشواری کو حل کرنے میں پروفیسر شروانی نے بہترین اختیار تمیزی کا اظہار فرمایا ہے جو قابل ستائش ہے۔"

شہاب الدین انصاری

ڈاکٹر انصاری کے چند خطوط

ڈاکٹر انصاری کے خطوط سے ایک شفیق باپ کی شخصیت جھلکتی ہے، ایک ایسا باپ جو اپنے بچوں کے لئے کوئی بھی قربانی دینے کو تیار ہے جو اپنے سماجی رجحانات کے لحاظ سے اپنے ہم عصروں اور خاندان کے دوسرے افراد سے کہیں آگے ہے لیکن جو مشرقی روایات کا حامل بھی ہے اور دوسروں کے جذبات کا بھی خیال کرتا ہے۔ یہ چند خطوط ہیں اور بہت مختصر مدت کا احاطہ کرتے ہیں لیکن ان خطوط میں وہ ایک ایسے فرد کی حیثیت سے نظر آتے ہیں جو بے تکلفی سے اپنے بچوں سے گفتگو کر رہا ہو، کبھی ان پر غصہ کر رہا ہو، کبھی انھیں سمجھا رہا ہو، کبھی ان کی نازبرداری کر رہا ہو اور کبھی انھیں دنیا کے نشیب و فراز سے واقف کرا رہا ہو۔

ان خطوط میں ہمیں ان کے خیالات کی جھلک ملتی ہے، کہیں وہ اپنے بچوں کو اپنے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں نہ بلائے جانے کی وجہ سمجھاتے ہیں تو کہیں انھیں الیکشن لڑنے کے طریقے سمجھاتے ہیں۔ کہیں ہندوستان کے لوگوں کی ناعاقبت اندیشی کے قصے سناتے ہیں تو کہیں تعلیم کے طریقے اور مقصد سمجھاتے ہیں۔ لڑکیوں کے لئے تعلیم کے مقصد کو ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں:

"تم کو امتحان پاس کرانا نہیں ضروری ہے۔ علم، تجربہ، دنیا کے جدید حالات ترقی وغیرہ سے پوری طور پر واقفیت

جناب شہاب الدین انصاری، لائبریرین ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

حاصل کرانا مقصود ہے تاکہ تم ایک جدید تعلیم یافتہ خاتون بن کر
جدید تمدن اور تہذیب سے بھی پورے طور پر بہرہ ور رہو۔"
[بنام زہرہ بیگم از ماؤ نا وہائیم، جرمنی، یکم ستمبر ۱۹۳۲ء]

وہ تعلیم پر صحت کو مقدم سمجھتے ہیں:

"پیاری منو، تم نوشت و خواند کے پیچھے اپنی صحت کو خدا کے
لئے تلف نہ کرو اگر تم خدانخواستہ بیمار ہوگئیں تو میں تردد
اور فکر کے مارے تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔"
[بنام زہرہ بیگم از ویانا، ۱۰ ر جون ۱۹۳۴ء]

"دیکھو بیٹی پڑھائی کے علاوہ اپنی صحت کا خیال بہت رکھنا اگر
خدانخواستہ تم بیمار ہوئیں تو اس کمزور صحت میں تمھاری
علالت کی فکر مجھ کو مار ڈالے گی۔ ہفتہ وار آرام کیا کرو اور دماغ
کو راحت پہونچانے کے لئے تفریح کے لئے سینما جایا کرو۔"
[بنام قدسیہ بیگم از بیٹینیالی ۲۴ ر جون ۱۹۳۴ء]

ڈاکٹر انصاری کو اپنے بزرگوں اور عزیزوں کے جذبات کا کتنا خیال تھا۔ وہ زہرہ بیگم کو اپنے ساتھ یورپ کے سفر پر لے جانا چاہتے تھے لیکن یہ بھی جانتے تھے کہ اس بات سے ان کے بڑے بھائی کو صدمہ ہوگا، چنانچہ باوجود اپنی خواہش کے انھوں نے اپنے بھائی کے جذبات کو مقدم جانا۔ زہرہ بیگم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آصف کی دعوت میں نہ جانا ہی مناسب ہوا۔ ابھی ہماری
سوسائٹی اس قابل نہیں کہ یک بیک تمھارا پردہ اٹھادیا
جائے۔ خاندان میں بڑی آفت مچے گی، لوگوں کو صدمہ اور
رنج پہونچانے سے کیا فائدہ۔"
[بنام زہرہ بیگم از ویانا، ۱۲ ر جون ۱۹۳۴ء]

اس صدی کے تیسرے دہے میں وہ جرمنی میں تھے، وہاں ہٹلر نے ریفرینڈم کرایا تھا۔ جس کروفر اور جزئی انتظام کے ساتھ رائے عامہ کو متاثر کیا گیا تھا اس سے ڈاکٹر انصاری بہت متاثر ہوئے اور ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان میں اسمبلی کے الیکشن کی کنویسنگ انہی خطوط پر کی جائے۔ لیکن پھر انھیں اپنی قوم کی کم عقلی کا خیال آیا، چنانچہ لکھتے ہیں:

"ہمارے یہاں تو ہندو مسلمان، کانگریسی و کانگریسی سوشلسٹ اور کیپٹلیسٹ، لیبر اور ایمپلائیرمیں خوب جوتی بیزار اور اجنبی حکومت کا تسلط خوب مضبوط... محکوم قوموں کی سمجھ کو سب سے قبل نقصان ہوتا ہے... کمبخت لڑے جائیں گے نہ آگا دیکھیں نہ پیچھا۔ عقل ایک رتی نہیں۔ اپنے آپ کو دنیا سے زیادہ عقلمند سمجھیں گے۔"

[بنام زہرہ بیگم از باونا وہائیم جرمنی، ۲۴ اگست سنہ ۱۹۳۴ء]

ڈاکٹر انصاری بچوں کی تربیت پر کڑی نگاہ بھی رکھتے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ تعلیم کے بہانے سے وقت برباد کیا جائے۔ اپنے ایک خط میں شوکت اللہ شاہ کو لکھتے ہیں:

"تعلیم تو ایسی چیز ہے کہ اس کو جتنا چاہو وسیع کر لو لیکن تعلیم وہی ٹھیک ہوتی ہے جو نتیجہ خیز ہو۔"

[بنام شوکت اللہ شاہ، از ڈسٹرکٹ جیل دہلی، ۱۸ جون سنہ ۱۹۳۲ء]

اگر شوکت اللہ شاہ خط نہیں لکھتے تو انھیں سختی سے اس کی تنبیہ کرتے ہیں لیکن جب ان کا خط آجاتا ہے اور غلط فہمی دور ہو جاتی ہے تو پھر اپنا دل بھی کھول کر رکھ دیتے ہیں:

"ہمیں ایک دوسرے سے کھل کر اور صاف صاف گفتگو کرنی چاہیئے۔ یہی ایک طریقہ ہے ایک دوسرے کو سمجھنے کا

اور اسی طرح ہم ایک دوسرے پر مکمل بھروسہ کریں گے اور ایک
دوسرے سے محبت کریں گے۔ محبت کی بنیاد اگر ایک۔۔
دوسرے کی ذات کو سمجھ کر ہو اسی وقت یہ دیرپا ہوتی ہے۔
مجھے تعجب ہے کہ تم مجھ سے ڈرتے تھے۔ کیوں ؟ کس لئے ؟

[بنام شوکت اللہ شاہ از بادناؤہیم، ۱۶ر نومبر ۱۹۳۲ء]

ایک دوسرے خط میں شوکت اللہ شاہ کو زمانہ کی نیچ اونچ سمجھانے کے بعد لکھتے ہیں :

"میں تم کو یہ اس وجہ سے لکھتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے اور
میرا فرض ہے کہ تمہارے اخلاق کی نگرانی کروں۔"

[بنام شوکت اللہ شاہ از لوزان ، ۲ر جولائی ۱۹۲۵ء]

وہ شوکت اللہ شاہ کے خط نہ لکھنے کی عادت پر اُن سے خفا بھی ہو جاتے ہیں انھیں سخت سُست بھی کہتے ہیں لیکن اگر انھیں ان کی کسی پریشانی اور علالت کا علم ہوتا ہے تو بے چین بھی ہو جاتے ہیں :

"گذشتہ مہینہ غلام محمد آئے۔ انھوں نے بتایا کہ جب انھوں
نے تمھیں جنوری میں دیکھا تھا تو تم بیمار تھے ، اس اطلاع
سے میں بہت پریشان ہو گیا ہوں۔ اب مجھے یورپ آنے
کی ایک اور وجہ مل گئی ہے تاکہ میں تمھیں اپنے ساتھ تفریح
کے لئے لے جا سکوں۔"

[بنام شوکت اللہ شاہ از دہلی جیل ، ۲۰ر اپریل ۱۹۳۲ء]

ڈاکٹر انصاری ۱۹۳۲ء میں جیل میں تھے ان کی صحت خراب تھی وہ جیل سے رہا ہو کر یورپ تبدیلی آب و ہوا اور علاج کے لئے جانا چاہتے تھے لیکن پیسے کی کمی نے ان کی راہ میں رکاوٹ ڈال رکھی تھی ، چنانچہ اس سے پہلے شوکت اللہ شاہ کو جو خط جیل سے لکھا تھا اس میں اپنے ارادہ کے اظہار کے ساتھ ساتھ یہ جملے

بھی تھے :

"صرف پیسہ راہ کی رکاوٹ ہے۔ تمھیں معلوم ہے اس کا کیا مطلب ہے ... یورپ آنے سے پہلے مجھے دس ہزار روپوں کی ضرورت ہے اور یہ مسالہ (مسئلہ) ہے"

[بنام شوکت اللہ شاہ از دہلی جیل، ۳۰ مارچ ۱۹۳۲ء]

اپنے بچوں کو پیسہ ضائع کرنے سے منع کرتے ہیں تو اس طرح کہ انھیں اپنے تعلیمی زمانے کی مشکلات کی تفصیل بتاتے ہیں :

"اسکول کے لئے ہمیں روزانہ تین چار میل پیدل چلنا پڑتا تھا۔ ہمارے ناشتہ میں صرف دال روٹی ہوتی تھی۔ میں تمھیں یہ اس لئے لکھ رہا ہوں تاکہ تمھیں یہ انداز ہو جائے کہ ہم پریشانی کے دور سے گزر کر یہاں پہونچے ہیں ... میں تمھارے واسطے بہترین (تعلیمی) سہولت مہیا کر رہا ہوں۔"

ایک دوسرے خط میں نصیحت کا انداز زیادہ مشفقانہ ہے :

"دیکھو بیٹا دل لگا کر خوب محنت سے پڑھو۔ لہو ولعب میں نہ پڑنا۔ بری صحبت اور عادت سے بچنا۔ بری صحبت اچھے اچھوں کو خراب اور تباہ کر دیتی ہے۔"

[بنام شوکت اللہ شاہ، یورپ جاتے ہوئے جہاز سے،
۲۱ مئی ۱۹۲۶ء]

"میں چاہتا ہوں کہ تمھیں بتاؤں کہ تم اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا اور جتنی جلد ممکن ہو اپنا امتحان پاس کر لو ... گھبرانے کی بات نہیں لیکن تمھیں آگاہ کرنا اور صحیح صورت حال سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔"

[بنام شوکت اللہ شاہ از دہلی، ۹ مئی ۱۹۳۹ء]

شوکت مرحوم کو ڈاکٹر صاحب کی مالی پریشانیوں کا احساس تھا، چنانچہ انھوں نے تجویز پیش کی کہ وہ اپنے اخراجات کم کریں گے۔ موٹا جھوٹا کھا پہن کر تعلیم کے آخری ایام پورے کرلیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کے حساس دل کو بھلا ان کی یہ پریشانی کیونکر منظور ہوتی۔ لکھتے ہیں:

"چاہے مجھے کتنی محنت کرنی پڑے میں تمھارے قیام کے آخری سالوں میں تمھیں متردد اور فکرمند نہیں دیکھنا چاہتا....
تم فکرمند مت رہو۔ میں جلدی ہی اپنی مشکلات پر قابو پالوں گا۔"
[بنام شوکت اللہ شاہ از دہلی ۱۰/ اگست ۱۹۳۵ء]

ڈاکٹر انصاری کو انگریزوں کی حکمت عملی اور ہندوستانیوں کی ناعاقبت اندیشی کا پورا پورا احساس تھا اور وہ اس کا اظہار بہت واضح الفاظ میں اپنے خطوط میں کرتے تھے۔ جب اُن کا نام گول میز کانفرنس کے شرکاء میں نہیں شامل ہوا تو وہ دل برداشتہ ہونے کے بجائے مطمئن تھے باوجود اس کے کہ مہاتما گاندھی اس اس کوشش میں تھے کہ ڈاکٹر انصاری کو بھی اس کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملے۔ ڈاکٹر انصاری حالات کو سمجھ رہے تھے اور انھیں معلوم تھا کہ ایسا نہیں ہوگا چنانچہ اپنے ۲۸/ ستمبر ۱۹۳۱ء کے خط (از دہلی) میں جو شوکت اللہ شاہ کے نام ہے لکھتے ہیں:

"مجھے پکا یقین ہے کہ حکومت نے نیشنلسٹ مسلم پارٹی کے نمائندوں کو جان بوجھ کر گول میز کانفرنس میں نہیں مدعو کیا ہے۔ کیونکہ وہ ہندو مسلم مسائل کو اپنی چودھراہٹ کے بغیر نہیں حل کرنا چاہتے۔ انھیں معلوم ہے کہ اگر ہندوستان میں کوئی جماعت ہے جو ہندو مسلم اتحاد پیدا کرسکتی ہے تو وہ نیشنلسٹ مسلم پارٹی ہے، اس لئے اس پارٹی کے نمائندے کو گول میز کانفرنس میں نمائندگی دینا ان کے حق میں درست نہیں۔ کیوں کہ اس طرح ہندوستان

کے مختلف گروہوں میں اتحاد مستحکم ہوگا اور یہ استحکام ہندوستان
کے اُن نمائندوں کے سامنے جو آزادی ملک کے لئے زور ڈال
رہے ہیں [انگریزوں] کو ان کی مخالفت میں اپنا ٹرمپ کارڈ
کھیلنے کی راہ میں مانع ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ میں جان بوجھ کر
گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کی فہرست سے خارج
کر دیا گیا ہوں۔ مہاتما گاندھی چاہے جتنی ہی کوشش کر لیں مجھے
یقین ہے کہ میں کبھی نہیں مدعو کیا جاؤں گا۔"

ڈاکٹر انصاری کے سینے میں ایک نرم و گداز دل تھا، وہ پکے ہندوستانی اور سچے مسلمان تھے انھوں نے اپنی ڈاکٹری کی پریکٹس سے بڑی دولت کمائی لیکن کانگریس، ملک اور قوم کے لئے بے دریغ خرچ کیا۔ مسلسل کام نے ان کی صحت پر بُرا اثر ڈالا تھا اور انھیں ۱۹۳۲ کے جیل کے ایام میں اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ وہ اب زندگی کے آخری موڑ پر پہونچ گئے ہیں۔ اپنے یورپ کے سفر کے دوران زہرہ بیگم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ارے میری پیاری بیٹی، اب میری تھوڑے ہی دن تم کو اور ناز برداری
کرنا ہے۔ پھر ابّا کو یاد کر کے بہت رویا کرو گی۔ پیار کر لو،
محبّت کر لو، جو کچھ کرنا دھرنا ہے کر کرا لو، پھر میرے بعد مجھ جیسا
دل و جان سے پیار کرنے والا نہ باپ ملے گا نہ دنیا میں کوئی
اور...."

[انڈویانا، اسٹریا ۵ رجولائی ۱۹۳۴ء]

۱۹۳۴ میں جب ڈاکٹر انصاری یورپ گئے تو نواب رام پور کے ساتھ طبیب ذاتی کی حیثیت سے گئے۔ دن بھر نواب صاحب کے ساتھ گذرتا تھا اور ڈاکٹر انصاری کی آزاد طبیعت پر یہ بہت گراں تھا لیکن حالات سے مجبور تھے:

"میں نے سر پر اتنا بوجھ اٹھا رکھا ہے کہ کسی وقت بے فکری

اور آرام نصیب نہیں ہوتا۔ خیر اللہ مالک ہے، زیادہ عمر گذر گئی، اب تھوڑی باقی ہے وہ بھی اسی طرح گذر جائے۔ تم بچوں کی تعلیم و تربیت ہو جائے۔ تم کو دنیا میں مستحکم و مستقل دیکھ لوں بس۔ اس کے بعد پھر کوئی آرزو باقی نہ رہے گی۔ سفر آخرت کے لئے بالکل تیار اور اپنے گناہوں کے زبردست گٹھے کو کندھوں پر اٹھائے اپنے کرتوتوں کی پوری سزا بھگتنے کے لئے آمادہ اور اس کی رحمت اور بخشش کی امید دل میں لئے روانہ ہوں گا۔"

[بنام زہرہ بیگم از پشتیانی، چیکوسلاواکیہ، ۲۴ جون ۱۹۳۴ء]

۹ اور ۱۰ مئی ۱۹۳۶ء کی درمیانی شب میں یہ مرد حق آگاہ اور مرد مجاہد خداوند کریم کی رحمت اور بخشش کی امید دل میں لئے اس کے حضور میں حاضر ہو گیا۔

ڈاکٹر مجیب رضوی

دیوانہ مرگیا آخر.....

مٹی، پانی، آگ، ہوا، آکاش کی ترتیب کا بکھرنا موت ہے۔ لیکن زندگی؟ صرف ایک معمہ۔ صدیوں سے بنے ڈھانچے میں ڈھلتے آنا زندگی ہے، اجتماعی عادات کی پابندی زندگی ہے۔ اس ڈھانچے اور ان عادات کو بدلنے کی کامیاب کوشش زندگی ہے۔ زندگی کی نہ جانے کتنی سطحیں اور تہیں ہیں۔ کہنے کو زندگی حرکت ہے، لیکن حقیقتاً یہ منجمد ہے۔ صدیوں میں کوئی پیدا ہوتا ہے جو اسے متحرک کرتا ہے اور خود بھی اس میں منجمد ہو جاتا ہے۔ خود پرستی اور خود غرضی کی تکمیل بھی زندگی ہے۔ اس لحاظ سے پنڈت سندر لال بہت ہی ناکام زندگی جئے۔ وہ پیدا ہوئے تھے ایک کامیاب انجینیر کے گھر میں۔ اکلوتے بیٹے تھے۔ دودھوں نہلاتے گئے۔ ریشم پہناتے گئے۔ میور سنٹرل کالج الہ آباد سے انھوں نے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ یہیں سے اُن کی ناکامیاں شروع ہوگئیں۔ اُن کے والد بابو طوطارام سوامی باغ کے معماروں میں تھے۔ انھوں نے آگرے میں ایک دوسرا تاج محل تعمیر کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ انھوں نے یقیناً اکلوتے بیٹے کی زندگی کی عمارت کا نقشہ بھی ضرور بنایا ہوگا۔ لیکن سندر لال نے اُن کے ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا، اُن کی تمناؤں کا خون کر دیا۔ وہ زندگی گذارنے کے بجائے اسے بدلنے کی دُھن میں لگ گئے۔ ملک کو آزاد کرانے میں وہ خود کو بھول گئے۔ اس زمانے میں بیٹوں کی ایسی بے راہ روی سے نجات کا واحد ذریعہ اُن کے پیروں میں

ڈاکٹر مجیب رضوی، ریڈر و صدر شعبۂ ہندی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی

ذمہ داری کی بیڑیاں ڈالنا تھا۔ اُسی آزمودہ نسخے سے سندرلال کا بھی علاج کیا گیا۔ اُن کی شادی کر دی گئی۔ کہتے ہیں کہ بیوی دل فریب بھی تھیں اور کچھ زیورِ علم سے آراستہ بھی۔ وہ اس حسن و خوبی کی زندگی میں آئے ضرور لیکن چند ہفتے بھی ٹک نہ سکے۔ عشقِ آزادی میں صحرانوردی پر وہ مجبور تھے۔ حکومتِ وقت کے جبر نے ایک گرہست کو سنیاسی بنا دیا۔ اُدھر وہ خانہ برباد دربدر گھوم رہے تھے ادھر رفیقۂ حیات کی جیون لیلا کو پلیگ نے ختم کر دیا۔ یہ حادثہ شادی کے ایک سال بعد پیش آیا لیکن حقیقت میں پنڈت جی کی ازدواجی زندگی کی مدت ہفتے عشرے سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن یہ سرسری ملاقات ان کے دل پر نقش ضرور تھی۔ ایک دفعہ پنڈت جی کے پھوپھی زاد بھائی نے انھیں اپنے گھر بلایا۔ اس گھریلو ماحول میں حال کی راکھ کے نیچے دبی ماضی کی چنگاریاں سلگتی رہیں۔ اسی درمیان اُن کے بھائی زنانہ لباس کا ایک جوڑا اٹھا لائے۔ پنڈت جی نے اسے دیکھا۔ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ انھوں نے آنکھیں دوسری طرف پھیر لیں۔ بھائی نے پوچھا۔ "ان کپڑوں کو پہچانتے ہیں"، مُنہ سے الفاظ نہیں نکلے۔ سر ہلا کر، آنکھیں بند کیے ہوئے اقرار کیا۔ ڈبڈبائی آنکھیں خاموشی سے ایک دلگداز کہانی سُنا گئیں۔ یہ اُن کی بیوی کا چوتھی کا جوڑا تھا۔

پنڈت جی کے نہ گھر تھا، نہ گرہستی، نہ بیوی، نہ بچے۔ اس سے زیادہ ناکام زندگی اور کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کا انھیں غم کبھی نہیں ہوا۔ اس کے لیے انھیں آہیں بھرتے کسی نے کبھی نہیں پایا۔ اُن کی زندگی میں اُن کی بیوی ہی پہلی اور آخری خاتون تھیں جو داخل ہوتے ہی غائب ہو گئیں۔ اُن کی سادہ زندگی میں کوئی بھی گرم مسالہ نہیں ملتا جس سے اُن کی سوانح عمری لکھنے والا چٹپٹا پن پیدا کر سکے۔ اُن کے مخالفین نے کیچڑ اچھالنے کی کوشش ضرور کی۔ "اُما سندری" نام سے پمفلٹ لکھ کر اما نہرو اور سندرلال کو بدنام کرنے کی ترتیب کی گئی۔ ان لوگوں کی پاکیزگی مہاتما بھگوان دین نے دی ہے اور وہ بہت ہی مُنہ پھٹ گواہ ہیں۔ کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ کانپور کی "دس لوا نقوا" کا ذکر کچھ لوگوں نے اس سلسلے میں کیا

تھا۔ یوپی صوبائی کانگریس کا اجلاس کانپور میں ہو رہا تھا اور پنڈت سُندر لالُ اس کی صدارت کر رہے تھے۔ ایک والنٹیر نے ایک پرچی لا کر دی ۔ وہ فوراً باہر گئے اور دو خواتین کو بصد احترام ڈائس پر لائے ۔ ان کے ڈائس پر بیٹھتے ہی چہ می گوئیاں شروع ہوگئیں ۔ ڈائس پر اس وقت سروپ رانی نہرو بھی موجود تھیں ۔ انھوں نے "طوائفوں" کو وہاں بٹھانے پر سخت احتجاج کیا اور جلسہ گاہ چھوڑ کر چلی گئیں ۔ صدر جلسہ سندر لال نے وہیں اعلان کیا ۔ "دیش بھگتی کسی کا ورثہ نہیں ہے ۔ اس گنگا میں سب پاک ہو جاتے ہیں ۔ ہم ان بہنوں کے بے حد احسان مند ہیں ۔ انھوں نے اس جلسے کے لئے کثیر رقم بھی دی ہے اور اب یہ ستیہ گرہیوں کی صف میں کھڑی ہیں ۔ عیاشوں کے دیئے سونے کے کڑے انھوں نے آزادی کی قربانگاہ پر چڑھا دئے ہیں اور اب ان کی کلائیاں انگریزی سرکار کی ہتکڑیوں کی منتظر ہیں ۔

پنڈت سُندر لال تاریخ نویس تھے لیکن تاریخ نے ہر قدم پر اُن سے دھوکا کیا ۔ نہ جانے کتنی تحریکوں کے وہ بانی تھے لیکن جب تاریخ مرتب کی گئی تو ان کا نام حرفِ غلط کی طرح اس سے خارج کر دیا گیا ۔ پٹا بھی سیتا رمیا کی لکھی کانگریس تحریک کی تاریخ ایسی غلطیوں سے پُر ہے ۔ پنڈت جی چاہتے تو ان غلطیوں کی اصلاح بھی کر سکتے تھے ، لیکن وہ ان باتوں سے بے نیاز تھے ۔ وہ کانگریس چھوڑ چکے تھے ، سیاست سے الگ ہو چکے تھے ، وہ صرف دیش بھگت تھے ، ایک متحد ہندوستان اور متحدہ تہذیب کے سرگرم علمبردار ۔

پنڈت سندر لال کے خیالات و جذبات اُن کے خون میں رواں دواں تھے ، انھوں نے انھیں اوپر سے نہیں اوڑھ رکھا تھا ۔ اسی لئے ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا ۔ وہ جو کچھ کہتے اور کرتے تھے ، محض ایک پالیسی کے طور پر نہیں ، محض جذبات کے تحت نہیں ، یہ انھیں ورثے میں ملا تھا جسے اُن کے ذہن نے ملکی حالات اور اپنے آدرش کے تحت ایک شکل دی تھی ۔ اُس کے حصول

کے لئے انھوں نے ایک راہِ عمل اختیار کی تھی ۔ بھارت میں انگریزی راج، گیتا اور قرآن، حضرت محمدؐ اور اسلام، حضرت عیسیٰؑ اور عیسائی دھرم اس کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ان سب کا مقصد تاریخی، مذہبی، تہذیبی اور لسانیاتی غلط فہمیوں کو دور کرنا ہے، ہندوستانیت کو پائدار بنانا ہے، ایک متحدہ قوم کی داغ بیل ڈالنا ہے ۔ آج کے تاریخ داں کہتے ہیں کہ بھارت میں انگریزی راج تاریخ نہیں پروپگنڈہ ہے ۔ اُس وقت تاریخ لکھی ہی جاتی تھی پروپگنڈے کے لئے ۔ اس وقت کی تاریخی کتابیں فرقہ واریت کو ہوا دیتی تھیں، ۔ بھارت میں انگریزی راج اُس کے انسداد کے حربے کے طور پر لکھی گئی تھی ۔ اسی لئے اس کے اوراق برطانوی حکومت کی نظروں میں خطرناک تھے ۔ یہ وہ کتاب ہے جس کا پاس رکھنا، پڑھنا، دوسرے کو پڑھانا جرم قرار دیا گیا تھا۔ رنگون تک سارے ملک میں تلاشیاں ہوئیں ۔ ہاتھ میں اس کتاب کو لے کر آزادی کے متوالوں نے کلائیوں میں ہتھکڑیاں ڈلوائیں ۔ یہ کتاب نہیں تھی، جنگ آزادی کا ایک موثر حربہ تھی ۔ انگریز جس بات سے بہت زیادہ خوفزدہ تھے وہ ہندوستانیوں کا اتحاد تھا اور یہ کتاب آپسی خلوص اور اتحاد کی دستاویز تھی ۔ اسی لئے بے حد خطرناک بم تصور کی گئی تھی ۔

پنڈت سندر لال بات بات میں شمس تبریز، مولانا روم، شیخ سعدی، کبیر داس اور دادو کے خیالات دوہراتے ملتے تھے ۔ ان لوگوں کی بانیاں سنتے ہوئے وہ جوان ہوئے تھے ۔ ان کا تعلق رادھا سوامی سلسلے سے تھا اور یہ مذہبی تحریک اس وقت کالستھوں اور کھتریوں میں بہت مقبول تھی ۔ رادھا سوامی مت والے کسی مذہبی کتاب یا کسی مذہب کے بانی کو لازوال اور لافانی نہیں مانتے ۔ ان کے ست سنگھ میں رومی، تبریزی اور سعدی کا کلام روحانی تسکین کے لئے پڑھا جاتا ہے اور یہی ان کی عبادت ہے ۔ اس سلسلے میں کبیر اور دادو بھی اہم مقام رکھتے ہیں ۔ انھیں لوگوں کے خیالات سے سندر لال کا خمیر بنا تھا ۔ انھیں سے اُن کو مذہب اور انسانیت کا درس ملا تھا۔ حیرت ہے کہ ایک ہی سلسلے سے متعلق ہوتے ہوئے بھی سندر لال اور پرشوتم داس ٹنڈن

دو مختلف راہوں پر چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ دونوں کے سیاسی نظریئے ہی الگ نہیں، اُن کے قومی نظریئے بھی جدا ہیں۔ ست سنگھ میں ٹنڈن جی مولانا روم کے کلام پر سر دھنتے ہیں اور اپنے عمل میں اس کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیتے۔ سندر لال نے اپنی ساری زندگی انھیں سنتوں کی بانی کے مطابق ڈھال لی۔

پنڈت جی گاندھی بھگت تھے۔ لیکن یہ بھگتی نہ خالص جذباتی تھی اور نہ اس میں ابھرتے سورج کی پوجا کی رمق تھی۔ گاندھی جی تک وہ دہشت پسندی کے راستے پہونچے۔ ایک دو ملاقاتوں میں ان پر گاندھی جی کا جادو نہیں چلا۔ برسوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ملاقات ہوتی رہی، ہنسا اور اہنسا کے نظریات ٹکراتے رہے۔ گاندھی جی کی جس بات نے دہشت پسند سندر لال کو مرعوب کیا وہ یہ تھی کہ انھیں ارد گرد پھیلی فوجی تنظیم کا پورا علم تھا۔ انھیں سپاہیوں کی پوری تعداد کا ہی پتہ نہیں تھا، بندوقوں، کارتوسوں، گولوں اور بارود کے ذخیروں سے بھی وہ واقف تھے۔ گاندھی جی نے کہا کہ اس سے مقابلہ کرنے کے لئے تین گنا منظم فوج اور تین گنا ہتھیار چاہئیں۔ اگر یہ میسّر نہیں ہیں تو اہنسا کا راستہ اپنائیے، اس تکنیک سے لڑائی لڑیئے۔ دوسری چیز جس پر گاندھی جی نے زور دیا وہ عوامی تنظیم اور عوامی بیداری کا لائحہ عمل تھا۔ سندر لال نے ان مسائل پر کبھی اس طرح سوچا ہی نہیں تھا۔ گاندھی جی کی باتوں سے روشنی ملی اور وہ اہنسا وادی ہو گئے۔ لیکن انھوں نے کسی تحریک کو کبھی اس لئے بُرا نہیں سمجھا کہ وہ ہنسا کے سہارے چل رہی ہے۔ اسی لئے تلنگانہ کی ہتھیار بند تحریک کے صحیح خدوخال پیش کرنے کا سہرا اُن کے سر ہے، ویت نام کے بہادروں کی مداحی میں وہ پیش پیش ہیں، افریقہ کے گوریلوں سے اُن کا ذہنی رشتہ ہے اور فلسطین کے مجاہدین کے ساتھ ان کی تمام تر ہمدردیاں ہیں۔ یہ ان کا تضاد نہیں، ان کی کشادہ ذہنی کا ثبوت ہے، وہ ہر طرح کے تحفظ ذہنی اور تعصب سے پاک ہیں۔

دنیاوی لحاظ سے پنڈت جی نے بہت ہی غربت کی زندگی بسر کی۔ لیکن ان کے لئے یہ عسرت نہیں فقیری تھی۔ یہ زندگی انھیں ان فقراء سے ملی تھی جن کے وہ

معنوی اولاد تھے۔ یہ ان کی شعوری کوشش کا نتیجہ تھی۔ اسی لئے اس پر انھیں تاسف نہیں تھا۔ اس فقیر کی کوٹھری میں چین اور ویتنام کے سفیر بوریا نشین ہوتے رہے اور ماؤ و ہوچی منھ جیسے مشاہیر عالم کے پیغام وسلام لاتے رہے۔ ان کی اس حالت زار پر کچھ دوسرے لوگ ناراضگی کا اظہار کرتے رہے۔ رحم کھاتے رہے۔ لیکن وہ خود اس پر فخر کرتے رہے۔ اس سلسلے میں وہ یقیناً حضرت عمرؓ سے متاثر تھے۔ اسلامی مشاہیر کی تاریخ ان کے ذل و دماغ پر نقش تھی۔ انھوں نے پیغمبر اسلامؐ کی سوانح بھی لکھی اور اُن سے متاثر بھی ہوئے۔ لیکن ان سب میں حضرت عمرؓ کا درجہ بہت بلند تھا۔ کبھی کبھی ایک خاص ترنگ میں کہہ اٹھتے تھے ــــ حضرت محمدؐ کی تعلیم و تربیت سے حضرت عمرؓ جیسی شخصیت پیدا ہوئی اور حضرت عمرؓ نے حضرت محمدؐ (کی تعلیمات) کو ساری دنیا سے روشناس کرایا، ان کے خیالات کو ایک ٹھوس حقیقت بنایا۔ سندر لال کے لئے حضرت عمرؓ آدرش حاکم تھے اور انھوں نے ہی گاندھی جی کو اس حقیقت سے روشناس کرایا تھا۔ اسی لئے ۳۷ء میں گاندھی جی نے کانگریس کے وزراء کو ایک ہی منتر دیا تھا اور وہ یہ تھا کہ حکومتی معاملات میں حضرت عمرؓ کو مشعل راہ بنایا جائے کیونکہ تاریخ کے صفحات میں آدرش حکمراں کی اُن سے زیادہ اچھی مثال کوئی اور موجود نہیں ہے۔

پنڈت سندر لال گاندھی جی کے پجاری ضرور تھے لیکن ان کا مٹھ بنا کر انھوں نے مجاوری کبھی نہیں کی۔ وہ گاندھی جی کی عظمت کے قائل تھے لیکن مہاتما کو بھی قائل معقول کرتے رہتے تھے۔ گاندھی جی کی پرارتھنا سبھا میں ہندوستانی زبان کو مروج کرانے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ برسہا برس دونوں اس سلسلے میں بحث کرتے رہے۔ گاندھی جی سنسکرت میں پرارتھنا کرنے کا موہ نہیں چھوڑ پاتے تھے۔ سندر لال کا کہنا تھا کہ ساری زبانیں خدا کی ہیں جو خدا عربی و سنسکرت سمجھتا ہے وہ ہندوستانی بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ کئی برس کی جد و جہد کے بعد گاندھی جی نے سندر لال کی بات مان لی۔ اللہ، ایشور تیرے نام، آج گاندھی جی کی پرارتھنا

کے لازمی جز ہیں۔ لیکن اسے اس درجے پر فائز کرنے میں سندر لال اور صرف سندر لال کا ہاتھ ہے۔ اسی طرح ہندوستانی تحریک کو گاندھی جی کے تعمیری پروگرام کا جز منوانے کا سہرا بھی انھیں کے سر ہے۔ گاندھی جی آسانی سے اس طرف مائل نہیں ہوتے اس کے لئے سندر لال کو کافی کوشش کرنی پڑی ہے۔

اخبار نکالنا سندر لال کا مشن تھا۔ انھوں نے درجنوں اخبار نکالے۔ مدھیہ پردیش کے دو وزیر اعلیٰ روی شنکر شکلا اور دوارکا پرشاد مصرا ان کی ماتحتی میں ان جریدوں میں کام کر چکے ہیں۔ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے "کرم یوگی" کی اشاعت شروع کی۔ لیکن ایک سال کے اندر ہی اس سے ضمانت طلب کر لی گئی۔ خطا صرف اتنی تھی کہ اس جریدے میں روسی جنگ آزادی کے جوانمردوں کی سوانح شائع کی گئی تھی۔ ہندوستان کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری بھی سندر لال کی تحریر اور تقریر کے زیر اثر قومی تحریک میں شامل ہوئے تھے۔ یہ وہ بات ہے جس کا اعتراف خود انھوں نے میری موجودگی میں کیا تھا۔

مدھیہ پردیش میں وہ کرم ویر سندر لال تھے، یو پی میں پنڈت سندر لال۔ چاہنے والے انھیں صرف پنڈت جی کہتے تھے اور ان کے حریف انھیں مولوی خوبصورت علی[1] کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ان پر نہ کسی کی تعریف و توصیف کا اثر ہوتا تھا اور نہ کسی کی دشنام طرازی کا۔ وہ کبیر کی طرح ہر ایک کو چھیڑتے چھاڑتے اپنی راہ پر چل رہے تھے۔ مسلمان سے بھڑتے تو اس کے ذہن کو جھنجھوڑتے اور ہندو یا سکھ سے ٹکراتے تو اسے آئینہ دکھاتے۔ ان کی گفتگو نشتر میں ضرور ہوتی تھی لیکن اس میں کبیر کے طرز تکلم کا صاف عکس نظر آتا تھا۔ وہ جمعیۃ العلماء کے عالمانِ دین اسلام کی بے حد تعظیم کرتے تھے۔ لیکن انھیں کے مجمع میں بیٹھ کر ان کے تعصبات ذہنی کو قرآن و حدیث کی روشنی میں ہی چیلنج کرتے تھے، ان کے ذہنوں کے دریچے کھولتے

---

[1] وہ جب یکجہتی کی بات کرتے تھے تو اپنا نام سندر لال عرف جمیل احمد بتاتے تھے۔ اعظمی

تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ مسلمان ذہن کا کھوٹا ہے اور ہندو دل کا۔ اسی لئے وہ مسلمانوں کے ذہن کو جھنجھوڑتے تھے اور ہندوؤں کے دل پر کچوکے لگاتے تھے۔ ملک و قوم کے مریضوں کا ان کے پاس یہی طریقہ علاج تھا۔

کہا جاتا ہے کہ آزادی کے بعد وہ گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ لیکن ایسا کہنے والے نہیں جانتے کہ پنڈت سندر لال ایسے انقلابی تھے جو ہمیشہ ہمیشہ انقلاب کی راہ پر چلتے رہتے ہیں۔ وہ کبھی رکتے نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ کبھی منزل پر نہیں پہونچتے۔ آزادی کے بعد خون خرابہ ہوا۔ سندر لال تماشائی نہیں بنے رہے، وہ لاہور کے سکریٹریٹ میں دھوتی پہنے اور چھڑی پکڑے بے خوف وہراس انسانیت کی دہائی دینے پہونچ گئے۔ ان پر ایک نوجوان نے حملہ بھی کیا۔ لیکن نہ جانے کیا جادو تھا ان کی شخصیت میں کہ قاتل آنکھ ملتے ہی کانپ گیا، اُس کا جامد غصّہ پگھل پگھل کر آنکھوں کے راستے بہنے لگا۔ وہ دلّی کی سڑکیں ناپتے رہے۔ خون خرابہ ہوتا رہا اور وہ پھر بساؤ کی کوشش میں لگے رہے۔ میواتیوں کی آواز پر انھوں نے لبّیک کہا اور انھیں بسانے کے لئے گڑگاؤں کی خاک چھاننے لگے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ چپ ہو گئے، گوشہ نشین ہو گئے۔ وہ آخری دم تک اپنے مشن میں لگے رہے کیونکہ یہی تو اُن کی زندگی کا حاصل تھا۔

آزادی کے بعد انھوں نے پھر بساؤ کا کام ہاتھ میں لیا، لیکن صرف وہ بستی میں بسانے، گھر میں بسانے، روزگار میں بسانے، سماج میں بسانے کے قائل نہیں تھے۔ وہ ایک دوسرے کے دلوں میں لوگوں کے بسانے کے خواہش مند تھے۔ اسی لئے انھوں نے نیا ہند نامی ماہوار رسالہ نکالا۔ ہندوستانی کلچر سوسائٹی کی تنظیم کی۔ وہ دلوں کو تہذیبی، لسانی، مذہبی اور تواریخی تعصبات سے پاک کر کے خالص انسان کو وہاں بسانا چاہتے تھے۔ ابھی تک ان کی ساری کوششیں قومیت کے دائرے میں محدود تھیں۔ اب ان کا یہ انسان بین الاقوامی ہو گیا، رنگ و زبان کی تفریق سے بالا ہو گیا۔ اسی لئے سندر لال کا دائرہ عمل بین الاقوامی

ہوگیا۔ اسی لئے وہ امن کا پرچم لے کر دنیا بھر کی راجدھانیوں اور شہروں میں گھومنے لگے ـــــ رومی کا ایک مصرعہ دہراتے ہوئے ـــــ ہم نے تمھیں جوڑنے کے لئے بھیجا ہے، توڑنے کے لئے نہیں۔ صوفی کا ایک قول سناتے ہوئے ـــــ مجھے سُوئی دو قینچی نہیں۔

سُندرلال چاک گریباں سیتے رہے اور تعصب کی قینچی اسے کاٹتی رہی، لیکن وہ ہارے نہیں۔ وہ اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہوئے، لیکن اس دنیا سے وہ نااُمید بھی نہیں گئے۔ اگر زندگی تزکیہ نفس کا نام ہے، اگر زندگی دوسروں کے لئے جینے کا نام ہے، اگر زندگی بندھے بندھائے ڈھانچوں کو توڑنے کا نام ہے تو یقیناً پنڈت سُندرلال ۹۵ سال تک بھرپور جئے، انھوں نے جینے کا حق ادا کر دیا۔

"پنڈت سندرلال جو سنیچر کو [مورخہ ۹ مئی ۱۹۸۱ء] کو نئی دہلی میں وفات پا گئے ایک غیر معمولی شخصیت تھے۔ تحریک آزادی میں حصہ لینے کے علاوہ ملک کی آزادی کو بامعنی اور بامقصد بنانے، اسے محفوظ رکھنے اور اس کا پھل ملک کے سب طبقوں تک پہنچانے کی جدوجہد میں بھی حصہ لیا اور ان چیزوں کے لیے زندگی بھر جہاد کرتے رہے، وہ ایک بہت بڑے عالم تھے اور اپنے علم کو انھوں نے ملک اور اس کے باشندوں کی خدمت کے لیے استعمال کیا۔ آزادی کی جنگ کے دوران انھوں نے "بھارت میں انگریزی راج" کے عنوان سے ایک کتاب لکھ کر برطانی حکومت کی سامراجی سازشوں اور پھوٹ ڈالو والی حرکتوں کو اس طرح بے نقاب کیا کہ ان کی کتاب بحق سرکار ضبط کر لی گئی۔ ان حرکتوں کو وہ ہندستان میں برطانی حکومت کے استحکام کا بہت بڑا ذریعہ سمجھتے تھے اور اسی لیے اس کے جہاد کا خاص مورچہ فرقہ وارانہ اتحاد تھا۔"

ایک مراسلہ، ایک تجویز

دہلی سے واپسی پر "جامعہ ڈاکٹر انصاری کی یادمیں" دیکھنے کو ملا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کی شخصیت پر معتبر اور مستند پُراز معلومات مضامین جناب نے اس جریدے میں جمع فرماکر حقیقتاً ایک کامیاب نمبر نکالا ہے جو لائق تحسین و آفریں ہے۔

"ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں" بھی دونوں بزرگوں کے قومی و سیاسی کارناموں کے لحاظ سے کامیاب ہے، لیکن اس لحاظ سے تشنہ ہے کہ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں دونوں نے مل کر فن طب کے لیے کیا کارنامہ انجام دیا، جبکہ دونوں فن طبابت سے گہرا تعلق رکھتے تھے، صرف قدیم وجدید کا فرق تھا۔

جو طبی لٹریچر میرے سامنے ہے، اس کی روشنی میں میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے جو تجدید طب کا نظریہ قائم فرمایا اور جدید طبی علوم کی روشنی سے قدیم علم طب کو روشن و آبدار بنانے کا جو منصوبہ بنایا اس میں ڈاکٹر انصاری برابر کے شریک تھے، اس لیے کہ حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب کی پہلی ملاقات ۱۹۱۰ء میں لندن میں ہوئی تھی جس کا تذکرہ آپ نے اپنے مضمون میں تفصیل کے ساتھ فرمایا ہے اور اصلاح طب کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حکیم صاحب نے ۲؍جولائی ۱۹۲۶ء کو جمعہ کے دن کام شروع فرمایا اور ایک طبی اصلاحی کمیٹی بنائی جس میں حکیم صاحب کے علاوہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب، حکیم محمد الیاس خاں صاحب اور حکیم محمد کبیر الدین صاحب شامل تھے۔ اس کمیٹی نے اصلاح طب کے لیے اصول مرتب کیے اور جو مواد جمع کیا وہ کتاب: "قانون عصری" میں شامل

ہے، بہرحال اس امر کی تحقیق ضروری ہے کہ ہندوستان میں طب کی اصلاح اور اس فن کے فروغ کے لیے ڈاکٹر صاحب اور حکیم صاحب نے مل کر کیا کیا کارنامے انجام دئے۔

اس نمبر کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہے کہ ڈاکٹر انصاری صاحب اور حکیم اجمل خاں صاحب کا جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے قیام اور تعمیر و ترقی میں بڑا حصہ ہے اور حکیم صاحب پہلے اور ڈاکٹر صاحب دوسرے امیر جامعہ رہے ہیں، لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ جامعہ نے علم طب کے لیے کچھ نہیں کیا، ایک طبیہ کالج جامعہ میں بھی قائم ہونا چاہئے تھا اور وزارت صحت کے تحت ریسرچ کی اسکیمیں جامعہ میں بھی جاری ہونا چاہئے تھیں۔ میری درخواست ہے کہ اراکین جامعہ ڈاکٹر صاحب اور حکیم صاحب کے مشترک فن طب کے اجراء کے لیے جامعہ میں خصوصی کوشش فرمائیں، تاکہ ان حضرات کی خوابیدہ آرزو پوری ہو اور دونوں مرحومین کی روحیں خوش ہوں۔

میری رائے میں اراکین جامعہ کو فی الحال وزارت صحت کے تحت جامعہ میں طبی لٹریری ریسرچ اسکیم کے اجراء کے لیے کوشش کرنا چاہئے، تاکہ خاندان شریفی کے وہ کارنامے روشن ہوں جو اس خاندان نے ہندوستان میں طب کے فروغ کے لیے انجام دئے ہیں اور اس خاندان کا جملہ لٹریچر طبع و شائع ہو کر دنیائے طب میں جلوہ گر ہو۔

(ڈاکٹر) حکیم سید کمال الدین حسین
اجمل خاں طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

نوٹ: اس مراسلے کے سلسلے میں اس شمارے کا شذرات ملاحظہ فرمائیے۔

کوائف جامعہ

شیخ الجامعہ صاحب کی واپسی اور نئے تعلیمی سال کا آغاز

شیخ الجامعہ جناب الورجال قدوائی صاحب ۲۹ رجون کو باہر سے واپس آگئے اور اسی دن اپنے عہدے کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ ٹیچرز کالج اور مدارس کھل گئے ہیں، جامعہ کالج ۴ راگست کو کھلے گا۔ آج کل نئے داخلے ہو رہے ہیں، جس کی وجہ سے جامعہ میں اچھی خاصی چہل پہل ہے، باقاعدہ تعلیم عید کے بعد شروع ہو گی

دو افسوسناک موتیں

ابھی حال میں جامعہ کے ایک کارکن اور ایک استاد کا انتقال ہو گیا، ۲۲ رجون کی صبح کو دفتر شیخ الجامعہ کے کارکن جناب شعیب احمد خاں صاحب کا اور ۲۷ رجون کی شب میں شعبۂ انگریزی کے لکچرر جناب افتخار احمد صدیقی صاحب کا۔ ویسے تو سبھی موتیں افسوسناک ہوتی ہیں، مگر یہ دونوں خاص طور پر اس لیے زیادہ افسوسناک تھیں کہ دونوں کی عمریں خاصی کم تھیں، اول الذکر کی تقریباً ۴۴ سال اور ثانی الذکر کی تقریباً ۴۲ سال تھی، دوسرے دونوں کی وفات دماغ کی رگ پھٹ جانے کی وجہ سے یکایک ہوئی۔

شعیب احمد خاں صاحب ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے اور ۴ رجولائی ۱۹۳۷ء کو پیدا ہوئے ــــــ ۱۹۵۳ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۵۵ء میں انٹرمیجیٹ کا۔ ۱۹۵۹ء میں جامعہ آگئے اور ۱۹۶۴ء میں اپنی ملازمت کے

دوران، نجی طور پر جامعہ سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ مرحوم کا سب سے پہلے ٹیچرز کالج کے توسیعی پروگرام میں تقرر ہوا تھا، اس کے بعد آرٹس انسٹی ٹیوٹ میں منتقلی ہوگئی اور یکم اگست ۷۴ء کو اسٹینوگرافر کی حیثیت سے دفتر شیخ الجامعہ میں تقرر ہوا، کچھ عرصے سے شیخ الجامعہ کے قائم مقام پی اے کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ مرحوم بڑے جفاکش، مخلص اور قابل اعتماد کارکن تھے۔

مرحوم کی صحت کچھ عرصے سے خراب تھی، انھیں دل کی تکلیف اور بلڈ پریشر کی شکایت تھی، اس کا ان کی طبیعت اور صحت پر بہت زیادہ اثر تھا۔ وفات سے پہلے وہ رخصت لیکر گھر چلے گئے تھے۔ ۲۲ جون کو صبح سویرے گھر سے جامعہ کے لیے روانہ ہوئے، راستے ہی میں ایک بس اسٹاپ پر یہ حادثہ پیش آیا، فوراً گھر پہنچایا گیا، جہاں اسی روز شام کو انھیں سپرد خاک کیا گیا، جونہی جامعہ میں اطلاع پہنچی، تمام دفاتر بند ہوگئے اور کچھ لوگ کار سے ان کے گھر گئے اور ان کی تجہیز وتدفین میں شرکت کی، دوسرے روز قائم مقام شیخ الجامعہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں صدر جلسہ کے علاوہ انجمن انتظامی اسٹاف کے قائم مقام سکریٹری سید محمد غوث صاحب اور دوسرے ساتھیوں نے تقریریں کیں اور مرحوم کی بے لوث خدمات کا اعتراف کیا۔

افتخار احمد صدیقی صاحب دلّی کے رہنے والے تھے اور ۴ار جنوری ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں ہائر سیکنڈری کا امتحان پاس کیا، ۱۹۵۸ء میں بی اے کیا اور ۱۹۶۰ء میں انگریزی میں ایم اے۔ ۲۰ر اگست کو بحیثیت لکچرر جامعہ کالج میں کام شروع کیا۔

صدیقی صاحب اپنی طبیعت کے لحاظ سے بہت ہی ملنسار، خوش مزاج اور نجامرنج تھے، انھیں بس اپنے کام سے کام ہوتا، طالب علموں میں وہ بہت ہر دلعزیز تھے، ان کی والدہ عرصے سے علیل تھیں جس کی وجہ سے انھیں

بڑی فکر رہتی تھی، پھر بھی انھیں طالب علموں کا بڑا خیال رہتا تھا کہ ان کا نقصان نہ ہونے پاتے۔ محض اپنی والدہ کی علالت کی وجہ سے وہ شادی کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، دوست احباب اور عزیز و اقارب کے اصرار پر ابھی کوئی ۸ ماہ ہوئے انھوں نے شادی کی تھی کہ یہ حادثہ پیش آیا۔

دیکھنے میں تو ان کی صحت اچھی تھی، صرف بلڈ پریشر کی شکایت تھی، جون کے اواخر میں ان کو کچھ تکلیف ہوئی، پرانی دہلی کے ایک ہسپتال میں داخل ہو گئے اور بہت ہی مختصر علالت کے بعد ۳۰ جون کی شب میں تقریباً ۸ بجے جاں بحق ہو گئے۔ دوسرے دن یکم جولائی کو صبح کے تقریباً ۱۰ بجے قبرستان مہندیاں (میر درد روڈ نئی دہلی) میں سپرد خاک کئے گئے۔

یکم جولائی کی صبح کو جامعہ میں اطلاع آئی، اسی وقت دفاتر میں چھٹی کر دی گئی اور اس مختصر اطلاع پر جو لوگ پہنچ سکے انھوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔

مرحوم جامعہ میں آنے سے پہلے بہت عرصے تک آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اردو کے اناؤنسر تھے۔

ایک کارکن کے دو شعری مجموعے

جناب سید نظر ربانی صاحب ایک عرصے سے ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری میں کام کرتے ہیں، انھیں نثر اور نظم دونوں سے دلچسپی ہے، چنانچہ ان کے کلام کے متعدد مجموعے چھپ چکے ہیں اور ایک مجموعۂ مضامین مولانا محمد علی کی شخصیت اور خدمات پر مرتب کر کے شائع کیا ہے، جس میں مختلف مشہور ادیبوں کے مضامین شامل ہیں۔ پہلے آپ سنجیدہ اشعار کہتے تھے، مگر اب کوئی سات سال سے مزاحیہ اشعار کہتے ہیں اور اب اس کا کچھ ایسا چسکہ لگ گیا ہے کہ بقول خود: "سنجیدہ شاعری کو بالائے طاق رکھدیا اور طنز و مزاح کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔"

اس وقت موصوف کے دو مجموعۂ کلام ہمارے سامنے ہیں جو تعارف کے لیے موصول ہوئے ہیں۔ ایک سنجیدہ کلام کا نمائندہ ہے اور دوسرا مزاحیہ کلام کا۔ پہلا مجموعہ "[illegible]"

۱۹۷۷ء میں شائع ہوا ہے، کتابی سائز پر ۱۳۸ صفحات پر مشتمل ہے اور دس روپے قیمت ہے۔ شروع میں خمار بارہ بنکوی صاحب اور ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کی ایک ایک صفحے کی اور محمود ہاشمی صاحب کی چار صفحے کی تعارفی تحریریں شامل ہیں۔

دوسرا مجموعۂ کلام "چمچے" جو مزاحیہ کلام پر مشتمل ہے، کتابی سائز پر ۱۲۸ صفحات کا ہے، پچھلے ہی سال ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا ہے اور اس کی قیمت بھی دس روپے ہے۔ اس میں ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کی چار صفحے کی ایک تعارفی تحریر شامل ہے، اردو کے مشہور مزاحیہ نگار خواجہ عبدالغفور صاحب کا ایک خط ہے اور جامعہ کے شعبۂ اردو کی لکچرر اور کئی ناولوں کی مصنفہ ڈاکٹر صغریٰ مہدی صاحبہ کی دو صفحے کی تقریظ ہے۔ صغریٰ صاحبہ نے اپنی اس تحریر میں ایک دلچسپ بات لکھی ہے، فرماتی ہیں: "ابھی میں خود ہی اپنی تحریروں پر دوسروں کی رائے لکھوا کر چھپوانے کی پوزیشن میں ہوں، نظر برنی صاحب کا اصرار ہے کہ میں ان کے شعری مجموعے پر اظہار رائے کروں، شاید اس لیے کہ وہ مجھے اسی طرح PATRONIZE کرنا چاہتے ہیں۔"

ڈاکٹر قمر رئیس صاحب جو نظر برنی صاحب کے استاد بھی ہیں، زیر نظر مجموعے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: "چمچے ان کے طنزیہ اور مزاحیہ کلام کا انتخاب ہے، سچ تو یہ ہے کہ موجودہ قومی معاشرے کو اگر کسی علامتی لفظ سے ادا کیا جا سکتا ہے تو وہ چمچہ ہی ہے ؎

کوئی بھی کام ہو حل کیجئے اس کے دم سے
اس خوشامد نے تو دنیا کو ہلا رکھا ہے

صرف دنیا ہی نہیں ہفت آسمان تک اس کا اثر پہنچتا ہے، بقول نظیر اکبر آبادی:

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

نظر برنی نے نہ صرف مجموعے کا نام رکھ کر بلکہ متعدد اشعار میں اپنے زمانے کے خوشامدانہ مزاج پر کھل کر طنز کیا ہے، گویا روح عصر کا احاطہ کر لیا ہے۔" آخر میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ: "چمچے کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان کے سفر کی پہلی منزل ہے، ابھی انھیں طویل راستہ طے کرنا ہے، اگر گردو پیش کی زندگی سے وہ اسی طرح پیمانِ وفا باندھے رہے اور اسے اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھتے رہے تو ہر منزل ان کے لیے آسان ہو جائے گی۔"

یہ دونوں مجموعے ادبی سنگم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے مل سکتے ہیں۔

عبداللطیف اعظمی

تعارف و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

بیاؔن میرٹھی ۔ حیات و شاعری از ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحلؔ

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۲۴۴ صفحات، مجلد مع گردپوش، قیمت: ۲۵ روپے سال اشاعت: ۱۹۸۰ء۔ فاضل مصنف سے، محمد علی روڈ، مومن پورہ، ناگپور ۴۴۰۰۱۸ کے پتے پر کتاب حاصل کی جا سکتی ہے۔

بیاؔن میرٹھی، جن کا پورا نام سیّد محمد مرتضیٰ تھا، بنیادی طور پر انیسویں صدی کے شاعر ہیں۔ ان کے سنہ ولادت میں کافی اختلافات ہیں، مختلف لوگوں نے ۱۸۴۰ء سے ۱۸۶۰ء تک مختلف سنہ لکھے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب کے نوجوان مصنف نے ۱۸۵۰ء کو ترجیح دی ہے (صفحہ ۱۸)، تاریخ وفات ۱۳ مارچ ۱۹۰۰ء ہے (صفحہ ۳۵)۔ بیاؔن نے اردو شاعری کے تمام مروجہ اصناف سخن میں شعر کہے ہیں یعنی غزل، نعت، مراثی، قصائد، قطعات، رباعیات، نظمیں اور سہرے وغیرہ۔ اسی کے ساتھ وہ صحافی اور ادیب بھی تھے، مگر بنیادی طور پر وہ شاعر تھے اور ان کے کلام میں بقول فاضل مصنف: "وہ تمام خصوصیاتِ شاعری اور لوازماتِ فن موجود ہیں جو کسی بڑے اور کامیاب شاعر کی شہرت یا بقائے دوام کا باعث ہوتے ہیں۔ نازک خیالی، تناسبِ لفظی، معنی آفرینی، بداہتِ اسلوب، تخیل پروازی، ندرتِ خیال، جوشِ جذبات، شاعرانہ مصوری و محاکمات، صنائع و بدائع غرض کیا ہے جو اُن کے کلام میں موجود نہیں" (صفحہ ۳۴) نیز انہی کے الفاظ میں: "اُن کے کلام کا بڑا حصہ استادانہ رنگ، تخیل آفرینی، معنی آفرینی، مضمون آفرینی، داخلی کیفیات، خارجی اثرات اور سلاست و

سادگی سے بھرپور ہے اور اس میں وہ کشش وجاذبیت پائی جاتی ہے جو سامع اور قاری کے دل ودماغ پر دیرپا اثر چھوڑ جاتی ہے.... اس کے علاوہ ان کا کلام ان کے دور کی ترجمانی بھی کرتا ہے، اس میں ہم ان کے عہد کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی مسائل کو بہ خوبی محسوس کر لیتے ہیں۔" اسی کے ساتھ ساتھ فاضل مصنف کی یہ رائے بھی ہے: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیان صرف مقلد ہی رہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اپنا رنگ مفقود ہے، بہر حال یہ حقیقت [ہے] کہ وہ ایک کامیاب مقلد تھے اور جس رنگ میں چاہتے شعر کہہ لیتے، غرضکہ ان کی ۲۵ سالہ ادبی زندگی تقلید و تتبع میں گذری۔" (حرفِ آخر، صفحہ ۲۴۱)

زیرِ تبصرہ کتاب کے مصنف، ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل نوجوان ادیب ہیں، اس کتاب کے مقدمہ نگار کے الفاظ میں: "اس نوجوان نے جب اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا تو اس وقت اس کی عمر ۲۰ سال تھی اور آج وہ تیس سال کا ہے۔" تین مضامین اردو، فارسی اور عربی میں ایم اے اور اردو کے پی ایچ ڈی ہیں، جامعہ کے مضمون نگار بھی ہیں، اگرچہ بہت کم لکھتے ہیں، انھوں نے خود اپنے بارے میں لکھا ہے کہ: "میں نہ تو زباں داں ہوں نہ اہلِ زباں، نہ ادیب، نہ محقق نہ نقاد" لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان میں مضمون نگاری اور تصنیف وتالیف کی اچھی صلاحیت اور تحقیق وجستجو کا قابلِ تعریف ذوق ہے۔ اگرچہ ان پر خاندانی کاروبار کی ذمہ داری ہے، مگر ان جیسے باصلاحیت نوجوان سے یہ توقع کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اپنے علمی وتحقیقی ذوق کو ہر حال میں زندہ رکھیں گے۔

ماہنامہ شاعر (بمبئی) ـــ ایک شمارہ ۱۹۸۰ء کے نام

مدیرِ اعلیٰ: افتخار امام صدیقی

سائز ۲۰×۳۰، حجم ۲۳۳ صفحات، زرِ سالانہ: ۲۵ روپے۔ اس شمارے کی قیمت: ۸ روپے۔ پتہ: ماہنامہ شاعر۔ مکتبہ قصرالادب۔

پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ ۔ بمبئی ۴۰۰۰۰۸

ماہنامہ شاعر تقریباً نصف صدی سے اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے، اس نے بہت سے خصوصی شمارے نکالے ہیں جنھوں نے شہرت اور مقبولیت حاصل کی، مگر پیش نظر شمارہ گذشتہ خصوصی شماروں سے مختلف ہے اور اپنے اندر ندرت رکھتا ہے ۔ اس شمارے میں ۱۹۸۰ء کے اردو ادب کا جائزہ لینے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے اور اس سال کے متوفی ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کے حالات زندگی اور خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے، نیز جن ادیبوں اور شاعروں کی صدی تقریبات منائی گئی ہیں، مثلاً غالب، اقبال، پریم چند، حسرت، فانی اور آغا حشر، انھیں نذرانۂ عقیدت پیش کیا گیا ہے ۔ اگر ان میں مولانا محمد علی اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو بھی شامل کر لیا گیا ہوتا تو یہ فہرست مکمل ہو جاتی۔

یہ کام جتنا اہم ہے اتنا ہی مشکل بھی اور ایک دو آدمیوں کے بس کا نہیں، مگر فاضل مدیر نے اردو ادیبوں کے تعاون سے ایک کامیاب نمبر پیش کیا ہے۔ یہ کام اتنا وسیع اور مشکل ہے کہ اس میں خامیوں کا رہ جانا اور فروگذاشتوں کا ہونا عین ممکن ہے ۔ ہم نے اسے غور سے پڑھا ہے اور متعدد خامیاں نظر آئیں مگر اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ قابل درگذر ہیں ۔ ادارۂ شاعر نے اگلے سال بھی اسی قسم کا نمبر نکالنے کا اعلان کیا ہے ۔ ہمیں امید ہے کہ پچھلے تجربے کی روشنی میں کوشش کی جائے گی کہ آیندہ یہ خامیاں نہ ہوں ۔

یہ شمارہ اس قابل ہے کہ اردو کے ہر کتب خانے کی زینت بنے ۔ ہمیں توقع ہے کہ اسے یقیناً حسن قبول حاصل ہوگا ۔

سالانہ قیمت
۹ روپے

جامعہ

قیمت فی پرچہ
۷۵ پیسے

جلد ۷۸	بابت ماہ ستمبر ۱۹۸۱ء	شمارہ ۹

فہرست مضامین

مجلس ادارت

پروفیسر محمد مجیب — پروفیسر مسعود حسین

ڈاکٹر سلامت اللہ — ضیاء الحسن فاروقی

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: جمال پریس دہلی ۶ • ٹائٹل: فائن پریس دہلی ۶

شذرات

میرا تعلق جامعہ کی اُس نسل سے ہے جس نے جامعہ کے افلاس اور تنگی و ترشی کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اب فراغت کی زندگی بھی دیکھ رہی ہے جب جامعہ کی اہم اور بنیادی ضروریات اور اہل جامعہ کی روزمرہ کے اخراجات کے لیے پیسے نہیں تھے، اس وقت کی زندگی بڑی پُرسکون، قناعت پسند اور پربہار تھی اور اگر غور سے دیکھا جائے تو اسی زمانے میں جامعہ نے وہ ترقی کی جس نے اسے تعلیمی اور علمی دنیا میں شہرت دوام عطا کی۔ اُس زمانے میں ہوسٹل ہوں یا دفاتر یا معمول کے جلسے اور عام زندگی، ہر جگہ نفاست اور صفائی وستھرائی نظر آتی، طالب علموں میں نظم وضبط ہوتا، جلسے وقت پر ہوتے، غرض پوری زندگی ایک لحاظ سے مثالی تھی۔ یہ سب دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں پیسوں کی کمی ہے یا کوئی شخص تنگ دست ہے، ماحول میں ایک چہل پہل اور زندگی تھی جو ہر طرف نظر آتی تھی۔

اس زمانے میں جامعہ کی تعلیم سے ملازمتیں نہیں ملتی تھیں، اس لیے کالج میں طالب علموں کی تعداد بہت کم تھی، بس کچھ دیوانے ہی تھے جو کالج میں پڑھتے تھے، مگر ابتدائی اور ثانوی مدارس کی حالت مختلف تھی، وہاں داخلے بڑی مشکل سے ملتے تھے، اس کے لیے بڑی دوڑ دھوپ اور جدوجہد کرنی پڑتی تھی، داخلے کے زمانے میں یہاں کا سماں بالکل ویسا ہی ہوتا تھا جیسا آج کل پبلک اسکولوں میں نظر آتا ہے، یہاں روپے کی فراوانی سے کام آسان ہو جاتا ہے مگر جامعہ میں جب تک امیدواروں میں مناسب لیاقت، ضروری صلاحیت اور علم کا شوق نہ ہو تو کامیابی مشکل تھی۔ کالج کے بیشتر اساتذہ وہ تھے جو علی گڑھ کالج کو چھوڑ کر یہاں آئے تھے اور جو لوگ بعد میں آئے تھے وہ بھی تعلیمی معیار اور اسناد کے

لحاظ سے عام یونیورسٹیوں کے معیار کو پورا کرتے تھے، مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ اس فاقہ مستی کے زمانے میں ابتدائی اور ثانوی مدارس کے بیشتر اساتذہ بھی اپنی تعلیمی صلاحیت اور تجربے کے لحاظ سے بہت ممتاز اور خدمت کے جذبے کے لحاظ سے منفرد اور بے مثال تھے۔

جامعہ نے صرف تعلیم وتربیت کے میدان ہی میں نئے زمانے کے رجحانات و نظریات اور تقاضوں کے مطابق نئے انداز اور جدید طریقے اختیار نہیں کئے بلکہ اردو زبان وادب کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ کی۔ نئے موضوعات اور جدید علوم وفنون پر ایسی کتابیں شائع کیں جو اسلوب کے لحاظ سے دلکش اور گیٹ اپ کے لحاظ سے بڑی خوبصورت تھیں، خاص طور پر بچوں کے لیے ایسی کتابیں لکھوائیں اور شائع کیں جو مغربی معیار کو پورا کرتی تھیں۔ اردو زبان وادب میں سب سے پہلے جو خوشگوار تبدیلیاں آئیں وہ علی گڑھ تحریک کی مرہون منت تھیں، مگر بعد میں زبان میں جو سلاست، اسلوب میں دلکشی اور ظاہری شکل وصورت میں جو حسن پیدا ہوا وہ جامعہ کی دین ہے۔ اُس زمانے میں جامعہ سے دو ماہوار رسالے نکلتے تھے، ایک علمی وادبی رسالہ "جامعہ" اور دوسرا بچوں کے لیے "پیام تعلیم"۔ ان رسالوں نے علم وادب، معلومات اور اسلوب کا جو معیار پیش کیا، اس کی مثال اس دور کے رسالوں میں بہت کم ملے گی اور ماہناموں میں تو بالکل ہی نہیں اور آج تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے میں، مادی ترقی اور وسائل کی فراوانی کے باوجود یہ خوبیاں اور خصوصیات خواب وخیال کیوں معلوم ہوتی ہیں؟ اس کی وجہ جہاں تک راقم الحروف سمجھ سکا ہے یہ ہے کہ اب لوگوں میں پہلے کی طرح خدمت کا جذبہ نہیں ہے، پرفکشن، خوب سے خوب تر کی تلاش اور بیتا ماری کی نہ لوگوں میں اہمیت ہے اور نہ اس کے لیے کسی کو فرصت، کسی کام میں چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اپنے کو

غرق اور فنا کر دینے کا تصوّر آجکل ایک ایسے دیوانے کا خواب سمجھا جاتا ہے جو اس بھری پری دنیا میں نہیں، احمقوں کی جنت میں رہتا ہے۔ ذاکر صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ جو کام اس قابل ہے کہ کیا جائے وہ اس قابل بھی ہے کہ اچھی طرح کیا جائے ، اب عقل مند اسے سمجھا جاتا ہے جو برا بھلا کسی نہ کسی طرح کام پورا کر کے اپنی میز سے آگے بڑھا دے۔ چھوٹے سے چھوٹے عوارض اور معمولی سی معمولی مشکلات لوگوں کے لیے کام نہ کرنے کا بہانہ بن جاتی ہیں۔ ایک مرتبہ جامعہ کے کچھ کارکنوں نے مجیب صاحب سے کام کے اوقات کی تبدیلی کی درخواست کرتے ہوئے، گرمی کی شدت اور کولر کے نہ ہونے کی شکایت کی۔ مجیب صاحب نے فرمایا کہ جامعہ میں سب سے زیادہ اور سب سے اچھا کام اُس زمانے میں ہوا ہے جب یہاں نہ بجلی تھی اور نہ پانی اور نہ آمد و رفت کی موجودہ آسانیاں۔ اسی طرح ایک مرتبہ علی گڑھ کے کچھ سینیر طلبہ مجیب صاحب سے ملے اور باتوں باتوں میں دریافت کیا کہ یہ کیا بات ہے کہ آپ نے اپنے بڑے بھائی پروفیسر حبیب صاحب سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ اگر میری طرح ان کی تنخواہ بھی کم کر دی جائے تو وہ بھی میری طرح لکھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ان باتوں کو یہاں عرض کرنے کا خدانخواستہ یہ مطلب نہیں ہے کہ آرام دہ زندگی، سہولت کے وسائل اور اچھی تنخواہ بری چیزیں ہیں یا ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کہنے کا کا مدعا صرف اس قدر ہے کہ وسائل اور روپے سے زیادہ اہمیت اس کی ہے کہ کسی کام کی طرف کتنی توجہ کی گئی، کوئی کام کتنی لگن اور محنت سے کیا گیا نیز کسی کام کی تکمیل میں اپنے جملہ وسائل اور اپنی پوری صلاحیتوں کو استعمال کیا گیا یا نہیں۔ کوئی کام لازوال شہرت اور حیثیت اس وقت اختیار کرتا ہے جب اس کام کا کرنے والا اپنے آپ کو اس میں کھپا دے، فنا کر دے۔ جب جامعہ میں شاندار عمارتوں کی بنیاد پڑنے لگی تو ایک موقع پر ذاکر صاحب نے فرمایا تھا کہ مجھے اس زمانے سے ڈر لگتا ہے جب یہ عمارتیں مقبرے ثابت ہوں۔

یں صرف جامعہ ملیہ ہی کی بات نہیں کر رہا ہوں، میرے پیش نظر اردو کے تمام تصنیفی ۔اشاعتی ادارے ہیں۔ مسلمانوں کی تمام سیاسی اور غیر سیاسی جماعتیں اور سوسائٹیاں ،اور ملک کے تمام تعلیمی ادارے ہیں جن میں قدیم علوم کی درسگاہیں بھی شامل ہیں اور ربی علوم کی یونیورسٹیاں بھی۔ آج اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے ملک میں کتنے ارے قائم ہیں، نجی اداروں کو چھوڑیئے۔ ان سے کوئی بڑی اور قابل ذکر توقع سنا ہی غلط ہے، شکایت ان سے ہے جن پر ملک و قوم کا بہت بڑا سرمایہ لگا ہے رہر سال ان پر ایک کثیر رقم صرف ہوتی ہے، ایسے اداروں کی تعداد اچھی خاصی ہے لیکن ان اداروں سے جس اچھے نتیجے کی توقع تھی وہ ابھی تک سامنے نہیں یا۔ بسا اوقات تو ان کا حال دیکھ کر مایوسی ہی ہوتی ہے۔

جب میں جامعہ کی پچھلی زندگی یاد کرتا ہوں تو جناب حکیم عبدالحمید صاحب کے موجودہ کام اور تغلق آباد کی ترقی پذیر بستی آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ ان دونوں میں وسائل سے قطع نظر بڑی مشابہت ہے، جامعہ نے جس طرح اپنے کاموں کا آغاز کیا، حکیم صاحب کچھ اسی نہج پر کام کر رہے ہیں اور جس طرح جامعہ نے شہر سے دور ایک تعلیمی بستی بسائی تھی، اسی طرح حکیم صاحب بھی شہر سے دور ایک بستی بسا رہے ہیں۔ ابھی حال میں انھوں نے "ہمدرد ایجوکیشن" کے نام سے ایک سوسائٹی قائم کی ہے اور اس کے ذریعے وہ مسلمانوں کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کو اور زیادہ بہتر بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں اس شمارے کے آخر میں ایک مراسلہ شائع کیا جارہا ہے۔ ہمیں قوی امید ہے کہ تعلیمی اور سماجی کام کرنے والے اس طرف ضرور توجہ کریں گے اور اپنے تعاون سے اس مفید کام کو کامیاب بنانے میں مدد دیں گے۔

ضیاء الدین لاہوری

منشی رجب علی کی "اسنادِ خیر خواہی"

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری میں انگریز کے جن خیر اہوں نے نمایاں کردار ادا کیا ان میں میرزا الٰہی بخش اور منشی رجب علی سرِفہرست دکھائی دیتے ہیں۔ یہ انہوں ہی کا کارنامہ تھا کہ جنرل بخت خاں بادشاہ کو اپنے ہمراہ چلنے کے لئے آمادہ نہ کر سکا اور میجر ہڈسن اپنے شکار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ نتیجتاً بادشاہ اسیری کی زندگی اپنا کر رنگون سدھارا، متعدد شہزادے، بے شمار رہنمایانِ انقلاب اور ہزاروں محبِ وطن افراد قتل ہوئے، جو بچے وہ انتقام کی چکی میں پسنے لگے اور خیر خواہوں کو انعام و اکرام کے حصول کے لئے ایک وسیع میدان مل گیا۔

تاریخی کتب اس واقعہ کے پس منظر میں زیادہ تر میرزا الٰہی بخش کی مساعی کو بادشاہ کی حوالگی کا سب سے بڑا ذریعہ قرار دیتی ہیں اور منشی رجب علی کی کوششوں کو نسبتاً زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس کے علاوہ ان میں بادشاہ کے مقبرہ ہمایوں سے نکلنے کے ساتھ ہی وہاں میجر ہڈسن کی موجودگی کی روایات

اس مضمون میں شامل انڈیا آفس لائبریری اینڈ ریکارڈز لندن کی دستاویزات (کراؤن کاپی رائٹ) کی اشاعت اور ترجمہ کی اجازت کے لئے کنٹرولر آف ہر میجسٹیز اسٹیشنری آفس شکریہ کے مستحق ہیں۔

مذکور ہیں۔ انڈیا آفس لائبریری میں متفرق فائلوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے مجھے ایک فائل میں چند ایسے شواہد دستیاب ہوئے جن سے ان واقعات کی بابت ذرا مختلف حالات کا پتہ چلتا ہے۔ ان دستاویزات میں منشی رجب علی کا کردار بہت نمایاں دکھائی دیتا ہے اور اس وقوعہ میں جہاں دوسروں کی زبانی اس کی خصوصی اہمیت اجاگر ہوتی ہے وہاں وہ خود بھی بادشاہ اور شہزادوں کی گرفتاری کے جال کا سہرا بلا شرکت غیرے اپنے سر باندھتا ہے اور اس دعوے کے ثبوت میں متعلقہ حکام کی اسناد بھی پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے بیان میں یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ بادشاہ کو حوالگی پر قائل کر کے مقبرہ ہمایوں سے نکال لانے کے بعد نصف راہ میں اس کی اطلاع پر میجر ہڈسن اس کے ساتھ شریک ہوا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بعض ایسی تحریریں مطالعہ میں آتی ہیں جو سُنے سنائے واقعات پر مبنی ہوتی ہیں اس لیے ان میں باہم اختلاف نظر آتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اس قسم کے ہنگامی موقعوں پر افواہوں کی گردش ایک عام معمول ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مخدوش حالات کے باعث ممنوعہ یا متنازعہ اہم جگہوں پر جانا اور وہاں کی بالکل درست اندرونی کیفیات سے آگاہ ہونا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ادھر فریقین انتظامی مصلحتوں یا دیگر مجبوریوں کی بنا پر اصل صورت حال کا انکشاف نہیں کر سکتے یا اس کی مبہم وضاحت کرتے ہیں تو قیاس آرائیاں جنم لیتی ہیں۔ اس کے علاوہ اصل واقعات میں ذاتی ہمدردیوں یا منافرتوں کی آمیزش بھی ہو جایا کرتی ہے جس سے مختلف حلقوں میں مختلف روایتیں مشہور ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس افراد کے ساتھ براہ راست پیش آنے والے واقعات یا ان کے ذاتی مشاہدات ہمیشہ قابلِ ترجیح سمجھے جاتے ہیں بشرطیکہ کسی خاص مصلحت کے تحت انھیں گھڑا نہ گیا ہو۔ تاہم اگر باقاعدہ تحقیق سے بیانات کی مطابقت میں مستند دستاویزی ثبوت مہیا ہو جائیں تو وہ بہر حال قابل اعتماد ٹھہرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات میں بعض جگہ اختلاف کا سبب مذکورہ بالا

وجوہات ہیں۔

منشی رجب علی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران انگریزی حکومت کے شعبۂ جاسوسی (انٹیلی جنس) کا باقاعدہ تنخواہ دار ملازم تھا۔ اس کے کام کی اہمیت اور اس کی اہلیت کا اندازہ "تاریخ عروج عہد سلطنتِ انگلشیہ" میں منشی ذکاء اللہ دہلوی کے اس بیان[1] سے بخوبی ہو سکتا ہے:

"سرکار انگریزی کے جو ایجنٹ، اس مخبری کے لئے کہ دشمن کیا حرکتیں کرتا ہے، دہلی میں رہتے تھے اور ان کے سردار منشی رجب علی تھے۔ جاسوسی کے لئے جو اعلیٰ درجے کی لیاقتیں چاہئیں وہ ان میں تھیں۔ انگریز منتظموں کو ان پر پورا اعتماد تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے کارفرماؤں کے ساتھ راست باز رہے۔ سچی بات دریافت کر لینے کی عجیب قابلیت واستعداد اور فراست وکیاست رکھتے تھے۔"

انگریزوں سے اس کے تعلقات کی نوعیت اور اس کا پس منظر سمجھنے کے لئے منشی رجب علی کے سوانحی خاکے کے اہم اقتباسات خود اس کی اپنی تحریر سے[2] جو اس نے اپنے خاندانی حالات کے ضمن میں "تحقیقات چشتی" میں درج کروائی، ملاحظہ کیجئے:

"حال راقم کا یہ کہ ۱۸۰۶ء سمت ۱۸۶۳ بکر ماجیت بمقام تلونڈی اپنی جاگیر میں تولد ہوا۔ سمت ۱۸۶۴، ۱۸۰۷ء میں دیوان محکم چند، افسر فوج مہاراجہ رنجیت سنگھ، نے تلونڈی

---

[1] بحوالہ "۱۸۵۷ء"، مؤلفہ غلام رسول مہر، کتاب منزل لاہور، صفحہ ۱۳۷۔

[2] "تحقیقات چشتی"، مؤلفہ نور احمد چشتی، پنجابی ادبی اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۴ء، صفحات ۱۸ تا ۲۲۔

کو مع دیہات بے سبب بلا وجہ ضبط کر کے ہمارے بزرگوں کو جلا وطن کر دیا۔ وہاں سے نکل کے جگراؤں میں آتے۔ سردار فتح سنگھ بہادر آہلووالیہ نے محض عالی جاہی سے دو حویلیاں لائق واسطے استقامت کے جگراؤں میں عطا کیئے، اور پھر راجہ نہال سنگھ ان کے فرزند نے کچھ زمین باغ کے لئے بخش دی اور ہمیشہ مہربانی کرتے رہے۔۔۔۔"

"۱۸۲۵ء میں دہلی مدرسہ تجویز ہوا، حکام درپے اشاعت علوم متوجہ ہوئے تو راقم نے بھی علوم متداولہ رسمیہ وہاں حاصل کیا اور مدرسہ دہلی میں مدرس علم ریاضی[۲۳] کا رہا۔ حکام حضور چارلس مٹکاف صاحب بہادر اور ایلیٹ صاحب بہادر ریذیڈنٹ دہلی عنایت کرتے رہے، خصوصاً سر چارلس ٹرولین صاحب جو اب مدراس میں گورنر ہیں، ان کی عنایتوں کی تو نہایت نہیں، بہت نظر عنایت میرے حال پر مبذول تھی، بلکہ جب حضور لارڈ امہرسٹ صاحب گورنر جنرل ہندوستان نے دہلی میں بعد فتح بھرت پورہ دربار کیا تو میں بھی بذریعہ رضیعہ انہی صاحبان جلیل الشان کے حاضر دربار ہو کر خلعت سے معزز و ممتاز ہوا اور بہ تقاضائے قدردانی علم کے پیش گاہ بندگان حضور لارڈ گورنر جنرل بہادر سے دربار

---

۲۳ علم ریاضی کی تحصیل میں منشی رجب علی کو سرسید کے نانا نواب دبیر الدولہ خواجہ فریدالدین احمد خاں کی شاگردی کی سعادت حاصل ہے جو اس علم میں بہت ماہر سمجھے جاتے تھے (دیکھئے حیات جاوید، مؤلفہ خواجہ الطاف حسین حالی، انجمن ترقی اردو دہلی، ۱۹۳۹ء، حصہ اول، صفحہ ۱۹) [ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ایڈیشن ۱۹۷۹ء صفحہ ۳۵۔ لطیف اعظمی]

میں کرسی کبھی مرحمت ہوئی۔ ۱۸۳۰ء میں بعد قطع تعلق مدرسہ براہ آگرہ گوالیار وارد ہوشنگ آباد ہوا۔ تب جان ریف اوسلی صاحب بہادر وہاں حاکم تھے۔ تعریف ان کے اخلاق کی بیرون از احاطۂ تحریر ہے، خصوصاً جو مجھ پر عنایتیں کرتے تھے میں بیان اس کا نہیں کر سکتا....."

"جب وارد انبالہ ہو کے ملازمت حضور آنریبل سر جارج رسل کلارک صاحب بہادر، جن کے اوصاف سے زبانِ قلم قاصر ہے، حاصل کی تو صاحب موصوف نے یکم فروری ۱۸۴۴ء کو بخدمت گری ملک محفوظہ مابین جمن و ستلج اولاً و میر منشی ممالک پنجاب ثانیاً مامور فرمایا۔ جب سے خدمت جارج براڈفٹ صاحب بہادر و سر فریڈرک کرے بارنٹ صاحب بہادر و سر ہنری لارنس صاحب بہادر و بندگان حضور مسٹر جان لارنس صاحب بہادر، جو بفضل الٰہی سریر آرائے محکم گورنری کشور ہند ہیں، بمقدور خود کاروبار میں سرگرم رہا۔ انہی گورنر جنرل بہادر کو جب حاکم اعلیٰ لاہور کے تھے، ۱۸۵۳ء میں استعفا دے کر بحصول رخصت و خلعت و خط انگریزی و جاگیر وارد جگراؤں ہوا۔ بعد اس کے حسب الطلب سر ہنری لارنس صاحب بہادر ملک راجپوتانہ کا بھی سر کیا....."

"مفسدہ ۱۸۵۷ء میں بمقام دہلی بالائے پہاڑی کمپوئے سرکار میں بعہدہ میر منشی گری کمانڈر انچیف معزز و ممتاز ہو کے تحت جناب جرنیل بیچر صاحب بہادر جو کچھ خدمت مجھ سے ہو سکی اس سے قاصر نہ رہا۔ بعد تسخیر دہلی بحصول رخصت وطن میں آیا۔ جب جارج کارنک بارنس صاحب بہادر کمشنر اس دوئے ستلج

> نے رپورٹ اہل خدمت کی کی تو پیش گاہ لارڈ کیننگ صاحب بہادر گورنر جنرل کشور ہند وائسرائے سے خلعت پانچ ہزار روپیہ بذریعہ بندگان حضور سر جان لارنس صاحب بہادر گورنر جنرل حال مرحمت ہوا اور کچھ جاگیر بھی عطا ہوئی اور خطاب ارسطو جاہ کا ملا اور خطاب خان بہادر کا مہم لاہور میں پیش گاہ لارڈ ہارڈنگ صاحب بہادر گورنر جنرل سابق سے عطا ہو چکا تھا۔ ۱۸۶۱ء و ۱۸۶۳ء میں براہ سکھر و کراچی و بمبئی و عدن مشرف بہ حج و زیارت ہو کر وارد جگراؤں ہوا اور بتقریب سیر عجائب خانہ کے بھی بحضور صاحب لفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب حاضر ہو کر مورد مراحم بے پایاں ہوا اور شکر گزار عنایات مرخص ہوا.....“
>
> ”جناب باری اس دولت انگلسی کو روز بروز ترقی بخشے کہ طرح طرح کی ترقیات کشور ہندوستان میں بہ نسبت نیک حکام سپہر مقام عمل میں آئی ہیں۔ اگرچہ مجھ میں کوئی لیاقت اور قابلیت نہیں مگر الحمدللہ کہ اوقات میرے عزت و آبرو سے بسر ہوئے حکام عہد ہمیشہ عزت افزائی میں مصروف رہے اور امثال و اقران میرے مجھ کو ہمیشہ بنظر اعتبار و اقتدار دیکھتے رہے۔ صاحبان ڈپٹی کمشنر بہادر لدھیانہ ابتدا سے آج تک مجھ پر نظر عنایت مبذول رکھتے ہیں، چنانچہ اب چارلس ایلیٹ صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر حال بہت نظر عنایت رکھتے ہیں۔“

یہ ہے منشی رجب علی کی زندگی کا ایک مختصر خود نوشت خاکہ۔ اگرچہ اس میں اس نے ۱۸۵۷ء کے دوران انجام دی جانے والی اپنی خصوصی کارگزاریوں کی نشان دہی نہیں کی تاہم اس کی روشنی میں اس کے ”ان کارہائے نمایاں“ کا پس منظر سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے جن کا ذکر انڈیا آفس ریکارڈز کے حوالے سے ذیل

میں کیا جا رہا ہے۔

انڈیا آفس لائبریری میں امیدواران تمغہ "ستارۂ ہند" کے ذاتی کاغذات پر مشتمل چند فائلیں موجود ہیں۔ ہر فائل میں متعدد امیدواروں کی دستاویزات ہیں منشی رجب علی کے کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے "اسٹار آف انڈیا" دینے کی تحریک ۱۸۶۷ء میں ہوئی جس کی پیروی لندن میں مقیم ایک شخص سید عبداللہ[۵] نامی کرتا رہا۔ سید عبداللہ کی طرف سے ۱۴ دسمبر ۱۸۶۷ء کی تحریر کردہ پہلی درخواست دفتر میں دو روز بعد ۱۶ دسمبر کو اندراج کی گئی۔ بعد میں ایک اور درخواست محررہ ۱۰ مارچ ۱۸۶۹ء پر رجسٹری ڈیپارٹمنٹ انڈیا آفس کی اگلے روز یعنی ۱۱ مارچ کی وصولی کی مہر درج ہے۔ کاغذات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی رجب علی کو اس سے پیشتر اس کی خدمات کے اعتراف میں انعام و جاگیر سے نوازا گیا تھا مگر وہ اس عطیہ سے مطمئن نہ تھا اور نہ ہی اس کے ہمدرد رفقا اسے تسلی بخش سمجھتے تھے، لہٰذا مزید نوازشات کے لئے اس کی بھاگ دوڑ ایک عرصہ جاری رہی۔ اپنے بیان میں وہ اس سلسلہ میں کی جانے والی مسلسل تگ و دو کا ذکر کرتا ہے۔ اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کے ثبوت میں وہ ایک ایسے خیرخواہ کی مثال پیش کرتا ہے جس کی کارگزاریاں اس کی خدمات کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہ رکھتی تھیں لیکن اسے ایک بھاری جاگیر عطا کی گئی۔ وہ اپنی خیرخواہی اور جاں نثاری کے کارناموں کی زبردست اہمیت جتلا کر ان کے صلے میں حاصل کردہ جاگیر کو معمولی اور ناکافی قرار دیتا ہے۔

---

[۵] اس شخص کا ذکر مجھے کہیں اور نہیں مل سکا سوائے حیات جاوید کے جہاں مولانا حالی نے اس کے ایک طویل مضمون کا ذکر کیا ہے جو اس نے سرسید احمد خاں کی تعریف میں ۱۸۷۰ء میں ان کے دورۂ لندن کے فوراً بعد وہاں کے ایک اخبار میں شائع کروایا تھا (دیکھئے حیات جاوید، حصہ اول، صفحہ ۱۴۴) [ترقی اردو بورڈ ایڈیشن۔ صفحہ ۱۶۰۔ اعظمی]

فائل مذکور میں منشی رجب علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک فارسی خط بھی موجود ہے جس کا عکس زیرِ نظر مضمون میں شامل ہے۔ اس خط کے مندرجات اس لحاظ سے خاصے دلچسپ ہیں کہ ان میں انگریزوں کے شعبۂ جاسوسی کا یہ "نامور" اور کامیاب ترین اہل کار جہاں ایک جانب "برائے استحکام سرکار انگریزی" مفادِ عامہ کے خلاف گہری سازشوں میں ملوث نظر آتا ہے وہاں دوسری جانب وہ اپنی تمام کمائی رفاہِ عامہ کے کاموں، مساجد اور کنوؤں کی تعمیر اور خیراتی مقاصد میں صرف کر دینے کا دعویٰ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ بقول نظیر لدھیانوی مصحح و مدوّن "داستانِ غدر" [۵]:

> "مقبرہ ہمایوں کے واقعہ کے بعد مسلمانوں کو مولوی رجب علی اور ان کے خاندان سے عقیدت کم ہو گئی تھی، تاہم مولوی رجب علی نے تلافیٔ مافات کے طور پر دہلی کے ستم رسیدہ لوگوں کی حتی الامکان امداد کی۔"

اور اس کے بعد وہ فلاح و بہبود کے کاموں میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ اس کے پیچھے کیا جذبہ کارفرما تھا۔ تلافیٔ گناہ، عوام میں کھوئی ہوئی عزت اور وقار کی بحالی یا کچھ اور؟ مقصد کوئی بھی ہو۔ اس عالمِ پیری میں بھی وقت پڑنے پر "انگریز بہادر" کی سربلندی کے لئے اپنی جان تک قربان کر دینے کے دعوے کی برقراری اس کے ذہن اور کردار کی عکاسی کرتی ہے۔

مذکورہ دستاویزات میں سے چند تو انگریزی میں نقل مطابق اصل ہیں، باقی کا انگریزی ترجمہ منشی رجب علی کے پیروی کنندہ سید عبداللہ نے کیا ہے اور یہ زیادہ تر اسی کے ہاتھوں کی تحریر کردہ ہیں۔ ذیل میں ان دستاویزات

---

[۵] داستانِ غدر، مصنفہ ظہیر دہلوی، اکادمی پنجاب لاہور، ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۶۲

حضور [illegible] صاحب بهادر

دام اقبالهم

جناب معلی القاب

دریای علم گوهر نایاب سپهر اقبال آفتاب جهانتاب مرجع علما و فضلاء متبحرین محرز قصبات السبق حکماء دوربین

خدمت با عظمت میرساند

که از تحریر مشفقی عبیدالله توجهات و التفات و عنایات آنجناب نسبت خود دریافته سجده شکر بارگاه باری ادا کردم که این ذره بیمقدار را بندگان حضور پیغام رونق افزود خورشید پایه سپهر اعتلای لندن فراموش نفرموده‌اند بلکه برای فلاح و بهبود بنده با وجود کثرت مشاغل توجه دارند حقیقت اینست که خدمات این ذره هیچ مقدار از عهد فرمانفرمای دستور عدل و انصاف و مروت و دانش و فتوت و علم و فضل سر جارج رسل کلارک صاحب بهادر دام اقبالهم در ملک محروسه این روی دریای ستلج و کوهستان و لاهور و حاضر بودن بحضور آنجناب در عهد ریاست سر هنری منتگمری لارنس صاحب بهادر و بمقدمه تحقیقات جرم مولراج ناظم ملتان و در مفسده سنه ۱۸۵۷ع موجود بودن در عین کارزار بمقابله افواج آتش بار و آوردن بادشاه کوتاه اندیش دهلی بحضور صاحبان [illegible] ظفرامواج و مقابله بودن بسیف و سنان و مجروح شدن هیچ سوار همراهی خود و مامور شدن بحکم ویسرای گورنر جنرل حال تا برید دهلی مسٹر میٹکاف صاحب بهادر در مقدمه ڈیسمبر و غیره حالات که از دفتر گورنری و لاهور و انباله و دهلی ظاهر و خطوط انگریزی صاحبان عالیشان بران شاید صادق والحمدلله که درین وقت حضور سر جارج رسل کلارک صاحب بهادر و سر فریدرک کری بارنت صاحب بهادر و ما نسل صاحب بهادر و بخصوص آنجناب رفیع الالقاب بدربار دربار ملکه معظمه انگلستان خلدالله ملکها و سلطنتها موجود اند و عند الاستفسار هر چه واقعی است بنظر انصاف از شرح و بسط آن دریغ نخواهند فرمود لیس مقام غور است که اقراری که بابت عطای کمل جاگیر موروثی بنده برادی فوت صاحب بهادر کرده‌اند و سر فریدرک کری بارنت صاحب بهادر که اگر در معرکه سنگهان لاهور

تا هشت قرن و قدامت ابتدای [illegible] حکمرانی فرمودند تمام کشور پنجاب از دست سرکار انگریزی بدر می رفت
و کشور [illegible] علم برپا می شد امید خود بر اقرار برادر [illegible] صاحب بهادر [illegible] نشده و من حق خود نرسیدم
و روز قرار انگریزی حالتش واضح است و دران وقت رازها در سررشته که نزد جناب ممدوح سپرد
بنده کرده تا امروز هم بر زبان نیامده و صاحب ممدوح در خط انگریزی خود اشاره بیان کرده اند
و نزد من موجود و دیگر صاحب ممدوح الصدر شنید الاستفسار خود بیان خواهند نمود هرگاه [illegible]
عالیشان مرتبه خود و گواه خود دارم و از قاف تا قاف عدالت سرکار انگلشیه مشهور است دل [illegible]
چرا [illegible] این امر [illegible] نگردد دیده چون جگر خون چگونه نشود ملاقه برای این نکردم
عمر نوح و خزانه قارون و گریه ایوب و صبر یعقوب از کجا پیدا کنم و دنیای دنی را که نظر
نیاورده ام و هرچه بدست آمد در بنای مساجد و چاهات فی سبیل الله و خیرات براه خدا صرف
کردم این امر از [illegible] شهرت محتاج بدلیل نیست پس اگر [illegible] انتخاب اندک نظر توجه وزرای عظام
کشور انگلستان بحالم شود بمقصود خود خواهم رسید بقول شاعر زبان شکوه نداریم و دست [illegible]
داستان بنده دراز است زیاده ازین طول نکردم که موجب ملال مزاج همایون نگردد مختصر این
قبل ازین هم خدمات سرکار بجانفشانی کرده ام و آنوقت عمرم زیاده از شصت سال است
تا زنده ام بجان حاضرم و دعای ترقی ملک و دولت سرکار سپهر اقتدار انگلشیه و صاحبان قدر
افزا و شناخت فرمای خود می کنم قلم شکستم و مضمون مختصر کردم که [illegible] گفتگوی [illegible]
آفتاب اقبال تابان باد

[illegible] ضلع لدهیانه [illegible]

کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو موضوع زیر بحث سے متعلق ہیں ۔ یہ وضاحت بھی کردوں کہ میں نے ان کے آزاد ترجمہ کی بجائے ترجمہ مطابق اصل کو ترجیح دی ہے ۔

بیان[۶] منشی رجب علی

۱۸۴۶ء میں سکھوں کے دائمی یادگار معرکہ کے دوران میں نے آں جہانی میجر جارج براڈفٹ صاحب بہادر کے ماتحت سرکار برطانیہ کے لئے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ۔ اہم واقعات کے اس دور میں اپنی جان اور مال سے یکساں قطع نظر جب بھی فرائض منصبی نے مجھ سے ان کی قربانی طلب کی ، میں نے سر پر منڈلاتے ہوئے سخت خطرات میں ہر موقع پر اپنی جان جوکھوں میں ڈالی ۔ جاں نثاری کی اس کیفیت نے مذکورہ بالا ممتاز افسر کی نظر عنایت اس طرف مبذول کی اور انھوں نے سر فریڈرک کری بارٹ صاحب کی موجودگی میں وعدہ کیا کہ وہ نو مواضع کی ایک جاگیر، جو میری موروثی جائداد تھی ، مجھے عطا فرمائیں گے مگر یہ وعدہ ، جو سر فریڈرک کری بارٹ صاحب بہادر کے دستخطوں سے توثیق کیا گیا تھا، میجر براڈفٹ صاحب بہادر کے افسوس ناک انتقال کے باعث کالعدم ہو گیا بعد ازاں سر فریڈرک کری بارٹ صاحب کی نوازش سے اس قابل ہُوا کہ اپنا معاملہ ارباب اختیار کی خدمت میں دوبارہ پیش کرسکوں ۔ لازوال یادگار کے مالک کرنل سر ہنری منٹگمری لارنس صاحب بہادر نے بملاحظہ سرکار میرے حق میں رپورٹ تحریر کی ۔ اس عرضی کے نتیجے میں موضع تلونڈی اور دوسرے مواضع ، جو میری موروثی جائداد تھے ۔ اور جن کی سالانہ جمع دو ہزار روپے تھی بمع ایک اور موضع کے جسے اپنی سعی و کوشش سے آباد کیا تھا اور جس کی سالانہ جمع چار سو روپے تھی ، مجھے اور میری آئندہ نسلوں کو دائمی طور پر عطا کئے گئے ۔

---

[۶] انڈیا آفس ریکارڈز فائل نمبر L/P&S/15/73 ورق ۸۷۸

آں جہانی سرہنری لارنس صاحب بہادر اکثر اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کرتے تھے کہ سرکار کو میرا معاملہ تاخیر سے پیش کئے جانے کے باعث مجھے میرے قومی اور جائز دعاوی کا شایان شان صلہ نہیں دیا گیا اور انھوں نے میرے ساتھ وعدہ کیا کہ انگلستان پہنچنے پر وہ میرے مفادات میں اضافے کی حتی المقدور کوشش کریں گے۔ موت نے اس قابل احترام محسن کو جو میرے دوست بھی تھے، مجھ سے چھین لیا۔ جنرل برنارڈ صاحب بہادر، جنھوں نے دارالحکومت کے محاصرے کے دوران دہلی فیلڈ فورس کی کمان کی تھی، میری مستحکم خیر خواہی کے علاوہ مسلسل جاں فشانی اور تن دہی کے اتنے معترف تھے کہ انھوں نے مجھے مکمل یقین دلایا کہ یہ خدمات کسی صورت بھی صلہ کے بغیر نہیں رہیں گی اور یہ کہ وہ بذاتِ خود میرے معاملے میں کیمپ میں کسی دوسرے فرد کی نسبت زیادہ دلچسپی لیں گے لیکن یہ عظیم قدر شناس وقت سے پہلے ہی ہیضہ کا شکار ہو کر میجر ہڈسن صاحب بہادر اور مسٹر گریٹ ہیڈ صاحب بہادر کی طرح جو جنرل برنارڈ صاحب بہادر کے میرے ساتھ مذکورہ بالا وعدے کے وقت موجود تھے، ہم سے قطع تعلق کر گئے۔ تسخیر دہلی کے بعد کرنل بیچر صاحب بہادر نے مجھے ایک سند عطا کی اور ساتھ ہی سر جان لارنس بارٹ صاحب بہادر کے حضور، جب یہ ممتاز مدبر انبالہ میں تھے، میری پر زور سفارش کی۔ میری خدمات کے عوض مجھے جو انعام دیا گیا وہ کونسل میں گورنر جنرل صاحب بہادر کے فرمان کی منسلک نقل سے ظاہر ہے۔ اس فرمان سے متعلق مجھے چند معروضات پیش کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔

مجھے دائمی طور پر جو دو مواضع عطا کئے گئے ان میں سے چار سو روپے سالانہ جمع کا ایک موضع دراصل اس سفارش کی بدولت عطا کیا گیا تھا جو حضور سر جارج رسل کلارک صاحب بہادر نے کرنل سر کلاڈ مارٹن ویڈ صاحب بہادر کو فرمائی، جنھوں نے میرا

معاملہ ہز ہائی نس مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر کی خدمت میں پیش کیا۔ سر جارج رسل کلارک صاحب بہادر کو اس صورت حال کا بخوبی علم ہے۔ یہ عطیہ میں نے جس وقت وصول کیا ایک بنجر آراضی کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ صرف اس پر صرف کردہ عظیم سرمایہ اور سخت محنت و استقلال کا نتیجہ ہے جو میں اسے پیداواری اور قابلِ رہائش بنانے میں کامیاب ہوا اور اب یہ پچھلے اٹھارہ برس سے میرے قبضے میں ہے۔ آٹھ سو روپے سالانہ جمع کا تلونڈی کا دوسرا موضع جو مجھے اور میرے وارثوں کو دائمی طور پر عطا کیا گیا ہے، یہ بھی قدیم جاگیر کا ایک حصہ ہے۔ لہٰذا میں بڑے ادب کے ساتھ گزارش کرتا ہوں کہ آں جہانی جنرل برنارڈ صاحب بہادر کے میرے ساتھ کئے گئے وعدے کے پیشِ نظر مجھے عطا کردہ انعام کسی طور بھی میری کارگزاریوں کے ہم پلہ نہیں ہے۔ اگر میں جان فشن خاں ولایتی کا حوالہ دوں تو اس کا ناکافی ہونا بہ نمایاں ہوگا۔ اس نے دہلی سے پہلے کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا، کسی ایک لڑائی میں بھی شریک نہیں ہوا اور اس کے فرائض چند گھوڑ سواروں کے ساتھ ہیڈ کوارٹر میں موجود رہنے تک محدود تھے، لیکن اسے بیس ہزار روپے سالانہ جمع کی جاگیر عطا کی گئی۔ اس کے برعکس میں شب و روز سرکار کی خدمت میں مصروف رہا اور باغیوں کے خلاف میری جدوجہد دہلی میں ان کے سرغنوں کے لئے اس قدر اہمیت کی حامل تھی کہ انھوں نے ایک باضابطہ اعلان جاری کیا جس میں اس شخص کے لئے بیس ہزار روپے انعام کا وعدہ کیا گیا جو انھیں مولوی سید رجب علی خاں بہادر کا سر لاکر دے۔

میں اپنے کئی معتمد ملازموں سے محروم ہو گیا ہوں جنھوں نے جاسوسوں کے طور پر کام کیا اور جو دشمن کے ہاتھوں میں پڑ کر یا تو سفاکی سے قتل کر دیے گئے یا بے دردی سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے گئے۔ خود میرے باغیوں کے ساتھ جھگڑے ہوتے رہے جن میں سے ایک مقابلے میں میرے چار سوار خطرناک حد تک زخمی کر دیے گئے اور میں انھیں ایک چارپائی پر ڈال کر کیمپ میں لایا۔

آخر میں یہ عرض ہے کہ یہ میری تنہا اور بلا شرکت غیرے ذاتی جدوجہد اور اثر آفرینی کا باعث تھا جو سابق شاہِ دہلی حوالگی پر آمادہ ہوا ـــــ اور یہ کہ اس کے بیٹے یعنی شہزادے کیپٹن ہڈسن صاحب بہادر کے حوالے کئے گئے ـــــ اور یہ کہ سابق شاہ کے ہزاروں حامیوں سے جنھوں نے تلواریں ہاتھوں میں لئے ہوئے مرنے کا عزم کر رکھا تھا، اسلحہ چھینا گیا۔ کرنل بیجر صاحب بہادر میرے اس تمام بیان کی سچائی کی تصدیق کریں گے۔

میں عاجزانہ واثق امید کا اظہار کرتا ہوں کہ سرکارِ انگلشیہ، جس نے اپنے خیر خواہ حامیوں کے کارہائے نمایاں کے اعتراف اور انھیں انعامات سے نوازنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا، میرے دعاوی پر فیاضانہ غور فرمائے گی اور مجھے میری جدوجہد اور قربانیوں کے شایان انعام صلہ میں دے گی۔

فرمانِ گورنر جنرل ہند بنام منشی رجب علی (محررہ ۱۸ جون ۱۸۵۸ء)

یہ دیکھتے ہوئے کہ مفسدہ شروع ہونے سے قبل حسب الطلب کیپٹن ہڈسن تم دہلی کے ہیڈ کوارٹر میں پیش ہوئے اور بعد ازاں کیپٹن موصوف کے ماتحت کمانڈر انچیف کے میر منشی مقرر ہوئے اور تم نے محکمۂ خفیہ اطلاعات میں اپنے فرائض نہایت خاطر خواہ طور پر ادا کئے۔

ـــــ اور یہ کہ محاصرہ دہلی کے دوران تم نے مستند خبروں کی فراہمی میں شاندار کارکردگی دکھائی۔

ـــــ اور یہ کہ بدلی سرائے کی مہم کے دوران بھی تم موجود تھے اور علاقہ کے زمیں داروں کو اپنے مقاصد میں شریک کر کے ان کے جاسوسوں کے ذریعہ باغیوں کی روزمرہ نقل و حرکت کی اطلاعات فراہم کرتے رہے۔

ﮯ۵ فائل مذکورہ، ورق ۷۷۹۔

——— مزید برآں یہ دیکھتے ہوئے کہ مقبرہ ہمایوں کے قریب شاہِ دہلی کی گرفتاری کے موقع پر اور دوسری صبح شہزادگان مرزا مغل، ابوبکر اور خضر سلطان کو حراست میں لئے جانے کے وقت تم میجر ہڈسن کے ہمراہ موجود تھے* ۔
——— اور یہ کہ اس کے علاوہ تم نے متعدد اہم اور امتیازی خدمات سر انجام دی ہیں ۔

لہٰذا ۲۶۹۶ روپے جمع کی وہ جاگیر جو ۱۸۵۳ء میں تمھیں ضلع لدھیانہ میں جگراؤں کے نزدیک بطورِ ذیل بخشی گئی تھی کہ ۲۲۹۶ روپے تمھارے نام تاحیات اور ۴۰۰ روپے برائے نسلاً بعد نسلٍ، ہماری کمال عنایت کے سبب اس جاگیر سے ۱۴۹۶ روپے تمھیں عمر بھر جاری رہیں گے اور ۱۲۰۰ روپے کی جاگیر نسلاً بعد نسلٍ تمھارے ان بیٹوں کے لئے ہو گی جو تمھارے اپنے خونی رشتے کے وارث ہوں۔
چیف کمشنر پنجاب کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ تمھیں اس فرمان عام کے ساتھ ایک خلعت مالیتی پانچ ہزار روپے پیش کی جائے ۔ تم بلاشبہ اس اعلیٰ انعام کو، جو تمھاری ان شاندار اور مؤثر کارگزاریوں کے عوض عطا کیا گیا ہے جو تم سرکار کے لئے بجالائے، اپنی آسائش اور بہبودی کا ذریعہ سمجھو گے اور اس فرمان کو اپنے دوستوں اور ہمسروں کے درمیان ذاتی فخر اور عزت کا باعث خیال کرو گے۔

(اصل فرمان فارسی میں لکھا گیا تھا جس کے انگریزی ترجمہ سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے ۔ اس فرمان میں جہاں منشی رجب علی کا بادشاہ اور شہزادوں کی گرفتاری کے موقع پر میجر ہڈسن کے ہمراہ موجود ہونے کا ذکر ہے وہاں اس نے صرف موجودگی کے بیان کو اپنی خدمات کے مقابلے میں کم تر سمجھ کر اس کے رد میں مندرجہ ذیل نوٹ لکھا ہے)

* یہ ایک غلطی ہے۔ وہ میں ہی تھا جو سابق بادشاہ دہلی کو ہمایوں کے مقبرے سے لایا اور نصف راہ میں کیپٹن ہڈسن صاحب بہادر کی طرف گھوڑسوار دوڑائے ۔

وہ تھوڑے ہی فاصلے پر موجود تھے اور میری طرف سے سابق بادشاہ کی سپر اندازی کی اطلاع پر فوراً میرے ساتھ آ ملے۔ اس کے ثبوت میں کرنل بیچر صاحب بہادر اور کرنل برن صاحب بہادر کی اسناد منسلک ہیں (مولوی سید رجب علی خاں بہادر)

سند^۸ (کرنل) اے۔ بیچر کوارٹر ماسٹر جنرل بحق منشی رجب علی
(محررہ دہلی ۲۹ر ستمبر ۱۸۵۷ء)

مجھے ان گراں بہا خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بڑی خوشی ہوتی ہے جو میر منشی مولوی رجب علی خاں بہادر نے دہلی فیلڈ فورسز کی نقل و حرکت کے دوران تمام عرصہ فرسٹ ای۔ بی فیوزیلیٹرز کے قائم مقام کوارٹر ماسٹر جنرل لفٹیننٹ ڈبلیو۔ ہڈسن کی براہ راست ہدایات کے تحت محکمۂ خفیہ اطلاعات میں اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے انجام دیں۔ مئی کے مہینے سے لے کر جب کہ کرنال میں اس کی تشکیل ہوئی، موجودہ وقت تک مولوی رجب علی کی جدوجہد میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ وہ بڑے دشوار حالات میں کبھی مصروف کار رہا ہے۔ اس نے تقریباً ہر روز شہر سے خطوط کے ذریعہ لگاتار مخبری کرتے رہنے کے علاوہ دشمن کی بیرونی حرکات و سکنات کے متعلق براہ راست اور مستحکم جاسوسی رکھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولوی رجب علی نے سرکار ہند کے ساتھ قابل تعریف اور دیانتدارانہ جاں نثاری کے جس اعلیٰ کردار کا ہمیشہ مظاہرہ کیا ہے وہ اس نے عظیم آزمائش کے اس دور میں نہ صرف برقرار ہی رکھا بلکہ اس میں بے حد اضافہ کیا۔ میں اس کی کارگزاریوں کو سرکار کے ہمدردانہ ملاحظہ کے لئے پیش کرتے ہوئے اس کے لئے ٹھوس اور مستقل انعام کی پُرزور

---

۵۸ فائل مذکورہ، ورق ۷۷۔

سفارش کرتا ہوں۔ وہ فتح دہلی سے ہی بادشاہ کی حوالگی کے لئے آلۂ کار بنا رہا ہے اور ان تین شہزادوں کی گرفتاری کے لئے بھی جو سرکار کے لئے انتہائی خطرناک تھے اور دہلی میں عیسائیوں کے بے رحمانہ قتلِ عام میں ملوث تھے۔ ان فرائض کی بجا آوری میں اس نے بہت سارے ذاتی خطرات مول لئے۔ مجھے واثق یقین ہے کہ سرکارِ برطانیہ کے نیک مقاصد کی خاطر وہ اب بھی اپنی تلوار کو اتنا ہی استعمال کرنے کو تیار ہے جتنا کہ اپنا قلم۔

سند[۹] (کرنل) ایچ۔ پی۔ برن۔ بنام جی۔ رِکٹس، اسسٹنٹ کمشنر لدھیانہ بمتعلق منشی رجب علی (محررہ دہلی ۲ر اکتوبر ۱۸۵۷ء)

حاملِ ہذا مولوی سید رجب علی خاں بہادر نے مجھے آپ کے نام یہ تحریر دینے کی درخواست کی ہے۔ ضلع لدھیانہ میں اپنے ایک جاگیردار کی حیثیت سے آپ اسے پہلے ہی جانتے ہیں۔

گذشتہ چار ماہ کے دوران اس نے محکمۂ خفیہ اطلاعات میں بڑی عمدہ خدمات انجام دی ہیں اور جدوجہد کے آخری مراحل میں بادشاہ اور اس کے بیٹوں کو پیش کرنے کا ذریعہ یہی تھا۔ بادشاہ کو اس نے بذاتِ خود پیش کیا۔

اس نے لاہور بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کے تحت، وہ تمام عرصہ جب کہ میں وہاں ڈپٹی سیکرٹری تھا، ملازمت کی۔ سر ہنری لارنس کو، جن کا وہ پنجاب کی جنگ کے دوران معتمد (کانفیڈنشل) منشی تھا، اس پر بے حد اعتماد تھا۔ میرے علم میں سرکار کا کوئی مقامی اہلِ کار ایسا نہیں جس نے ملک کے لئے مولوی رجب علی سے بہتر خدمات انجام دی ہوں اور مجھے سن کر بڑی مسرت ہوگی کہ اسے اس کا مناسب انعام مل گیا ہے۔

---

[۹] فائل مذکورہ، ورق ۷۷۹۔

چٹھی[۱۰] سر جان لارنس بحیثیت چیف کمشنر پنجاب بنام منشی رجب علی

(محررہ لاہور ۱۷ راگست ۱۸۵۷ء)

بعد تسلیمات، تمہاری چٹھی بنام حکیم احسن اللہ خاں وزیر شاہِ دہلی کی نقل، جو تم نے کمشنر ضلع ستلج (سی آئی ایس) کو بھیجی، مجھے مل گئی ہے۔ درحقیقت اس کا انداز اور تجاویز اس نوعیت کی تھیں کہ........ جب وہ چٹھی باغیانِ دہلی کے ہاتھوں میں پہنچی ہوگی تو ان کے لئے اس قدر شدید دھچکے کا باعث ہوئی ہوگی گویا کہ بارود خانے کے درمیان کوئی بم گرا ہو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ فی الجملہ اُلجھن میں پڑ کر انھوں نے ایک دوسرے میں کل اعتماد کھو دیا ہوگا۔

(اصل چٹھی اردو میں لکھی گئی تھی جس کے انگریزی ترجمہ سے اردو میں منتقل کی گئی ہے)

فرمان[۱۱] سر جان لارنس وائسرائے و گورنر جنرل ہند بنام منشی رجب علی

(محررہ ۳۱ راگست ۱۸۶۸ء)

تمہاری ان گراں بہا خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے جو تم نے بعض اہم مواقع پر ملک کے لئے انجام دیں یعنی:

— برطانوی افواج کے افغانستان جانے کے لئے برائے حصول اجازت عبور سکھ سرحد حاکم پنجاب سے گفت وشنید کے وقت

— ان مہمات میں جو پنجاب کے برطانوی عمل داری میں شمولیت کا باعث ہوئیں اور

---

۱۰ فائل مذکورہ، ورق ۷۷۵۔

۱۱ فائل مذکورہ، ورق ۷۷۵۔

ـــــــــ ۱۸۵۷ء میں محاصرہ دہلی کے دوران
۲۶۹۶ روپے سالانہ جمع کی ایک جاگیر، جس میں سے ۱۵۲۱ روپے کی رقم دوامی عطیہ ہے اور بقایا صرف تاحیات، تمھیں مرحمت کی جاچکی ہے۔ اب مذکورہ بالا کارکردگیوں کے پیش نظر برائے منظوری مزید انعام ہزآنر لفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب کی سفارش پر اس کی بجائے مذکورہ کل جاگیر تمھیں دائمی طور پر عطا کی جاتی ہے۔ اس عطیہ کے بدلے تمھیں سرکارِ برطانیہ کے ساتھ اپنی خیر خواہی کا ہمیشہ ثبوت دینا چاہیئے۔

نوٹ از ادارۂ تحریر

فاضل مضمون نگار، جناب ضیاء الدین لاہوری، پاکستان کے نوجوان ادیب ہیں اور انھوں نے انڈیا آفس لائبریری (لندن) کے ریکارڈ سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے، موصوف نے ابھی حال میں سرسید مرحوم پر اپنی تحقیقات مکمل کی ہیں۔

اس مضمون کے سلسلے میں ہم ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری (ڈائرکٹر مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کراچی) کے تہہ دل سے ممنون ہیں، جن کی عنایت سے یہ قیمتی مضمون اشاعت کے لیے موصول ہوا۔

سید جمال الدین

ہندی مسلم فنِ تعمیر

مقصد، تکنیک اور جمالیات

ایک جائزہ

(۱)

کسی تہذیب یا سماج کے معیارِ زندگی کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے فنِ تعمیر میں اس کی مکمل تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے مقاصدِ زندگی، ان کی تکمیل کے لئے قوتِ اظہار اور اظہار میں بلندیِ خیال کے مطالعے کے لئے فنِ تعمیر ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ فنِ تعمیر کی کوئی مستقل یا مکمل تعریف ابھی تک پیش نہیں کی جا سکی ہے، تاہم ہم جب بھی یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہر شخص اس کے معنی سمجھ جاتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ آپ کہئے گھر تو گھر کی تصویر سامنے آ جائے گی۔ کہئے مسجد تو مسجد نظروں میں گھوم جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ایک مخصوص تہذیب میں پل بڑھ رہے ہیں اور فنِ تعمیر کا ایک تصور رکھتے ہیں جو ہمیں اپنے گرد و نواح یا اپنی ہی زندگی سے عطا ہوتا ہے۔ فنِ تعمیر کی تعریف میں اصل دقت اس بنا پر پیش آتی ہے کہ یہ انتہائی شاعرانہ لفظ ہے جبکہ اس کے تحت آنے والی تمام عمارتیں شاعرانہ طرز پر نہیں پائی جاتیں، لہٰذا ایک رجحان یہ بھی ہے کہ جو عمارتیں پیکرِ حسن ہیں یا شاعرانہ طرز کی ہیں وہی فنِ تعمیر کا مظہر ہیں۔ اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ فنِ تعمیر محض شاعرانہ حسن کا

جناب سید جمال الدین، لکچرر شعبۂ تاریخ، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

نام ہے ۔ دراصل فن تعمیر ایک مثنوی حیات ہے ، جس قدر یہ انسان کی زندگی سے قریب ہوگا اس کی رومانیت دوبالا ہوگی ۔ لہٰذا ہم جب بھی کسی فن تعمیر کا مطالعہ کریں تو یہ بات ضرور پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ ہم اس کے عیوب اور نقائص کو پیمانہ بنا کر اس کی اصلی روح تک نہیں پہنچ سکتے ۔

پروفیسر محمد مجیب نے فن تعمیر کی تعریف اس طرح کی ہے کہ فن تعمیر دراصل پیکر کو الفاظ میں اور الفاظ کو پیکر میں ڈھالنا ہے ۔ پیش نظر مضمون میں اسی تعریف کی روشنی میں ہندوستان کے مسلم فن تعمیر کا جائزہ لینا مقصود ہے ۔

زراعت اور فن تعمیر دونوں نے سطح زمین کی آرائش کی ہے ۔ مسلمانوں نے ابتدائی عہد میں دیہاتوں کی طرف توجہ کرنے اور زراعت کو ترقی دینے کے بجائے نئے نئے شہر بسائے جس کے نتیجے کے طور پر فن تعمیر کو فروغ حاصل ہوا ۔ ہندوستان میں گپتاؤں کے عہد کے بعد شہر بسانے کا رجحان ختم ہوگیا تھا ، مسلمانوں کے آنے کے بعد ہی شہری بستیاں توجہ کا مرکز بنیں اور تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا ۔ شہر اور دیہات کے درمیان تمیز دونوں کی عمارتوں ہی سے ہوتی ہے ۔ شہر کے ساتھ دولت کے جمع ہونے اور اقتدار کے قیام کے تصورات وابستہ تھے ۔ دفاع کا خیال ناگزیر تھا ۔ لہٰذا شہر کا محاصرہ یا فصیل ، شہر میں داخلے کے لیے باب شہر کے نقشہ کا بنیادی جز بنے ۔ محاصرہ کے اندر قلعہ ، جہاں خزانہ محفوظ ہوتا ، صاحب اقتدار کا مسکن بنا ، اقتدار کے جواز اور عقیدے کے اظہار کے لئے مذہبی عمارتیں تعمیر ہوئیں ۔ شہر کا منصوبہ ، قلعہ کی دیواریں ، عبادت خانے ، انھیں دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے بانی کس طرح کے حالات کے حامل بنے ۔

دلی شہر متعدد بار بنا اور مٹا ، مٹا اور بنا ۔ یہاں کا ہر شہر اپنی ایک جدا داستان رکھتا ہے ۔ مہرولی ، سیری ، تغلق آباد ، جہاں پناہ ، فیروز شاہ کوٹلہ ، دین پناہ ، شاہجہان آباد ، یہ تمام شہر دلی کے سینہ پر پھیلے

ہوئے ہیں۔ ان شہروں کے آثار بتاتے ہیں کہ عمارت بلند تھی۔ شہر دہلی کی عمارتوں کو ہی لے لیا جائے تو انھیں ہندوستانی مسلمانوں کا قابل قدر کارنامہ کہا جاسکتا ہے، یہاں وہ عمارتیں موجود ہیں جو ہندوستان میں مسلمانوں کے دوسرے تہذیبی مراکز کے لئے نظیر ہیں۔

ترک مسلمانوں نے جب شمالی ہندوستان میں اپنا اقتدار قائم کیا تو وہ اپنی تہذیبی میراث سے بخوبی واقف تھے۔ فن تعمیر کا اسلامی تصور یا نمونہ ان کی نظروں اور ذہنوں میں تھا، مسجد کیسی ہو مقبرہ کیسا ہو وہ بخوبی جانتے تھے۔ وہ تعمیر کی تکنیک سے بھی واقف تھے۔ محراب اور گنبد ان کی آمد سے پہلے ان کی سرزمین میں رواج پاکر ترقی کرچکے تھے۔ ابتدا میں اگر کوئی مسئلہ تھا تو یہ کہ کون سے اور کہاں سے مسالے دستیاب کئے جائیں۔ معماروں اور صناعوں کو کیسے سمجھایا جائے کہ انھیں خانۂ خدا بنانا ہے۔ کیونکہ ہندو معمار تو بت خانہ ہی بنا سکتے تھے۔ کیونکہ وہ اس سے بخوبی واقف تھے اور ہندو مسلم دونوں کے عبادت خانوں کے فن تعمیر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مندر کتنا ہی وسیع و عریض کیوں نہ ہو لیکن اس میں مرکزی حیثیت تو بت کو ہی دی جاتی ہے اور بت ہمیشہ ایک کوتاہ کمرہ میں رکھا جاتا ہے جسے ومان کہتے ہیں، اس کوتاہ کمرہ میں ایک شخص اپنے کو بت کے سامنے پیش کرتا، ومان میں بت تک رسائی اور بت سے اظہار عقیدت دونوں شخصی معاملے تھے اور اس کے لئے تنہائی ضروری تھی جو کوتاہ کمرہ ہی میں میسر آسکتی تھی، گو کہ کمرہ کے ملزومات میں کنڈ یا تالاب اور منڈپ بھی شامل تھے جن کا طول و عرض وسیع بھی ہوسکتا تھا لیکن ان سے مندر کی شان میں تو اضافہ ہو جاتا البتہ شخصی عبادت کا بنیادی تصور ان سے متاثر نہ ہوتا تھا اور کیوں کہ ومان کو اسی تصور سے نسبت تھی لہذا ومان کوتاہ ہی رہا۔ مسلمان کی عبادت اجتماعی شکل میں ہوتی ہے اور جماعت تنگ جگہ میں ممکن نہیں لہذا مسجد کے تصور میں کشادگی کو اولین اہمیت حاصل ہے۔ لہذا ہندوؤں اور

مسلمانوں کے عبادت خانوں کے فن تعمیر میں مماثلت تلاش کرنا اور اس کی بنیاد پر کوئی مفاہمت قائم کرنا ناممکن تھا، اگر مندر اپنے روایتی تصور کے پیش نظر بنایا جائے گا تو وہی تنگ و مان ہوگا جس میں نہ کوئی آرائش ہوگی نہ کوئی صناعی تاکہ اس میں داخل ہونے والا شخص پوری طرح سے اپنا دھیان بت پر ہی لگائے اور کوئی خارجی شے اس کی توجہ میں مخل نہ ہو۔ مسلمان جماعت کے ساتھ اپنے عبادت خانے میں اس خدا کو سجدہ کرنے حاضر ہوتا ہے جو واجد ہے، رحیم ہے، کریم ہے، اس کے رحم وکرم کا طالب ادب اور احترام سے اپنے عبادت خانے میں تکبیر کہتا ہے۔ رکوع وسجود میں جاتا ہے، پوری جماعت خشوع وخضوع کے ساتھ جماعت میں شریک ہوتی ہے۔ عبادت کے اس اجتماعی تصور نے مسجد کے فن تعمیر کو ایک جداگانہ طرز عطا کیا ہے۔ مقبرہ کا اسلامی تصور بھی ہندستان کے لئے اجنبی تھا، اور جیسا کہ آثار سے ظاہر ہے مسلمانوں نے جتنی یادگار مسجدیں یا مقبرے بنوائے ہیں اتنی دوسری عمارتیں نہیں بنوائیں۔ گوکہ وقت کی ستمگری سے ان میں بہت سی محفوظ نہ رہیں لیکن جو باقی ہیں، مکمل یا جزوی طور پر، ان کے بلند بام و در اور گنبد و مینار ہندوستانی مسلمانوں کے فن تعمیر میں اعلیٰ ذوق کی مثال پیش کرتے ہیں گو کہ ان عمارتوں کے مختلف حصے مختلف تہذیبی روایات سے وابستہ ہیں لیکن ان کا یکجا پایا جانا ہی دراصل ہندوستانی مسلمانوں کا فن تعمیر میں عطیہ تسلیم کیا جانا چاہیئے۔

ہندی مسلم فن تعمیر میں بعض اجزاء کو اسلامی فن تعمیر سے جوڑنے اور دیگر کو ہندو یا بودھی فن تعمیر سے جوڑنے کا رجحان محققین میں پایا جاتا ہے۔ مختلف اجزاء شناخت کرنے کے بعد نتیجہ یہ اخذ کیا گیا کہ ہندی مسلم فن تعمیر اسلامی اور ہندو روایات کی آمیزش کا نمونہ ہے۔ بعض مغربی محققین نے اسے اسلامی فن تعمیر ہی ایک مقامی طرز قرار دیا ہے جبکہ مغرب ہی کا دوسرا طبقہ اسے ہندو فن تعمیر ہی کی ایک شکل قرار دینے

۴ پر اصرار کرتا ہے۔ بے شک ایسی مسلم عمارتیں مل جائیں گی جو ہندو طرز سے اتنی قریبی مماثلت رکھتی ہیں کہ انھیں ہندو فن تعمیر ہی کا نمونہ کہا جائے گا۔ دوسری طرف ایسی عمارتیں بھی ہیں جو خالص اسلامی طرز کی ہیں اور ان میں ہندوستانی پن کا کوئی نشان نہیں۔ لیکن یہ مثالیں ہماری صحیح رہنمائی نہیں کرتیں۔ مسلمانوں کے زیر حکومت شام، مصر، یونان وروم، افریقہ، اسپین اور ایران کی تہذیبیں آئیں اور مسلمانوں نے ان تہذیبوں کی اعلیٰ قدروں کو اپنی تہذیب میں اس خوبی سے شامل کرلیا کہ وہ بذاتِ خود ایک مستقل طرز بن گئیں جسے ہم مسلم یا اسلامی طرز کہتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر ہم غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ مسلمان جہاں بھی گئے وہاں انھوں نے رفتہ رفتہ ایک ایسے طرز کو ترقی دی جس کی بنیادیں اس علاقے کے جغرافیائی حالات اور دوسری تہذیبی اقدار پر قائم تھیں، مگر پھر بھی اس طرز میں کچھ ایسی خصوصیات اور انفرادیت تھی کہ اس کی جداگانہ شخصیت اور حیثیت تسلیم کی گئی۔

متضاد مذہبی عقیدوں اور روایات کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں نے جس طرح مقامی مسالے، معماروں اور صناعوں کی مدد سے، اسلامی فن تعمیر کے معیاری اصولوں سے تجاوز کیے بغیر اپنی عمارتوں کی تعمیر کی وہ ایک کارنامہ ہے، اسی لئے ہم اس خیال کی تائید کرنے کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے جس فن تعمیر کو جنم دیا اسے دراصل ہندی مسلم فن تعمیر کا نام دیا جانا چاہیئے۔ مسلمانوں کی تو یہ خصوصیت رہی ہے کہ انھوں نے نسلی یا جغرافیائی یا آب وہوا سے پیدا ہونے والی خصوصیات کے اظہار کو مفلوج نہیں کیا۔ اسلامی معمار ہندوستان میں جہاں جاکر بسے وہاں کے دیسی باشندوں کے طرز اخذ کرنے میں انھوں نے اسی صلاحیت کا ثبوت دیا جیسا کہ دوسرے ممالک میں دیا تھا اور اسی لئے ہندی مسلم فن تعمیر کے کئی نمایاں مقامی طرز وجود میں آئے۔ موسم اور امتداد زمانہ کے ہاتھوں نے ان طرز ہائے رنگا رنگ کو پھیکا یا ماند کر دیا ہے

لیکن اب بھی ان کا حسن اتنا تابناک ہے کہ اہل فن اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہندی مسلم فن کے اس طرز خاص کی جو خصوصیت سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ یہ کہ کس طرح نئے مقاصد کے اظہار کے لئے اجنبی تکنیک سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد اپنے روایتی تعمیری مسالے سے ایسی عمارتیں تعمیر کیں جو ذوق جمال کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہیں۔ نئے مقاصد، نئی تکنیک اور موسمی حالات و علاقائی روایات میں مطابقت پیدا کرنا ہی بڑا کارنامہ تھا۔ مطابقت کی ان ہی اشکال میں ہندوستانی مسلم تہذیب نے اپنے اظہار کی راہیں متعین کیں۔

ترکوں کی آمد کے بعد پہلی اہم تعمیر قوت الاسلام مسجد تھی۔ اس مسجد کی تعمیر کی کوئی ایک تاریخ نہیں۔ اس کی تعمیر کی تاریخ ۱۱۹۹ھ ہے لیکن دراصل اس کا ارتقا فیروز شاہ تغلق کے عہد تک ہوتا رہا جس نے مسجد کے مشہور مینار کی بالائی منزلوں میں ردوبدل کیا۔ اس مسجد میں جینی مندروں کے مسالے استعمال کئے گئے ہیں۔ ستون تمام جینی ہیں، چھت کی وضع بھی جینی طرز کی ہے۔ اس طرح کے مسالے اور تکنیک سے بنائی ہوئی عمارت سے عبادت کا مقصد تو حل ہو سکتا تھا لیکن ذوقِ جمال کی تسکین نہیں ہو سکتی تھی۔ اس میں حسن کا وہ رعب نہیں ہو سکتا تھا، جس سے پیشانی خود بخود جھک جائے۔ تعمیر کے بعد یہ مسجد مسلمانوں کو مندر کا نمونہ معلوم ہوئی ہو گی، اسی لئے ایک ایسے جز کے اضافے کی تحریک شروع ہوئی جس سے مسجد میں شان پیدا ہو سکے اور اس کی اسلامی شناخت قائم کی جا سکے۔ چنانچہ صحن کے مغرب کی طرف ایک مقصورہ تعمیر کیا گیا جو کمانوں کا ایک سلسلہ ہے۔ لیکن بنانے والے ہندو ہی تھے لہٰذا انھوں نے ان محرابوں کو اسی تکنیک کی بنیاد پر بنایا جس پر اپنے ہاں کے گنبد بناتے تھے۔ کمانوں کے اس سلسلے میں مرکزی محراب خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ نوکدار محراب کو دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ خوشی سے اچھل پڑی ہو۔ سنگ تراشی کی ایسی مثالیں

جیسی یہ محراب ہے کم ملیں گی۔ محراب کے گرد قرآنی آیات ہندوانی اشکال پر مشتمل حواشی کے درمیان آسمان کی بلندیوں کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ عربی خط اور ہندوانی اشکال کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی سعی اور وہ بھی ابتدائی دور میں قابل ستائش ہے۔ ہندوستانی معماروں نے اپنے روایتی اصولوں کے مطابق ہی ان محرابوں کی تعمیر پر اصرار کیا ہوگا۔ مسلمانوں کے پاس اپنے معمار نہ ہونے کی وجہ سے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا ہوگا لیکن ہندوستانی معماروں کو یہ ضرور یقین ہوگیا ہوگا کہ اب انھیں نئے مقصد کے لئے نئی شکلیں بنانا ہوں گی۔ نئی شکلوں کی تعمیر کے لئے انھوں نے اپنی تکنیک پر اس لئے اصرار کیا ہوگا کہ نئی تکنیک سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے وقت اور تجربہ درکار ہوتا ہے اور اس کی عدم موجودگی میں وہ کوئی خطرہ مول لینا نہ چاہتے ہوں گے۔ اجمیر کی مسجد اڑھائی دن کا جھونپڑا بھی اسی طرز پر تعمیر ہوئی۔ یہاں بھی ستونوں اور شہتیروں کے نئے منصوبے کے مطابق ازسرنو ترتیب دیا گیا کہ مسجد کا نقشہ تیار ہو جائے اور بعد ازاں صحن کے مغرب کی جانب کمانوں کا سلسلہ تجویز ہوا۔ ان دونوں مثالوں کے تجربے سے مسلمانوں کو کسی حد تک یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ہندوستانی معماروں کے پاس وہ صلاحیت موجود ہے جس کی مدد سے نئے تقاضوں اور ہندوستانی مسالے اور فن سنگ تراشی کے درمیان مطابقت پیدا ہوسکتی ہے۔ قطب مینار جو قطب مسجد کے جنوب مشرقی گوشے میں واقع ہے اس بات کی سند ہے کہ ہندوستانی معماروں نے اپنے مسلمان آقاؤں کے مقاصد کو سمجھنے میں کس حد تک کامیابی حاصل کر لی تھی۔ قطب مینار کی تعمیر میں وہ مقصد نہیں تھا جو مسجدوں کے مینار اور ماذنے کی تعمیر میں ہوتا ہے، گو کہ اس کے پہلے درجے پر چڑھ کر اذان دی جاتی تھی، اور غالباً اس کی تعمیر کا ایک یہ مقصد بھی رہا ہو لیکن درحقیقت یہ فتح کی یادگار اور مسلمانوں کے غلبے کے نشان کے طور پر تھا جسے ہندو بخوبی سمجھ سکتے تھے۔ مگر مغلوب ہندو معماروں

نے فاتح قوم کے نصرت و کامرانی کے مردانہ تصور کو پتھر میں ڈھالتے وقت ایک نسوانی لطافت عطا کر دی۔ مینار وسط ایشیا کے ترکوں کی میراث میں شامل تھا۔ بخارا اور غزنی کے مینار قطب مینار کے موجد فضل بن ابو المعالی اور محمد امیر کوہ کے لیے، جس کی نگرانی میں مینار التمش کے عہد میں مکمل ہوا، مثالی نمونہ رہے ہوں گے۔ فاتح کا مقصد، عمارت کا نقشہ دونوں ہندوستانی معماروں کے پیش نظر رہے ہوں گے لیکن ہند و صناعوں نے، جن کا آبائی پیشہ سنگ تراشی تھا، مینار کی موجودہ صورت طے کی ہوگی۔ انھوں نے اپنے موروثی تصورات کے مطابق یہ اصرار کیا ہوگا کہ غیر عمودی دباؤ مکمل طور پر نکال دیا جائے۔ اس لئے مینار نمایاں طور پر مخروطی ہے۔ وسط ایشیا کے مینار بھی مخروطی تھے لیکن وہاں کے معمار بنیادی طور پر فن تعمیر کے ماہر تھے اور ہندوستانی معماروں کا میدان عمل سنگ تراشی تھا لہٰذا پتھر کی تراش خراش کے ذریعے انھوں نے قطب مینار کو ایک لطیف احساس بنا کر پیش کیا، اسی لئے یہ اپنے بھاری پن کے باوجود ہندی مسلم جمالیات کا آئینہ دار بن گیا، مینار کے تمام عمارتی پہلو یا اجزاء سنگ تراشی کے خارجی پردوں میں اس طرح چھپ گئے ہیں کہ یہ مینار فن تعمیر کا نمونہ نہ رہ کر سنگ تراشی یا اسکلپچر کا نمونہ بن گیا ہے۔ شکل اور معنی کے اعتبار سے قطب مینار ویسا نہیں ہے جیسا کہ اس کے بانی یا موجد نے تصور کیا ہوگا۔ ترک اس کی تخلیق طاقت اور استحکام کے نشان کے بطور چاہتے ہوں گے جیسا کہ اس کی بلندی اور یکے بعد دیگرے بالائی منزلوں کے اوپر اٹھنے سے ظاہر ہوتا ہے لیکن ہند و صناع اپنی چھاپ ڈالے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے غالباً یہی کہا ہوگا کہ ٹھیک ہے طاقت اور اقتدار تمھیں مبارک لیکن میں اسے حسن و جمال سے اس طرح آراستہ کروں گا کہ جو اسے دیکھیں وہ یہ جان لیں کہ حسن ہی وہ واحد قوت ہے جو باقی رہتی ہے طاقت تو آنی جانی شے ہے۔

التتمش نے مسجد قوت الاسلام کی توسیع کی، اور کمانوں کا سلسلہ پہلی مسجد کے مقصورہ کے دونوں جانب قائم کیا۔ محرابوں کی شکل اور آرائش سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے سنگ تراشی میں ہندوستانی فطری شکلوں کے بجائے اپنی رسمی شکلوں پر اصرار شروع کر دیا تھا، لیکن محرابوں کی تعمیر یہاں بھی ہندوستانی اصولوں کے مطابق ہوئی۔ توسیع شدہ مسجد کے شمال مغربی گوشے کے عقب میں ملاہوا، التتمش (انتقال ۱۲۳۵ء) کا مقبرہ ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا حجرہ ہے، قدیم دہلی میں ہندی صناعی سے اسلامی مقاصد کے لئے جو کام لئے گئے ان میں اس سے بڑھ کر شاندار نمونہ شاید نہ ہو۔ اور اگرچہ ہندوستانی معماروں نے نئی تکنیک استعمال کرنے میں اناڑی پن دکھایا ہے تاہم یہ بہت خوبصورت عمارت ہے۔ حسن صنعت کی مثال ہونے کے علاوہ اس مقبرہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ہندوستان کا سب سے قدیم مقبرہ ہے۔

ہندو اور اسلامی تہذیب کے تضاد کے پیش نظر یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے کہ ترک مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے بعد مختصر مدت میں ہندوستانی معماروں نے نئے بانیوں کے مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنے ذہن کو آمادہ کر لیا تھا۔ ان کے قدیم سرپرست خاندانوں کا سیاسی زوال ہو گیا تھا، اس لیے انھوں نے نئے آقاؤں کی سرپرستی قبول کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کیا مگر ساتھ ہی بہت جرأت مندی سے اپنے فن کی بعض جزئیات کی برتری کا اعتراف اپنے آقاؤں تک سے کروا لیا۔ سیاسی طور پر ترک سلطانوں کو راجپوت راجاؤں اور راجاؤں پر قوت حاصل کرنے میں کافی دقت پیش آئی اور وقت بھی زیادہ لگا لیکن جہاں ان کی حکومت قائم ہو گئی وہاں انھوں نے ہندوستانی تہذیب کی ان قدروں کی بازیافت شروع کر دی، جنھیں وہ اسلام کے بنیادی اور مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی کئے بغیر اختیار کر سکتے تھے، یہ بات قابل غور ہے کہ اس سماجی عمل کے لئے انھوں نے اپنی مسجدوں اور مقبروں کو، جن کی

نوعیت بڑی حد تک مذہبی ہوتی ہے۔ ہندو صناعوں کے سپرد کر کے خود دور سے نظر رکھی کہ معماروں کو ان کے مروجہ سماجی عمل میں پوری آزادیٔ فکر ہو، اس طرح ابتدا ہی سے ہندوستانی مسلمانوں نے، مذہبی اور سماجی پابندیوں کے باوجود نئے اور اجنبی حالات میں اپنے اظہار کے لئے فن تعمیر میں زیادہ آزادانہ طور پر کام لیا۔ جو بات ان اجنبی حالات میں مضامین اور کتابوں میں نہیں لکھی جا سکتی تھی۔ اسے فن تعمیر کے پیکر میں اس خوبصورتی سے پیش کیا گیا کہ تعصب کی نظر اس پر نہیں جا سکی اور اس کی اپنی علیحدہ شناخت بھی ہونے لگی جسے ہم ہندی مسلم فن تعمیر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

تقریباً ایک صدی کے وقفے کے بعد علاء الدین خلجی نے قوت الاسلام مسجد کی مزید توسیع کی۔ ظاہر ہے اس عرصے میں آبادی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہو گا جس کی وجہ سے توسیع کی ضرورت محسوس کی گئی ہو گی۔ مسجد کے طول و عرض کے ساتھ ساتھ علاء الدین خلجی نے مسجد کے جنوب کی طرف ایک داخلی دروازہ بھی تعمیر کروایا جو علائی دروازہ کے نام سے موسوم ہے، یہ اس عہد کے عروج کی یادگار ہے جب ہندی معمار بیرونی آقاؤں کی ضروریات کے مطابق اپنی اعلیٰ صناعی سے کام لینا سیکھ گئے تھے۔ مولوی سید ہاشمی فرید آبادی نے فرگسن کی مشہور و معروف تالیف کے ترجمے (مطبوعہ ۱۹۳۲ء) میں مصنف کے اس مرکزی خیال پر حاشیے میں تبصرہ کیا ہے جو قابل غور ہے کیونکہ ہم دیکھیں گے کہ نو آبادیاتی نظام میں ہند و مسلم تہذیب کے اختلاف اور تضاد کو شعوری طور پر نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی اور تمام دستاویزی اسناد کے باوجود یہ دلیل پیش کی گئی کہ مسلمان شروع سے اپنے کو ہند و اثرات سے آزاد رکھنے آئے تھے۔ مولوی سید ہاشمی کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

> "مؤلف (فرگسن) کا یہ مفروضہ غلط ہے کہ ان عمارتوں کے
> صناع و معمار لازماً ہندی تھے ... لیکن اس موقعہ پر یہ تنبیہ

مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مؤلف کی پوری تحریر اس نظریے پر
مبنی ہے کہ اسلامی عمارتوں پر ابتدا ہی سے ہندی اثرات
پڑ رہے تھے، حالانکہ یہ خیال تاریخ اور بداہت دونوں کے
خلاف ہے، تازہ وارد مسلمانوں کے دل میں طبعاً اہل ہند
کی اول اول کوئی وقعت نہ تھی اور ان کی ابتدائی
تہذیب و معاشرت ہندی اثرات سے بالکل آزاد رہی،
اس زمانے میں انھوں نے جو عمارتیں بنائیں وہ بھی خالص
اسلامی طرز کی اور وسعت و استحکام کے اعتبار سے نہایت
ممتاز ہیں، البتہ آگے چل کر جس نسبت سے ہندی اثرات
بڑھتے گئے، عمارتوں میں خالی نمائشی خوبی اور کمزوریاں نمایاں
ہونے لگیں۔" (اسلامی فن تعمیر ہندستان میں، حاشیہ نمبر ا صفحہ ۲۴)

اس رائے کو نظر انداز کیا جا سکتا تھا لیکن یہاں محض اس لئے نقل کیا گیا کہ ہر سماجی فکر اپنے دور کے تقاضوں کے تابع ہوتی ہے اور اس میں ایک رجحان تاریخ کو اپنے تقاضوں کے تابع بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے، معروضی نقطۂ نظر سے ہم دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ عہد وسطی کی سماجی زندگی میں ہندو اور مسلم معاشرے کی علیحدگی ممکن نہیں تھی، اس کی تشریح فن تعمیر سے ہو جاتی ہے۔

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خاں ندوی

عربی زبان

اور

غیر ملکی زبانوں کی تعلیم کے نئے طریقے

(ماہانہ مذاکرۂ علمی مرکز مطالعات ایشیائے غربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں برائے مباحثہ پیش کیا گیا۔)

عربی زبان سامی زبانوں کے خاندان کی شاید وہ تنہا زبان ہے جو اپنی ابتداً سے آج تک بلا کسی بنیادی بڑی تبدیلی کے عروج وزوال اور پھر نشاۃ ثانیہ کے مراحل سے گذرتی ہوئی ترقی کی راہ پر ثابت قدمی کے ساتھ گامزن ہے، وہ آج پندرہ کروڑ عربوں کی مادری، قومی، علمی، ادبی اور ثقافتی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا کے پچھتر کروڑ مسلمانوں کی دینی اور مذہبی زبان بھی ہے۔
اس زبان میں جو علمی، ادبی، اخلاقی اور مذہبی ذخیرہ محفوظ ہے وہی اس کی تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لئے کیا کم تھا کہ موجودہ دنیا میں عرب علاقے کی روز افزوں سیاسی، اقتصادی اور فوجی اہمیت نے گویا دنیا کو ایک دم نئے سرے سے اس کی طرف متوجہ کر دیا، ہر شخص کی نظر اس طرف ہی لگی ہوئی ہے، دولت

ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خاں ندوی، ریڈر شعبۂ عربی۔ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

کی فراوانی اور کام کے مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہر شخص کوشش کر رہا ہے۔

آج کا طالب علم بھی اس دنیا کا خاموش تماشائی نہیں ہے، وہ بھی موجودہ زمانے کی نفسیات کے مطابق کم وقت کم محنت اور زیادہ فائدے کے اصول کی بنیاد پر عربی زبان کو سیکھنے کا خواہش مند ہے، زبان میں استادی کا مرتبہ حاصل کرنا اس کا مقصد نہیں ہے، نہ نحو اور صرف کی دقیقہ سنجیوں سے اس کو غرض ہے، اس کو پہلے مرحلہ میں زبان کی اتنی واقفیت چاہیئے جس سے وہ اپنا مافی الضمیر زبانی طور پر ادا کر سکے، اس کو روزمرہ استعمال کی معیاری زبان کی ضرورت ہے جس سے وہ اپنی مقصد براری کر سکے، اس کو اس رواں دواں زبان کی ضرورت ہے جس کو حاصل کرتے ہوئے اس کے شوق و ذوق کی دھار آبدار ہو اور دوسری زبانوں کے طلباء کے سامنے اس کو احساس شکست اور مایوسی سے دوچار ہونا نہ پڑے۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ ہماری عربی درس گاہوں اور ان کے اساتذۂ کرام نے اس طالب علم کے خیر مقدم کے لیے کیا کیا تیاریاں کی ہیں؟ کیا ہم نے اس طالب علم کے وقت، اس کی ضروریات، نفسیات، [illegible] اور دلچسپیوں کا خیال رکھتے ہوئے اس کے لئے نئے کورس تیار کئے ہیں؟ کیا ہم نے اس کی بول چال اور تحریر و تقریر کی صلاحیت اجاگر کرنے کے لئے عربی نصاب تعلیم میں کوئی گنجائش رکھی ہے؟ کیا ہم نے خالص زبان کی تعلیم کے تربیت یافتہ اساتذہ تیار کرنے کا کوئی پروگرام بنایا ہے؟ کیا ہمارے عربی زبان کے سکھانے والے اساتذہ کو زندہ زبان سے رابطے کے مواقع حاصل ہیں؟ کیا اس زبان کے اساتذہ علمی، ادبی، معیاری زبان اور مختلف لہجوں کی بول چال والی زبان کے استعمالات کے درمیان ربط و تعلق کی وضاحت کر سکتے ہیں؟ کیا ہم کو اس زبان کی لسانیات کے اصول و مبادیٔ سے اتنی واقفیت ہے کہ ضروری مواقع

پر اس کی مدد لی جا سکے؟ کیا ہم اہلِ زبان کی ثقافتی، تاریخی اور جغرافیائی معلومات کے پس منظر میں زبان کے مفردات اور استعمالات کی وضاحت کر سکتے ہیں؟ کیا ہمارے اساتذہ زبان کی تعلیم کی سمعی بصری ٹیکنیک (AUDIO LINGUAL TECHNIQUES) سے واقف ہیں؟ کیا ہم کو رائج الوقت عام سمعی بصری آلات، اور ان سب کی مرکب و پیچیدہ مگر مفید ترین مشین، زبان کی تجربہ گاہ کے استعمال کے مواقع حاصل ہیں؟ کیا ہم اجنبی زبان کی تعلیم کے میدان میں گذشتہ ایک صدی میں کئے جانے والے تجربات اور ان کے سود و زیاں سے واقف ہیں؟ غالباً ان میں سے اکثر سوالات کا جواب نفی میں ہے، حالانکہ یہ تمام چیزیں آج کے اجنبی زبان کے معلّم کے لئے بنیادی پیشہ ورانہ صلاحیت کے لئے مسلّم ہیں۔

مگر اس صورتِ حال سے دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے، انسانی عزم اور مخلصانہ محنت ہر مشکل کو سر کر سکتی ہے۔ امریکہ میں گذشتہ صدی کے اواخر اور موجودہ صدی کے اوائل میں غیر ملکی زبانوں کی تعلیم کی حالت ہندوستان میں عربی تعلیم کی موجودہ حالت سے بہتر نہیں تھی، وہاں پر بھی غیر ملکی زبانوں کی تعلیم میں نحوی صرفی اور ترجمہ والا قدیم طریقہ رائج تھا، جس میں صرف ترجمے پر زور دیا جاتا تھا، جس سے اصل زبان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی تھی، بلکہ طالبعلم پہلے مادری زبان کو سیکھتا تھا (جیساکہ ہندوستان میں ہو رہا ہے)، پھر مادری زبان کا ترجمہ اس نئی زبان میں کرتا تھا جس کو وہ سیکھ رہا ہے، یہ طریقہ زبان سیکھنے کے فطری سلیقے کے سراسر خلاف ہے۔ زبان سیکھنے کا کامیاب ترین طریقہ وہی ہے جس سے بچہ اپنی مادری زبان سیکھتا ہے، یعنی اس کا گھر، اس کا معاشرہ اور ماحول جس طرح معلّمی کا فرض انجام دیتا ہے، کچھ ایسی ہی توقع غیر ملکی زبان کے استاد سے بھی رکھی جاتی ہے، جو اگرچہ گھر اور ماحول و معاشرے کو تو نہیں بدل سکتا، لیکن اپنی کلاس میں تعلیم کے دوران تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی وہ ماحول ضرور پیدا کر سکتا ہے جو غیر ملکی زبان سے مانوس کرنے میں مددگار ثابت ہو۔

گذشتہ صدی میں امریکہ میں غیر ملکی زبانوں کی تعلیم کے ٹھیکیدار بھی، ہمارے ہندوستان
رح ،صرف کلاسیکل زبانوں کو ہی اعلیٰ تعلیم کے قابل سمجھتے تھے، یورپ کی معاصر
نوں (بشمول انگریزی زبان) کو اعلیٰ تعلیم کے سنجیدہ علمی بحث و تحقیق کے
نورع سے کم رتبہ سمجھا جاتا تھا۔ وہاں پر بھی ہماری طرح انتہائی مضحکہ خیز لطیفے
، آتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک فرانسیسی خاتون ایک فرانسیسی زبان
مریکی پروفیسر سے اپنی ملکی و قومی زبان میں گفتگو کرنے پر بضد ہوگئیں، اور
، پروفیسر صاحب کی تمام آنا کانی ناکام ہوگئی تو انھوں نے زچ ہوکر مذاق میں
، کو اس طرح ٹالا کہ "میڈم! میں فرنچ پڑھاتا ہوں، میں نے آپ سے کب کہا
ں فرنچ بول بھی سکتا ہوں۔ ایک دوسرے امریکی پروفیسر نے اپنے غیر ملکی دورے
وقع پر اپنی زبان دانی کا خراجِ تحسین ان الفاظ میں وصول کیا کہ "آپ انیسویں
ی کے کسی ناول کے کردار کی زبان اچھی طرح بول لیتے ہیں۔"
ان نامساعد حالات کے باوجود غیر ملکی زبانوں کے اساتذہ نے ہمت نہ ہاری،
ادی اور اجتماعی کوششیں جاری رہیں، غیر ملکی زبان کی ترویج اور ان کی تعلیم
ؤثر اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے نت نئے تجربات جاری رہے، چنانچہ امریکہ کی
نل ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کی ایک بارہ رکنی کمیٹی کی رپورٹ شائع شدہ
۱۸۹۸ء میں فطری اور راست (ڈائرکٹ) طریقۂ تعلیم کے اشارے ملتے ہیں، جو
ہر ہے کہ اس وقت ابتدائی مراحل میں تھے۔
جنگ عظیم دوم کے موقع پر جب امریکہ کو جاپانی، چینی، روسی، جرمن وغیرہ غیر ملکی
نوں کے جاننے والے افسروں کی ضرورت پڑی تو مذکورہ زبانوں کے اساتذہ کے
ون سے ایک نیا کامیاب طریقۂ وجود میں آیا، جو اگرچہ فوجی طریقۂ تعلیم کے نام سے
ہور ہوا، لیکن حقیقتاً وہ اس صدی کے چھٹے دہے میں مقبول عام ہونے والے
ست طریقۂ تعلیم (ڈائرکٹ میتھڈ) کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس
گامی طریقۂ کے تحت زبان سیکھنے والے فوجیوں کا انتخاب ان کی ذہانت، غیر ملکی

ن حاصل کرنے کی مناسبت اور ملکی خدمت کے جان فروشانہ جذبے کے تحت کیا گیا۔
تاشام اتنے منظم پروگرام کے تحت ان کی تعلیم وتربیت ہوئی کہ اس وقت کے
ولوں اور کالجوں کے چھ سالہ تعلیمی وقت کو صرف نو ماہ کی تعلیمی مدت میں سمیٹ
گیا، خاص طور پر تربیت یافتہ ماہرین لسانیات کی نگرانی میں اہل زبان اور شبہ
) اہلِ زبان معلمین کے ذریعے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں اور جماعتوں کو نئی زبان
تربیت دی گئی۔ ذریعہ تعلیم تو متعلقہ غیر ملکی زبان خود تھی ہی، اس پوری مدت
ان طلباء کے درمیان رابطہ کی زبان بھی وہی غیر ملکی زبان تھی جس کو وہ سیکھ
ہے تھے، اہلِ زبان معلمین صبح سویرے سے رات کو سوتے وقت تک ان طلباء
صحیح رہنمائی اور مفردات وتعبیرات کی فراہمی کے لئے ان کے درمیان ہی رہتے
، صحیح لہجے میں مکمل رواں گفتگو کی تعلیم ان کا واضح مقصد تھا، لکھنے پڑھنے کی
یت ثانوی تھی۔ علمی، ادبی، ثقافتی اور تاریخی معلومات کی جگہ اہل زبان کے رسم
اج اور طور طریقے اور زندگی سے واقفیت کو دی گئی تھی، درسی اسباق کی
فوجی ضروریات کی گفتگو، ہدایات اور پیغامات یاد کرائے گئے تھے۔ جنگی بجٹ
تحت ہر قسم کی تعلیمی سہولتیں اور ضرورتیں ان کو کثرت سے فراہم کی گئی تھیں۔ اتنی
ت مسلسل محنت اور تربیت کا نتیجہ ظاہر ہے بہت اچھا نکلا، اور اتنی مختصر مدت
غیر ملکی زبانوں کو روانی کے ساتھ بولنے اور سمجھنے والے فوجیوں کی ایک بڑی ٹیم
رہوگئی، جو غیر ملکی قیدیوں سے ان کی مادری زبانوں میں انٹرویو لینے کی صلاحیت
تی تھی، جاسوسی کے جملہ کام انجام دیتی تھی، اور غیر ملکی ریڈیو دھیمی آواز اور
بیائی رکاوٹوں اور مزاحمتوں کے باوجود اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔ اتنی مختصر مدت
تیار کی ہوئی زبان دانوں کی یہ فوجی ٹیم ان امریکی اسکولوں اور کالجوں کے
ہار سے بدرجہا بہتر تھی جن میں دو سے چھ سال تک تعلیم حاصل کرنے کے باوجود
شکل اٹک اٹک کر اور ادھوری بات کرنے کی صلاحیت پیدا ہو سکی
ی۔

مذکورہ طریقہ اگرچہ ہنگامی ضرورت کے تحت وجود میں آیا تھا، اور اس کو فوجی نظم وضبط کے تحت چلایا گیا تھا، اس لئے اس کو ہوبہو اسکولوں اور کالجوں میں نافذ کرنا کسی کے بس کا کام نہ تھا، لیکن اس کی بے مثال کامیابی نے امریکہ میں غیر ملکی زبانوں کی تعلیم کی فتوحات کے دروازے کھول دیئے، غیر ملکی زبانوں کے اساتذہ نے اس طریقے سے رہنمائی حاصل کی اور اپنے طلباء کے مقاصد ضروریات اور دلچسپیوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس طریقے کو ترقی دی اور متعدد تجربات کئے۔ ان کی کوششوں کو مختلف نام دیئے گئے، جیسے نیا طریقہ تعلیم، اصلاحی طریقۂ تعلیم، فطری طریقۂ تعلیم، اور زبانی طریقۂ تعلیم، یہاں تک کہ ان مخلص اساتذہ کی انفرادی اور اجتماعی بے لوث کوششوں کا جامع راست طریقۂ تعلیم وجود میں آیا، اور بیسویں صدی کے چھٹے دہے میں مشہور اور مقبول ہوا۔

یہ راست طریقۂ تعلیم ہے کیا ؟ مختصراً یوں سمجھئے کہ یہ طریقۂ تعلیم طلباء کا غیر ملکی زبان سے مادری زبان کی طرح براہ راست رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے، اُن کے مناسب حال وقال زبان وبیان کی مدد فراہم کرنے کی سفارش کرتا ہے، اساتذہ کو اندرون وبیرون کلاس مناسب ماحول پیدا کرنے اور ان پر غیر ملکی زبان کے کلمات ومفردات، جملوں اور مفاہیم کو منطبق کرکے زبان کا تعلمی فائدہ حاصل کرنے پر ابھارتا ہے، اُس نے اِس سلسلے میں کنایہ واشارہ اور حکایت و افسانہ، بلکہ تماشا تک سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے، لیکن مداری کا یہ کھیل بھی متعلقہ زبان ہی میں ہونا چاہیئے، جس کو طلباء سیکھ رہے ہیں، کیونکہ یہی اس طریقہ کا بنیادی نکتہ ہے۔

یہ طریقۂ تعلیم قدیم ترجمہ والے طریقہ کی ضد ہے، کیونکہ ترجمہ آج کل ایک مستقل فن تصور کیا جاتا ہے، جس کی تربیت صرف اس وقت دی جاسکتی جبکہ طالب علم زبان کے ابتدائی مراحل سے گذر کر نئی زبان میں سوچنے سمجھنے اور مافی الضمیر کی مکمل تعبیر کرنے پر قادر ہو چکا ہو، اسی لئے راست طریقۂ تعلیم میں نئی زبان کی تعلیم

پہلے دن اور پہلے سبق سے اسی زبان میں دینے پر زور دیا جاتا ہے جس کو طلبا ء سیکھ رہے ہیں ، مادری یا رابطہ کی زبان کا سہارا لینے کو سخت مضر سمجھا جاتا ہے ، اور ایسے استاد کو نتیجے کے اعتبار سے مفید ترین سمجھا جاتا ہے جو طلبا ء کی مادری اور رابطہ کی زبان سے واقف نہ ہو ، کیونکہ پھر وہ طلبا ء سے صرف اسی زبان میں گفتگو کرنے پر مجبور ہوگا جس کو طلبا ء سیکھ رہے ہیں ۔

یہ طریقہ اپنی تمام نتیجہ خیزی کے باوجود جتنا مشکل ہے ، اور جتنی عظیم ذمہ داری استاد کو سونپتا ہے اس کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے ۔ اس کے لئے ایسے تجربہ کار استاد کی ضرورت ہے جو کلاس کے اندر نئی زبان سکھانے کے لیے وہ مکمل ماحول پیدا کرسکے جو مادری زبان سیکھتے وقت بچے کو خود بخود اس کے گھر ، ماحول اور معاشرے میں حاصل ہوتا ہے ، اسی طرح اس طریقے پر عمل طور پر عمل کرنے کے لئے ایسے اعلیٰ معیار کے مصوّر کورس کی ضرورت ہے جو طلبا ء کی عمر ، مقاصد ، ضروریات اور دلچسپیوں کا آئینہ دار ہو ، اگر ایسا کورس تیار نہ ہو تو استاد کو خود ایسا کورس تیار کرنا ہوگا ، پھر ان وسائل کو بھی سوچنا ہوگا جن کے ذریعے وہ طلبا ء کی دلچسپی برقرار رکھتے ہوئے ، وہ سب کچھ سکھا سکے جو اس نے ان کے لئے انتخاب کیا ہے ، جیسے مفردات کے مجسم مدلولات یا ان کے ماڈل (نمونے) ، یا ان کی تصویریں ، یا بلیک بورڈ پر ان اشیا ء کے خاکے بنا کر طلبا ء کے سامنے پیش کرنا ، نقّالی اور ایکٹنگ کے مفاہیم کی وضاحت ، دو چیزوں کے مقابلے سے ان کے فرق کو ذہن نشین کرانا ، ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے اہل زبان کی آواز میں صحیح تلفظ کی مشق وغیرہ وغیرہ ۔

اس راست طریقۂ تعلیم پر ہی زبان کی تعلیم کی فتوحات ختم نہیں ہوگئیں بلکہ اس کے بعد لسانی بنیادوں پر زبان کی تعلیم کا طریقہ ایجاد ہوا ، جس میں طلبا ء کی تفقیقی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے بنیادی ترکیبوں کے مثالی جملوں کے نمونوں کی کثیر اور متنوع طلبا ء کے یاد کرنے کے لئے تیار کی جاتی

ہیں، اور ان کو اہلِ زبان کی آواز میں ٹیپ کر کے صحیح تلفظ اور صوتی زیر و بم کے ساتھ اس کی نقل اتارنے اور یاد کرنے پر زور دیا جاتا ہے، تاکہ غیر ملکی زبان عادت و سلیقہ کی حیثیت سے دل و دماغ میں بس جائے، اور زبان سے برجستگی اور روانی کے ساتھ برمحل ادا ہونے لگے۔ اس طریقہ کی مقبولیت میں موجودہ زمانے کے سمعی بصری آلات اور زبان کی تجربہ گاہ کا بڑا ہاتھ رہا ہے، جس کے بغیر اب ترقی یافتہ دنیا میں زبان کی تعلیم کا تصور اٹھ گیا ہے۔

اس طریقۂ تعلیم کو مدّ نظر رکھتے ہوئے مشیگن یونیورسٹی کے مرکز مطالعات شرق ادنیٰ اور شمالی افریقہ نے گذشتہ ۱۵-۱۶ سال کے عرصے میں غیر ملکیوں کی عربی زبان کی تعلیم کے میدان میں نمایاں اور قابل قدر کام انجام دیا ہے۔ ابتدائی اور درمیانی مراحلِ تعلیم کے چھ بہترین کورس اب تک تیار کئے جا چکے ہیں، جو کتابی اور ریکارڈ کئے ہوئے کیسٹ کی شکل میں مذکورہ یونیورسٹی سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔

زبان کی تعلیم کے سلسلے میں آخری چیز یہ یاد رکھنے کی ہے کہ مذکورہ تمام طریقِ تعلیم نقائص سے پاک نہیں ہیں۔ ان سب پر تنقیدیں ہوئی ہیں، اسی لئے ناقدین کا خیال ہے کہ غیر ملکی زبانوں کے معلّم پر کوئی ایک متعین طریقہ لازمی طور پر تھوپنا مناسب نہیں ہوگا، لیکن ان اساتذہ سے یہ توقع ضرور کی جاتی ہے کہ وہ موجودہ رائج طریقوں سے واقف ضرور ہوں گے، اور خود اپنے اور طلباء کے حسب حال ان سب تعلیمی طریقوں کے مناسب اور مفید ترین عناصر سے مدد لے کر اپنے اسباق کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ، مفید اور نتیجہ خیز بنانے کی کوشش کرتے ہوں گے۔

عطیہ اویس
(کراچی یونیورسٹی)

غزل

لاکھ ہوتا ہو خونِ جگر دیکھنا
ان پہ ظاہر نہ ہو چشمِ تر دیکھنا
جن کو سورج بھی دن میں دکھائی نہ دے
لوگ ان کو کہیں دیدہ ور دیکھنا
تم سے دیکھا نہ جائے تو بات اور ہے
ہو سکے تو ہمیں اک نظر دیکھنا
کل تلک ان کے دل کے مکینوں میں تھے
ہو گئے آج ہم در بدر دیکھنا
تم ہواؤں کا رُخ دیکھ کر ہی چلو
آج اُدھر دیکھنا کل اِدھر دیکھنا
راہ و منزل سے بھٹکا کے چھوڑا ہمیں
کیسے کیسے ملے ہمسفر دیکھنا
بک گئی تھی جو انمول بازار میں
آبروئے متاعِ ہنر دیکھنا
زندگی کا نہ تھا اعتبار آج تک
زندگی ہو گئی معتبر دیکھنا
کرچیوں میں ہمیں ہم نظر آئیں گے
تم کبھی آئینہ توڑ کر دیکھنا

عبداللطیف اعظمی

تعارف و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

رقعات رشید صدیقی مرتبہ : پروفیسر مسعود حسین

سائز ۱۸×۲۲/۸ ، حجم ۲۹۵ صفحات ، مجلد مع گردپوش ، کتابت و طباعت عمدہ ، قیمت : ۲۰ روپے ، سنہ اشاعت : ۱۹۸۱ء ، ناشر: شعبۂ لسانیات ، مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ ۔ ۲۰۲۰۰۱

زیرِ تبصرہ کتاب پروفیسر رشید احمد صدیقی (۹۲ ۱۸ ۔ ۱۹۷۷) کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے پروفیسر مسعود حسین صاحب کو لکھے ہیں ، ان خطوط کی کل تعداد ۱۹۰ ہے اور ان کی مدت کم و بیش ۳۱ سال پر مشتمل ہے ، اس مجموعے میں ان کا پہلا خط ۲۹ ستمبر ۱۹۴۴ء کا ہے اور آخری خط ۲۲ جنوری ۱۹۷۷ء کا ، مگر ستمبر ۱۹۴۴ء سے اپریل ۱۹۵۹ء کی درمیانی مدت کا کوئی خط نہیں ہے ، اسی طرح ۱۹۵۹ء اور جنوری ۱۹۶۱ء کی درمیانی مدت کا کوئی خط نہیں ہے اور بقول فاضل مکتوب الیہ : "۱۹۴۴ء تا ۱۹۶۲ء کے بیشتر رقعات زائل (؟ ضائع) ہوگئے ۔ تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں تھی ، میں علی گڑھ ہی میں تھا اور رشید صاحب سے مراسلت کا کاروبار ابھی نہیں کھلا تھا ، ان کے خطوط کا باقاعدہ سلسلہ ۱۹۶۲ء کے بعد شروع ہوتا ہے ۔ جب میرا عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا اور میں علی گڑھ سے چھ سال کے لیے باہر چلا گیا ، خطوط کی بڑی تعداد انھیں چھ سال سے تعلق رکھتی ہے ۔" (صفحہ ۱۶) ۱۹۷۶ء کا بھی

صرف ایک ہی خط ہے (مورخہ ۲۲ جنوری)، اگلے سال ۱۵ جنوری کو فاضل مکتوب نگار کا انتقال ہوگیا، گویا آخری خط وفات سے ایک سال پہلے کا ہے، غالباً صحت کی خرابی کی وجہ سے اس عرصے میں انھوں نے کوئی خط نہیں لکھا اور اگر لکھا تو وہ محفوظ نہ رہ سکا۔

کتاب کا نام دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ شاید فاضل مرتب نے خطوط اور مکاتیب کے کثرت استعمال کی وجہ سے ان سے بچنے کی کوشش کی ہے، مگر انھوں نے اس کی وجہ اور لکھی ہے، فرماتے ہیں: "میں نے ان مکاتیب کو جان بوجھ کر "رقعات" سے موسوم کیا ہے، اس لیے کہ ان میں سے بیشتر رقعوں اور پرچوں پر لکھے گئے ہیں، کچھ اس وجہ سے کہ مکتوب الیہم مقامی تھا اور اس کا مکان ان کے دولت کدے سے بہ مشکل ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا اور کچھ اس سبب سے کہ رشید صاحب اپنے خطوط کے لیے مخصوص اسٹیشنری یا ڈاک کے بے جا خرچ اٹھانے کے قائل نہ تھے۔ جب ڈاک کے ذریعہ ترسیل خط منظور ہوتی تو پوسٹ کارڈ کا استعمال کرتے، اس میں کفایت کے علاوہ سہولت بھی تھی، ایک دفعہ کی گفتگو سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ پوسٹ کارڈ کو لفافے (بند یا کھلے) کے مقابلے میں زیادہ پائدار سمجھتے تھے۔" (صفحہ ۱۶)

رشید صاحب بڑی کثرت سے خطوط لکھا کرتے تھے اور انتہائی پابندی سے جواب دیتے تھے۔ ریٹائر ہونے سے پہلے، مجھے معلوم نہیں کہ ان کا کیا دستور تھا، مگر ریٹائر ہونے سے وفات تک، یکم مئی ۱۹۵۸ء تا ۱۵ جنوری ۱۹۷۷ء ان کا یہی معمول تھا، اس لیے ان کے مکتوب الیہم کی تعداد سیکڑوں ہوسکتی ہے، مگر زیر تبصرہ رقعات کے مکتوب الیہ پروفیسر مسعود حسین ان کے شاگرد رشید تھے اور ان پر بڑا اعتماد کرتے تھے اس لیے میرا اپنا خیال ہے کہ اگر وہ دل کی بات کسی سے کہہ سکتے تھے تو وہ صرف مسعود صاحب ہیں۔ اگرچہ مسعود صاحب نے لکھا ہے کہ: "رشید صاحب بنیادی طور پر ایک "دروں بیں" شخصیت کے مالک تھے، ایسی شخصیت اپنے نجی رشتوں اور

تحریروں میں احتیاط اور دیر سے کھلتی ہے، خاص طور پر اگر مکتوب الیہہ اس کا ہمدم و ہمراز نہ ہو۔۔۔۔ مکتوب نویسی میں ان کے اس رویے کے باعث رشید صاحب اپنے رقعات میں بہت کم بے پردہ ہوئے ہیں" (صفحہ ۱۸) مگر ان خطوط کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ رشید صاحب کے دل و دماغ کو سمجھنے کے لیے ان خطوط سے بڑی مدد ملتی ہے۔ ان خطوط کی اہمیت اور خصوصیت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوگا جب وہ خطوط بھی سامنے ہوں جو انھوں نے اپنے ہم عصروں، ساتھیوں اور عزیزوں کو لکھے ہیں، مگر اس سے بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان خطوط کی اشاعت سے اردو کے مکتوباتی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہوا ہے اور ان کے مطالعے سے مرحوم کے خیالات و افکار کو سمجھنے اور ان کے مکتوباتی اسلوب کو پرکھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں خطوط کے علاوہ فاضل مرتب کی دو مفید تحریریں بھی شامل ہیں، ایک کا عنوان ہے: "رشید صاحب: چند یادیں" اور دوسری کا: "رقعاتِ رشید: چند باتیں" ان دونوں تحریروں سے فاضل مکتوب نگار کی شخصیت اور ان کے خطوط پر بڑی مفید روشنی پڑتی ہے۔ امید ہے کہ علمی اور ادبی حلقوں میں اس کتاب کو قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا، جس کی وہ بہرحال مستحق ہے۔

غلام ربانی تاباں ــــ حیات اور شاعری　　از شفیق النساء قریشی

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم ۱۴۸ صفحات، مجلد، قیمت: ۱۰ روپے۔ تاریخ اشاعت: نومبر ۱۹۸۰ء۔ ناشر: نئی آواز، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

غلام ربانی تاباں صاحب اردو کے مشہور اور مقبول شاعر ہیں اور ترقی پسند شعراء میں ایک ممتاز مقام کے مالک ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب کی فاضل مصنفہ، محترمہ شفیق النساء قریشی صاحبہ نے "حرفِ آغاز" میں لکھا ہے کہ

"تاباں کی شاعری پر ہمارے نقادوں نے اتنی توجہ نہیں دی جس کی وہ مستحق تھی، ترقی پسند تحریک کے ایک سرگرم کارکن ہونے کے باوجود انھیں نظر انداز کیا جاتا رہا، اس کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ انتہا پسندی سے بڑی حد تک دور رہے اور گروہ بندی سے خود کو الگ رکھا، ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے بھی تاباں کو اردو تنقید نے مناسب مقام نہیں دیا، حالانکہ غزل میں تاباں کی انفرادیت بہت نمایاں ہے اور اردو غزل کو آگے بڑھانے میں انھوں نے جو حصہ لیا اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زیر نظر مقالے میں ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ اردو شعر و ادب کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے سلسلے میں تاباں کی شاعری کا جو حصہ رہا ہے اس کا مفصل جائزہ لیں۔" (صفحہ ۲۲)

حضرت تاباں کے بے تکلف دوست اور عقیدت مند جناب رشید حسن خاں صاحب نے اس کتاب کے لیے پیش لفظ لکھا ہے، جس میں تاباں صاحب کی شاعرانہ خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: تاباں نے غزل کو سیاسی عقیدے کا ترجمان نہیں بنایا، سیاسی عقیدے کی نسبتوں نے جب کبھی احساس اور جذبے کو پگھلا کر سیّال بنا دیا، تب وہ غزل کے کام آیا ہے۔ غزل کے اسلوب کی بالادستی برقرار رہی ہے۔۔۔ میں یہاں ان کی ایک غزل کے چار شعر پیش کرتا ہوں، ان ہی سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غزل کی روایت کو اس زمانے میں تاباں نے کس طرح توسیع بخشی ہے:

راہ رو کا ساتھ تو کیا دے گی دن کی روشنی
جاتے جاتے سارے منظر ہی اٹھا لے جائے گی

پیڑ سے ٹوٹے ہوئے پتّوں کی آخر کیا بساط
جس طرف چاہے گی جنگل کی ہوا لے جائے گی

دوست بن کے آئی تھی، دل میں سکوں کی آرزو
کیا خبر تھی، ساری رونق ہی چرا لے جائے گی

راس آئے یا نہ آئے مصلحت کی زندگی
دربدر رسوا کرے گی، جا بجا لے جائے گی

(صفحہ ۱۴ و ۱۵)

یہ کتاب دراصل ایک طویل مقالہ ہے جسے جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو کی ایک لکچرر اور ریسرچ اسکالر مسز شفیق النساء قریشی صاحبہ نے لکھا ہے، اس شعبے کی پروفیسر، محترمہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ نے اس مقالے کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "انھوں نے تاباں صاحب کی نظم و نثر دونوں پر نظر غائر ڈالی ہے، یہ نظر سطحی نہیں، اس میں محققانہ شان ہے۔" (صفحہ ۱۸) ہمیں قوی امید ہے کہ یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی اور اردو ادب میں مناسب جگہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوگی۔

شام کا پہلا تارا (شعری مجموعہ) از زہرا نگاہ

سائز ۲۲×۱۸/۸، حجم ۱۶۰ صفحات، کتابت و طباعت و کاغذ عمدہ،
قیمت: ۲۱ روپے۔ تاریخ اشاعت: جولائی ۱۹۸ء
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

محترمہ زہرا نگاہ، پاکستان کی مشہور ترین اور مقبول ترین شعراء میں سے ہیں، ان کا کلام تو اپنی جگہ پر اچھا اور معیاری ہوتا ہی ہے، ان کے پڑھنے کا انداز بڑا ہی موثر اور سحر انگیز ہے۔ آج سے بیس تیس سال پہلے جب وہ دلی کے انڈو پاک مشاعرے میں آتی تھیں تو چاہے پاکستانی شاعر ہوں یا ہندوستانی، ان کے سامنے کسی کا چراغ جل نہ پاتا۔ وہ جامعہ کے مشاعرے میں بھی بارہا آئی ہیں اور یہاں بھی خوب مقبول ہوئیں۔ ان کی یہ مقبولیت اب بھی اسی طرح برقرار ہے۔

اس کتاب پر مشہور ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض کا ایک دیباچہ ہے جس میں انھوں نے معروضی انداز میں محترمہ کی شاعری اور ترنم پر اظہار خیال کیا ہے۔ انھوں نے

زہرا صاحبہ کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے، ان تینوں ادوار کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے اہم حصے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

"برسوں پہلے جب ہم نے پہلی بار زہرا کو سنا، تب بھی مشاعرے کے نقار خانے میں ان کا طوطی بول رہا تھا لیکن ان کے مدّاح انھیں داد کچھ اس طرح کے الفاظ میں دیا کرتے تھے کہ یہ منحنی سی لڑکی ایسا عمدہ کلام کیسے کہہ سکتی ہے، ضرور کوئی بزرگ لکھ کر دیتے ہوں گے۔ اگر ان خیالی بزرگ کا کوئی وجود ہوتا اور وہ اب تک بقید حیات ہوتے تو نہ جانے یہ سن کر خوش ہوتے یا آزردہ کہ یہی صاحبزادی ان سے کس درجہ بہتر شعر کہنے لگی ہیں۔.... مشاعرہ لوٹنے کے بہت سے مجرّب اور آزمودہ نسخے پہلے سے موجود ہیں جو زہرا نے چھوٹی سی عمر میں سیکھ لیے تھے۔ اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو اسے لحن کا ایک گداز عطا ہوا ہے جو اپنی جگہ زہرا کو مشاعرہ اسٹار بنانے کے لیے کافی تھا لیکن زہرا اس مشاعرانہ دور سے بہت جلد گزر گئیں اور جس سُرعت سے یہ نسخے یاد کئے تھے اسی عجلت سے انھیں بھول گئیں اور پھر اگلے دور میں قدم رکھتے ہوئے، جسے شاید رومانوی واقعیت کا دور کہہ سکتے ہیں، اس سے مرحلہ ہائے ہنر بھی اتنی ہی جلدی طے کر لیے۔.... اس دور کی شاعری میں آپ بیتی کے خونِ جگر کی نمود اور جگ بیتی کی پرچھائیوں کا وجود روایت اور ایجاد دونوں کے تلازمے کچھ اس صناعی سے یکجا ہوئے ہیں کہ اگر زہرا اسی پر اکتفا کر لیتیں جب بھی جریدۂ سخن پر ان کا نقش

یقیناً دوام حاصل کر لیتا لیکن اب انھوں نے ستاروں بھرے
شہر کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے اور اس رنگ کو تج کر ایک بالکل
نیا اسلوب اختیار کیا اور اس کی طاقت سے اپنے موضوعِ
سخن میں بھی بہت کچھ ترمیم کر لی ہے، اس کلام میں روزمرہ
کی زندگی کے جذباتی معاملات بھی ہیں جنھیں زہرا صنف
نازک کی شاعری کہتی ہیں...۔"

خود فیضؔ نے تینوں ادوار کے جو نمونے دیباچے میں درج کئے ہیں، ان
میں سے دو دو تین تین شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں:

دورِ اوّل:

یہ کیا ستم ہے کوئی رنگ و بو نہ پہچانے
بہار میں بھی رہے بند تیرے میخانے

ترا خیال فروزاں ہے دیکھئے کیا ہو
خموش گردشِ دوراں ہے دیکھئے کیا ہو

دورِ دوم:

دل بجھنے لگا آتشِ رخسار کے ہوتے
تنہا نظر آتے ہیں غمِ یار کے ہوتے

آج پھر حلقۂ بگوشوں میں اٹھا ہے کچھ شور
کوئی ہم جلیسوں پہ مائل بہ کرم ہے شاید

کوئی کرتا ہے اگر پیار کی بات تو ہم
شہر کے شہر ستاروں سے سجا دیتے ہیں

دورسوم:
جس نظم کے نام پر زیرِتبصرہ کتاب کا نام رکھا گیا ہے — "شام کا پہلا تارا"
وہ اسی دور سے تعلق رکھتی ہے، اس کے دو بند ملاحظہ ہوں:

جس نے ہمیں ہنس کر دیکھا تھا
وہ پہلا دوست ہمارا تھا
وہ شام کا پہلا تارا تھا
جو شاید ہم دونوں کے لیے
کچھ وقت سے پہلے نکلا تھا

☆

جس نے ہمیں دُکھ سے دیکھا تھا
وہ پہلا دوست ہمارا تھا
وہ شام کا پہلا تارا تھا
جو شاید ہم دونوں کے لیے
اس رات سحر تک جاگا تھا

دیباچے کے آخر میں جناب فیض نے لکھا ہے کہ: "یہ کلام پنجابی اصطلاح میں بالکل "نخالص" شاعری ہے جو غالباً شاعری کا منتہی مقام ہے۔ زہرا کی شاعری آجکل اسی مقام پر ہے۔"

آخر میں ایک پوری غزل سُن لیجیے:

یہ اداسی یہ پھیلتے سایے — ہم تجھے یاد کر کے پچھتائے
مل گیا تھا سکوں نگاہوں کو — کی تمنّا تو اشک بھر آئے
گل ہی اکتا گئے ہیں گلشن سے — باغباں سے کہو نہ گھبرائے
ہم جو پہنچے تو رہ گزر ہی نہ تھی — تم جو آئے تو منزلیں لائے
جو زمانے کا ساتھ دے نہ سکے — وہ ترے آستاں سے لوٹ آئے
بس وہی تھے متاعِ دیدہ و دل — جتنے آنسو مژہ تلک آئے

کوائف جامعہ

سابق شیخ الجامعہ صاحب کا تعزیتی خط

ماہنامہ جامعہ کے پچھلے شمارے میں، جناب شعیب احمد خاں صاحب کی ناگہانی وفات کی خبر شائع کی جا چکی ہے۔ مرحوم کا اگست ۱۹۷۴ء میں جب اسٹینو گرافر کی حیثیت سے دفتر شیخ الجامعہ میں تقرر ہوا تھا تو اس وقت شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین صاحب تھے، انھوں نے فرمایا کہ میں اس جگہ پر ایک ایسے شخص کا تقرر کرنا چاہتا ہوں جو بھروسے کا ہو، محنتی ہو اور اردو ٹائپ جانتا ہو۔ جامعہ کے کئی کارکن اس جگہ کے لیے خواہش مند تھے، ہم میں سے متعدد لوگوں نے شعیب صاحب کی سفارش کی اور بالآخر ان ہی کا تقرر ہوا، وہ اُس وقت اردو ٹائپ نہیں جانتے تھے، مگر دن و رات محنت کرکے، بہت ہی مختصر مدت میں انھوں نے اردو ٹائپ سیکھ لیا اور جلد ہی ان کی رفتار اور کارکردگی بھی بہتر ہوگئی۔ کچھ عرصے کے بعد دفتر کے ایک کارکن طویل رخصت پر چلے گئے جس کی وجہ سے مرحوم کا کام بڑھ گیا، لیکن ایسی لگن اور خلوص کے ساتھ کام کیا کہ یہ کمی کبھی محسوس نہ ہونے دی۔ چند برسوں کے بعد ایک ایسا نازک دور آیا جب کسی پر بھروسہ کرنا بڑا مشکل تھا، مگر مرحوم کو دفتر کے ہر ایک شخص کا اعتبار حاصل تھا اور ہر شخص کی نظر میں ان کی بڑی عزت تھی۔ مرحوم کی ان ہی خصوصیات کی وجہ سے، سابق شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین صاحب کو ابھی حال میں جب شعیب صاحب کے انتقال کی اطلاع ملی تو انھیں بڑا رنج ہوا، انھوں نے اپنے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے راقم الحروف کو لکھا کہ: "منشیر الحق صاحب کی زبانی شعیب صاحب کے اچانک انتقال کی خبر ملی، نہ پوچھیے دل پر کیا گزر گئی۔ پچھلی چار سال کی رفاقت کی تمام یادیں زندہ ہوگئیں، بڑی حسرت ناک موت ہے،... خدا مغفرت کرے، مرحوم

ایک نہایت لائق اعتماد اور ہمدرد انسان تھے۔ میں جامعہ کو یاد کرتا ہوں تو چند لوگوں کا خیال آتا ہے، جن میں ایک وہ بھی تھے۔"

دو پاکستانی شاعر جامعہ میں

جب کبھی پاکستان کے ادیب و شاعر دلی آتے ہیں تو شعبۂ اردو انھیں جامعہ آنے کی ضرور دعوت دیتا ہے، اسی روایت کے مطابق، قائم مقام صدر شعبہ ڈاکٹر عنوان چشتی صاحب کی دعوت پر پاکستان کے دو مشہور شاعر جناب طفیل ہوشیارپوری صاحب مدیر ماہنامہ محفل۔ لاہور) اور جناب محسن احسان صاحب (استاد شعبۂ انگریزی پشاور یونیورسٹی) ۱۲ اگست کو جامعہ تشریف لائے اور شعبۂ اردو میں ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ جناب عنوان چشتی صاحب نے ان معزز مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو زبان و ادب اس مشترکہ تہذیب کی زندہ علامت ہے جو دونوں ممالک، کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ اردو شاعری میں جہاں اسلامی افکار کی جلوہ گری ہے، وہیں ہندوستانی تہذیب و تمدن کی بھی اس پر چھاپ ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان، ممکن ہے سیاسی سطح پر کچھ اختلافات ہوں، مگر خوشی ہے کہ اردو زبان و ادب کی وجہ سے دونوں جگہ کے ادیبوں اور دانش وروں میں مضبوط اور خوشگوار تعلقات ہیں۔ جناب محسن احسان صاحب نے اپنا کلام سنانے سے پہلے شعبۂ اردو کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ پاکستان کے عوام اور خواص کے دلوں میں ہندوستان کے لیے محبت اور دوستی کے مخلصانہ جذبات ہیں اور یہاں اردو ادب و شاعری نے جو ترقی کی ہے، اس سے ہم پوری طرح واقف ہے اور اس سے ہمیں خوشی ہے۔ اس کے بعد موصوف نے ایک طویل نعت اور کچھ غزلیں سنائیں۔ اس کے بعد جناب طفیل ہوشیارپوری صاحب نے اپنے کلام سے محظوظ فرمایا۔ انھوں نے پہلے کچھ قطعات سنائے، اس کے بعد غزلیں اور دوہے وغیرہ۔ دونوں شعراء کا کلام بے حد پسند کیا گیا۔ ہم انشاء اللہ ماہنامہ جامعہ کی کسی اشاعت میں ان دونوں شعراء کا مکمل تعارف اور ان کے کلام کا (باقی صفحہ ۵۶ پر)

مراسلہ

مسلمانوں کے تعلیمی سروے کا پروگرام

یہ ایک عام تجربہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کے سماجی و معاشی مسائل پر جب کبھی سنجیدگی سے غور و فکر کی نوبت آتی ہے تو آخر میں نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ان کی پسماندگی کا اصلی سبب تعلیم کی طرف ان کی بے توجہی ہے اور اس بے توجہی کے اسباب پر غور کرنے کی بات ہوتی ہے تو ہمارے سماجی اور تعلیمی کارکنوں کو باقاعدہ سروے اور صحیح اعداد و شمار کے فقدان کا شدید احساس ہوتا ہے، کیوں کہ اس کے بغیر نہ تو مسائل کی ماہیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، نہ ان کا معقول اور مؤثر حل تجویز کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے مسلمانانِ ہند کے تعلیمی مسائل کا مکمل سروے اور ریسرچ کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ ماہرینِ تعلیم سے مشورہ کر کے سر دست ۲ دو سوال نامے تیار کیے گئے ہیں۔ ایک اسکولوں کے لیے اور دوسرا کالجوں کے لیے۔ عربی مدارس، مسجدی، مکتبی اور پرائمری تعلیم کا سروے اس کے بعد کیا جائے گا۔

سوال ناموں کی تیاری میں کمپیوٹر کے ماہرین کے مشورے بھی شامل ہیں تاکہ حاصل شدہ معلومات کو کمپیوٹرائز کیا جا سکے اور ملک میں جس کسی کو تعلیمی مسئلے پر ان اعداد و شمار اور معلومات کی ضرورت ہو، فوراً مہیا کی جا سکیں۔

اس ابتدائی تعلیمی سروے کے بعد سوسائٹی کی طرف سے مختلف ریسرچ پروجیکٹ بنائے جائیں گے، جن میں فیلڈ ریسرچ بھی شامل ہوگا۔ ان ہی کی روشنی میں سمینار اور سمپوزیم منعقد ہو سکیں گے، جن میں سائنٹفک طریقے سے مسائل پر غور اور بحث کے ذریعہ صحیح فیصلوں پر پہنچنے میں مدد ملے گی۔

آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ سوال ناموں میں مسلم اسکولوں اور کالجوں میں سائنس کی

تعلیم سے متعلق مسائل کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ یہ در اصل ان تجویزوں پر عمل درآمد کی ابتدائی صورت ہے جو ۲۲ر جنوری ۱۹۸۱ء کی رات کو "ہمدرد ہاؤس" میں ۲۵ ماہرین سائنس اور تعلیم کی ایک نشست میں پروفیسر عبدالسلام (نوبل انعام یافتہ) کی موجودگی میں پیش ہوئی تھیں، جن میں ہندستان کی سطح پر سرسید سائنٹفک سوسائٹی اور بین الاقوامی سطح پر مسلمانانِ عالم میں سائنس کی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے ایک فاؤنڈیشن قائم کرنے کی تجویز بھی شامل ہے۔ پروفیسر عبدالسلام اس فاؤنڈیشن کے لیے آج کل دورے کر رہے ہیں اور سرسید سائنٹفک سوسائٹی کا قیام بھی مناسب وقت پر انشاء اللہ ہو جائے گا۔ مسلمانوں میں سائنس کی موجودہ تعلیم کے سروے کا ابتدائی کام ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے بہر حال شروع کر دیا ہے۔

اسکولوں اور کالجوں کے ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل صاحبان اور دیگر تعلیمی کام کرنے والے یہ سوال نامہ سوسائٹی کے دفتر سے فوراً منگا لیں۔ جو جوابات موصول ہوں گے ان کے لیے یہ گراں قدر انعامات رکھے گئے ہیں :

اسکولوں اور کالجوں کے لیے ۲۵ ہزار رُپے کے گراں قدر انعامات

معیار انعامات :

(۱) سوال نامہ کی صحیح، مفصّل اور صاف ستھری خانہ پُری

(۲) مسلمانانِ ہند کو تعلیمی پستی سے نکالنے کی جامع اور قابلِ عمل تجویزیں اور ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے موجودہ پروگراموں پر تنقید یا تبصرہ اور مشورے۔

انعامات

اسکولوں کے لیے :

پہلا انعام	دس ہزار رُپے
دوسرا انعام	تین ہزار رُپے

تیسرا انعام	دو ہزار روپے
کنسولیشن انعامات ۵	ایک، ایک ہزار روپے کے

کالجوں کے لیے :

پہلا انعام	دس ہزار روپے
دوسرا انعام	تین ہزار روپے
تیسرا انعام	دو ہزار روپے

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی پانچ مسلمہ ماہرین تعلیم کا ایک پینل مقرر کرے گی جو ان انعامات کا فیصلہ کرے گی۔

توقع ہے کہ سوسائٹی کے سروے کا موجودہ پروگرام دسمبر ۱۹۸۱ء تک پورا ہو جائے گا اور یکم جنوری ۱۹۸۲ء کو جمعہ کے دن ان انعامات کا اعلان کر دیا جائے گا۔ سوال ناموں کے جوابات کے لیے آخری تاریخ ۳۱ر اکتوبر ۸۱ء ہے۔

سید شہاب الدین دسنوی
سکریٹری ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی
ہمدرد نگر، نئی دہلی ۶۲ ۱۱۰۰

کوائف جامعہ (بسلسلہ صفحہ ۵۳)

انتخاب پیش کریں گے۔

ان معزز مہمانوں کے ساتھ دلی کے ہر دلعزیز شاعر جناب مخمور سعیدی صاحب بھی تشریف لائے تھے، انھوں نے بھی صدر جلسہ کی درخواست پر اپنے کلام سے مستفید فرمایا، ان کے علاوہ جامعہ کے اساتذہ میں سے، ڈاکٹر حنیف کیفی، ڈاکٹر مظفر حنفی، ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر محمد ذاکر، ڈاکٹر شمیم حنفی اور جناب انور صدیقی صاحب نے اپنا کلام سنایا۔ آخر میں ڈاکٹر محمد ذاکر صاحب ریڈر شعبۂ اردو نے معزز مہمانوں اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ (کوائف نگار)

جامعہ

سالانہ قیمت ۹ روپے

قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

جلد ۷۸ | بابت ماہ اکتوبر ۱۹۸۱ء | شمارہ ۱۰

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

معاون مدیر

عبداللطیف اعظمی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی ● مطبوعہ: جمال پریس دہلی ● ٹائٹل: فائن پریس دہلی

شذرات

اگرچہ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ اسرائیل کی پشت پناہی امریکہ کرتا رہا ہے، لیکن ابھی حال میں اسرائیل کے وزیر اعظم بیگن اور امریکہ کے صدر ریگن میں واشنگٹن میں جس فوجی تعاون کی بات طے ہوئی ہے اس سے اس امر کی پوری طرح توثیق ہو گئی ہے کہ مغربی ایشیا میں اسرائیل امریکہ کا بہت بڑا اسلحہ خانہ ہے۔ دونوں سربراہوں کی گفتگو کے بعد یہ اعلان کیا گیا ہے کہ امریکہ اور اسرائیل کا یہ نیا معاہدہ روس کی توسیع پسندی کی روک تھام کے لئے کیا گیا ہے۔ تعجب نہ ہونا چاہئے کہ اسرائیل نے اس گفتگو میں عرب علاقے پر اسرائیلی قبضے یا فلسطینیوں کے حقوق کے مسئلہ کا ذکر تک نہیں آنے دیا۔ فوجی تعاون کے اس معاہدہ کے مطابق امریکہ اسرائیل میں اپنے اسلحے جمع کرے گا۔ اسرائیل کے فوجی اڈے استعمال کرے گا، نئے فوجی مراکز بنائے جائیں گے اور اسرائیل کی بندرگاہیں بحیرۂ روم اور بحیرۂ قلزم کی راہ سے بحر عرب میں امریکی بحری بیڑوں کو تمام سہولتیں فراہم کریں گی۔ ظاہر ہے کہ امریکی اسلحوں میں ایٹمی ہتھیار، میزائل، نیوٹرون بم، ایف ۱۶ لڑاکو جہاز، اور نہ معلوم کیا کیا ہوگا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان اسلحوں کا مالک امریکہ ہوگا لیکن کنٹرول اسرائیل کا ہوگا، ظاہر ہے کہ کوئی بھی صاحب نظر جو امریکی فوجی حکمت عملی اور اسرائیلی عزائم سے واقف ہے، ملکیت اور کنٹرول کی لفظی بازیگری سے دھوکا نہیں کھا سکتا، وہ جانتا ہے کہ اسرائیل اور امریکہ درحقیقت ایک ہیں اور اُسے مصر اور اسرائیل کی پچھلی جنگ کے موقع پر جب امریکہ نے اپنی بے پناہ فوجی مدد سے مصر کی جیتی ہوئی بازی شکست میں بدل دی تھی، صدر سادات کی یہ بات یاد ہے کہ "مصر اسرائیل سے تو لڑ سکتا ہے لیکن امریکہ سے جنگ نہیں کر سکتا"

اِس معاہدہ میں کوئی ایسی ضمانت نہیں دی گئی ہے کہ اسرائیل یہ امریکی اسلحے کسی صورت میں بھی عربوں کے خلاف نہیں استعمال کرے گا، لیکن یہ کہا گیا ہے کہ بیرونی طاقتوں کے اشارے پر اگر اسرائیل

کے خلاف دہشت گردی ہوئی تو پھر ایسی صورت میں یہ معاہدہ بروئے کار آ سکتا ہے۔ معاہدہ کی یہ وہ دفعہ ہے جسے بہانہ بنا کر عربوں کے خلاف اور خاص طور پر لبنان میں فلسطینیوں کے خلاف یہ امریکی اسلحے استعمال ہو سکتے ہیں اور بہانہ تلاش کرنا اسرائیل جیسے ملک کے لئے جو خود دہشت گردی اور بین الاقوامی قزاقی کی زندہ مثال ہے، بڑی آسان بات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خلیج کے علاقے جہاں پٹرول کے کنوئیں ہیں اور مغربی ایشیا کے دوسرے ملک روس کی توسیع پسندی کی زد میں ہیں، لیکن کیا خود اسرائیل کی توسیع پسندی ظاہر و باہر نہیں ہے؟ کیا وہ دجلہ و فرات سے لے کر نیل تک کا علاقہ اپنے قبضے میں لینے کا منصوبہ نہیں رکھتا۔ کیا وہ لبنان کے جنوبی حصے پر اپنا پرچم لہرانا نہیں چاہتا؟ اور پھر کیا امریکہ کا یہ منصوبہ نہیں ہے کہ اگر خلیج کی ریاستیں عرب کاز کے حق میں یہ طے کریں کہ وہ امریکہ اور مغربی یوروپ کے خلاف اپنا تیل کا حربہ استعمال کریں گی تو وہ اپنی مجوزہ برق رفتار فوج کو حرکت میں لا کر تیل کے سارے ذخیروں پر قابض ہو جائے گا۔ کئی برس کی کاوش کے بعد یہ برق رفتار فوج اب غالباً تیار ہو گئی ہے اور امریکہ کے فوجی ہیڈ کوارٹرز میں پورا منصوبہ تیار ہے۔

اسرائیل اس بات کا پُرزور مخالف ہے کہ امریکہ سعودی عرب کو "اواک" طیارے فروخت کرے اور امریکہ میں اسرائیل نواز حلقے اس سلسلے میں صدر ریگن پر اعتراض کر رہے ہیں۔ امریکہ کے ذمہ داروں نے اسرائیل کو رام کرنے کے لئے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ اگر امریکہ نے "اواک" طیارے سعودی عرب کو نہ دئے تو وہ برطانیہ سے ایسے ہی طیارے خرید لے گا۔ اسی کے ساتھ یہ خبر بھی آئی ہے کہ "اواک" طیارے پانچ برس تک امریکی ہوا باز اڑائیں گے۔ ایسی صورت میں اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس مدت میں ہر صورت میں یہ طیارے سعودی عرب ہی کی مرضی سے اُڑیں گے۔ سعودی عرب میں اس وقت کئی سو کی تعداد میں امریکی فوجی ماہرین موجود ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ سعودی عرب میں جو امریکی اسلحے ہیں یا جو اور اسلحے آئندہ وہاں آئیں گے اُن کا استعمال امریکی فوجی ماہرین ہی کی تکنیکی صلاحیتوں کا مرہون منت ہوگا اور یہ بات عیاں ہے اور بارہا تجربے میں آ چکی ہے کہ امریکہ عربوں کے مقابلے میں اسرائیل کا دوست ہی نہیں بلکہ وفادار حلیف

عربوں کو جیسے ہی امریکہ اور اسرائیل کے مابین فوجی تعاون کے اس معاہدہ کا علم ہوا، انھوں نے اس کے خلاف اپنے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ یاسر عرفات نے کہا کہ یہ معاہدہ مغربی ایشیا پر غلبہ حاصل کرنے کی ایک تدبیر ہے۔ امریکہ نے اس پورے علاقے کو اپنے بحری بیڑوں اور فوجی اڈوں سے گھیر رکھا ہے۔ خلیج صدرہ کا واقعہ، عراق کے ایٹمی ری ایکٹر کی تباہی اور لبنان میں اسرائیل کی فوج کشی —— یہ سب واقعات اس کا بین ثبوت ہیں۔ کویت نے بھی امریکہ اور اسرائیل کے اس معاہدہ کی مذمت کی ہے۔ اسلامی کانفرنس تنظیم کے سکریٹری حبیب شطی نے متنبہ کیا ہے کہ امریکہ اور اسرائیل کے حالیہ معاہدہ سے مشرق وسطیٰ میں مشرق و مغرب کی جنگ کا خطرہ بہت بڑھ گیا ہے۔ انھوں نے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ اس سے ایک دوسری بڑی طاقت (یعنی روس) کو یہ بہانہ مل جائے گا کہ وہ بھی اس علاقے میں اپنے فوجی اڈے بنائے اور اپنے اسلحوں کا ذخیرہ اکٹھا کرے۔ اس طرح مغربی ایشیا میں مغرب اور مشرق کی کشمکش بہت بڑھ جائے گی، یہ گویا انسانوں کے بنائے ہوئے ایک "آتش فشاں" پہاڑ کی سی صورت ہوگی جس سے کسی وقت بھی آگ اور لاوا برس سکتا ہے۔

مغربی ایشیا میں اس آتشیں صورت حال کی ذمہ داری صدر ریگن کی فوجی مہم جوئی کی پالیسی کے علاوہ بڑی حد تک آیۃ اللہ خمینی کے غیر دانشمندانہ طریقۂ کار، ایران کی موجودہ سیاسی صورت حال اور افغانستان میں روس کی فوجی مداخلت پر بھی ہے۔ روس کی تقریباً ایک لاکھ فوج افغانستان میں ہے۔ ایک چھوٹے سے ملک پر ایک بڑی طاقت کا یہ ٹرا حملہ ہے جس کا کوئی اخلاقی جواز نہیں۔ روس کی اس فوج کشی نے بین الاقوامی سیاست کے رُخ کو بدل دیا ہے اور ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں اُس کی امن دوستی کا نعرہ محض ایک فریب سمجھا جارہا ہے اور یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام ہو یا سوویٹ مشرق کا اشتراکی نظام، دونوں امن عالم کے لئے خطرہ ہیں، دونوں "جنگ زرگری" کے مجرم ہیں اور دونوں اپنی بالادستی کی خاطر دنیا کو تباہ کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔

اُدھر پولینڈ میں کچھ ایسی صورت حال پیدا ہوگئی ہے کہ کسی وقت بھی خانہ جنگی ہوسکتی ہے۔ یہ صورت حال امریکہ اور روس کی لاگ ڈانٹ سے اور بھی پیچیدہ ہوگئی ہے اور مغربی ایشیا کی طرح یوروپ بھی آگ کے دہانے پر کھڑا ہے۔ پولینڈ کی آزاد مزدور تنظیم (Solidarity) حکومت کی مزدور تنظیم اور خود وہاں کی کمیونسٹ حکومت کے خلاف صف آرا ہے۔ اس صف آرائی میں امریکہ کو بھی بہت دلچسپی ہے لیکن اس کی اس دلچسپی میں سیاست زیادہ ہے اور انسان دوستی کم۔ سوویٹ روس اِسے اشتراکی نظام کے خلاف بغاوت تصوّر کرتا ہے۔ سالیڈیریٹی نے اب یہ بات کھل کر کہہ دی ہے کہ وہ پولینڈ میں اپنی حکومت بنا سکتی ہے اور اس کا ارادہ بھی رکھتی ہے۔ اس لئے دوسرے کمیونسٹ ملکوں کے مزدوروں سے بھی اپیل کی ہے کہ وہ نہ صرف اس کی ہمنوائی کریں بلکہ اپنے یہاں بھی اس طرح کی تحریک چلائیں۔ ظاہر ہے کہ روس کے لئے یہ صورت حال ناقابل برداشت ہے اور وہ بار بار دھمکی دیتا ہے، اس طرح اس کا کسی وقت بھی امکان ہے کہ پولش حکومت سالیڈیریٹی کے خلاف کوئی اقدام کرے اور اس کی حمایت میں روسی ٹینک پولینڈ کی سرزمین پر دوڑنے لگیں۔ لیکن روس کے لئے سوچنے کی بات ہے کہ آخر پولینڈ کے لوگ آزادی کے کیوں خواہاں ہیں؟ کیا یہ مناسب ہے کہ انسان کے جذبۂ حریت کو ٹینکوں سے کچل دیا جائے؟ کیا یہ انسانی فطرت کا بنیادی و داخلی تقاضا نہیں ہے کہ وہ آزادی چاہتی ہے، اظہار خیال کی آزادی، عقیدے کی آزادی، ضمیر کی آزادی —— انسان کی روح مادی آرام و آسائش کے سامان کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتی ہے، اُس کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوجائیں، اُسے آرام اور تفریح کے لئے بھی وقت مل جائے، یہاں تک کہ انسان اتنا خوش حال ہوجائے کہ اُسے اپنی آمدنی کے خرچ کے لئے کوئی بہانہ بھی نہ ملے، تو بھی اُس کی فطرت کا تقاضا یہ ہوگا کہ اُسے آزادی سے اپنی بات کہنے کا موقع ملے، اُسے اِس کی آزادی ہو کہ وہ جہاں چاہے اور جب چاہے کسی اپنے سے بالاتر ہستی" کے سامنے سربسجود ہوکر اپنی ناطاقتی کا اظہار اور اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرے۔ وہی نظام اچھا ہے جس میں مادی ضرورتوں کے ساتھ انسانی فطرت کے روحانی و اخلاقی تقاضے بھی آزاد فضا میں پورے ہوسکیں۔

ڈاکٹر اوصاف احمد

صنعتی لائسنس پالیسی
اور
علاقائی ترقی

ہندوستان جیسے کسی ملک میں، جو ریاستوں کے ایک وفاق کی صورت میں مضبوط مرکزی حکومت کے تحت پارلیمانی نظام کے ذریعہ اپنا انتظام و انصرام چلاتا ہو، مرکزی حکومت کی خاص خاص معاشی پالیسیاں ہی علاقائی ترقی اور اس کی رفتار کا تعین کرتی ہیں۔ اس لئے بے حد ضروری ہے کہ حکومت کی معاشی پالیسیوں کے علاقائی پہلو کا مطالعہ کیا جائے اور اس بات کو سمجھا جائے کہ یہ پالیسیاں مختلف علاقوں کی معیشتوں پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔

ہندوستانی معیشت ایک مخلوط معیشت ہے جہاں بنیادی معاشی فیصلے افراد خود کرتے ہیں لیکن حکومت بھی معاشی زندگی میں ایک اہم رول ادا کرتی ہے اور ایسے اصلاحی اقدامات کرتی ہے کہ قلیل وسائل کی تقسیم جو بڑی حد تک نظام قیمت کے ذریعہ سرانجام پاتی ہے، سماجی ترجیحات کے تابع ہو سکے۔ صنعتی لائسنس پالیسی ہمارے ملک میں صنعتی پالیسی کو نافذ کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ آزادی کی قومی جدوجہد کے دوران ہی یہ بات طے پا چکی تھی کہ آزاد ہندوستان

ڈاکٹر اوصاف احمد، ریڈر شعبۂ معاشیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

، قومی حکومت معاشی ترقی کے عمل کی نگرانی اور کنٹرول کی ذمہ داری قبول کرے گی۔
زادی کے بعد حکومت ہند نے صنعتی پالیسی سے متعلق تجویز ۱۹۴۸ء کے ذریعہ
عاشی زندگی میں زیادہ بھرپور کردار ادا کرنے کی کوشش کی۔ بعد میں، ۱۹۵۱ء میں
صنعت (ترقی اور ضابطہ) ایکٹ نافذ کیا گیا جس کے ذریعہ صنعتوں پر حکومت
کے کنٹرول میں اضافہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس قانون کی مختلف شقوں کی
رو سے صنعتی کارخانوں کے لیئے ضروری تھا کہ وہ ایک خاص مدت کے دوران
اپنے آپ کو مرکزی حکومت کے پاس رجسٹر کرائیں۔ اور کسی فرد، یا تنظیم کو یہ
اختیار نہیں حاصل تھا کہ وہ کوئی نیا کارخانہ کھولے یا کسی پرانے صنعتی کارخانے
کی پیداواری صلاحیت میں معتدبہ اضافہ کرے تا وقتیکہ وہ اس امر کے لئے مرکزی
حکومت سے ایک لائسنس نہ حاصل کرلے۔ یہ تمام اقدامات اس مفروضہ کی
بنیاد پر کئے گئے تھے کہ وہ فیصلے جو ساری معیشت کو متاثر کرتے ہوں صرف
افراد کے ذریعہ نہ کئے جائیں بلکہ ایسے اہم معاملات میں جیسے کہ مختلف زمروں
کے مابین پیداواری صلاحیت کی تقسیم، اُن کی درآمد خرچ ضروریات اور مختلف علاقوں
کے مابین معاشی ترقی کی تقسیم وغیرہ، فیصلہ سازی کا اختیار حکومت کو حاصل ہونا
چاہیئے۔ صنعت (ترقی اور ضابطہ) ایکٹ کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ معیشت کی
یک طرفہ اور یک رُخی ترقی کو روکا جا سکے اور اس کے بجائے تمام زمروں اور
تمام علاقوں کی متوازن ترقی ہو، نیز صنعتی دائرے میں عوامی فیصلہ سازی کے
عنصر داخل کئے جائیں تاکہ سماجی ترجیحات کو پورا کیا جا سکے۔

بعض ماہرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ خود حکومت کی ساخت اور طرز حکومت
سے ہی بڑی حد تک کسی ملک میں معاشی سرگرمی کے حلقے متعین ہو جاتے ہیں۔
ہندوستان میں ریاستی حکومتوں کو صنعتی لائیسنس جاری کرنے کا اختیار نہیں ہے،
اس لئے مرکزی حکومت کی لائیسنس پالیسی ہی اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ
صنعتوں کی علاقائی تقسیم کیسے ہو اور اسی کے ذریعہ وہ مختلف علاقوں میں

صنعتی ترقی کی سطح کا تعین کرتی ہے۔

صنعتی پالیسی کے مقاصد

تیز رفتار صنعتی نمو، درآمد کو ملکی پیداوار سے تبدیل کرنا، اجارہ داری کا کنٹرول، معاشی طاقت کے ارتکاز کو روکنا اور مختلف علاقوں کے مابین صنعتی ترقی میں نابرابری کو کم کرنا، ہندوستان میں صنعتی پالیسی کے اعلان شدہ مقاصد رہے ہیں۔ ان مقاصد میں صنعتوں کا علاقائی پھیلاؤ اور صنعتی ترقی میں علاقائی عدم مساوات کو کم کرنے کے رجحانات ہمیشہ نمایاں رہے ہیں۔ صنعت ایکٹ ۱۹۵۱ء نے حکومت کو اس بات کا موقع دیا کہ وہ صنعتی کارخانوں کے تعین مقام (LOCATION) کو کنٹرول کر سکے۔ اس قانون کی دفعہ ۱۱ (۲) کی رو سے یہ ضروری تھا کہ لائیسنس لینے والا "اس کارخانے کے تعین مقام کے حالات" بیان کرے جس کے لئے لائیسنس مانگا جا رہا ہے۔ دفعہ ۱۲ حکومت کو یہ حق عطا کرتی ہے کہ اگر کسی لائیسنس پر ان شرائط کے مطابق عمل درآمد نہیں ہوا جن پر وہ جاری کیا گیا تھا تو حکومت لائیسنس رد کرنے کی مجاز ہوگی۔ دفعہ ۱۳-۱- (ای) میں کہا گیا ہے کہ کسی صنعتی کارخانے کا مالک، اس کارخانے کے کل یا کسی جزو کے تعین مقام میں تبدیلی کرنے کا مجاز نہ ہوگا تاوقتیکہ اس امر کی منظوری حکومت سے نہ حاصل کر لی جائے۔

ان دفعات کا مقصد یہ تھا کہ صنعت کے تعین مقام کو کنٹرول کیا جائے تاکہ صنعتی ترقی میں بہتر علاقائی توازن پیدا ہو سکے۔ اس ضمن میں دو امور خاص طور پر قابل غور ہیں۔ اول یہ کہ تعین مقام کے ابتدائی انتخاب کا مسئلہ صنعت کاروں کی تمیز اختیاری پر چھوڑ دیا گیا اور اس ضمن میں مفروضہ یہ تھا کہ صنعت کار ہمیشہ بہترین تعین مقام کا انتخاب کریں گے دوسرے یہ کہ تعین مقام کا آخری فیصلہ حکومت کے ہاتھ میں تھا جس کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ مجوزہ تعین مقام کو منظور کر دے یا رد کر دے۔ بین السطور

یہ بھی مضمر تھا کہ حکومت اپنے ان اختیارات کا استعمال اس طرح کرے گی کہ صنعتی سرگرمیوں کے قائم شدہ مراکز میں اجتماع کا رجحان کمزور پڑے اور مختلف علاقوں کے درمیان صنعتوں کے پھیلاؤ میں ترقی ہو۔ اس بات کو ۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی تجویز میں زیادہ واضح کر دیا گیا۔ اس تجویز کے ذریعہ اعلان کیا گیا کہ "(اس مقصد کے حصول کی خاطر) صنعتیت کے ذریعہ ملک کی پوری معیشت کو فائدہ پہونچ سکے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ مختلف علاقوں کے درمیان ترقی کی سطح میں عدم مساوات کو رفتہ رفتہ کم کر دیا جاتے۔" تجویز میں یہ بھی مذکور تھا کہ ہندوستان میں قومی منصوبہ بندی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مختلف قسم کی سہولتیں جیسے قوت، ذرائع نقل وحمل، پانی کی فراہمی، وغیرہ ان تمام علاقوں میں بھی عام طور پر دستیاب ہونے لگیں "جو صنعتی طور پر پیچھے رہ گئے ہیں" یہ اعلان بھی کیا گیا کہ صنعتوں کا کنٹرول، حسب سابق، صنعت ایکٹ ۱۹۵۱ء کے ضابطوں کے مطابق جاری رہے گا۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایکٹ کے ضابطوں کا استعمال، اُن ہدایات کی روشنی میں کیا جانا تھا جو صنعتی پالیسی تجویز میں دی گئی تھیں۔ یہ امر دلچسپی کا باعث ہوگا اگر ہم اس بات کا پتہ لگائیں کہ یہ مقاصد، لائسنس پالیسی نظام کے واقعی استعمال کے ذریعہ کس حد تک حاصل کئے گئے۔

صنعتی اجتماع اور لائسنس پالیسی

اس سے قبل کہ ہم صنعتی لائسنس پالیسی کے علاقائی پہلو کا مطالعہ شروع کریں، نامناسب نہ ہوگا کہ تھوڑی دیر کے لئے صنعتی اجتماع کے نظریہ سے بھی رجوع کر لیا جائے۔ صنعتی اجتماع کے رائج شدہ نظریات کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر بازار کی قوتوں کو آزاد چھوڑ دیا جاتے تو صنعتی سرگرمی میں چند علاقوں میں مرکوز ہو جانے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ کسی علاقے میں مجتمع صنعتی اکائیوں کو اجتماعی کفایات حاصل ہوتی ہیں ۔۔ ان

کفایات میں، بڑے بازاروں تک رسائی، شہری محنت کے بازار اور انتظامی صلاحیتوں کا ظہور، نقل و حمل کی کفایات، رسل و رسائل کی کفایات، تجارتی، بنک کاری، اور دوسری مالیاتی سہولتوں کی موجودگی، اور عوامی خدمات میں بڑے پیمانے کی کفایات وغیرہ شامل ہیں۔

بعض مراکز پر ان کفایات کی موجودگی اور دوسری جگہوں پر ان کی عدم موجودگی مختلف علاقوں کی معاشی ساخت میں نمایاں فرق پیدا کر دیتی ہے، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یہ صنعت کاروں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ صنعت کاروں کو بعض مقامات پر ایک طرح کی 'نفسیاتی آمدنی' حاصل ہوتی ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ بعض علاقوں کی معاشی آب و ہوا صنعت کے لئے موافق ہے اور بعض کی ناموافق۔ ان نفسیاتی عوامل کی وجہ سے صنعت کاروں کے ذہن میں جمودِ تعین قیام (LOCATION INERTIA) پیدا ہو جاتا ہے، اس صورت حال کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مختلف علاقوں کے درمیان معاشی عدم مساوات میں اضافہ ہو۔

تعین مقام پر کنٹرول ایک طرح سے بازار کی قوتوں میں مداخلت ہے اور اس کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس سے صنعتی سرگرمی کے ارتکاز کا تدارک ہو۔ صنعتی ترقی کا بہتر علاقائی توازن نہ صرف یہ کہ سیاسی وجوہات اور علاقائی امنگوں کو پورا کرنے کے لئے مطلوب ہے بلکہ اس کی معاشی افادیت بھی ہے اور وہ یہ کہ پس ماندہ علاقوں میں، جن میں نمو کا امکان زیادہ ہے، ان معاشی وسائل کا فائدہ اٹھایا جا سکے گا جن کا اب تک استعمال نہیں کیا گیا۔ اس لئے لائیسنس پالیسی کا استعمال اس طرح کیا جانا چاہیئے کہ اجتماع کے رجحانات کی ہمت شکنی ہو۔ بعض حلقوں کی جانب سے یہ کہا جاتا رہا ہے کہ لائیسنس پالیسی اس ضمن میں صرف ایک منفی کردار ادا کر سکتی ہے کیونکہ یہ صنعتی اکائیوں کو کسی خاص علاقے میں جانے سے روک تو سکتی ہے لیکن صنعتوں کو کسی پس ماندہ علاقے میں جانے

یہ بھی مضمر تھا کہ حکومت اپنے ان اختیارات کا استعمال اس طرح کرے گی کہ صنعتی سرگرمیوں کے قائم شدہ مراکز میں اجتماع کا رجحان کمزور پڑے اور مختلف علاقوں کے درمیان صنعتوں کے پھیلاؤ میں ترقی ہو۔ اس بات کو ۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی تجویز میں زیادہ واضح کر دیا گیا۔ اس تجویز کے ذریعہ اعلان کیا گیا کہ "(اس مقصد کے حصول کی خاطر) صنعتیت کے ذریعہ ملک کی پوری معیشت کو فائدہ پہونچ سکے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ مختلف علاقوں کے درمیان ترقی کی سطح میں عدم مساوات کو رفتہ رفتہ کم کر دیا جاتے" تجویز میں یہ بھی مذکور تھا کہ ہندوستان میں قومی منصوبہ بندی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مختلف قسم کی سہولتیں جیسے قوت، ذرائع نقل وحمل، پانی کی فراہمی، وغیرہ ان تمام علاقوں میں بھی عام طور پر دستیاب ہونے لگیں" جو صنعتی طور پر پیچھے رہ گئے ہیں" یہ اعلان بھی کیا گیا کہ صنعتوں کا کنٹرول، حسب سابق، صنعت ایکٹ ۱۹۵۱ء کے ضابطوں کے مطابق جاری رہے گا۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایکٹ کے ضابطوں کا استعمال، اُن ہدایات کی روشنی میں کیا جانا تھا جو صنعتی پالیسی تجویز میں دی گئی تھیں۔ یہ امر دلچسپی کا باعث ہوگا اگر ہم اس بات کا پتہ لگائیں کہ یہ مقاصد، لائیسنس پالیسی نظام کے واقعی استعمال کے ذریعہ کس حد تک حاصل کئے گئے۔

صنعتی اجتماع اور لائیسنس پالیسی

اس سے قبل کہ ہم صنعتی لائیسنس پالیسی کے علاقائی پہلو کا مطالعہ شروع کریں، نامناسب نہ ہوگا کہ تھوڑی دیر کے لئے صنعتی اجتماع کے نظریہ سے بھی رجوع کر لیا جائے۔ صنعتی اجتماع کے رائج شدہ نظریات کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر بازار کی قوتوں کو آزاد چھوڑ دیا جاتے تو صنعتی سرگرمی میں چند علاقوں میں مرکوز ہو جانے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ کسی علاقے میں مجتمع صنعتی اکائیوں کو اجتماعی کفایات حاصل ہوتی ہیں ـــ ان

کفایات میں، بڑے بازاروں تک رسائی، شہری محنت کے بازار اور انتظامی صلاحیتوں کا ظہور، نقل وحمل کی کفایات، رسل ورسائل کی کفایات، تجارتی، بنک کاری، اور دوسری مالیاتی سہولتوں کی موجودگی، اور عوامی خدمات میں بڑے پیمانے کی کفایات وغیرہ شامل ہیں۔

بعض مراکز پر ان کفایات کی موجودگی اور دوسری جگہوں پر ان کی عدم موجودگی مختلف علاقوں کی معاشی ساخت میں نمایاں فرق پیدا کر دیتی ہے، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یہ صنعت کاروں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ صنعت کاروں کو بعض مقامات پر ایک طرح کی "نفسیاتی آمدنی" حاصل ہوتی ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ بعض علاقوں کی معاشی آب وہوا صنعت کے لئے "موافق" ہے اور بعض کی "ناموافق"۔ ان نفسیاتی عوامل کی وجہ سے صنعت کاروں کے ذہن میں جمود تعین قیام (LOCATION INERTIA) پیدا ہو جاتا ہے، اس صورت حال کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مختلف علاقوں کے درمیان معاشی عدم مساوات میں اضافہ ہو۔

تعین مقام پر کنٹرول ایک طرح سے بازار کی قوتوں میں مداخلت ہے اور اس کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس سے صنعتی سرگرمی کے ارتکاز کا تدارک ہو۔ صنعتی ترقی کا بہتر علاقائی توازن نہ صرف یہ کہ سیاسی وجوہات اور علاقائی امنگوں کو پورا کرنے کے لئے مطلوب ہے بلکہ اس کی معاشی افادیت بھی ہے اور وہ یہ کہ پس ماندہ علاقوں میں، جن میں نمو کا امکان زیادہ ہے، ان معاشی وسائل کا فائدہ اٹھایا جا سکے گا جن کا اب تک استعمال نہیں کیا گیا۔ اس لئے لائیسنس پالیسی کا استعمال اس طرح کیا جانا چاہیئے کہ اجتماع کے رجحانات کی ہمت شکنی ہو۔ بعض حلقوں کی جانب سے یہ کہا جاتا رہا ہے کہ لائیسنس پالیسی اس ضمن میں صرف ایک منفی کردار ادا کر سکتی ہے کیونکہ یہ صنعتی اکائیوں کو کسی خاص علاقے میں جانے سے روک تو سکتی ہے لیکن صنعتوں کو کسی پس ماندہ علاقے میں جانے

پر آمادہ نہیں کر سکتی ۔ لائیسنسنگ پالیسی انکوائری کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اس نقطۂ نظر کو بجا طور پر "غلط اندازِ نظر" سے تعبیر کیا ہے ۔ اگر منصوبہ سازوں نے مختلف علاقوں کے لئے صنعتوں کی ایک ترجیحی فہرست تیار کی ہوتی جس میں تعین قیام کے تمام عوامل کو ملحوظ رکھا گیا ہوتا اور صنعت کاروں کو پہلے سے آگاہ کر دیا گیا ہوتا کہ اگر وہ اپنی صنعتی اکائیاں ترجیحی علاقوں میں لگائیں گے تو ان کی درخواستوں پر موافقانہ غور کیا جائے گا، تو کوئی وجہ نہیں کہ لائیسنس پالیسی متوازن علاقائی ترقی کو فروغ دینے میں ایک مثبت اور تعمیری کردار ادا نہ کر سکتی ۔ اس بنیادی حکمت عملی کی عدم موجودگی کے نتیجہ میں، جیسا ہم آگے چل کر ثابت کریں گے ۔ لائیسنس پالیسی بازار کی قوتوں کا عمل روکنے میں ناکام رہی اور اس نے علاقائی عدم توازن کو بڑھانے میں مدد دی ۔

لائیسنس پالیسی کا علاقائی پہلو

اپنی شروعات سے ہی صنعتی لائیسنس پالیسی کو سخت نکتہ چینی اور تنقید کا سامنا کرنا پڑا ہے ۔ سرمایہ دار طبقہ شروع سے ہی لائیسنس نظام کا مخالف تھا کیونکہ صنعت کے عوامی کنٹرول سے سیدھی ضرب اس کے مفادات پر پڑتی ہے ۔ اس لئے اس نے سست رفتار صنعتی نمو کی ذمہ داری ایسی پالیسیوں پر رکھی جو بڑے صنعتی گھرانوں کی توسیع میں رکاوٹ ڈالتی ہیں، یا ان پر عوامی کنٹرول نافذ کرتی ہیں ۔ دوسری جانب غیر سرمایہ دار اور علمی حلقوں میں بھی اسے نکتہ چینی کا سامنا خاص طور پر اس بنا پر کرنا پڑا ہے کہ یہ اپنے اعلان شدہ مقاصد کو بھی حاصل کرنے میں ناکام رہی ۔ چنانچہ آر ۔ کے ۔ ہزاری سے منصوبہ بندی کمیشن نے صنعتی منصوبہ بندی اور لائیسنس کے موضوع پر ایک رپورٹ پیش کرنے کی درخواست کی ۔ آر ۔ کے ۔ ہزاری اپنی اس رپورٹ میں لکھتے ہیں :

"جہاں تک متوازن علاقائی ترقی کا تعلق ہے برقی قوت

(POWER) کا لامرکزی پھیلاؤ اور فولاد، سمینٹ،
اور کوئلہ کو ڈھونے کی شرح، اور عوامی زمرہ کے صنعتی
پروجیکٹوں کے اردگرد صنعتی مراکز کا قیام ایک مثبت اور
مفید اقدام کی حیثیت رکھتے ہیں بہ نسبت اس منفی پہلو
کے جو لائیسنس پالیسی میں موجود ہے۔"

(صنعتی منصوبہ بندی اور لائیسنس پالیسی ۴۷)

اس میں شک نہیں کہ برقی قوت کے لامرکزی پھیلاؤ اور شرح نقل وحمل کی علاقائی ترقی میں بڑی اہمیت ہے۔ لیکن اس مرحلہ پر یہ بات اہم ہے کہ شری ہزاری جیسے ماہر معاشیات بھی یہ نہ دیکھ سکے کہ لائیسنس پالیسی کو مثبت انداز میں استعمال کیا جا سکتا تھا۔

جب سیاسی حلقوں میں لائیسنس پالیسی کی نکتہ چینی بہت بڑھ گئی تو حکومت ہند نے ۶۷ء میں ماہرین کی ایک کمیٹی کا تقرر کیا جو لائیسنس پالیسی انکوائری کمیٹی کہلائی۔ تاکہ "وہ اس بات کی تفتیش کرے کہ صنعتی لائیسنس کے نظام کی کارکردگی گذشتہ دس برسوں میں کیسی رہی ہے" اس کمیٹی کے سپرد جو دریافت طلب مسائل تھے ان میں دوسرے امور کے ساتھ یہ بھی مذکور تھا کہ جاری شدہ لائیسنس کس حد تک ۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی تجویز سے ہم آہنگ رہے ہیں۔

یہ بات کسی قدر عجیب لگتی ہے کہ کمیٹی نے صنعتوں کے علاقائی پھیلاؤ کے مسئلہ کا بھرپور جائزہ نہیں لیا، بلکہ اس کے برعکس اس نے اپنے آپ کو صرف اس بات کی تفتیش تک محدود رکھا کہ "آیا لائیسنس نظام ۱۹۵۶ء کی صنعتی تجویز کی اسپرٹ سے ہم آہنگ تھا یا نہیں۔" جب کبھی کمیٹی نے اس مسئلہ پر غور کیا تو اس کی کوشش یہ رہی کہ لائیسنسنگ حکام کو بری الذمہ قرار دے۔ کمیٹی کی رپورٹ کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے یہ بات ظاہر ہو جائے گی:

"ان صنعتوں کے معاملہ میں جو خام مال پر منحصر نہیں ہیں،

بعض اوقات علاقائی پھیلاؤ کے بارے میں ایک نقطہ نظر
اپنا یا گیا اور علاقائی پھیلاؤ جو درکار تھا اسی کی بنیاد پر
درخواستیں منظور یا رد کی گئیں۔"
(فائنل رپورٹ ص۳۳)

" اس مقصد (علاقائی پھیلاؤ) کو حاصل کرنے کے لئے
ایک ذریعہ کے طور پر لائسنس پالیسی کا نتیجہ بہت محدود
ہے، اس لئے یہ نامناسب نہ ہوگا کہ لائسنسنگ حکام
کو اس امر کے لئے ذمہ دار ٹھہرایا جائے کہ صنعتوں کے
علاقائی پھیلاؤ نے کچھ زیادہ ترقی نہیں کی۔"
(فائنل رپورٹ ص۱۱۴)

صنعتی ایکٹ ۱۹۵۱ء کے ضابطوں کے تحت ۱۹۵۶ء سے لیکر ۱۹۶۶ء تک ۱۱ ہزار ۳ سو دس درخواستیں صنعتی لائسنس جاری کرنے کے لئے موصول ہوئیں جن میں سے ۱۰ ہزار سولہ درخواستیں منظور کی گئیں اور ۷ ہزار ۲ سو ۹۴ درخواستیں رد کر دی گئیں۔ تقریباً تین ہزار درخواستوں کے لئے کسی طرح کی علاقائی معلومات مہیا نہیں ہے۔ مندرجہ ذیل تجزیہ صرف ان درخواستوں پر منحصر ہے جن کے لئے اعداد و شمار دستیاب ہیں۔

صنعتی لائسنس کے لئے کل آئی ہوئی تجاویز کا ۲۵ فی صد مہاراشٹر سے موصول ہوا۔ اس کے بعد مغربی بنگال (۱۶ فی صد)، گجرات (۸ صد) اور تامل ناڈو (۸ فی صد) کا درجہ ہے۔ اس طرح کل تجاویز کا ۵۷ فی صد صرف چار ریاستوں سے موصول ہوا۔ ان چاروں ریاستوں کے لئے منظور شدہ لائسنسوں کا بالترتیب ۲۷، ۱۶، ۸، ۱ اور ۹ فی صد ہے۔ یعنی کل منظور شدہ لائسنسوں کا ۶۰ فی صد مذکورہ بالا چار ریاستوں میں مرتکز تھا۔ پس ماندہ ریاستوں کا حصہ راجستھان میں ۹۷ ء ۶ فی صدی سے لے کر بہار میں ۱۶ ء ۵ فی صدی تک تھا۔ لیکن یہ بات دلچسپ

ہے کہ تناسب منظوری (یعنی منظور شدہ درخواستوں کا کُل درخواستوں سے فی صد تناسب) کسی بھی حال میں ۶۰ فی صدی سے کم نہیں ہے۔ سب سے کم تناسب منظوری راجستھان میں رہا (۶ر۵۹ فی صد)۔ اور سب سے زیادہ کیرالا میں (۸۲ فی صد)۔ پس ماندہ ریاستوں میں تناسب منظوری ۶۵-۶۰ فی صد کے درمیان ہے جب کہ ترقی یافتہ ریاستوں میں یہ تناسب ہر حال میں ۷۰ فی صدی سے زیادہ ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ تناسب منظوری پس ماندہ ریاستوں کے خلاف نہ تھا۔ لیکن جلد بازی میں یہ نتیجہ اخذ کرنے کے بجائے ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ پس ماندہ ریاستوں سے بہت کم تجاویز آئیں۔ اس لئے تناسب منظوری اونچا ہونے کے باوجود کل منظور شدہ لائسنسوں میں علاقائی نابرابری کافی تھی۔ دراصل پس ماندہ ریاستیں ایک بے ڈھب چکر میں گرفتار ہیں۔ وہ پس ماندہ ہیں اس لئے تجاویز کی کم تعداد، ان کو کم لائیسنس اس لئے ملتے ہیں کہ تجاویز کی تعداد زیادہ نہیں۔ یہ صورت حال منظور شدہ لائیسنسوں پر عمل درآمد نہ ہونے کی وجہ سے جس کا تناسب پس ماندہ ریاستوں میں زیادہ ہے اور بھی ابتر ہو جاتی ہے۔ آسام اور اڑیسہ نے پوری دہائی میں بالترتیب صرف ۹۵ اور ۱۰۸ لائیسنس حاصل کئے لیکن ان میں سے بھی بالترتیب ۵۱ اور ۴۰ فی صدی پر عمل درآمد نہیں ہوا، اس میں بڑے صنعتی گھرانوں کا بھی قصور ہے، ان بڑے صنعتی گھرانوں نے اپنے رسوخ کا استعمال کرکے لائیسنس تو حاصل کر لیا لیکن اس پر عمل درآمد نہیں کیا۔ اس سے ایک طرف لائیسنس شدہ صلاحیت اور واقعی پیداواری صلاحیت میں فرق بڑھا اور دوسری جانب پس ماندہ ریاستوں میں غیر عمل درآمد شدہ لائیسنسوں کے تناسب میں بھی اس کی وجہ سے اضافہ ہوا۔

اقسام مصنوعات کی رو سے لائیسنسوں کی علاقائی تقسیم کا جائزہ لینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مشین، اوزار، صنعت کے لئے منظور شدہ لائیسنسوں میں سے ۶۸ فی صدی مہاراشٹر، گجرات، مغربی بنگال اور تامل ناڈو میں

مرتکز تھے ۔ پنجاب اور ہریانہ میں سے ہر ایک کو ان کا ۱۰ فی صدی حصہ ملا ۔ بقیہ ۱۲ فی صدی میں باقی تمام ریاستیں شریک تھیں ۔ دھات کے بنے ہوئے آلات ، بغیر دھات کی مشینری ، روڈ ٹرانسپورٹ ، ربڑ اور چمڑے کی اشیاء اور سائیکل وغیرہ کم وبیش مساوی طریق پر مہاراشٹر ، گجرات ، مغربی بنگال ، تامل ناڈو اور پنجاب کے درمیان منقسم تھیں ۔ دوسری تمام ریاستوں کا حصہ تقریباً ناقابل لحاظ تھا ۔

مندرجہ بالا تجزیہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں تک منظور شدہ لائسنسوں کا تعلق ہے پس ماندہ اور ترقی یافتہ ریاستوں کے درمیان تفاوت اور نابرابری موجود ہے ۔ لائسنسنگ حکام اس صورت حال پر اپنی بے چارگی ظاہر کر سکتے ہیں کیونکہ پس ماندہ ریاستوں سے تجاویز زیادہ تعداد میں موصول نہیں ہوتیں ، دت کمیٹی نے اس سے ملتا جلتا خیال یوں ظاہر کیا ہے :

> "بہرکیف صنعتی طور پر کم ترقی یافتہ ریاستوں کی جانب سے
> تعین مقام کے لئے زیادہ تجاویز موصول نہیں ہوئیں ،
> اور اگر بعض صورتوں میں لائسنس دیئے بھی گئے تو
> عمل درآمد نہیں ہوا ۔"

(فائنل رپورٹ صفحہ ۱۹۳)

اس صورت حال کے پیش نظر ہم اس بات کی تفتیش کریں گے کہ پس ماندہ ریاستوں سے تجاویز کافی تعداد میں کیوں نہیں آئیں ۔

ذیلی ڈھانچہ اور لائسنس پالیسی

کسی علاقے میں نئے صنعتی کاروبار کے قیام کے لئے بعض ایسی شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے جو اس کی کامیابی کی ضامن ہو سکیں ۔ پیداواری عمل شروع کرنے اور اُسے جاری رکھنے کے لئے برقی قوت اور ذرائع نقل وحمل کی ضرورت

پیش آتی ہے تاکہ دور دراز علاقوں سے خام مال منگوایا جاسکے اور تیار شدہ مصنوعات کو ایسے بازاروں میں بھیجا جاسکے جو کافی فاصلہ پر واقع ہوں، رسل و رسائل کے ذرائع ضروری ہیں تاکہ تجارتی تعلقات قائم کیئے جاسکیں، اسی طرح بنک کاری، بیمہ کمپنیوں اور دوسرے مالی اداروں کی ضرورت بھی پڑتی ہے جن کے اوپر ہر صنعتی اکائی کی کامیابی کا بالواسطہ یا بلا واسطہ دارومدار ہے۔ ان تمام سہولتوں کو ذیلی ڈھانچہ کی سہولتیں کہا جاتا ہے، تعلیم کی ترقی اور سیاسی استحکام کو بھی ذیلی ڈھانچہ کی سہولتوں میں ہی شامل کرنا چاہیئے۔

ذیلی ڈھانچہ کی سہولتوں کی موجودگی مختلف ریاستوں میں الگ الگ مقدار میں ہوگی اور یہ صنعتی اکائیوں کو راغب کرنے یا انھیں بھگانے کا ایک بڑا سبب ہوسکتی ہیں۔ ذیلی ڈھانچہ کے اشاریہ کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی تقریباً نصف ریاستیں ذیلی ڈھانچہ کی ترقی میں قومی اوسط سے پیچھے ہیں۔ ان ریاستوں میں بہار، آندھرا پردیش، کرناٹک، جموں وکشمیر، آسام، اڑلیسہ، راجستھان اور مدھیہ پردیش شامل ہیں، پنجاب (بشمول ہریانہ) ذیلی ڈھانچہ کی ترقی میں سب سے آگے ہے اور اس کا خاص سبب اس کا آبپاشی اور سڑکوں کا نظام ہے۔ راقم الحروف نے بعض شماریاتی طریقوں کا استعمال کرکے منظور شدہ لائسنس فی لاکھ آبادی اور ذیلی ڈھانچہ کے درمیان تعلق کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے اور تحقیق کے یہ نتائج انگریزی میں عرصہ ہوا شائع ہوچکے ہیں۔ تکنیکی ہونے کے سبب ان کو یہاں پیش نہیں کیا جارہا ہے لیکن اتنا کہنا کافی ہوگا کہ مدھیہ پردیش راجستھان، اڑلیسہ، آسام، اترپردیش، آندھرا، اور کرناٹک جیسی ریاستوں کا ایک گروہ ہے جو ذیلی ڈھانچہ کی ترقی میں پس ماندہ ہے اور جس کا حصہ منظور شدہ لائسنسوں میں بہت کم ہے، دوسری جانب ایسی ریاستیں ہیں جو ذیلی ڈھانچہ کی سہولتوں میں کافی ترقی یافتہ ہیں، مثلاً مہاراشٹر، کیرالا، تامل ناڈو، پنجاب (بشمول ہریانہ) وغیرہ۔ ان ریاستوں کو منظور شدہ لائسنسوں کا ایک بڑا حصہ

ملا ہے۔

فی کس آمدنی کی بنیاد پر بھی مندرجہ بالا نتائج سے ملتے جلتے ہی نتائج اخذ کیئے گئے ہیں، تو پس ماندہ ریاستیں ایک گروہ کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ جن کی فی کس آمدنی بہت کم ہے۔ اور ان ریاستوں سے بھیجی جانے والی لائیسنس درخواستوں یا تجاویز کی تعداد بھی بہت کم ہے۔

میٹروپولیٹن ارتکاز

ہم صنعتی سرگرمی کے اجتماع کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ تعیین مقام پر عوامی کنٹرول کا جواز، اگر اس کو بازار کے عمل میں مداخلت کرنا ہی ہے تو یہ ہے کہ وہ اجتماع کے رجحان کی ہمت شکنی کرنے کی کوشش کرے تاکہ معیشت کے پیداواری ڈھانچہ میں علاقائی تنوع بھی پیدا ہو جائے۔ اس کے ذریعہ پہلے تو مختلف علاقوں کے مابین صنعتی ترقی کی سطح میں پائی جانے والی عدم مساوات میں کمی کی جا سکتی ہے اور بالآخر اس کو ختم کیا جا سکتا ہے، اس ضمن میں صنعتی لائیسنس پالیسی کی ناکامی جتنی المناک ہے اتنی کسی اور جگہ نہیں۔ اس ملک میں کل ۳۰۴ صنعتی محل وقوع ہیں جن میں سے صرف ۲۹ سرمایہ کاروں کے پسندیدہ ہیں۔ بلاشبہ ان مقامات میں بھی کافی تفریق پائی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بڑے صنعتی مراکز نے نئے صنعتی کارخانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی جانب کھینچ لیا اور عوامی کنٹرول (یا لائیسنس کا نظام) اس عمل کو روکنے میں ناکام رہا۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۱ء تک نئی صنعتی اکائیوں کے لئے ۳ ہزار سے زائد لائیسنس جاری کیئے گئے، مندرجہ ذیل جدول میں ان کی علاقائی تقسیم واضح کی گئی ہے۔ یہ سارے لائیسنس ۲۹ پسندیدہ مقامات پر مرتکز ہیں۔

سرمایہ کاروں کے پسندیدہ تعیّن مقامات

ریاست (۱)	پسندیدہ تعیّن مقامات کی تعداد (۲)	تعیّن مقام (۳)	نئے کارخانوں کے لئے دیئے گئے لائیسنس کی تعداد
۱۔ آندھرا پردیش	۲	وشاکھا پٹنم	۲۵
		حیدرآباد	۱۰۵
۲۔ بہار	۳	دھنباد	۲۰
		جمشید پور	۲۰
		رانچی	۳۱
۳۔ گجرات	۲	احمد آباد	۹۹
		بڑودہ	۷۴
۴۔ ہریانہ	۲	بلبھ گڑھ	۶۲
		فرید آباد	۲۲۹
۵۔ کیرالا	۱	ارناکلم	۳۶
۶۔ مہاراشٹر	۵	ناگپور	۴۴
		کلیان	۴۹
		پونہ	۱۳۶
		تھانہ	۱۸۳
		بمبئی	۹۲۰
۷۔ مدھیہ پردیش	۱	بھوپال	۵۰
۸۔ میسور	۱	بنگلور	۵۰

۹۔ پنجاب	۱	لدھیانہ	۲۱
۱۰۔ راجستھان	۲	کوٹہ	۲۸
		جے پور	۳۵
۱۱۔ تامل ناڈو	۲	کوئمبٹور	۱۰۵
		مدراس	۱۸۱
۱۲۔ اترپردیش	۳	غازی آباد	۷۹
		کانپور	۷۴
		لکھنؤ	۲۲
۱۵۔ مغربی بنگال	۳	کلکتہ	۳۰۶
		درگاپور	۴۶
		ہاوڑہ	۴۱
۱۶۔ دہلی		دہلی	۲۴۵
کل جمع	۲۹		۳,۳۶۰

اس جدول سے یہ حیرت انگیز انکشاف بھی سامنے آتا ہے کہ نئے صنعتی کارخانوں کی ایک تہائی تعداد بمبئی تھانہ کمپلیکس میں ہی مرتکز ہے۔ نئی صنعتی اکائیوں کے لئے منظور شدہ لائسنسوں میں سے ۸۰ فی صدی صرف ۱۵ متعینہ مقامات پر مرتکز ہیں جو مہاراشٹر، گجرات، تامل ناڈو، بنگال، ہریانہ اور دہلی میں واقع ہیں، اگر ہم تفاعلی رشتوں اور جغرافیائی اتصال کا بھی خیال کریں تو اجتماع کے رجحانات اور زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔ مثلاً دہلی کو نئے صنعتی کارخانوں کے لئے ۲۴۵ لائسنس جاری کئے گئے تھے۔ فرید آباد اور غازی آباد کو بالترتیب ۲۲۹ اور ۷۹ لائسنس ملے۔ تفاعلی اعتبار سے یہ دونوں شہر دہلی میٹرو پولیٹن علاقہ کے جز ہیں جس کا حصہ اب

۵۲ تک بڑھ جاتا ہے ۔ اسی طرح بمبئی، تھانہ اور کلیان کو ایک واحد صنعتی کمپلیکس قرار دیا جانا چاہیئے ۔ جغرافیائی اتصال اور تفاعلی رشتوں کی بنیاد پر چار بڑے صنعتی علاقے شناخت کئے جاسکتے ہیں ۔ کلکتہ کی صنعتی پٹی، دہلی میٹروپولیٹن علاقہ، بمبئی تھانہ کمپلیکس، اور مدراس میٹروپولیٹن علاقہ، ان چاروں صنعتی علاقوں کے درمیان نئے صنعتی کارخانوں کے لائسنس کی تقسیم اس طرح ہے :

بمبئی ۔ تھانہ کمپلیکس	۳۴ فی صدی
کلکتہ صنعتی پٹی	۲۳ فی صدی
دہلی میٹروپولیٹن علاقہ	۱۶ فی صدی
مدراس میٹروپولیٹن علاقہ	۵ فی صدی
کل جمع	۷۸ فی صدی

اس طرح نئے کارخانوں کے لئے جاری کئے گئے تمام لائسنسوں کا ۷۸ فی صدی صرف چار صنعتی علاقوں کو ملا اور بقیہ ۲۲ فی صدی لائسنس دوسرے تمام مقامات کے درمیان تقسیم ہوئے ۔ ان اعداد وشمار سے صاف ظاہر ہے کہ صنعتی لائسنس کے نظام نے صنعتی اجتماع کے رجحان کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور علاقائی ترقی کے لئے کسی طویل مدتی حکمت عملی کے نہ ہونے کے باعث حکومت دوسرے صنعتی علاقوں کے امکانات کا فائدہ نہ اٹھاسکی ۔

فروری ۱۹۷۰ء میں ایک نئی صنعتی پالیسی کا اعلان کیا گیا ۔ اس پالیسی کے مطابق وہ صنعتیں جن میں ایک کروڑ روپے تک سرمایہ کاری ہو اور صنعتی کارخانوں کے منجمد اثاثے ایک کروڑ سے پانچ کروڑ کے درمیان ہوں، لائسنس سے آزاد کر دیئے گئے ہیں لیکن اس ضمن میں دو شرائط عائد کر دی گئیں : (۱) ۲۰ بڑے صنعتی گھرانوں کو چھوڑ کر ان تمام کارخانوں کے لئے کسی لائسنس کی ضرورت نہ ہوگی جن میں اشیائے سرمایہ کی درآمد کے لئے بیرونی زرمبادلہ کی ضرورت کل سرمایہ کے دس فی صد یا ۱۰ لاکھ روپے تک ہو (ان دونوں میں سے جو کم ہو)

یا (۲) جہاں خام مواد کی درآمد کے لیے بیرونی زرمبادلہ کی ضروریات کل سالانہ پیداوار کا ۳ فی صدی یا ۳ لاکھ روپیہ ہو (ان دونوں میں سے جو کم ہو) ۔ نئی پالیسی میں تعین مقام کے کنٹرول کی کیا حیثیت ہے ؟ اس پر کچھ نہیں لیا گیا۔

مندرجہ بالا تجزیہ سے یہ ثابت ہوا کہ لائسنس پالیسی ، علاقائی پہلو کی نسبت سے ، وہ مقاصد حاصل نہ کرسکی جو وہ حاصل کرنا چاہتی تھی ۔ صنعتی ترقی میں بہتر علاقائی توازن پیدا کرنے کے بجائے اس کو اس طرح چلایا گیا کہ اس کے نتائج بھی وہی ہوئے جو اس صورت میں ہوتے جبکہ بازار کی قوتوں کو مکمل طور پر آزاد چھوڑ دیا گیا ہوتا ۔ زیادہ صحیح طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لائسنس کا نظام تعین قیام کے مسئلہ پر نجی فیصلہ سازی کے عمل میں مداخلت نہیں کرسکا ۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ حکومت نے علاقائی ترقی کے لئے کوئی قابل عمل حکمت عملی وضع نہیں کی ۔

نئی پالیسی کے تحت ، اوسط درجہ کی صنعتوں کے تعین قیام کا مسئلہ بازار کی قوتوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا ہے ۔ اس پالیسی میں بھاری سرمایہ کاری والی صنعتوں کے تعین قیام پر سخت کنٹرول کی ضرورت ہے کیونکہ ایسی صنعتوں کے پھیلاؤ کا اثر زیادہ ہوتا ہے ۔ اگر صنعتی اجتماع کے رجحانات کو سختی سے نہیں دبایا جاتا اور اس کے لئے مناسب پیش بندی اور صحیح منصوبہ بندی نہیں کی جاتی تو اس سے صنعتی ترقی میں علاقائی عدم مساوات کو مزید بڑھاوا ملے گا جس کے نتائج ، معاشی اور سیاسی دونوں اعتبار سے کافی ضرر رساں ہوسکتے ہیں ۔

سید جمال الدین

ہندی مسلم فن تعمیر
مقصد، تکنیک اور جمالیات

(ایک جائزہ)

(۲)

علائی دروازہ کی تعمیر اور آرائش میں بیرونی تکنیک اور جمالیات دونوں کا خاص دخل ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی صناعوں نے آرائش کے بدیسی اسالیب میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس عمارت میں بنائے جانے والے آرائشی گول تکونوں نے قدیم سیدھے سادے ترکی طرز تعمیر کو ایک نئے آرائشی اسلوب سے متعارف کیا۔ اس کے علاوہ "خفیفی محراب" (یعنی ڈاب دار محراب) کی شکل بھی پہلی دفعہ اس محراب میں نظر آتی ہے۔ فرگسن کے بقول: "یہ عمارت پٹھانی طرز کا منتہائے کمال پیش کرتی ہے ..... اتنی کامل چیز پہلے تیار نہ ہوئی تھی اور نہ اس کے بعد انھوں نے اس قدر مزین عمارت بنانے کا ارادہ کیا۔"[۱] علائی دروازہ کی کرسی کی باہر نکلی ہوئی چوکی کے پیش نظر پروفیسر محمد مجیب نے یہ خیال

---

[۱] اسلامی فن تعمیر: ارنسٹ ٹاڈ ہیام رچمنڈ، مترجم سید مبارز الدین رفعت، صفحات ۳۴ و ۳۵

ظاہر کیا ہے کہ "یہ اس بات کی مثال ہے کہ معمار مندر کے فن تعمیر کے ایک جزو کو اپنے مقصد کے لئے اختیار کر رہا تھا[۵۲]۔" علائی دروازہ کو پروفیسر محمد مجیب فن تعمیر اور سنگ تراشی کا دواعی بوسہ کہتے ہیں[۵۳]۔ دونوں فنون کا ایک وصل ایک مرتبہ پھر گجرات میں ہوا، لیکن اس سے بھی پہلے دہلی میں غیاث الدین تغلق کا سادہ شان وشوکت کا مقبرہ نمودار ہوا۔

علاء الدین خلجی (انتقال ۱۳۱۶) کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ عہد تغلق وسادات کے معماروں کے طبائع میں تبدیلی واقع ہوئی اور شیر شاہ کے عہد (۱۵۳۹) تک کی عمارتوں میں انتہائی سادگی پائی جاتی ہے۔ یہ سادگی غالبًا سماجی اور سیاسی ڈھانچے کے انتشار کے بڑھتے ہوئے خطرے کے خلاف ردعمل کا اظہار تھی۔ تاریخی اعتبار سے اس تغیر کی سب سے زیادہ اہمیت اس لئے ہے کہ اس طرز تعمیر میں مسلمانوں نے اپنے آپ کو ہندی اثرات سے آزاد رکھ کر اسلام میں رائج اصولوں کے تحت تعمیر کا کام شروع کیا۔ تغلق عہد کی عمارتوں میں جتنی محرابیں ہیں وہ صحیح محرابیں ہیں اور جزئیات میں تقلید نہیں کی گئی۔ اس وقت سے ہندی مسلم فن تعمیر کی علیحدہ شناخت زیادہ پائدار بنیادوں پر شروع ہوگئی، لیکن یہ درست ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مقابر ومساجد میں اکثر محنت سے بچنے کے لئے ہندی مسالے سے کام لیا اور اکثر عمارتوں میں ایک تازہ خوش نمائی پیدا کردی، ایسی مرکب عمارتوں کی بڑی تعداد صرف چار کھمبوں کی ہے جن پر چھوٹے چھوٹے گنبد بنا دئے گئے ہیں۔ جینی ستونوں کی طرح ان کی بارہ دری بھی اختیار کرلی گئی جو ہشت پہلو عمارتوں میں دئے جاتے تھے اور جن پر گول آثار دے کر گنبد بنانا سہل تھا۔ جب کہیں مسلمان ایسے مقام پر، جو پہلے ہندو، جینی، یا بودھ بستیاں تھیں، آباد ہوتے وہاں انھوں نے

۵۲ه اسلامک انفلوئنس آن انڈین سوسائٹی: پروفیسر محمد مجیب (۱۹۷۲ء) صفحہ ۱۲۵۔

۵۳ه ایضًا صفحہ ۱۲۶۔

ایسے ہی مرکب نمونے اختیار کئے اور اسلامی اجزا کو ہندی طرز میں "مدغم" کئے بغیر مقامی ہندی طرز کو اختیار کر لیا۔

علاء الدین کے بعد سیاسی اور سماجی تنظیم کو جو خطرہ لاحق ہوا اس کا عکس تغلق عہد کی مسجدوں کے طرز میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے، تحفظ کا احساس ان مسجدوں (جیسے بیگم پوری مسجد، کلاں مسجد وغیرہ) کی بلند اور مضبوط فصیلوں سے ہوتا ہے جن سے پہلی نظر میں قلعہ کا گمان ہوتا ہے۔

چودھویں اور پندرھویں صدی میں عمارتوں میں ہندوانی تکلفات متروک ہو گئے اور اسلام کی سادگی پسندی کا مظاہرہ ہوا، لیکن یہ سادگی بعد میں قائم نہ رہ سکی جیسا کہ عہد شیر شاہی کی غیر معمولی آرائش سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس عہد میں مسجدوں کی روکاریں زیادہ آراستہ کی جانے لگیں جن میں سنگ مرمر کی پچی ہونے لگی اور سنگ تراشی کی خوشنما اور پر تجمل وضع سے انھیں مزین کیا جانے لگا۔ اس طرز کی ابتدا میں وہ سب نزاکتیں اور باریکیاں موجود نہیں جو ہندی صناعی کا خاصہ ہیں، مگر آخری دور میں پہلے کی طرح باریکی اور جزوی تزئین کی طرف دوبارہ توجہ کی جانے لگی۔

عہد سلطنت میں مرکز کی کمزوری کے ساتھ ہی صوبائی حکومتوں کے قیام اور ان کے علاقوں کی نسبت سے مختلف طرز ہائے عمارت وجود میں آئے۔ جونپور، گجرات اور بنگال کے طرز تعمیر کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں دہلی کے مرکزی طرز سے ہٹ کر اپنے ایک جداگانہ طرز کی تخلیق کی کوشش کی گئی۔ ظاہر ہے علاقائی سلاطین جنھوں نے مرکز سے علیحدگی اختیار کی تھی اپنی آزاد شخصیت کی کی طرف متوجہ ہوتے ہوں گے اور اس کے لئے ضروری تھا کہ مرکز کے طرز سے گریز کرتے ہوئے اور اپنی آزادی کو مستحکم کرنے کے لئے اپنی جڑیں علاقائی تہذیب میں جمائیں اور وہاں کی تہذیبی قدروں میں اپنے نظریات کے مطابق جزئیات تلاش کرکے انھیں اپنی تخلیقات میں پیش کریں۔ جونپور کی مسجدیں

جن میں اٹالا مسجد اور جامع مسجد نمایاں ہیں، نیم ہندی ہیں البتہ دروازے اسلامی طرز کے ہیں۔ ان عمارتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے معماروں کو استحکام کی کس قدر فکر ہوگی لیکن استحکام کا اظہار فن تعمیر میں بھونڈا نہیں بلکہ دلکش ہے۔ جونپور میں ایسی بہت سی مسجدیں اور مقبرے ہیں جو ہندو اور جینی جزئیات کا مرکب اور مقامی تہذیب کی آئینہ دار ہیں۔

ہندی مسلم فن تعمیر نے ہندوستان میں جس قدر مختلف صورتیں اختیار کیں ان میں غالباً سب سے زیادہ نفیس، احمد آباد کے طرز کو سمجھا جائے گا، احمد آباد کی عمارتوں میں، خواہ وہ مسجد ہوں یا مقبرے۔ ہندو یا جینی اثرات آخری وقت تک دیکھے جاسکتے ہیں۔ محراب بطور اسلامی نشان ضرور استعمال کی گئی ہے لیکن عمارتوں میں جو طرزِ اختیار کیا گیا ہے ان میں محرابوں کی ضرورت نہیں تھی۔ دراصل گجرات کی ہندو مملکت مسلمانوں کی فتح سے پہلے تمدن کی بلندی تک پہنچ چکی تھی، مسلمانوں نے اسی تمدن کے نمائندہ صناعوں سے اپنی عمارتیں بنوائیں اور پھر یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ بانیٔ سلطنت ایک نومسلم تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے طرز عمارت میں جینی یا چالوکیہ صناعی کی نفاست کے ساتھ ایک خاص قسم کی وسعت تخیل شامل ہوگئی جس تک ہندو کبھی نہ پہنچ سکے تھے۔ گجرات کے صوبائی طرز کی ایک اہم خصوصیت یہی وسعت تخیل ہے۔ مسجدوں میں روشنی اور ہوا کی ضرورت نے جن طریقوں کو برتنے پر مجبور کیا وہ گجرات میں ہندی مسلم فن تعمیر کا عطیہ ہے۔ مسلمانوں کا ایک اور کارنامہ مینار ہیں جو تعمیر کے حسن اور کاریگری کی باریکی میں اسلامی مراکز تہذیب کے میناروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ مقبروں میں بھی ہندی وضع اور طرز غالب رہا ہے اور محرابیں تعمیری ضرورت کے تحت بنائی گئی ہیں۔ مقبروں اور مسجدوں میں آرائش کے لئے چھجے کے ساتھ ہنس استعمال کئے گئے ہیں، جو تہذیبی لحاظ سے پرسکون اور پُرامن کا مظہر ہیں ۔۔۔ خانقاہوں اور مسجدوں میں ہنس دیکھ کر حیرت ہوتی ہے لیکن گجراتی مسلمانوں

کی وسیع المشربی اور کشادہ قلبی نے اسے گوارا کرلیا۔

مالوہ کی عمارتوں میں دہلی کا طرز نمایاں ہے لیکن عمارتوں کی شکلوں میں تنوع پیدا کیا گیا ہے، اشرفی محل، جہاز محل، ہنڈولا محل اس کی اہم مثالیں ہیں۔ دہلی طرز کے یہاں حاوی ہونے کا ایک اہم سبب غالباً یہ رہا ہوگا کہ مقامی طور پر فن تعمیر کی کوئی روایت نہیں تھی، لیکن علاقائی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لئے مرکزی طرز کو اختیار کرتے وقت اس کا خاص خیال رکھا گیا کہ عمارتوں میں ایسی جدت پیدا کی جائے جس سے ان کا ایک علیحدہ طرز نمایاں ہوسکے۔

بنگال میں عمارتیں اینٹ سے بنانے کی روایات قدیم دور سے چلی آرہی تھیں۔ مسلمانوں کے یہاں خود مختار ہونے کے بعد جو طرز عمارت وجود میں آیا اس کی بھی ایک خصوصیت ہے۔ اینٹ کے سوا یہاں کوئی مسالہ ہاتھ نہیں لگا لہذا کشادہ عمارتوں (مسجد اور مقبرے) کی پائیداری کے لئے محرابوں سے کام لیا گیا اسی وجہ سے بنگال میں عمودی طرز رائج نہ ہوسکے اور چونکہ وہاں پتھر عنقا تھے، ان عمارتوں اور ستونوں کی پائیداری کے لیے اینٹیں استعمال کی گئیں۔ یہ بنگالی طرز جو ہندوستان میں خالص اینٹ کا واحد نمونہ ہے، ایک ایسی مقامی خصوصیت رکھتا ہے جو نہایت دلچسپ ہے۔ یہاں نکیلی محرابوں کو ترقی دی گئی اور اس کے علاوہ بنگالی معماروں نے چھت کی ایک نئی وضع بھی ایجاد کی جس کا موجودہ عہد تک اثر پڑتا رہا۔ یہ کروی وضع کی چھت ہے جو مانسونی علاقے میں بارش کے پانی کو تیزی سے بہہ جانے کے لیے ضروری تھی۔ کروی وضع ہندو اور مسلمان دونوں میں مقبول ہوئی۔

دکن میں بھی گلبرگہ، بیجاپور اور گولکنڈہ میں مسلمانوں کے فن تعمیر کے اصولوں پر ہندوستانی صناعی سے کام لیا گیا۔ دکن میں ہندو مسلم فن تعمیر کا نمایاں کارنامہ زیادہ کشادہ کمرہ پر عظیم گنبد قائم کرنے کی پائیدار تکنیک ہے۔

اس کے بعد ہم مغلیہ عہد میں داخل ہوتے ہیں، لیکن مغلیہ عہد ہر اعتبار سے

عہد وسطی کے ابتدائی دور سے اس قدر جداگانہ حیثیت رکھتا ہے کہ شیر شاہ نے انتظامیہ کے علاوہ شعبۂ فن میں بھی اکبر کو وہ راستہ دکھایا جس پر چل کر مغل شہنشاہ رتبۂ کمال تک پہنچ سکے۔ تاریخی اعتبار سے مغل شہنشاہ سور خاندان کے جانشین سمجھے جاتے ہیں اور بے شک شیر شاہ کا طرز عمارت بعض اعتبار سے مغلوں کے طرز عمارت کے لئے مثالی رہا ہے لیکن مغلوں نے اس فن میں وہ کمال حاصل کیا کہ یہ پہلو کچھ ماند پڑجاتا ہے۔

اکبر کا فلسفۂ صلح کل اس کی عمارتوں کا رہنما اصول بنا تو غوریوں کا جمالیاتی شعور شاہجہاں کی عمارتوں کا روح رواں ثابت ہوا۔ ان دونوں مغل بادشاہوں کی عمارتیں رنگ و وضع میں ایک دوسرے سے اس قدر جدا ہیں کہ گمان ہوتا ہے ان کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہوگا۔ فن تعمیر کی تمام اہم جزئیات گنبد، محراب، مینار، وغیرہ میں انقلابی تبدیلیاں مغلوں کے عہد میں نمودار ہوئیں۔ اس انقلاب کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ غوریوں کی سرپرستی میں فن تعمیر نے وسط ایشیا میں جو ترقی حاصل کی تھی اور شاہجہاں نے بالخصوص وسط ایشیا کے صناعوں اور ماہرین فن تعمیر کو طلب کیا تھا، مثال کے طور پر تاج کے معماروں میں وسط ایشیا کے معماروں کا کافی حصہ تھا اور تمام جزئیات میں ماہرین کا قلم تھا۔ لیکن مجموعی طور پر جب عمارت کو دیکھئے تو وہ خالص ہندوستانی نظر آتی ہے۔ اکبر کی تعمیرات بالخصوص فتح پور سیکری کے سلسلۂ عمارات میں مختلف مقامی تہذیبوں سے فنی نمونے مستعار لئے گئے ہیں۔ فکر اور عمل کا ایسا قریبی ربط اکبر کے علاوہ اور کہیں مشکل سے ملے گا اور اس ربط کی جس قدر جھلکیاں اس کے فن تعمیر میں نظر آتی ہیں وہ کسی اور طرز تعمیر میں مشکل سے ملیں گی۔

اس مضمون میں جو جائزہ پیش کیا گیا ہے، اس سے چند اہم نتائج نکلتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ کہ مسلمانوں کی عمارتوں کے مقاصد کی وجہ سے جو اسلامی تہذیب سے وابستہ تھے۔ طرز تعمیر میں بلندی اور کشادگی کے

تصورات نمایاں ہوئے ۔ ادب میں جس وسعت قلب کی جھلکیاں ملتی ہیں اسی وسعت قلب کا آئینہ دار ہندی مسلمان فن تعمیر بھی ہے ۔ کشادہ کمرے کے لئے چھت کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے ہندوستانی مسلمانوں نے گنبد کی تعمیر کا آغاز کیا اور اسے ترقی دی ۔ یہ ایک مستقل حیثیت کا کارنامہ ہے ۔ ڈاٹ دار محراب گنبد کی تخلیق میں معاون ثابت ہوئی ۔ گنبد کی ڈاٹ دار چھت نیز ڈاٹ دار محراب نے جہاں عمارات کو پائیداری دی وہیں اسے حسن و زیبائش بھی عطا کی ۔ میناروں سے وسیع عمارات میں توازن قائم کیا گیا ۔ اس کے علاوہ ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ گپت بادشاہوں کے بعد شہری بستیاں قائم کرنے کا جو رواج ترک کر دیا گیا تھا اس رواج کو بڑے پیمانے پر شروع کر کے ہندوستانی فنون اور صنعتوں کو، جو غالباً زیادہ عرصے تک متروک رہنے کے بعد اپنے جانشین بھی نہ چھوڑتیں، جلا دی اور اپنے بالکل جدا اور متضاد مقاصد کے لئے انہی صنعتوں اور فنون کے لئے وہ جزئیات اور مقامی مسالے استعمال کئے جن سے مقصد بھی حاصل ہو جائے، عقیدے کے اصول میں فرق نہ آئے اور حسن بھی پیدا ہو جائے ۔ ہندی مسلم فن تعمیر کی یہی دین ہے ۔

فن تعمیر عقیدہ کی آمیزش سے کیسی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ اس کے لئے ذیل کا تتمہ ملاحظہ ہو :

فن تعمیر ایک سماجی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس سلسلے میں دہلی کی خانقاہوں کے 'ارتقاء' کا مطالعہ قابل غور ہے ۔ لفظ 'ارتقاء' استعمال کرنا اس لئے مناسب ہوگا کہ ان خانقاہوں کی تعمیر کی کوئی ایک تاریخ نہیں بلکہ دہلی کی مشہور و معروف خانقاہوں میں مغلیہ عہد کے آخر تک ردّ و بدل ہوتا رہا ہے ۔ ان خانقاہوں میں جو بزرگ مدفون ہیں انھوں نے اپنے کو دربار سے علیحدہ رکھا تھا لیکن اُن کے مدفن بعد ازاں درباروں کی سرپرستی کا مرکز بن گئے ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عظیم صوفیاء کرام کے جانشینوں نے درباری یا دنیاوی زندگی کے ساتھ ہم آہنگی کی ضرورت کو تسلیم کر لیا تھا ۔ غالباً خانقاہوں اور دربار کی ہم آہنگی کی وجہ سے ہی دربار کی رواداری کی پالیسی

کوعوام میں مقبولیت حاصل ہوئی ہوگی۔

جب سلطنت مستحکم تھی، اس وقت بھی خانقاہوں کی تعمیر کی طرف توجہ کی جاری تھی اور جب سلطنت سکڑ کر لال قلعہ سے پالم تک رہ گئی تب بھی ان خانقاہوں کی وضع و شکل میں ترمیم و تغیّر کی سعی ہوتی رہی۔ خانقاہوں کے ارتقاء کی داستان دوہرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی تفصیل 'آثار الصنادید' اور 'واقعات دارالحکومت دہلی' میں مل جائیں گی، البتہ ان چند خانقاہوں یا درگاہوں کے نام بتانا مناسب ہوگا جو ارتقاء کے دور سے گزر کر موجودہ شکل اختیار کرسکی ہیں۔ یہ ہیں درگاہ حضرت قطب صاحب، درگاہ حضرت نظام الدین اور درگاہ حضرت روشن چراغ —— استحکام کے دور میں درگاہوں یا خانقاہوں کی سرپرستی اس بات کی سند ہے کہ عوام سے رابطہ قائم کرنے کے لئے ایک وسیلے اور ذریعے کی حیثیت رکھتے تھے اور سلطنت کے زوال کے وقت بھی جب مغل شہنشاہ اپنے عوام کو کوئی مادی فائدہ نہیں پہنچا سکتے تھے وہ مایوس اور ناامید عوام کی روحانی اور ذہنی تسکین کے مراکز کی بقا اور شان میں اضافے کے لئے کوشش کرتے رہے۔

دہلی کی قدیم درگاہوں کے علاوہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں مقامی فرماں رواؤں نے بھی اپنے علاقوں کے روحانی مراکز میں ہمعصر صوفیاء کے مزارات اور درگاہوں کی تعمیر کی۔ اس طرح گنبد و مینار اور محراب کا طرز مختلف علاقوں میں عام ہوا اور خانقاہوں کی شان و شوکت اور شہرت میں علاقائی فرمانرواؤں کی نیازمندانہ سرپرستی سے اضافہ ہوا۔ حتیٰ کہ مغل شہنشاہوں نے بھی ان خانقاہوں کو نذر و نیاز پیش کرنا اپنے لئے باعثِ سعادت خیال کیا۔

خانقاہوں کے علاوہ دہلی میں سلاطین کے تعمیر کئے ہوئے بند اور پل بھی اپنی مقصدیت اور تکنیک میں ترقی کے علاوہ ایک سماجی دستاویز پیش کرتے ہیں یہاں موضوعِ بحث 'ست پلہ' اور 'بولی بھٹیاری کے محل' ہیں۔

ست پلہ درحقیقت ایک بند ہے۔ اس کی تعمیر ۱۳۲۶ء میں سلطان محمد عادل

تغلق شاہ نے کی۔ دور دراز مقامات سے پانی لانے کا انتظام کیا۔ نالے کے لئے بیچ میں سات در بطور پل بنائے گئے۔ اسی سبب سے یہ ست پُلہ مشہور ہوا۔ "واقعات دارالحکومت دہلی"، (مطبوعہ ۱۹۱۹) کے مصنف بشیرالدین احمد دہلوی لکھتے ہیں کہ "تمام کھیتیاں اسی پانی سے سیراب ہوتی ہیں اور زمینداروں کو بہت فائدہ ہوتا ہے"۔[1] غرض ست پُلہ کا مقصد ضروریات زندگی کے لئے پانی جمع کرنا اور مسلسل تقسیم کرنا تھا، لیکن ہندوستان میں، جہاں مظاہر فطرت کو معبود سمجھ لیا جاتا ہے، پانی کی نسبت سے ست پُلہ بھی ایک تیرتھ استھان بن گیا اور اس پل کے دروں کے پاس تعمیر کیا ہوا کنواں متبرک مقام بن گیا، اگرچہ وہ کنواں اب نہیں رہا مگر نالے میں ایک گڑھا کر کے پانی جمع کیا جاتا ہے اور اس سے تبرک کے طور پر بیماروں کو نہلایا جاتا ہے اور ٹھلیوں میں پانی بھر کر دور دور لے جایا جاتا ہے۔ کاتک کے مہینے میں دیوالی کے قریب یہاں بڑا ہجوم ہوتا۔ زن و مرد اور بچے نہانے کو آتے تاکہ آسیب، جن اور بھوت اور جادو سے محفوظ رہیں۔ روایت یہ ہے کہ یہاں حضرت روشن چراغ دہلی نے وضو کیا تھا لہٰذا یہ پانی متبرک قرار دیا گیا۔

کچھ ایسا ہی بولی بھٹیاری کے محل کے ساتھ ہوا۔ یہ بھی ایک بند ہے۔ اس کی تعمیر فیروز شاہ تغلق سے منسوب کی جاتی ہے۔ بند کا مقصد بہرحال وہی تھا جو ہونا چاہیئے تھا لیکن پانی کا یہ منبع بھی متبرک مقام بن گیا اور اس کے ساتھ ایک روایت جُڑ گئی کہ اس بند پر جو ایک چھوٹا سا مکان بنا ہوا ہے اس میں کسی زمانے میں بوعلی خاں بھٹی رہا کرتے تھے جب سے بولی بھٹیاری کا محل مشہور ہو گیا اس بند پر ہر سال اساڑھ کے مہینے میں پورنماشی کو پون پرچھیا کا میلہ ہوتا ہے اور برہمن اس میدان میں ایک جھنڈی کھڑی کر کے ہوا کا رخ دیکھتے ہیں اور اس سے

---

[1] واقعات دارالحکومت دہلی، جلد سوم (مطبوعہ ۱۹۱۹ء) صفحہ ۱۰۳۔

موسم کی بھلائی برائی معلوم کی جاتی تھی اور اس روز سے یہاں میلہ ہونے لگا۔

مضمون میں اس تتمہ کو شامل کرنے کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ فن تعمیر کے بعض نمونے ایسے ہیں جن کی تعمیر کے پیچھے مقصد عام افادیت تھا لیکن جن سے بعض ایسی روایات وابستہ ہوگئیں کہ یہ مقدس اور متبرک مقام بن گئے۔ مسلمانوں کی بنائی ہوئی عمارتیں ہندوؤں کا تیرتھ استھان بن جائیں یہ اسی فضا میں ممکن ہو سکتا تھا جہاں مماثلت کی گنجائش ہو۔ مسلمان عام افادیت کے خیال سے اگر بند اور پُل کی تعمیر کو فروغ دے رہے تھے تو ہندو اسی افادیت سے متاثر ہو کر ان مقامات کو تیرتھ استھان بنا رہے تھے۔ مماثلت کی تلاش کی یہ ایک مثال ہے۔

مآخذ:

۱۔ دی انڈین مسلمس: پروفیسر محمد مجیب، لندن۔ ۱۹۶۷ء

۲۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا: مرتب: وولزلے ہیگ، دہلی۔ ۱۹۶۵ء

۳۔ اسلامی فن تعمیر: ارنسٹ ٹا ڈہیام رچمنڈ، مترجم: سید مبارز الدین، دہلی۔ ۱۹۵۲ء

۴۔ اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں: جیمس فرگسن، مترجم: سید ہاشمی فرید آبادی، حیدر آباد۔ ۱۹۳۲ء

۵ اسلامک انفلوئنس آن انڈین سوسائٹی: پروفیسر محمد مجیب، دہلی۔ ۱۹۷۲ء

۶۔ ہندوستان کا گزیٹر، جلد دوم، تاریخ و تہذیب، مرتبہ: ڈاکٹر پی۔ این چوپڑا، دہلی، ۱۹۷۳ء، غیر مطبوعہ، اردو ترجمہ از غلام ربانی تاباں

۷۔ آثار الصنادید: سر سید احمد خاں، دہلی۔ ۱۹۶۵ء

۸۔ واقعات دار الحکومت دہلی: بشیر الدین احمد دہلوی، آگرہ۔ ۱۹۱۹ء

سید معین الدین احمد قادری

ماضی کے دیار

(۱)

ہاں دکھا دے اے تصوّر پھر وہ صبح وشام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو

راہی منزل کے قریب ہو تو مڑ کر دیکھنا اس کے لئے قدرتی ہے، ماضی کے نہاں خانے سے صف در صف اور قطار در قطار یادوں کے پرے کے پرے چشم تصوّر کے سامنے، ناچتے، تھرکتے، دھیمی چال سے، دبے پاؤں گذرتے رہتے ہیں۔ خلوت ہو کہ جلوت ہمہ وقت ہر لمحہ یہ انجمن برپا اور یہ مجلس گرم رہتی ہے، اشخاص، واقعات، مقامات، سطح ذہن پر اُبھر اُبھر کر سامنے آتے ہیں اور ایک کُہر آلود طلسم تصور کرشمہ کار رہتا ہے۔ سنہ وسال کے مرحلۂ آخر میں یادوں کی دنیا اور ماضی کے دیار کا دل و دماغ پر چھائے رہنا ناگزیر ہے۔

(۲)

وہ جو ایک لمبی شاہراہ شیر شاہ نے پشاور تک بنوائی تھی جس کو انگریزوں نے گرانڈ ٹرنک کا نام دیا اور جو ملک کی تقسیم کے ساتھ کٹ بٹ گئی، اس پر الہ آباد سے تقریباً چودہ میل مغرب شمال کی جانب ایک کچا راستہ دریائے گنگا کو جاتا ہے۔ اس راستے کی انتہا پر ایک پرانی لبستی ہے۔ اس کا نام اوجھنی ہے۔ یہ میرا مسقط

جناب سید معین الدین احمد قادری، سول لائنز، سلطان پور (یوپی)

راس اور وطن مالوف ہے۔ یہاں پہنیاں بلندیوں کا تعاقب کرتی نظر آتی ہیں۔ دریا کے کنارے ٹیلے ہیں دیو قامت، صدیوں سے سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ دور سامنے سنگرور ہے۔ کہتے ہیں بن باس کو جاتے ہوئے رامچندر جی کا مختصر قافلہ اسی گھاٹ سے پار اترا تھا اور رکی ہے۔ ڈاکٹر اعظم کریوی کا گاؤں جنھوں نے اس علاقے کے کسانوں کی سادہ، قناعت پسند، حرکت و عمل سے عبارت زندگی کا ہو بہو مرقع پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں سے اپنے گاؤں اور وہاں کے قدرتی ماحول ثبات دوام بخش دیا ہے۔ گاؤں کے پچھم ایک عید گاہ ہے، پختہ، شاندار، کشادہ اور پرفضا۔ خشت و سنگ میں بنانے والے کے ذہن و ظرف کی وسعت اور بلندی کی پائیدار اور پائندہ یادگار۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

گاؤں والے اس مسجد کے بانی کا کچھ عجیب سا نام بتلاتے ہیں۔ مقامی آدمی نہ تھے سلطنت اودھ میں اثر و اقتدار رکھتے تھے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے آس پاس کے دیہات و قریات میں ایسی کئی عمارتیں بنوائی تھیں جو ان کے عسیر التلفظ نام سے منسوب ان کی یادگار ہیں۔ اس مسجد کی محرابوں میں بے شمار نام اور بہت پرانی تاریخیں قلم یا پنسل سے لکھی ہیں، کسی صاحب جاہ کی وزیٹرس بک پر اتنے دستخط نہ ہوں گے، یہ شاید اس عمارت کی پائیداری اور پائندگی کے سہارے زندہ رہنے کا جذبہ تھا یا پھر یہ خواہش کہ بعد میں آنے والوں کو اپنے شرف سیاحت سے مشرف ہونے کی خبر دیں۔ اس مسجد کے شمال مشرق لکھاوری اینٹوں اور پتھر کے چوکھٹ کا ایک دروازہ ہے اس کے پیچھے بہت پرانی پختہ قبریں، چوکھٹ سے متصل ہی میرے جد امجد کی قبر ہے جس کے آثار و نشان بھی اب مٹ چکے ہیں۔ اپنی وصیت کے مطابق وہ یہاں مدفون ہوئے، نہ جاننے والے اس

سے گذرتے ہیں۔ یہی ان کی خواہش تھی۔ معلوم نہیں یا مال ہونے کی یہ خواہش عقیدت کا مظاہرہ تھی یا والہانہ افتاد طبع کا نتیجہ۔ حاجی محمد اکرام صاحب سکندر لودی کے زمانے میں یہاں آکر فروکش ہوتے تھے۔ ان کا خاندان اس مقام سے مشرق ایک ٹیلے پر آباد تھا، پہلے چار گھر تھے اب ایک رہ گیا ہے۔ سید محمد عاقل صاحب مرحوم الہ آباد کے نامور ایڈوکیٹ کا۔ وہ بھی سیل حوادث کی رہ گذر میں ہے۔ حاجی صاحب مرد آفاقی تھے۔ ساری انسانیت کو خدا کا کنبہ سمجھتے تھے۔ انسانیت ان کے نزدیک ایک ایسی قدر مشترک تھی جو ذات، برادری، نسل، رنگ، عقیدہ و مسلک کے اختلاف کے باوجود رشتۂ الفت کو استوار اور بہی خواہی کے جذبے کو مستحکم اور کارفرما رکھتی ہے۔ مغلوں کے عہد میں کچھ معافی اراضی عطا ہوئی تھی، انگریزوں کے زمانے میں اس کی توثیق نہ ہوسکی۔ فرنگی کے سامنے دست سوال دراز کرنا درویشانہ غیرت وحمیت کے لئے عار تھا۔

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصاب زر و سیم

غوث پور، تاج پور، قیام الدین پور، آس پاس کی چھوٹی چھوٹی بستیاں اسی خاندان کے بزرگوں کے نام سے موسوم ہیں۔ یہاں بڑی آبادی اہیروں کی ہے۔ یہی یہاں کے قدیم ترین باشندے ہیں۔ کم وبیش ان ہی کے برابر ان لوگوں کی جو اس علاقے میں گدّی کہلاتے ہیں، کچھ تھوڑے ہی وہ لوگ جو "ترکیہ" کہلاتے ہیں مسلمانوں کے عہد میں آکر بس گئے ہوں گے۔ دریا کے کنارے دور تک ان کی آبادیاں ہیں۔ عام طور پر زراعت پیشہ ہیں۔

زندگی اور ذوق دونوں میں تبدیلی کا نتیجہ تھا کہ یہاں کے خانوادہ سیادت سے سلسلۂ ارادت ختم ہوا۔ دنیاداری نے درویشی کی جگہ لی۔ شاہ محمد یحییٰ صاحب اور شاہ محمد مدثّر صاحب تک سلسلہ چلتا رہا۔ ان کے بعد جب ان کے اخلاف تلاش معاش میں نکلے تو انھوں نے دیانت داری سے بساط تقدیس لپیٹ دی۔

شاہ محمد یحییٰ صاحب اردو فارسی اور ہندی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کے پوتے سید محمد رفیق صاحب صدر شعبۂ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی نے اپنے تبحر علمی اور وسیع و عمیق مطالعے سے فی الحقیقت اپنے اجداد کی علمی روایت کو تسلسل بخشا ہے۔ علم و تحقیق کے جو در اُن پر وا ہوئے اس میں بزرگوں کے فیض اور توارث کو بھی دخل ہے۔

(۳)

۱۹۳۹ء کا زمانہ تھا جب میں حیدر آباد وارد ہوا۔ میرا قیام مرحوم و مغفور مولانا عبدالقدیر صاحب بدایونی مفتی عدالت عالیہ حیدر آباد کے یہاں لال ٹیکری پر تھا، وہاں سے قریب ہی ملے پلی میں آرائش بلڈ کے مکانات ہیں۔ ان ہی میں سے ایک میں علامہ (حیرت بدایونی مرحوم) رہتے تھے اور اس سے کچھ آگے فانی صاحب۔ حیرت صاحب بڑے باغ و بہار انسان تھے۔ ظرافت اور بذلہ سنجی مزاج میں تھی۔ چبھتے فقروں سے وہ ہر ملنے والے کی تواضع کرتے تھے۔ بہت پرگو، بڑے زود گو شاعر تھے۔ ان کا اردو فارسی کلام ان کے لقب کے شایان شان ہے۔ ۱۹۶۸ء میں ان سے آخری بار ملاقات ہوئی۔ مجھے یقین نہ تھا کہ پہچانیں گے۔ ملنے گیا۔ اطلاع پر باہر نکلے اور نکلتے ہی نام لے کر انھوں نے میری پیرانہ سالی پر فقرہ چسپت کر دیا۔ وہ تب بھی ویسے ہی تھے جیسے ۱۹۳۹ء میں۔

فانی صاحب کے مکان کے سامنے جو میدان تھا۔ اس کو اب فانی میدان کہتے ہیں۔ زبانِ خلق نے شاید اس کو یہ نام دیدیا ہے۔ میں نے فانی صاحب کو پہلی بار مفتی صاحب کے یہاں ایک دعوت میں دیکھا۔ ان کی شخصیت میں ان کی شاعری کا سارا رنگ و آہنگ تھا۔ شعر پڑھنے کے انداز میں اور گفتگو میں، نشست و برخاست میں خود شناسی، خود نگری اور بے نیازی کی جھلک تھی۔ یہاں تک کہ تحسین و آفریں کا جواب دینے میں بھی ان کا رکھ رکھاؤ اور ان کی انفرادیت نمایاں تھی۔ تابش دہلوی ان کے رنگ میں شعر بھی کہتے تھے اور ان ہی کی لے

میں پڑھتے بھی تھے مگر وہ بات کہاں۔ فانی صاحب شعر پڑھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا آسیائے چرخ ان کی ہستی کو سرمہ بنا دینے کی ہر کوشش میں ناکام رہ گئی ہے۔

شعر کی داد دینے میں ان کا اور مولانا حسرت موہانی کا مسلک ایک دوسرے کی ضد تھا۔ فانی صاحب ہر شعر کی داد نہ دیتے تھے۔ وہ اس کو شعر کی حرمت اور سخن فہم سامع کی سکرمت کے منافی جانتے تھے۔ مولانا ہر شاعر کو ہر شعر کی داد دیتے تھے۔ یہ اچھا ہے، یہ بھی اور آخر میں سب اچھے۔ ظاہر ہے کہ یہ انداز خُرد نوازی اور ہمت افزائی تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا شعر و فن کے مبصر نہ تھے۔

بیوی کی علالت، بیٹوں کی جہالت اور زمانے کی ناقدری نے اس دور میں فانی کو ابتلا و آزمائش، کوفت اور کاہش کا ہدف بنائے رکھا۔ مہاراجا سرکشن پرشاد مدار المہام ریاست کی زندگی تک وہ معاش و مآل سے بے فکر و بے نیاز رہے اس کے بعد انھیں غمِ تنہائی نانڈیڑ سے بھی واسطہ پڑا اور عنقیم اور سکول دشمن ہنگامہ زا، ہنر ناشناس درباری زندگی سے بھی۔ اس زندگی کا کرب ان کے چہرے پر دیکھا جا سکتا تھا۔ اس زندگی کو وہ موت کے مترادف سمجھتے تھے۔

فانی کی زندگی بھی کیا زندگی ہے یارب
موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہیئے تھا

وہ منظر حافظے میں ثبت ہوکر رہ گیا ہے۔ بھوپال کے مشاعرے سے ان کی واپسی کی اطلاع ملی، یہ ریڈیو سے معلوم ہوچکا تھا کہ ناسازیِ مزاج کے سبب وہ خود اپنی غزل نہ پڑھ سکے تھے۔ ان کی غزل جگر مرادآبادی مرحوم نے پڑھی تھی۔ بعد مغرب میں اور ہادی قادری بدایونی مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوتے۔ فانی صاحب تنہا تھے، گھر کے اندرونی دالان میں۔ زمین پر چٹائی بچھی تھی اس پر بیٹھے تھے۔ پست اور نحیف آواز میں مشاعرے کا تذکرہ کرتے رہے۔ علالت کے

ذکر کو انھوں نے ایسے ٹالا جیسے اس کی کوئی اہمیت نہ تھی، لالٹین کی دھندلی روشنی میں ان کا ہیولیٰ یادوں کے دوش پر کبھی چشم تصور کے سامنے آتا ہے تو دل لرز جاتا ہے اور ابنائے روزگار کی بےحسی اور شعر وفن کی ناقدری پر دل خون ہوتا ہے۔
دوسرے ہی دن صبح معلوم ہوا کہ فانؔی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ فی الحقیقت شب گزشتہ ان کے لئے موت سے راز ونیاز کی رات تھی۔

مرگ فانؔی قریب ہے شاید
موت سے ہو رہے ہیں راز ونیاز

وجدانیات ان کا آخری مختصر مجموعۂ کلام تھا۔ اس کی قیمت ایک روپیہ تھی۔ یہ مجموعۂ کلام کی قیمت بھی تھی، فانؔی کے فکر وفن کی بھی اور ان کی خودداری، المناک اور مرقع عبرت زندگی کی بھی۔

(۴)

الہ آباد سے حیدر آباد اور حیدر آباد سے سلطانپور، ذہنی اور جسمانی اعتبار سے ایک لمبا سفر ہے جس کی داستان دراز ہے اور یادوں کے ہجوم میں انتخاب و امتیاز آسان نہیں اور ایسے حال میں کہ ایک غم تازہ کی کسک اور ایک مخلص کی یاد دل ودماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ یہ ۱۹۴۳ء تھا۔ اس زمانے میں یہاں وقار عظیم صاحب مرحوم کے چھوٹے بھائی اقبال عظیم صاحب تھے۔ عزیز الدین صاحب سالکؔ تھے، محی الدین صاحب شوقیؔ تھے۔ یہ تینوں میرے ہم پیشہ تھے اور شاعر تھے۔ ان کے علاوہ مجرؔوح صاحب تھے، جرّاح تھے، جُدر اج بلی علیش تھے۔

مجرؔوح صاحب بابو ایوب خاں مرحوم کے یہاں رہتے تھے۔ یہ مکان گنگبیو کی کوٹھی کہلاتا ہے۔ یہاں شام میں شیخ محمد یٰسین صاحب مرحوم وکیل، میرے ایک بزرگ سید ممتاز الدین صاحب (وہ بھی وکیل تھے)، کچھ اور ہم مشرب اور ہم ذوق لوگوں کی نشست ہوتی تھی۔ ارباب صدق وصفا

ہر شام لازمی طور پر یہاں یکجا ہوتے ۔ باتیں ہوتیں، مباحثے رہتے، مشاعرے ہوتے ۔ بڑی رونق بہت چہل پہل رہتی ۔ مجروح صاحب کی اس دور کی شاعری کے ذکر کا یہ محل نہیں ۔ وہ ان کے تذکرہ نگار یا خود ان کی خودنوشت سوانح عمری کا موضوع ہوسکتی ہے ۔ جرّاح کے تخلص ہی سے ظاہر ہے کہ وہ طنز و مزاح کے شاعر تھے ۔ مشہور تھا کہ تخلص ان کو کسی نے نذر کیا ہے اور شاعری بھی از قسم عطیات ہے ۔ حقیقت جو کچھ بھی ہو ان کے کلام میں طنز و مزاح کا اچھا امتزاج تھا ۔

شیخ محمد یٰسین صاحب سے میرے بزرگوں کے قریبی تعلقات تھے ۔ وہ میرے لئے جانی پہچانی شخصیت تھے لیکن فی الحقیقت ان کی معرفت مجھے پہلی بار تب نصیب ہوئی جب وہ میونسپل الیکشن میں امیدوار ہوتے ۔ میں نے نہ ان کو ووٹ دیا نہ ان کے حریف مقابل کو ۔ دیرینہ تعلقات کا تقاضا تھا کہ ان کو تکدر ہوتا ۔ نہ وہ مکدر ہوتے نہ ان کے برتاؤ میں فرق آیا ۔ وہ خود اظہار رائے میں بے باک تھے ۔ اس لئے دوسروں کی جانب سے اس کا مظاہرہ ہو تو وہ تحمل و برداشت کے ساتھ اُن کی بات سنتے تھے ۔ گنگیو کی کوٹھی کی بزم شب جو برسوں برپا رہی اس نے ان کو شام گھر پر نہ گذارنے کا عادی بنا دیا تھا ۔ یہ عادت تمام زندگی قائم رہی ۔

بڑے جامہ زیب تھے اور بہت جاذب توجہ شخصیت کے مالک تھے، زندگی کا بیشتر حصہ انھوں نے سرگرم سیاست میں گذارا ۔ ان کے تعلقات ہر عقیدہ و مسلک کے لوگوں سے نہایت خوشگوار تھے ۔ وہ اپنے سیاسی اور ذاتی مخالفوں سے بھی خندہ پیشانی سے ملتے ۔ اپنی بات کہنے میں تامّل نہ کرتے لیکن معقولیت کو ہاتھ سے نہ دیتے ۔ اور کوشش کرتے کہ گفتگو میں تلخی راہ نہ پائے ۔

وہ ایک مقبول شخصیت بھی تھے اور متنازع فیہ بھی ۔ مگر ان کو اصرار

تھا کہ ذاتی تعلقات کی بنیاد انسانیت دوستی، کشادگی ذہن اور روا داری پر ہونی چاہئے۔ اس کو وہ وضعداری کا تقاضا اور شرافت وشائستگی کی علامت جانتے تھے۔

کوئی سیاسی اور سماجی تحریک ایسی نہیں جس میں انھوں نے حصّہ نہ لیا ہو۔ ان کا جذبۂ خدمت خلق کسی بھی ہمت شکن مخالفت سے ہراساں اور مغلوب نہ ہوتا تھا۔ ہمیشہ کسی نہ کسی رفاہی کام کا منصوبہ بناتے رہتے اور اس کو روبہ عمل لانے کی سعی بھی کرتے۔ غربار کی امداد کے لئے "چٹکی" کی اسکیم ہو یا ہسپتال اور فساد زدگان کی امداد کے لئے چندہ، دینی تعلیم، زکوٰۃ کی تنظیم، علی گڑھ تحریک کی حمایت غرضکہ ہر موقع پر وہ سماجی خدمت کے لئے تیار رہتے اور انھوں نے ایسے کام بسا اوقات انتہائی ناسازگار ماحول میں کئے۔ آخری دنوں میں بھی جب وہ بلڈ پریشر کے مریض اور امراض قلب کا شکار تھے اور ان کی صحت مشقت ومحنت کی متحمل نہ تھی وہ ایسے کاموں میں تامل نہ کرتے تھے۔

آخر عمر میں کفایت شعاری ان کا موضوع خاص بن گئی تھی۔ ایسا نہیں کہ قلّت زر کے مسئلے سے دوچار رہے ہوں اور یہ اس کا نفسیاتی اثر رہا ہو۔ ان کی زندگی میں ضبط ونظم ہمیشہ سے تھا۔ وہ آمد وخرچ پر نگاہ رکھنے کے عادی تھے اور اس کے فوائد کا تجربہ رکھتے تھے۔ وہ قلّت کی نفسیاتی فضا بنائے رکھنے کو مصلحت، مآل اندیشی اور دوربینی سمجھتے تھے اور اس کی تبلیغ ہر کسی کو کرتے تھے۔ وہ مدعی تھے کہ خرچ کے سلسلے میں وہ سختی کی حد تک محتاط ہیں لیکن یہ ساری احتیاط اپنی ذات کے مصارف کی حد تک تھی ــــ چھوٹا بڑا کوئی امداد کا خواہاں ہو وہ انکار نہ کرسکتے تھے۔ انھوں نے قرضداروں کو کئی زمرے میں تقسیم کر رکھا تھا۔ وہ جو قرض لیں اور ادا نہ کرنے کی پوری استطاعت رکھتے ہوں۔ مالی اعتبار سے کمزور لوگ جو بہ وقت رقم واپس

سکیں۔ وہ جنھیں قرضِ دیتے وقت ہی وہ جانتے تھے کہ یہ رقم واپس نہ ہوگی۔
ی استطاعت لوگوں نے بھی ان کے ساتھ گھپلا کیا۔ انھیں تلخ تجربات ہوئے
لکن پیسے کے معاملے میں سخت ہونے کے اپنے ادعا کے باوجود آخر وقت تک
ھوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ان کی موت نے کم ازکم اس دنیا میں بہتوں
، نادہندگی پر پردہ ڈال دیا۔ فرشتے نامۂ اعمال میں لکھ دیں لیکن مجھے شبہ
ہے کہ وکیل صاحب آخرت میں ان سے مطالبہ کریں گے۔

صاف ستھرے بے داغ کھدّر کے لباس سے ڈھکا ہوا لاغر جسم، سرخ و
سفید پرگوشت منبسم چہرہ، لاغری کی تردید اور ذہانت، فراغت اور طمانیت
، گواہی دیتا ہوا، آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہر شام وہ میرے یہاں آتے،
ھوڑی دیر بیٹھتے، پھر چل پڑتے۔ ہم دونوں کچھ دیر ٹہلتے اس کے بعد ظہیر صاحب
ے یہاں اردو سروس سے خبریں سُن کر گھر واپس ہوتے۔ ۱۹۷۳ء سے جب
ں ملازمت سے سبکدوش ہو کر آگیا، یہ روزانہ کا معمول تھا۔ ۲۰ ستمبر
۱۹۷ء کی شام کو ان کو آنے میں دیر ہوئی۔ میں پان لئے نکلا۔ یقین تھا
ہ میں کہیں نہ کہیں آتے ملیں گے۔ گھر کے باہر ہی خبر ملی "وکیل صاحب" کا
نتقال ہوگیا۔ ۲۰ سال کی پرانی رفاقت ایک لمحے میں دائمی مفارقت سے
ل گئی۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

میر مشتاق احمد

ڈاکٹر ذاکر حسین (مرحوم)

ذکرِ ذاکر حسین ہے لب پر
ذکرِ خیر اُن کا فرض ہے سب پر
دردِ انساں کو جانتے تھے وہ
سب کو اپنا ہی مانتے تھے وہ
آدمیت کے تھے علمبردار
اُن کے اوصاف کا نہیں ہے شمار
علم و عرفاں کی ایک مشعل تھے
سچ تو یہ ہے کہ مردِ کامل تھے
جامعہ یادگار ہے اُن کی
جاودانی بہار ہے اُن کی
اُن کے علم و عمل کا کیا کہنا
اب کہاں کوئی اور اُن کا سا
وہ تھا حاصل حسین قدروں کا
اس لئے بار بار ذکر کیا
ہستی بے مثال تھی اے میرؔ
حاصلِ صد کمال تھی اے میرؔ

ڈاکٹر سید محمد عزیز الدین حسین

اُستاد قمر جلالوی پر ایک نظر

سید محمد حسین نام اور تخلص قمر تھا۔ اور اپنے ہم عصر شعراء میں استاد کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ ۱۸۸۷ء میں قصبہ جلالی، ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے مادر وطن کی طرف نسبت کرتے ہوئے قمر جلالوی کے نام سے دنیائے اردو ادب میں مشہور ہوئے۔ قصبہ جلالی ایک تاریخی مقام ہے جہاں سلطان غیاث الدین بلبن نے ایک قلعہ تعمیر کرایا اور آج جامع مسجد جلالی سلطان بلبن کی یادگار کی شکل میں موجود ہے۔ دور وسطی کا سیاح ابن بطوطہ بھی جلالی گیا۔ سلطنت اودھ کے عروج کے بعد نواب شجاع الدولہ بھی جلالی گئے آپ نے سید خیرات علی شاہ کے امام باڑہ کے لئے پانچ گاؤں دیئے۔ سادات جلالی میر سید علی ہمدانی کی نسل سے ہیں۔ استاد قمر جلالوی بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ قمر جلالوی کے دادا سید نجیب علی برطانوی عہد حکومت میں رسالدار میجر کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی خدمات کے سلسلے میں کافی جائداد ملی جو بعد میں زمینداری میں تبدیل ہو گئی۔

قمر جلالوی کو شاعری اور علم و ادب ورثے میں ملے تھے، اس وقت جلالی ممتاز اصحاب علم اور شعراء کا مرکز تھا۔ کافی تعداد میں کتب خانے تھے جن میں مختلف علوم و فنون پر نادر اور نایاب کتابیں موجود تھیں۔ خود قمر جلالوی کے

ڈاکٹر سید محمد عزیز الدین حسین، لکچرر تاریخ، جامعہ ملیہ اسلامیہ

والد سید غلام سجاد حسین بھی شاعر تھے، لیکن تقسیم ہندوستان سے اس گہوارۂ علم و ادب کو بڑا نقصان پہونچا، علمی و ادبی ماحول ختم ہوگیا اور کتب خانے اُجڑ گئے اور قیمتی کتابیں ردّی میں بیچ دی گئیں۔

۱۸۹۵ء میں، جب قمر جلالوی کی عمر صرف ۸ سال تھی، شعر کہنا شروع کیا اور ۲۴ سال کی عمر میں، انھیں اتنی شہرت حاصل ہوگئی تھی کہ ضلع علی گڑھ کے نوجوان شعراء ان سے اصلاح لینے لگے تھے، مگر وہ خود اپنی شاعری سے پوری طرح مطمئن نہیں تھے، اس لیے اس زمانے کے مشہور اور جید شاعر آمیر مینائی کی شاگردی اختیار کی اور بطور نذرانہ حسب ذیل قطعہ استاد کی خدمت میں پیش کیا:

ازل سے معتقدِ حضرت آمیر ہوں میں
اسی لیے تو قمر اب فقیر ہوں میں
زرِ قلیل نہیں ہوں کہ دیکھ لے دنیا
جو دفن رہتی ہے وہ دولتِ کثیر ہوں میں

معاش کے سلسلے میں مرحوم نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں، مگر وطن میں کوئی معقول انتظام نہ ہوسکا تو مجبوراً مع اہل و عیال کے ۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان چلے گئے، مگر وہاں بھی اطمینان نصیب نہ ہوا اور کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، چنانچہ ان کی شاعری میں غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم روزگار کا ذکر بھی جگہ جگہ ملے گا۔ لیکن زندگی کی تمام مشکلوں اور پریشانیوں کے باوجود طویل عمر ملی اور ۸۱ سال کی عمر میں ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو یرقان کی بیماری میں کراچی میں انتقال کیا۔

مرحوم کی زندگی میں تو ان کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہوسکا، البتہ وفات کے بعد کراچی سے مختلف مجموعے شائع ہوئے ہیں: رشکِ قمر، اوجِ قمر، غم جاوداں اور عقیدتِ جاوداں۔ افسوس کہ اب تک اس عظیم اور مقبول شاعر پر کسی نے

تحقیقی کام نہیں کیا ہے، حالانکہ مرحوم نے بڑا قابل قدر شعری سرمایہ چھوڑا ہے۔
مرحوم کی شاعری کو سمجھنے اور محظوظ ہونے کے لیے ذیل میں ایک مختصر انتخاب پیش کیا جاتا ہے:

ہزار عیش قفس میں سہی وہ بات کہاں
کہ اپنا گھر ہوا کرتا ہے اپنا گھر پھر بھی

خزاں نے آکے چمن میں وہ تفرقہ ڈالا
کہ مدّتوں مجھے صیّاد و باغباں نہ ملے

نہ کرنا رہا چاہے صیّاد لیکن
تسلّی تو تھی باغ میں آشیاں ہے

افسوس ہے یہی مجھے فصل بہار میں
میرا چمن ہوا اور مجھی کو نہ گھر ملے

ہمارے کارواں کو پیش ایسی رہ گزار آئی
نہ رہبر سازگار آئے نہ منزل سازگار آئی
ہزاروں ہو گئے بے آشیانہ آشیاں والے
بہار آئی مگر بربادیاں لے کر بہار آئی
بس اب اے ناخدا طوفاں میں ہم کو ڈوب جانے دے
وہ روتے ہیں جنھیں کشتی کنارے پر اتار آئی

چمن میں جانا تو صیّاد دیکھ بھال آنا
اکیلا چھوڑ کے آیا ہوں آشیانے کو

ہم سے یہ سُن کر کہ اس گلشن سے بہتر تھا قفس
باغباں دینے لگا طعنے رہا کیوں ہو گئے

ہنسے ہیں گل نہ کلی کوئی مسکرائی ہے
حضور کیسے یہ کہہ دوں بہار آئی ہے
اسیر کیا کہیں صیّاد یہ تو سمجھا دے
قفس میں بوئے چمن پوچھنے کو آئی ہے

ہمارا غم نہ کریں سوچ کر یہ اہلِ وطن
بہت سے پھول چمن سے نکل بھی جاتے ہیں

مل گیا گلشن میں گھر اور قید کی مدت بھی ختم
اب قفس سے چھوٹنے والا بڑی مشکل میں ہے

خوب صیّاد ستا، جور کر ، ایذا پہنچا
اب تو تقدیر ترے دام میں لے آئی ہے

اسیر چُپ ہیں تو صیّاد یہ سمجھتا ہے
قفس میں اہلِ چمن کی بدل گئی بو باس

ہر انقلاب نہیں آدمی کے لئے
کبھی کسی کے لئے ہے کبھی کسی کے لئے

دعا بہار کی مانگی تو اتنے پھول کھلے
کہیں جگہ نہ رہی میرے آشیانے کو

اے اہل قفس یہ کیوں فغاں ہے
میرا بھی چمن میں آشیاں ہے

دہائی ہے تری تو لے خبر او لامکاں والے
چمن میں رو رہے ہیں آشیاں کو آشیاں والے

خوشی میں آئے تھے اہل وطن سے مل مل کے
کسے خبر تھی کہ یہ راستے ہیں مشکل کے
جواب دے گئے پاؤں یہ کوئی بات نہیں
سوال یہ ہے کہ گھر کے رہے نہ منزل کے

چمن کو چھوڑ کر صحرا میں جا بیٹھا ہے دیوانہ
گلستاں کے نہ کام آئی کہ مٹی تھی بیاباں کی

قمرؔ زوال پہ اپنے بھی چھوٹ جاتے ہیں
چھپا نہ تھا تو شعاعیں تھیں آفتاب کے پاس

عبداللطیف اعظمی

تعارف و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

پاکستانی اہلِ قلم کی ڈائرکٹری   نگران اعلیٰ: مسیح الدین احمد صدیقی

مرتبہ: فرید احمد۔ حسن عباس رضا۔ سرور اعوان۔ سرور سلطان

بڑا سائز، حجم ۴۹۶ صفحات، مجلد مع گردپوش، قیمت درج نہیں، سال اشاعت: ۱۹۷۹ء۔ ناشر: اکادمی ادبیات پاکستان۔ اسلام آباد

اردو زبان و ادب اور اردو ادیب و شاعر کی بہت سی بدقسمتیاں ہیں، جن میں سے دو ایسی ہیں جو بہت زیادہ محسوس ہوتی ہیں اور اکثر ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اردو ادب کی کوئی مکمل اور دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق تاریخ نہیں ہے اور دوسری اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی کوئی مکمل ڈائرکٹری یا ہوز ہو نہیں ہے۔ یہاں ساہتیہ اکیڈمی نے ۱۹۶۱ء میں انگریزی میں ایک ہوز ہو شائع کی تھی جس میں ہندوستان کی تمام مصدقہ زبانوں کے ادیب و شاعر کے نام شامل ہیں، مگر عرصہ ہوا ختم ہوگئی ہے اور دوسرا ایڈیشن ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے، کچھ لوگوں نے اردو ادیبوں اور شاعروں کی ڈائرکٹری یا ہوز ہو مرتب کرنے کی کوشش کی تھی مگر انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ مجھے خوشی ہے کہ پاکستان نے پہل کی اور اپنے ادیبوں اور شاعروں کی ڈائرکٹری شائع کرکے اس نے ایک اہم ضرورت پوری کردی۔

ڈائرکٹری کی اشاعت پر مجھے خاص طور پر اس لیے خوشی ہوئی کہ ابھی حال میں، میں نے اردو ادیبوں اور دانشوروں کی وفات پر تعزیتی نوٹ (وفیات)

لکھنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، جس میں ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے متوفی ادیبوں کا ذکر ہوتا ہے، ہندوستان کے ادیبوں کے بارے میں تو ضروری معلومات کسی نہ کسی طرح مل جاتی ہیں، مگر سب سے زیادہ دشواری پاکستانی ادیبوں کے بارے میں پیش آتی ہے، اس ڈائرکٹری کی اشاعت سے یہ دقت بڑی حد تک دور ہو گئی۔

اس ڈائرکٹری کے نگراں اعلیٰ جناب مسیح الدین احمد صدیقی صاحب نے مختصر پیش لفظ میں لکھا ہے کہ: "اہل قلم کے کوائف حاصل کرنے کے لیے ہم نے ہر جتن کر ڈالا، فرداً فرداً رابطے کے علاوہ خطوط بھی لکھے۔ حتیٰ کہ ملک کے تقریباً تمام اخبارات میں کئی دفعہ اشتہارات بھی دئے، اس کے باوجود ہمیں احساس ہے کہ ڈائرکٹری میں ابھی بڑی کوتاہیاں آپ کو نظر آئیں گی، لیکن ہم یہ عہد کر چکے ہیں کہ رفتہ رفتہ نئی ڈائرکٹری کی ترتیب تک یہ کوتاہیاں بڑی حد تک دور کر دی جائیں گی۔" چونکہ اس ڈائرکٹری کی خامیاں اگلے ایڈیشن میں دور کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے، اس لیے مجھے جو خامیاں نظر آئی ہیں، انھیں ذیل میں لکھتا ہوں، امید کہ مرتبین اس پر غور فرمائیں گے۔

ا۔ مجھے سب سے بڑی اور اہم خامی یہ محسوس ہوئی کہ بہت سے اہم اور مشہور ادیبوں کے نام اس میں شامل نہیں ہیں۔ پچھلے چند مہینوں میں جن پاکستانی ادیبوں کے انتقال کی اطلاع ملی ہے، ان میں سے حسب ذیل نام مجھے نہیں ملے:

(۱) سید نذیر نیازی (انتقال: ۲۷ جنوری) (۲) سید عبدالاحد آثر جلیلی (۷ اپریل) (۳) الطاف مشہدی (۲۴ جون) (۴) شاہ حسن عطا (۶ جولائی) (۵) شفیق بریلوی (۲۲ جولائی)

مجھے یقین ہے کہ اس خامی کی ذمہ داری فاضل مرتبین پر نہیں ہے، عام طور پر اردو کے ادیب و شاعر، بار بار کی یاد دہانیوں کے باوجود خانہ پری کر کے

وقت پر فارم نہیں بھیجتے، لیکن اگر ڈائرکٹری کو مکمل کرنا ہے تو کوئی نہ کوئی ایسی صورت ضرور نکالنی چاہیئے کہ کم از کم ممتاز ادیبوں اور شاعروں کے نام ضرور شامل ہو جائیں۔

۲۔ اس ڈائرکٹری میں جائے پیدائش درج نہیں، حالانکہ اس کی اہمیت قریب قریب وہی ہے جو تاریخ پیدائش کی ہے۔

۳۔ "سنہ" کی جگہ "سن" درج ہے جو صحیح نہیں ہے، بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے "قواعد اردو" میں لکھا ہے کہ "سنہ" کو "سن" لکھنا جائز نہیں ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ لفظ "سن" سے ممیز کرنے کے لیے سنہ ہی لکھنا مناسب ہے۔

۴۔ ناموں کے اندراج اور ترتیب میں نام کے اصل جزو اور تخلص کو پہلے لکھنا چاہیئے، مگر عام طور پر اس اصول پر عمل نہیں کیا گیا۔ مثلاً شیخ، سید، محمد اور عبدل نام کے اصل جزو نہیں ہوتے، مگر کہیں اس پر عمل کیا گیا ہے اور کہیں نہیں۔ جیسے جبار مرزا۔ عبدالجبار مرزا (صفحہ ۱۱۴) جمیل ملک۔ عبدالجمیل ملک (صفحہ ۱۱۹) یہ صحیح ہیں، مگر عبدالکافی ادیب (۳۰۶) عبدالکریم ثمر (ایضاً) عبدالکریم قدسی (ایضاً) صحیح نہیں ہیں، ان دونوں ناموں کے "صنف ادب" میں شاعری بھی درج ہے، اس لیے غالباً "ثمر" اور "قدسی" تخلص ہیں، اگر یہ قیاس صحیح ہے تو اس لحاظ سے ان دونوں ناموں کا اندراج ہونا چاہیئے تھا، ورنہ "عبدل" کے بجائے "کافی" اور "کریم" میں اندراج کرنا چاہیئے تھا۔ ایک نام غالباً یوں ہے: ڈاکٹر شیخ محمد سلیمان، اس کا اندراج یوں ہے اور بالکل صحیح ہے: سلیمان شیخ۔ ڈاکٹر محمد سلیمان۔ (۲۱۹) مگر سید محمد تقی (۲۲۷) کا اندراج "تقی" میں، سید مسعود ہاشمی (۲۲۸) کا "مسعود" میں اور سید یوسف بخاری (۲۲۹) کا "یوسف" میں ہونا چاہیئے تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

۵۔ شعراء کے تخلص پر نشان کر دیا جاتا ہے، یہ طریقہ زمانۂ قدیم سے اب تک رائج ہے، لیکن زیر تبصرہ ڈائرکٹری میں اس طریقے پر عمل نہیں کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے یقینی طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ نام کا کون سا جزو تخلص ہے، اس لیے آئندہ اس کا خیال رکھا جائے تو بہت اچھا ہوگا۔

آخر میں ایک تجویز پیش کرنی چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اگر کم از کم ممتاز اور مشہور ادیبوں اور دانشوروں کی تصویریں بھی ہوتیں تو اس کی افادیت میں اور اضافہ ہو جاتا، میں جانتا ہوں کہ اس کی وجہ سے کام میں بھی اضافہ ہو جائے گا اور اسی کے ساتھ دقتوں میں بھی اور ڈائرکٹری کی ضخامت میں بھی، اسی خیال سے میں نے اپنی گذارش کو ممتاز اور مشہور ادیبوں تک محدود رکھا ہے، ورنہ اگر سبھی کی تصویریں ہوں تو کیا کہنا ہے۔

بہرحال، ان گذارشوں سے قطع نظر جو خامیوں کی وضاحت کے سلسلے میں لکھی گئی ہیں، اس میں کلام نہیں کہ زیر تبصرہ ڈائرکٹری ہر لحاظ سے بہت مفید ہے اور اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے اردو کی ایک اہم ضرورت اور کمی کو پورا کر کے اردو کے سرمایے میں قیمتی اضافہ کیا۔

اقبال ـــ جادوگرے ہندی نژاد   از عتیق صدیقی

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم ۱۶۰ صفحات، مجلد، طباعت آف سٹ، قیمت: ۱۴ روپے، تاریخ طباعت: اگست ۱۹۸۰ء۔ ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵

اس کتاب کے مصنف عتیق صدیقی صاحب کو اردو کے مصنفین اور محققین میں ایک اونچا مقام حاصل ہے، اس سے پہلے انھوں نے جتنی کتابیں لکھی ہیں وہ معیار اور ضخامت دونوں لحاظ سے گراں قدر اور وزنی ہیں، مگر زیر تبصرہ کتاب ان کی تمام کتابوں میں بہت ہی مختصر اور منحنی سی ہے، ان کے مقابلے میں کتابچہ معلوم ہوتی ہے، نیز اس میں پچھلی کتابوں کی خصوصیات بھی نہیں ہیں۔

کتاب کے بارے میں فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ: "پچھلی پون صدی میں اقبال کی شاعری کے تقریباً تمام پہلوؤں پر جتنا لکھا گیا ہے، برصغیر ہند کے کسی شاعر کے بارے میں شاید ہی لکھا گیا ہو، لیکن اقبال کی سیاسی فکر اور ان کی سیاسی

زندگی کو براہ راست موضوعِ قلم بنانے سے نہ جانے کیوں گریز کیا گیا ہے، اسی خلا کو پُر کرنے کی نیت سے آگے آنے والے صفحات میں اقبال کی شاعری کی روشنی میں ان کے سیاسی افکار و اعمال کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔" (صفحہ ۷)

اس کتاب کا پس منظر یہ ہے کہ ماہنامہ جامعہ کے اقبال نمبر (بابت ماہ جنوری۔ مارچ ۱۹۷۸ء) میں عتیق صاحب کا ایک مختصر مضمون شائع ہوا تھا، جس کا عنوان ہے: "اقبال صدی اور اقبال ناشناسی"۔ اس میں انھوں نے شکایت کی ہے کہ: "اس موقع پر اقبال و اقبالیات کے موضوع پر جو کتابیں پاکستان و ہندوستان میں شائع کی گئیں، ان کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اقبال کے شعری مجموعے اور ان کے سیاسی و غیر سیاسی خطبات جس پیمانے پر تشریح و تجزیئے کے مستحق ہیں، اس کا حق ادا نہیں کیا جا سکا ہے۔ ضرورت تھی اور آج بھی ضرورت ہے کہ اقبال کے افکار کے نشوونما کی واضح تصویر پیش کی جاتی اور ان کے ذہنی رجحانات میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے محرکات کا پتہ لگایا جاتا۔" (صفحہ ۱۳۳) موصوف کو سب سے زیادہ شکایت یہ ہے کہ ان کتابوں میں اقبال کی "ہندوستانیت" کو کماحقہ، اجاگر نہیں کیا گیا ہے، انھوں نے دو مشہور ترقی پسند شاعر و ادیب، ایک پاکستانی اور ایک ہندوستانی، فیض احمد فیضؔ اور سردار جعفری کا خاص طور پر حوالہ دیا ہے۔ فیضؔ کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ "نقوش" کے اقبال نمبر حصہ دوم میں شائع ہوا تھا، عتیق صاحب کو شکایت ہے کہ اس میں "اقبال کی شاعری کے پہلے دور میں جو ۱۹۰۵ء پر ختم ہوتا ہے، "ہمالہ، ترانۂ ہندی، بچوں کا قومی گیت، نیا شوالہ اور تصویر درد جیسی نظموں کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا اور اس طرف ادنیٰ اشارہ کرنا بھی غیر ضروری سمجھا گیا کہ اقبال کے پہلے دور کی شاعری ہندوستانیت اور ہندوستان پرستی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔" (صفحہ ۱۳۴) سردار جعفری کا حسب ذیل اقتباس نقل کرنے کے بعد:

"اقبال مسلم بیداری کے شاعر تھے، اس میں ایشیائی بیداری

شامل ہے، اقبال ہندوستان کی بیداری کے شاعر تھے، اس
میں پوری تحریک آزادی شامل ہے اور اقبال انسانیت کی بیداری
کے شاعر تھے، اس میں اشتراکیت کی فتح اور کارل مارکس اور
لینن کے افکار کی عظمت شامل ہے ...۔"

عتیق صاحب لکھتے ہیں : "یہ عبارت الفاظ کا ایک طلسم ہے، ایک گورکھ دھندا ہے، جس میں قاری کا ذہن گم ہوکر رہ جاتا ہے، اقبال یہ بھی تھے، اقبال وہ بھی تھے، اقبال سب کچھ تھے۔ دوسرے الفاظ میں اقبال کچھ نہیں تھے۔" (صفحہ ۱۳۴)

عتیق صاحب نے سوچا اور بالکل صحیح سوچا کہ محض اعتراض کرنے سے کیا فائدہ، اس کمی کو پورا کرنے کے لیے خود لکھنا چاہیے، چنانچہ اقبالیات کی اسی خامی کو دور کرنے کے لیے قلم اٹھایا اور اس مختصر کتاب میں اقبال کی وہ تصویر پیش کی جو اُن کے نقطۂ نظر سے سچی اور صحیح ہے۔

فاضل مصنف نے اس مختصر کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال پکے ہندوستانی تھے، وہ لکھتے ہیں: "اقبال کی شاعری کا ایک نہایت اہم اور دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ پہلے دور کی جارحانہ وطن پرستی کو ترک کرنے کے بعد بھی ہندوستان کی دھرتی کے ساتھ اقبال کا لگاؤ باقی ہی نہیں رہا بلکہ آخری عمر میں اور بھی گہرا ہوگیا۔" (صفحہ ۲۰)، اسی طرح انھوں نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کمیونسٹ نہیں تو اشتراکی یقیناً تھے۔ لکھتے ہیں : "۱۹۰۳ء میں جب اقبال نے "علم الاقتصاد" لکھی تھی تو اس وقت ان کا ذہن سوشلزم کے اس تصور کو قبول کرچکا تھا جو انیسویں صدی کے وسط میں کارل مارکس نے ایک مکمل فلسفے کی شکل میں پیش کیا تھا۔" (صفحہ ۱۱۱) مزید فرماتے ہیں : "اقبال کو کمیونسٹ تو یقیناً نہیں کہا جاسکتا، لیکن ان کے سوشلسٹ ہونے سے انکار بھی ممکن نہیں۔" (صفحہ ۱۱۸) اسی طرح کے اس کتاب میں بہت سے ایسے دعوے ہیں، جنھیں ایک ایسے شخص کے لیے قبول کرنا مشکل ہے جس نے اقبال کی جملہ شاعری کا گہرا مطالعہ کیا ہو، جس کے سامنے

اقبال کی پوری زندگی اور اس کے کوائف بے کم و کاست ہوں اور جس کی ان کی شاعری کے ارتقا پر وسیع نظر ہو۔ عتیق صاحب نے رسالہ جامعہ کے مضمون میں ہندوستان اور پاکستان کے اقبال شناسوں سے جس طرح شکایت کی تھی کہ: "پاکستان میں اقبال کے ساتھ سب سے بڑا ظلم یہ کیا گیا کہ علامہ کی مسند سے انھیں حکیم الامت ہی نہیں بلکہ علیہ رحمتہ بنا کر بزرگان دین کی صف میں لا کھڑا کیا گیا، جن کے مناقب ہی بیان کئے جا سکتے ہیں... یہاں ہندوستان میں بھی... پاکستان ہی کا تتبع کرنے میں عافیت نظر آئی، اس لیے وہ بھی کوئی واضح راہ اختیار نہ کر سکے اور ان کی نگارشات بھی پریشاں خیالی کا شکار ہو گئیں۔" (صفحہ ۱۳۴) میرا خیال ہے کہ کچھ ایسی ہی شکایت زیر تبصرہ کتاب کے فاضل مصنف کے بارے میں بھی کی جا سکتی ہے، خاص طور سے آخری زیر خط فقرہ اس کتاب پر بڑی حد تک صادق آتا ہے۔ اگر عتیق صاحب کے مضمون کے "ردلیف و قافیہ" میں "اقبال شناسوں کی اقبال ناشناسی" کے عنوان سے کبھی کسی نے کچھ لکھا تو شاید زیر تبصرہ کتاب کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی جائے۔

اس مختصر کتاب کے بارے میں بہت کچھ لکھنے کی ضرورت تھی، مگر اس تبصرے میں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں، اس لیے اقبال کے ایک خط کے اقتباس پر ختم کیا جاتا ہے جو اگرچہ ۱۲ مارچ ۱۹۳۷ء کو پروفیسر آل احمد سرور صاحب کے کچھ سوالات کے جواب میں لکھا گیا تھا، مگر اس وقت کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اصل مخاطب زیر تبصرہ کتاب کے فاضل مصنف ہیں، خاص طور سے زیر خط فقرہ قابل غور ہے:

> "میرے نزدیک فاشزم، کمونزم یا زمانۂ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے، میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ہر نقطۂ نگاہ سے موجب نجات ہو سکتی ہے۔ میرے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائق اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے، اگر آپ پورے غور اور توجہ سے یہ مطالعہ کریں تو ممکن ہے کہ آپ انھیں نتائج تک پہنچیں

جن تک میں پہنچا ہوں ۔۔۔۔ یہ ممکن ہے کہ آپ کا VIEW مجھ سے مختلف ہو یا آپ خود دین اسلام کے حقائق کو ہی ناقص تصور کریں ۔ اس دوسری صورت میں دوستانہ بحث ہو سکتی ہے جس کا نتیجہ معلوم نہیں کیا ہو ۔"

"آپ ۔۔ لٹریچر کے اسالیب وبیان سے ۔۔ واقف ہیں ، تیمور کی روح کو اپیل کرنے سے تیموریت کو زندہ کرنا مقصود نہیں بلکہ وسطِ ایشیا کے ترکوں کو بیدار کرنا مقصود ہے ، تیمور کی طرف اشارہ محض اسلوب بیان ہے ، اسلوب بیان کو شاعر کا حقیقی VIEW تصور کرنا کسی طرح درست نہیں ، ایسے اسالیب کی مثالیں دنیا کے ہر لٹریچر میں موجود ہیں ۔"

(اقبال نامہ ۱۵ ۔ ۳۱۴)

ہر شاعر کا اپنا مخصوص انداز اور اسلوب ہوتا ہے ، اگر اس کے ذہن اور خیالات کو خلوص کے ساتھ سمجھنا ہو تو پہلے اس کے انداز اور طرز ادا کو سمجھنے کی ضرورت ہے ، پھر اس کی مجموعی زندگی کو ۔ اقبال کی شاعری میں بہت کچھ ہے ، لیکن اگر ان کے سیاسی خیالات کو سمجھنا ہو تو آخری دور کی شاعری کو خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیئے اور ان کے اشعار کی تفہیم وتعبیر میں ان کی عملی زندگی اور ان کے سیاسی بیانات اور تقریروں پر ضرور غور کرنا چاہیئے ، ورنہ صحیح نتیجے تک پہنچنا ممکن نہ ہوگا ۔ عتیق صاحب کو جن لوگوں کی اقبال شناسی پر اعتراض ہے ان میں سے بعض لوگوں نے یہی غلطی کی ہے اور خود عتیق صاحب بھی ۔۔۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر ۔۔۔ اسی کے مرتکب ہو گئے ۔

بہر حال اس لحاظ سے یہ کتاب دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے کہ اس کے مباحث ان کتابوں سے بالکل مختلف ہیں جو اقبال کے معتقدین ، بالخصوص پاکستان کے اقبال شناسوں نے لکھی ہیں ۔

سالانہ قیمت
۹ روپے

جامعہ

قیمت فی پرچہ
۷۵ پیسے

جلد ۷۸	بابت ماہ نومبر ۱۹۸۱ء	شمارہ ۱۱

فہرست مضامین

مجلس ادارت

پروفیسر محمد مجیب — پروفیسر مسعود حسین

ڈاکٹر سلامت اللہ — ضیاء الحسن فاروقی

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط وکتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: جمال پریس دہلی ۶ • ٹائیٹل: فائن پریس دہلی ۶

شذرات

۱۹۷۷ء میں جب جمہوریہ مصر کے صدر انور السادات یروشلم گئے تھے تو اسی وقت یہ بات ہمارے ذہن میں آئی تھی کہ انھوں نے یہ اقدام کرکے یقیناً اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ ۱۹۷۹ء میں ان کا یہ اقدام کیمپ ڈیوڈ معاہدہ پر منتج ہوا اور عربوں کی طرف سے اس کے خلاف جو شدید ردعمل ہوا اُس نے اِس خطرہ کو اور یقینی بنا دیا، اور آخر وہ ۶ر اکتوبر ۱۹۸۱ء کو ۱۹۷۳ء کی مصر۔ اسرائیل جنگ میں مصری افواج کے شاندار کارناموں کی یاد میں فوجی سلامی لیتے ہوئے، غالباً انھیں چند فوجی افسروں اور سپاہیوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے جنھوں نے ۱۹۷۳ء کی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ کیسا سبق آموز واقعہ ہے یہ! ۱۹۷۳ء میں جو اپنی قوم کا ہیرو تھا، چند برس بعد اُسی قوم نے اسے ہلاک کر ڈالا، پھر اس نے نہ تو ان کا سوگ منایا، نہ وہ اپنے گھروں سے نکل کر سڑکوں پر آئی، نہ بانار بند ہوئے، نہ ماتم و شیون کا کوئی اور منظر سامنے آیا، صدر ناصر کا انتقال ہوا تھا تو پوری مصری قوم گھروں سے باہر آگئی تھی اور جی بھر کر اس نے ان کا سوگ منایا تھا، حالاں کہ یہ انھیں کی عاقبت نا اندیشی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۶۷ء میں مصر کو اسرائیل کے ہاتھوں سخت ہزیمت و ذلت کا سامنا اور سینائی اور غزہ پٹی کے وسیع علاقے سے محروم ہونا پڑا تھا، اُدھر شام کو جولان کی پہاڑی اور اردن کو مغربی کنارے کے علاقے سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں صدر ناصر کے انتقال کے بعد جب انور السادات صدر بنے تو بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ مصر کو سنبھالنا ان کے بس کا کام نہیں ہے، ان کی صدارت بس ایک عارضی مدت کے لئے ہے، لیکن جلد ہی انھوں نے اپنی پوزیشن مستحکم کر لی، پھر انھوں نے "عروبہ" کے تصور کو خیرباد کہا، اور مصری قومیت اور اہل مصر کا مفاد ان کی توجہ کا مرکز بن گئے، انھوں نے ماسکو سے اپنا ناطہ توڑ لیا اور امریکہ سے مفاہمت ہی کو اپنا مقدر سمجھا کہ اسی میں انھیں مصر کی بھلائی نظر آئی، ان کا خیال تھا کہ امریکہ کی مدد سے ہی اسرائیل کے خلاف اس صف آرائی کا خاتمہ ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے مصر ہی کو ہمیشہ بھاری نقصان

اٹھانا پڑتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہی ان کی بڑی بھول تھی، مصر عرب دنیا سے منھ موڑ کر چین سے نہیں رہ سکتا، کوئی لیڈر اپنی قوم کی آرزوؤں اور تمناؤں کو، خواہ وہ قوم کتنی ہی نالائق کیوں نہ ہو، پامال کر کے لیڈر نہیں رہ سکتا، اور کبھی کبھی اسے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

انور السادات نے جب یہ محسوس کیا کہ اچھی اچھی باتیں کر کے سینائی کا کھویا ہوا علاقہ واپس نہیں لیا جا سکتا تو پھر انھیں امریکہ سے دوستی اور اسرائیل سے سمجھوتہ کرنے کے لیے یہ ثابت کرنا پڑا کہ اگر امریکی حکومت اسرائیل کی پشت پناہی نہ کرے تو اسرائیل کی فوجی قوت ناقابلِ تسخیر نہیں ہے، چنانچہ ۶ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو انھوں نے مصر کی افواج کو نہر سوئیز پار کرنے اور اسرائیلی دفاع کی بار لیولائن کے پرخچے اڑا دینے کا حکم دیا، اپنے اس منصوبے میں وہ کامیاب رہے اور یہی وہ چاہتے تھے، اس سے ایک طرف تو مصری افواج کے حوصلے بلند ہوئے اور دوسری طرف اسرائیل کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اگر صدر سادات کے صلح کے اقدامات کی قدر نہ کی گئی تو پھر جنگ ہوگی جس میں اسے شکست بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اسرائیل سے صلح کی جستجو میں وہ بہت دور چلے گئے اور پھر اس راہ میں انھوں نے عربوں کے جذبات و احساسات کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ ان کے یروشلم کے سفر اور کیمپ ڈیوڈ نے انھیں امن کا نوبل پرائز تو دلا دیا، لیکن وہ عرب قوم اور خود اپنی قوم کی آنکھ کا تارا نہ بن سکے۔ عام طور پر عرب دنیا نے ان سے قطع تعلق کر لیا اور پی۔ ایل۔ او اور بعض دوسرے عرب ملکوں نے اسرائیل کے خلاف اپنے موقف کی مضبوطی سے سادات پر یہ واضح کر دیا کہ اسرائیل سے، مصر کے بغیر بھی، جنگ جاری رکھی جا سکتی ہے۔

انور السادات میں بہت سی خوبیاں تھیں، وہ فکر و عمل کے اعتبار سے مسلمان تھے، سوائے اس کے کہ انھیں انگریزی طرز کے عمدہ سوٹ پہننے اور پائپ پینے کا شوق تھا، عام طور پر ان کی زندگی سادہ تھی، شراب بالکل نہیں پیتے تھے اور کم کھاتے تھے، زیادہ تر خاموش رہتے، کوئی معاملہ ہوتا تو اس کے مختلف پہلوؤں پر کئی کئی روز تک غور کرتے اور پھر جب کسی فیصلے پر پہنچ جاتے تو پھر اس کو

آسانی سے بدلنے کے لئے تیار نہ ہوتے، عموماً بڑے سے بڑا خطرہ مول لے کر اس پر عمل کرتے، فائل اور دفتری امور سے انھیں خاص دلچسپی نہ تھی، بلکہ اس طرح کے کام سے وہ بیزار ہی رہتے، اچھی نیند سوتے، دن میں دو تین گھنٹے کا قیلولہ کرتے۔ ان کی شخصیت میں جاذبیت تھی، جس سے ملتے کھل کر ملتے اور بہت جلد بے تکلفی کی فضا پیدا کر دیتے، اُن میں غضب کی ہمت اور حوصلہ تھا، بروقت اقدام کی بھرپور صلاحیت تھی، اور وہ اپنے ہمسفروں کا ساتھ چھوڑ کر اپنا کارواں اور اپنی راہ الگ بنا سکتے تھے، انھیں یہ محسوس ہوتا تھا کہ تاریخ میں ان کا ایک مشن ہے، اس کے لئے وہ اپنی جان دینے کے لئے بھی تیار رہتے تھے لیکن اپنی راہ چھوڑنے کے لئے آمادہ نہ تھے، ان کا خیال تھا کہ یہی ان کا مقدر ہے اور اس پر وہ راضی اور خوش تھے۔

مصر میں عام خیال یہ تھا کہ اسرائیل سے صلح کر کے اہل مصر کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا ہے۔ سادات کے وہ ساتھی بھی جو ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۷ء تک ان کے ہم نوا رہے تھے، ان کے ناقد بن گئے تھے، لوگوں نے ان کے سفر یروشلم کو کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ فلسطینی حکومت کے قیام کے مسئلہ پر اسرائیل کی ضد اور ہٹ دھرمی کے باوجود سادات اپنی راہ اور اپنا طریقہ بدلنے کے لئے تیار نہ تھے، اس سے مصریوں میں بے چینی تھی، گزشتہ جون میں سینائی میں سادات اور بیگن کی ملاقات ہوئی تھی اور اس کے ٹھیک تین دن بعد اسرائیل کے طیاروں نے سعودی عرب کی فضا میں اُڑ کر اور بغداد پہنچ کر عراقی ری ایکٹر پر بم برسائے، مصر میں بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ عراق کے ری ایکٹر پر اسرائیل کا حملہ یا تو سادات کی رضامندی سے ہوا یا پھر بیگن نے ان کو دھوکہ دیا، وہ کہتے تھے کہ "سادات نے اتنا کچھ دے کر بھی کچھ نہ حاصل کیا" ایک فلسطینی مبصر کی اس رائے میں بڑا وزن ہے کہ "کیمپ ڈیوڈ کے بعد اسرائیل کو یقین ہو گیا کہ وہ پورے یروشلم کو ہڑپ کر سکتا ہے اور اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد اردن کے مغربی کنارے کے علاقہ میں یہودیوں کی نئی بستیاں بسنے لگیں، وہاں اسرائیل کے مظالم بڑھ گئے، اور لبنان اور اس کے باشندوں پر اسرائیلی فوجوں اور بمبار ہوائی جہازوں کے حملے شدید اور زیادہ تباہ کن شکل میں ہونے لگے۔ کیمپ ڈیوڈ معاہدہ سے فلسطینیوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا" ان تلخ حقائق کے پیش نظر مغربی دنیا میں جس طرح سادات کو خراج محبت و

عقیدت پیش کیا گیا ہے اور جس انداز سے اسرائیل نے ان کا سوگ منایا ہے، اس سے امریکہ، مغربی یورپ اور اسرائیل کے خلوص کا بہت کچھ اندازہ ہو جاتا ہے ۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ گزشتہ ایک برس سے خود سادات کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ فلسطینیوں کے حقوق، خاص طور پر اردن کے مغربی کنارے اور غزہ پٹی کے علاقے میں آزاد فلسطینی حکومت کے معاملے میں اسرائیل کا رویہ دوستی اور مفاہمت کا رویہ نہیں ہے اور شاید کبھی نہ ہوگا، امریکہ بھی اپنی بے بسی کا اظہار کرنے لگا تھا۔ یہ وہ چیز کا تھا جس کی شدت کو سادات خود محسوس کرتے تھے، مصر کے لوگ محسوس کرتے تھے اور دنیا کی رائے عامہ بھی خوب سمجھتی تھی کہ جب تک فلسطینیوں کے حقوق کا مسئلہ طے نہ ہوگا، مغربی ایشیا میں انتشار و بحران کی کیفیت باقی رہے گی سعودی عرب کے شاہزادہ فہد نے جو تجاویز پیش کی تھیں ان کے بارے میں بھی اسرائیل کا رویہ انکار اور امریکہ کا سرد مہری کا ہے جب کہ عرب دنیا اور فلسطینیوں کی پوری تائید شاہزادہ فہد کو حاصل ہے ۔ امریکہ کی کانگرس نے سعودی عرب کے لئے اواک جہازوں کی سپلائی کی مخالفت کر کے عربوں کو امریکہ سے دور کر دیا ہے، ان حالات میں سادات کی موت کے بعد جس کا ہمیں افسوس ہے، ان کے جانشین حسنی مبارک کا کام خاصا مشکل معلوم ہوتا ہے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سادات کی راہ پر کتنی دور اور کتنی دیر تک گامزن رہ سکیں گے، ہمیں اس کا بھی اندیشہ ہے کہ اب اسرائیل سنائی کا باقی ماندہ علاقہ جسے اُسے اپریل ۸۲ء میں خالی کرنا تھا، اپنے قبضہ میں رکھنے کے لیے معاہدہ کی پابندی کے سلسلے میں ٹال مٹول سے کام لے گا تا وقتیکہ اسے اس کا پختہ یقین نہ ہو جائے کہ حسنی مبارک ہر معاملہ میں سادات کے سچے جانشین ہیں ۔

ڈاکٹر محمّد ذاکر

سیّد سجّاد حیدر یلدرم

ایک ادبی مطالعہ

زبان معاشرتی زندگی کی پیداوار ہے اور ادب معاشرے کی بنیادی اقدار کا خزینہ، اُس کے خیالات کا امین اور اُس کی اُمنگوں کا اِشاریہ : لیکن اس میں معاشرے کی ذہنی زندگی کے آثار و قرائن کا مجرّد فلسفے کی زبان میں بیان نہیں ہوتا، نہ ہی کسی سیاسی جماعت کے منشور کا سا پیرایہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ادیب معاشرے کی مخصوص فکر اور طرزِ زندگی ایسے تخیّل آمیز پیرائے میں ظاہر کرتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بالکل بے رنگ یا بے لطف نہیں ہو جاتا۔ اُس کی زبان اور اُس کے محرکات سماج کی اُس زندگی کی دین ہوتے ہیں جس سے اُس کی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے ؛ لیکن اس کی تخلیق بہر حال انفرادی کوشش و کاوش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہر اچھّے ادیب میں ایک خلّاق دانشور چھُپا ہوتا ہے ؛ وہ محض سماج کی واقعی زندگی کی ہو بہو عکّاسی یا نقّالی نہیں کرتا، نہ ہی لازمی طور پر وہ اپنے اظہار میں روایتی اسالیب یا پیرایوں کا پابند رہتا ہے۔ اسی لیے وہ ایک طرف معاشرتی اقدار کا محافظ و ترجمان ہوتے ہوئے بھی اُن کا احتساب کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے اور دوسری طرف ادبی اظہار کے پیرایوں کو وسعت دینے کا بھی۔ اِن سطور میں ایک ایسی ہی شخصیت کا ادبی مطالعہ مقصود ہے جِسے ہم سے جُدا ہوئے سینتیس اڑتیس برس

ڈاکٹر محمّد ذاکر۔ ریڈر شعبۂ اردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ

گزر گئے مگر اُس کی تخلیقات اپنے نئے پن کی وجہ سے اردو ادب کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتی ہیں اور اس کے اسلوبِ نگارش کی دلکشی اب بھی باقی ہے۔

ستّر اسّی برس پہلے جب ایک معزز خوش حال گھرانے کے علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوان — سیّد سجّاد حیدر یلدرم (وفات ۱۹۴۳ء) — نے لکھنا شروع کیا تو علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو ادب میں ادب کے افادی پہلو پر زور تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ شعر و ادب کو "علم اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام" سمجھا جاتا تھا۔ سنجیدگی، عقلیت اور سماجی اصلاح کی نئی نئی قائم شدہ روایت کا اتنا غلغلہ تھا کہ اس میں انفرادی لے کو مستحسن سمجھنے کی گنجائش ہی نظر نہ آتی تھی۔ نثری ادب میں اصلاحی اور قوم کی ڈوبتی نبضوں کو اُبھارنے والے قصّوں کے مقابلے میں حسن و عشق یا عورت اور مرد کے جنسی تعلقات کو موضوع بنانے کے لیے اور ساتھ ہی سیدھے سادے روزمرّہ کے محاورے کی بجائے کیف آور عبارت آرائی کرنے کے لیے کافی جرأت درکار تھی۔ یلدرم نے "مخزن" اور دوسرے رسائل میں اپنی نگارشات میں مرد و عورت کے جنسی رشتے سے دلچسپی لے کر اس جرأت کا ثبوت دیا۔ انھوں نے طبعزاد افسانے بھی لکھے اور ان سب سے زیادہ ترکی افسانوں اور ڈراموں کو اردو میں منتقل بھی کیا۔

سید سجاد حیدر کا اپنے نام کے ساتھ یلدرم کا جڑا لگانے اور ترکی ادب پاروں کو اردو میں منتقل کرنے سے ترکوں اور ان کی زبان و ادب سے ان کا تعلق خاطر ظاہر ہے۔ لیکن وہ محض اسی وجہ سے ترکی کے دلدادہ نہیں تھے کہ خود اُن ہی کے بقول "یہ ان لوگوں کی زبان ہے جو نہ کبھی غلام رہے نہ کسی کو غلام رکھا" بلکہ جن نئے معاشرتی مسائل کا ترکوں کو سامنا کرنا پڑ رہا تھا وہ ہندوستان میں ان کی تشہیر کرنا چاہتے تھے۔ گویا ان کا نقطۂ نظر افادی بھی تھا، صرف جذباتی نہیں۔ قیام ترکستان کے دوران سرگرم نوجوان ترکی افراد سے بھی ان کا رابطہ تھا۔ انھوں نے ایسے ترکی ادب پاروں کا انتخاب کیا جو اُن کے خیال میں ہندوستان کی معاشی صورت حال سے قریب تھے۔ یہ سوچنا غلط ہوگا کہ یلدرم محض تفریح طبع کے لیے لکھتے تھے۔ وہ سر سیّد کے تعلیمی

پروگرام کے پروردہ تھے اور اُن کے بے انتہا قائل۔[ے] انھوں نے ترکی ادب سے جو ترجمے کیے اس میں بھی اُن کا مقصد کیا تھا ان ہی کی زبانی سنیے :

"میری تمنا یہ تھی کہ کسی طرح ترکوں کے قصے ترجمے ہوں۔ اس سے نہ صرف ہمارے ناولوں کے لٹریچر میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا بلکہ ترکوں کی سوشل زندگی کا اصلی نقشہ بھی ہمیں نظر آجائے گا۔ ترکوں کی سوشل زندگی کی تصویر کشی میں اس لیے ضرورت سمجھتا تھا کہ ہماری سوسائٹی اور طرزِ معاشرت میں جو انقلاب پیش آرہا ہے وہ انھیں بھی پیش آچکا ہے۔ اس وجہ سے ہمیں اس نقشے سے معلوم ہوجائے گا کہ اس منزل سے وہ کس طرح گزرے ہیں اور اب کہاں ہیں۔"

یلدرم کے افسانوی مضامین بھی لطافت بیان کے باوصف لامحدود فضاؤں میں فرشتے کی بے آواز پرواز کے مماثل نہیں ہیں؛ ان میں زمین پر بسنے والوں کی حسرت پرواز سے تعلق خاطر نمایاں ہے۔

یلدرم نے طبعزاد افسانوں میں طبعی زندگی کو اپنا موضوع بنانے کے ساتھ ساتھ پیرایۂ بیان پر اتنی توجہ صرف کی کہ اُن کے ہاں پیرایۂ بیان کی لطافت بنیادی اہمیت کی چیز بن گئی اسی طرح اگرچہ انھوں نے ایک ترجمے کی پیشکش پر بطور اعتذار یہ کہا تھا کہ ترجمہ اُکھڑا اُکھڑا معلوم ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ترجمے میں بھی ان کے پیرایۂ بیان کی لطافت خاصے کی چیز ہے۔ اور زیادہ تر پیرایۂ بیان کی اسی امتیازی صفت کی وجہ سے وہ نثر اور ریاض کے ساتھ اردو نثر میں ایک نئی صنف ادب یعنی ادب لطیف کے بانیوں میں تسلیم کیے گئے۔

[ے] جیسا کہ ان کے مضمون "سید کی قبر پر" سے ظاہر ہے۔ یہ مضمون اس مصرع پر ختم ہوتا ہے

ع میں بت پرست ہوں رکھدی کہیں جبیں میں نے

اُن کے کلام میں سرسید پر ایک نظم بھی شامل ہے۔

یلدرم نے حسن و عشق کے موضوع کو اپنایا ہے مگر حسن و عشق کی کیفیات کی عکاسی میں جو فضا وہ پیش کرتے ہیں اس میں بڑا رکھ رکھاؤ اور ایسی شائستگی و شستگی ہے جو اخلاقی اقدار کے احساس سے کہیں بھی بے نیاز نہیں ہے۔ ایسی کیفیات کے بیان میں باوجود شوخ اشاروں کے ان کا انداز متین اور متوازن رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عورت کو اس کی تمام تر لطافت اور اس کی بھرپور جنسی خصوصیات کے ساتھ ایک آزاد کردار کی حیثیت سے پیش کرنے میں اُسے نہ تو عیاشی اور گناہ کا مظہر بنایا اور نہ سرّیت کی علامت۔ عورت ان کے ہاں لطافت اور زندگی کے صحت مند تصوّر کی علامت ہے اور اس کے ذکر میں خیال کی جس رعنائی سے کام لے کر وہ ہیجان انگیزی سے بچ کر نکل جاتے ہیں اس سے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ عورت ارضیت سے متّصف ہونے کے باوجود ان کے اعصاب پر سوار نہیں ہے۔ یہ اقوال دیکھیے :

"عورت آدھا میوہ، آدھا پھول ہے۔"

"عورت، عورت، ایک بیل ہے جو خشک درخت کے گرد
لپٹ کر اُسے تازگی اور زینت بخشتی ہے : وہ ایک دھونی
ہے کہ محبّت کی لپٹ سے مرد کو گھیر لیتی ہے۔"

ان اقوال میں عورت کے گرد تخیّل کا ایک ہالہ سا محسوس ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ وہ عورت کی وفاداری، ایثار اور خلوص میں تو حسن دیکھتے ہی تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اُس میں یہ جرأت بھی دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ اپنا حق آپ لینے کی ہمّت بھی پیدا کرے جیسا کہ ان کے افسانے "نکاح ثانی" سے ظاہر ہے۔

یلدرم کا اصلاحی رجحان اُن کے ترکی سے ماخوذ ایک افسانے "صحبتِ ناجنس" میں بھی نظر آتا ہے جس میں پیرایۂ بیان کی لطافت و ندرت قائم رکھتے ہوئے بے جوڑ شادی کی خرابی کی طرف اشارہ ہے۔ اِس افسانے کی پیشکش میں فنی ندرت بھی

ہے۔ یہ دو ایسی سہیلیوں کے خطوط سے ترتیب دیا گیا ہے جو اپنے اپنے شوہروں کے طور طریق سے خوش نہیں ہیں کیونکہ خود ان کی تربیتیں کسی اور طور پر ہوئی ہیں اور ان کے شوہروں کی کسی اور طور پر۔ خیال تو کیجئے اس جوان لڑکی کے دل پر کیا گزرتی ہوگی جسے انگریزی اسکول میں واگنر جیسے مغربی موسیقاروں کی تخلیقات سے دلچسپی لینا سکھایا گیا ہو مگر شادی کے بعد وہ اپنے شوہر سے یہ فرمائش سُنے کہ کوئی امانت یا مداری لال کی چیز سناؤ، یا اس تعلیم یافتہ لڑکی کے جذبات کیا ہوں گے جو چاہتی ہے کہ اُس کا شوہر روزانہ کی زندگی میں اس کا رفیق ہو مگر اس کی شادی ہو جائے کسی ایسے 'صاحب' سے جو یا تو محض کاروبار کی فکروں میں رہتے ہوں یا کھانے کے بعد توند پر ہاتھ پھیر پھیر کر آواز کے ساتھ لمبی لمبی ڈکاریں لینے کے بعد شب خوابی کے لیے تیار ہوتے رہیں۔ ایسے نسوانی کردار کے جذبات کی ترجمانی یلدرم نے اس افسانے میں کیسی نرم نرم تشبیہوں سے کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"وہ لڑکپن کی امیدیں ایک لال کی پرواز کی طرح غائب ہوگئیں، اُڑ گئیں؛ ایک چھوٹی چڑیا کی طرح اُن کا خون ہوگیا"۔

اسی افسانے میں مسئلہ ازدواج کے سلسلے میں یہ خیالات بھی یلدرم کے ایک کردار کی زبانی سنتے چلیے جس سے اُن کے افادیت پسند ذہن کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ زن و شوہر کی باہمی مناسبت کا استعارہ آمیز پیرایہ قابلِ التفات ہے:

"پہلے بیاہ شادیوں میں یہ دیکھا جاتا تھا، یہی نا کہ برہم کُف (کفو) ہے یا نہیں، اس کُف (کفو) اور برادری پر سب چیزیں قربان کردی جاتی تھیں۔ پھر اصلاح ہوئی، کُف (کفو) کا خیال ترک کردیا گیا، تعلیم کا زور ہُوا، "بر تعلیم یافتہ ہونا چاہیے، تعلیم یافتہ ہونا چاہیے" کا شور بلند ہُوا۔ تھوڑے دنوں کے بعد اخلاق کی بھی چھان بین ہونے لگی، بس یہاں پہنچ کے اصلاح رخصت ہوئی، گویا اب کوئی کام باقی نہیں رہا، لیکن مجھ سے پوچھو تو کوئی کام ہوا ہی نہیں؛ اصلی اصلاح تو جب ہے جب لڑکے لڑکی کے مزاج ،

اور طبیعت کی مناسبت کی پوری پوری چھان بین کی جائے۔ خاوند اور بیوی دوسرے کپڑے کی ابری، استر ہیں۔ ابری، استر کے رنگ کی مناسبت کا کتنا خیال کیا جاتا ہے، یہ نہیں کہ دونوں ایک ہی رنگ کے ہوتے ہوں، نہیں، یک رنگی میں کوئی زینت نہیں، خیال یہ کیا جاتا ہے کہ ایک رنگ دوسرے سے جوڑ کھاتا ہو۔"

اپنے ایک انشائیے میں یلدرم نے چڑے چڑیا کی زبانی انسانوں میں اونچ نیچ، 'انسان چڑے' کی ہوس کاری اور 'انسان چڑیا' کے اس بھولپن کا مذاق اڑایا ہے جس کی وجہ سے وہ انسان چڑے کی خوشامدانہ باتوں سے فریب محبت میں آجاتی ہے اور گھر میں بیٹھی اسے نیک اور اپنا عاشق سمجھا کرتی ہے۔ چڑیا کے الفاظ ملاحظہ ہوں :

"میرا چڑا... دن رات مجھ سے کہا کرتا ہے :

'تم بے حد خوبصورت ہو۔ تمھارے برابر دنیا میں کوئی خوبصورت نہیں۔'
مگر خوشامد سے میرا دماغ نہیں چل جاتا، میں اس کان سنتی ہوں اور اس کان اڑا دیتی ہوں کیوں کہ گو اس کی نظروں میں میں خوبصورت ہوں لیکن حقیقت میں خوبصورت نہیں۔ اسے میں اچھی طرح جانتی ہوں، مگر کہیں آدم نے حوّا سے کہہ دیا تھا کہ 'تم بہت خوبصورت ہو' بس وہ دن اور آج کا دن کہ انسان چڑیا کے سامنے سے آئینہ نہیں ہٹتا۔ آئینہ نہیں تو آرسی ہے، آرسی نہیں تو پانی میں اپنا عکس دیکھا جاتا ہے، اور اپنے عکس کو دیکھ دیکھ کے خود ہی جھوما کرتی ہے اور مارے غرور کے زمین پر قدم نہیں رکھتی۔ یہ نہیں سمجھتی کہ یہ سب چڑے کی خوشامد کی باتیں ہیں اور بس۔

"پھر گھر میں بیٹھی، چڑے کو نیک اور اپنا عاشق سمجھا کرتی ہے اور چڑا اس کی غیبت میں رنگ رلیاں مناتا ہے۔ یہ نہیں سمجھتی کہ 'مالِ عرب پیشِ عرب' ہی رہے تو اچھا ہے۔ میں اس نکتے کو سمجھتی ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں

ہر وقت اپنے چڑے کے ساتھ ہوں، یہاں تک کہ تدارکِ معیشت میں بھی برابر
کی شریک ہوں، مس چڑے کو فخر و تفوق کا موقع ہی نہیں دیتی۔"

اس اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ صنفِ نازک کو محض جمالیاتی تسکین کا ذریعہ نہیں بلکہ اُسے عملی طور پر برابر کا شریک دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس سے بھی یلدرم کے اصلاحی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔

اب چڑے کے خیالات دیکھیے جو انسان چڑے پر اپنا امتیاز یوں ظاہر کرتا ہے:

"میں ایک ـــــ بس ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں، ایک کعبہ کا طواف کرتا ہوں ایک دیوی کے گرد پھرتا ہوں، ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں اور اس کے ساتھ پیمانِ دفا باندھتا ہوں۔ اور اُس پیمان کو نہیں توڑتا، مگر یہ کہ موت آکے اُسے توڑے۔

"میں ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں اور اس کو پورا اختیار دیتا ہوں کہ میری کل حرکتوں کی نگرانی کرے... انسانوں کی طرح ہم علیحدہ علیحدہ زندگی بسر نہیں کرتے۔"

گویا یلدرم چڑے کی زبانی فرائض پدری کے احساس کی بھی تلقین کر جاتے ہیں اور وہ اس طرح ادب کے افادی پہلو کو فراموش نہیں کرتے۔

یلدرم کی نگارشات کے مواد و موضوعات کے اس بیان کے بعد اب ذرا ان کے اندازِ نگارش کے اور نمونے دیکھیئے جس کی وجہ سے انھیں نثر نگاروں میں امتیاز حاصل ہے۔ مگر اس سے پہلے یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ جب یلدرم نے اپنی نگارشاتِ لطیف پیش کیں تو جدید اردو نثر جس کی ابتدا کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں ہوئی تھی، دلی کالج کے مصنفین کی کاوشوں سے نہ صرف اس قابل ہو چکی تھی کہ اس میں سنجیدہ مباحث پر اظہارِ خیال کیا جا سکے بلکہ غالب کے اردو خطوط سے اردو نثر کے جو امکانات روشن ہوئے تھے وہ علی گڑھ کی ادبی، علمی اور مقصدی تحریک کی وجہ سے سرسید اور ان

کے رفقاء کے تصنیفی کارناموں میں واضح طور پر سامنے آچکے تھے۔ یلدرم نے اپنے پیشروؤں اور اپنے معاصرین کے اسالیب کے برعکس ایک نئے اسلوب کی طرح ڈالی جس میں لطافتِ بیان نمایاں ہے لیکن یہ لطافت لفظی نگاری سے مس نہیں رکھتی، نہ ہی ویسی استعارہ آرائی سے جو محمد حسین آزاد کا امتیاز ہے۔ اس میں خود ساختہ فارسی تراکیب ہیں جو طبع پر بار نہیں بنتیں بلکہ سیاق و سباق میں مخصوص فضا آفرینی میں مدد دیتی ہیں[۵]۔ یلدرم کے ہاں الفاظ چیختی چنگھاڑتی بھٹیوں کے لپکتے ہوئے شعلے نہیں ہیں؛ وہ خطابت کی گھن گرج نہیں رکھتے۔ ان کی نمائندہ تحریروں میں شاداب سبزے کی سی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ الفاظ ان کے ہاں ایک ذریعہ نہیں رہتے بلکہ رنگ و بو کی ایک مستقل کیفیت کے حامل ہو جاتے ہیں۔ "سلسبیلِ قمر"، "طغیانِ غرور"، "نیم خندۂ سحر"، "حکمِ عدالت کی مہابت"، "بوئے نخش کے بھپکے"، "گرد بادِ آہنگ" جیسے استعارے اور تراکیب ان کی جمالیت پسندی اور نزاکتِ خیال کا ثبوت ہیں۔ حسن کے بیان اور جذباتی منظر نگاری میں ان کی انشا پردازی کے یہ جوہر خوب کھلتے ہیں۔ مرد و عورت کی ایک دوسرے کے لیے فطری کشش اور ان کے ملن پر گلستان، خارستان اور شبرازے کے عنوان سے جو افسانوی مضامین انھوں نے تالیف کیے ہیں اُن میں نزاکتِ خیال پوری طرح نمایاں ہے اور ان کے کرداروں کے نام مثلاً نسرین نوش،

---

۵ اردو کی موجودہ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یلدرم کی فارسی آمیز اردو کی کشش کب تک باقی رہے گی؟ یہ اہم سوال ہے لیکن ہر فنکار کی طرح ادیب بھی اپنا کارنامہ پیش کرتے وقت اس کے جواب سے بے نیاز سا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ سوال اُس بڑے اور اہم سوال سے جڑا ہوا ہے جو اس وقت پورے ملک ہندوستان کے سامنے ہے یعنی وہ پیوندی، ترکیبی یا امتزاجی، چاندنی کی سی طرح سے لبھانے والی تہذیب جس کا آغاز مسلمانوں کے ہندوستان میں متوطن ہو جانے کے بعد ہوا تھا اُس کا اس ملک میں کیا حشر ہوگا۔ خود اردو اسی تہذیب کا دقیع مظہر ہے۔

گل چکاں، موجِ نور، طاؤس خرام، کبک ادا وغیرہ بھی ایک لطیف وخوشگوار رومان پرور فضا پیدا کر دیتے ہیں۔ رقص کا یہ منظر ملاحظہ ہو:

"ساز پر پریوں کا ایک خاص ناچ، ایک رنگین، نازک، نورانی ناچ ناچا گیا۔ "وہ گلابی، چمپئی، دھانی، ریشمی ساڑھیاں جو پریوں کے سڈول جسموں سے لپٹی ہوئی تھیں، وہ اس ناچ کے چکروں میں مل کر طرح طرح کے نئے رنگ پیدا کرتی تھیں۔ پریاں تیزی کی ہلکی پرواز کی طرح اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر ٹھمک ٹھمک کے آتی جاتی تھیں۔ کبھی دو ایک دوسرے سے ملیں، کبھی علیحدہ ہو جائیں؛ کبھی دو کے درمیان سے تیسری گزر جائے؛ کبھی حلقہ بن جائے، کبھی ٹوٹ جائے۔ اس ملنے، جدا ہونے، چکر کھانے سے رنگ اور نور کا انحلال واجتماع ایسا مختلف ہوتا جیسے ہشت پہلو شیشے میں آفتاب کی کرنیں گزر رہی ہوں۔ اِن پریوں کا تھرک تھرک کر ملنا، پھر تتر بتر ہو جانا، شانوں کا ہلنا، بالوں کا بحرِ سنبل کی طرح لہرانا، نازک کمروں کا لچکے کھانا، جُھک جُھک کے دُہرا ہو جانا، یہ سب باتیں سلیس وبلیغ گتوں سے (جو سازندہ پریاں بجا رہی تھیں) مل کر ایک نشہ آور منظر پیش کرتی تھیں کہ کان موسیقی اور رقص میں تمیز نہیں کر سکتی تھیں اور آنکھ نہیں بتا سکتی تھی کہ آیا موسیقی رقص کر رہی ہے، یا رقص نغمہ ساز ہے...

"نسرین نوش ان تمام تموّجاتِ رقص وآہنگ کو ایک سہیلی صبح خنداں کے زانو پر سر رکھے ایک بے پروا، لااُبالیانہ نگاہ سے دیکھ رہی تھی...."

"بالوں کا بحرِ سنبل کی طرح لہرانا"، "تموّجاتِ رقص وآہنگ" جیسی تشبیہیں اور استعارے تخیل کی شادابی اور طبیعت کی لطافت کا پتہ دیتے ہیں۔ جا بجا ان کے پیرایۂ بیان کی شعریت واقعیت پسندی سے زیادہ رومان کی کیفیت نمایاں کر دیتی ہے اور کھُردری حقیقتوں کی تلخی کو ذرا دیر کے لیے بھُلا دیتی ہے۔ مرد وعورت کے وصل کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

اُن دونوں کی روحیں ایک مبہم شوق کے ساتھ ایک دوسرے سے ملیں اور اس دفعہ دونوں کی آنکھوں میں ایک جاں فزا چمک ، ایک دلفروز چنگاری نکلی، موجیں ساحل کی طرف کیسے آتی ہیں ؟ آفتاب کائنات پر کس طرح روشنی ڈالتا ہے ؟ شہد کی مکھی کس طرح پھولوں کی طرف جاتی ہے ؟ بس بالکل اسی طرح ان دو بیگانہ روح آشنا کے ہونٹ ایک قدرتی کشش ، ایک فطری شوق کے ساتھ ایک دوسرے سے ملے ۔

"ان دونوں کا ایک دوسرے کا بوسہ لینا تھا کہ جزیرے کے پرند چہچہا کر اُڑنے لگے ۔ تمام کلیاں ایک دم کھل گئیں ۔ ایک گرد بادِ آہنگ ، ایک زمزمۂ جوش و خروش نے کل جزیرے کو گھیر لیا ۔

" اس کے ہنستے ہی اس جزیرے کے پہاڑ اور گھاٹیاں سبز ہو گئیں ۔ سیاہ غمناک کانٹے پھول ، اور سنبل بن گئے اور عورت کی جادو بھری نظر اور نیم خندۂ سحر نے اس مصیبت زدہ طائفے کو جو مدت سے شفقت کے لیے ترس رہا تھا ، جانِ تازہ بخش دی ۔"

یلدرم کو جذباتی منظر نگاری پر جو قدرت ہے اُس کا یہ نمونہ بھی دیکھیے ۔ ایک چلتی ہوئی ریل گاڑی میں بیٹھی ہوئی ذہنی طور پر پریشان عورت کی دماغی کیفیت کا بیان ہے :

"میں للت پور جارہی تھی ۔ رات تاریک تھی ؛ اور ٹرین کے انجن کا کثیف دھواں اس تاریکی کو کچھ کم نہیں کر رہا تھا ، بڑھا ہی رہا تھا ۔ اس عظیم الشان اور وسیع تاریکی میں گاڑی کی کھڑکیوں میں سے نکلنے والی روشنی نے ٹرین کو ایک چمکدار اور تیز رَو ، ہزار پا کیڑا بنا رکھا تھا جو بل کھاتا ہوا جارہا ہو ۔ اِس محیطِ حُزن و خوف میں میرے لیے عجیب کشش تھی ، میں بار بار سر نکال کے اس تاریکی پر نظر ڈالتی تھی اور میرا دل چاہتا تھا کہ اس میں غائب ہو جاؤں ۔" (گمنام خطوط : حکایات و احتساسات)

اگرچہ اس اقتباس میں ایک کردار کی ایسی ذہنیت پیش کی گئی ہے جو خوش آیند نہیں ہے کیونکہ اس کی شکست خوردگی میں سینہ سپری کا حسن نہیں بلکہ فرار و انفعالیت ہے لیکن اُسے چلتی ہوئی ٹرین

کا "بل کھاتے ہوئے ایک ہزار پا کپڑے" کی طرح محسوس ہونا اس کی پریشان خاطری کو نہایت عمدگی سے حل کرتا ہے۔

حسن کی بے پروائی، اپنے چاہنے والوں کی دل شکنی اور فریب کاری اردو شاعری کی مشہور روایت ہے۔ ذرا ایلدرم کے ساتھ حضرت دل کی زبانی اس کا بیان دیکھیے اور یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ یلدرم کی نگاہِ انتخاب نیچرل مظاہر میں کس طرح کام کرتی ہے اور اُن کی بات کو مدلل اور پُر تاثیر بنا دیتی ہے:

"رنگ برنگ کی تیتریاں مجھے اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ میں ان کی طرف بڑھتا تھا وہ اُڑ جاتی تھیں۔ حسن کی بے اعتنائی دیکھی۔

" ایک دن ایک پاک سفید و براق کبوتر میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں فرطِ محبت سے اسے بھینچتا تھا، اُسے چومتا تھا، لیکن وہ پھڑ پھڑا کے اور میرے ہاتھوں سے اپنے تئیں چھڑا کے اُڑ گیا، حسن قدر ناشناس ہے۔"

"چاند۔ وہ بے جان مخلوق میں سب سے زیادہ طرب انگیز چیز یعنی چودھویں رات کا چاند تو مجھے بالکل بیتاب کر دیتا تھا.... میں اُسے دیکھ دیکھ کے کھلکھلا کر ہنس پڑتا تھا کیونکہ اُسے میں اپنی طرف مائل پاتا تھا، اور پھر اُسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھاتا تھا۔ مگر آہ چاند دور تھا حسن دھوکا بھی دیتا۔"

ہر چند سماجی ترقی کے ساتھ ساتھ اب مشرق و مغرب کا فرق کم ہوتا جاتا ہے لیکن ذرا یلدرم کے ساتھ حضرت دل کی زبانی یہ بھی سُنیے کہ اُس دور میں جسے گزرے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے اُن پر کیسے کیسے اور کس کس طرح حملے ہوتے تھے۔ فرماتے ہیں:

"مشرق بالخصوص ہندوستان سے مجھے بہت شکایت ہے۔ مجھ پر چاروں طرف سے حملے ہوتے ہیں، لیکن کس طرح؟ دلیرانہ سامنے آکر حملے نہیں کیے جاتے، بلکہ گاڑی کی جھلملیوں میں سے، جھروکوں میں سے، کھڑکیوں میں سے، گھونگھٹوں میں سے، آنچلوں میں سے مجھ پر تیر برسائے جاتے ہیں اور میں جواب نہیں دے سکتا۔ بارہا حملہ آوروں کے نرغے میں پھنس گیا ہوں، مگر نظر اُٹھا کے دیکھتا ہوں، مدافعہ کی غرض سے نہیں، کیونکہ اس کی طاقت نہیں، بلکہ

استحکام، الغیا کی نسبت سے ـــــ تو حملہ آوروں کا پتہ نہیں، چشم زدن میں غائب، غرفہ بند، گھونگھٹ کھینچا ہوا، نقاب پڑی ہوئی ہے؛ گویا کبھی حملہ ہوا ہی نہ تھا۔"

مغرب میں اِن پر کیا گزرتی تھی وہ بھی ملاحظہ ہو:

"مشرق میں میں نے اس قدر ٹھوکریں کھائی تھیں کہ میں یہاں سے بھاگا۔ مغرب میں گیا۔ سوچا یہاں آرام وسکون نصیب ہوگا مگر آرام وسکون کیسا! یہاں بھی وہی بدنظمی، وہی لوٹ ...... یہاں میں جہاں جاتا تیروں کی بوچھار مجھ پر ہوتی تھی لیکن مجھے خبر بھی دیدی جاتی تھی کہ "ہم تیر برساتے ہیں، بچ سکتے ہو تو بچو، بھاگو یا سینہ سپر ہو۔" یہاں تیرانداز تیر چھوڑ کے غائب نہیں ہو جاتے تھے بلکہ اگر میں پوچھتا کہ کس نے تیر مارا؟ تو جواب کڑک کے ملتا: "ہم نے"....

"اور ہم کبھی آڑ کے پیچھے ہو کر تیر نہیں مارتے۔ یہ بُزدلی ہے اور ہمارے اصولِ جنگ کے خلاف ہے۔ زیادہ سے زیادہ آڑ اگر ہم کبھی کرتے ہیں تو صرف دستی پنکھے کی کرتے ہیں، اور بس، اور یہ بھی لڑائی کی شان بڑھانے کے لیے، ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔"

ہلکے ہلکے مزاح وطنز کی چاشنی آپ نے "چڑیا چڑے کی کہانی" اور "حضرت دل کی سوانح عمری" کے اقتباسات میں ملاحظہ فرمائی۔ اب ذرا حکایۂ لیلیٰ ومجنوں کے اس اقتباس میں اُن کے حُسنِ خیال وبیان کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ قیس کو بغرض تبدیلئ آب وہوا ہندوستان بھیجا گیا ہے جہاں وہ بشاش ہو کر ٹینس بھی کھیل لیتا ہے۔ یہاں اُس کی ملاقات ایک حسین لڑکی سے ہوتی ہے جو خود قیس کے بقول لیلیٰ نجد سے مشابہ ہے۔ لڑکی پوچھتی ہے کہ:

"نجد ہی کا حُسن آپ کی نظروں میں کیوں کھُبتا ہے؟"

قیس کا جواب ملاحظہ ہو:

"آپ امواجِ بحر سے پوچھیے کہ چاند کی طرف کیوں کھنچتی ہیں۔ آپ پروانوں سے ... پوچھیے کہ شمع پر آکر کیوں گرتے ہیں؟ آپ سورج مکھی سے کہ پرستندۂ آفتاب ہے سوال کیجیے کہ اُس نے آفتاب کو کیوں قبلہ بنا رکھا ہے؟ جب یہ جواب دے سکیں گے تو شاید میں بھی جواب دوں گی ....

اور یہ کہتے کہتے قیس صوفے سے زمین پر گر پڑا۔"

چاند کا ذکر عورت اور عشق و عاشقی کے معاملات کے بیان میں ایک حد تک روایتی ہے لیکن یلدرم کے مترجمہ ترکی کے ایک افسانے میں اس کے ذکر کا یہ نیا انداز ملاحظہ ہو:

"چاند اس وقت سیاہ جنگل کے عین اوپر آچکا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دیوتاؤں نے ہمارے عشق کو روشن کرنے کے لیے ایک سنہری مشعل بھیجدی ہے۔"

اب ذرا ترکی ہی سے ماخوذ ایک انشائیے "تیتری" کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے اور "آفتاب کے زرّیں تلاطم"، "تیتری کے آب گوں بازو" اور "نور کی آغوشِ پرستش" سے یلدرم کی لطافت اور ندرتِ خیال سے محظوظ ہو کر اُن کے حُسنِ اسلوب کی مزید داد دیجیے:

"اس طرح جیسے نسیم نے ہلکا سا جھونکا لیا۔ نہ معلوم کہاں سے تیتری پیدا ہوتی ہے۔ آفتاب اپنے زرّیں تلاطم سے ہر چیز کو غرق کر رہا ہوتا ہے۔ یہ تیتری اس نور کے دریا میں اپنے آب گوں بازوؤں کے ساتھ پُر ذوق اور پُرنشہ حریر کی پشواز پہنے ناچنا شروع کرتی ہے۔

"اب، اُس نازک غنچے کو جو چُھپ چُھپ کے ہنس رہا ہے، لرزتی ہوئی جاتی ہے اور چھونا چاہتی ہے، اس کے چاروں طرف جو نور کی بارش ہو رہی ہے اس میں خوشی اور مستانہ وار جھوم کے پھیرا کرتی ہے؛ اور وہ نور بھی اُسے اپنے آغوشِ پرستش میں لیتا ہے۔"

یلدرم نے شاعری کا دعویٰ تو نہیں کیا لیکن بقول خود وہ "شاہدِ شعر کے شیدا" ضرور تھے۔ اور انھوں نے تھوڑی بہت شاعری بھی کی ہے۔ شاعرانہ لطافت کے ساتھ اپنے خیالات نثر پارے میں ڈھالنے والے سے یہ کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اپنے خیالات کو منظوم صورت میں پیش کر سکے۔ چنانچہ ان کے کلام میں کچھ چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں جو انھوں نے عزیزوں اور دوستوں کی شادیوں یا ان سے بچھڑنے کے موقعوں پر کہیں۔ اسی ذیل میں ان کے وہ پُرتاثیر مرثیے ہیں جو انھوں نے امیر مینائی مرحوم اور داغ مرحوم کی وفات پر کہے۔ یہاں ان کی ایک ہلکی پھلکی چھوٹی سی نظم ملاحظہ ہو، "شملہ کالکا ریلوے پر ایک نظارہ":

ماتھے پہ بندی آنکھوں میں جادو
ہونٹوں کی بجلی گرتی تھی ہر سو
چال لچکتی بات بہکتی
جیسے کسی نے پی ہو دارو
انکھڑیاں ایسی جن میں تھے رقصاں
لمحہ میں رادھا لمحہ میں رادھو
ایسی پھڑک تھی خلق تھی حیراں
ریل پہ آیا کہاں سے آہو

اس نظم میں سراپا نگاری ہے، اور رومان کی چاشنی بھی لیکن اس چاشنی میں مزاج کی رنگینی کے ساتھ پاکیزہ خیالی بھی ہے۔ بے شک اس میں جنس کا بیان ہے لیکن اس بیان میں تلذذ طلبی کا شائبہ نہیں ہے۔ ایسی ہی شستہری نظموں میں "کشمیر و حسنِ کشمیر"، "ایک غم زدہ دوست کے نام"، "دیکھا نظارا ہم نے تمھارا" اور "انتہائے یاس" کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان نظموں سے یلدرم کی پوری شخصیت، ان کی متانت اور شائستہ رومانیت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

اردو کی ہلکی پھلکی تفریحی نظموں میں ان کی ایک نظم "مرزا پھویا علی گڑھ میں" کا

شمار ہوتا ہے۔ اردو نظم نگاری کی تاریخ میں اِسے اِس اعتبار سے اہم قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس سے انیسویں صدی کے اواخر اور اوائل بیسویں صدی کے شمالی ہندوستان کے ایک سماجی طبقے کا ماحول سامنے آجاتا ہے۔ یہ نظم اُس زمانے کے لکھنؤ کے آسودہ حال طبقے کے ایک ایسے نازپروردہ صاحبزادے کے "مصائب" کے بیان پر مشتمل ہے جنھیں علی گڑھ پڑھنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ پہلے لکھنؤ سے وداع ہونے کا منظر ملاحظہ ہو:

خالہ امّاں ، ممانی ، بھابی جان — اپنے مرزا پہ سب ہوئیں قربان
یاالٰہی یہ خیریت سے پھرے — اور دشمن پہ اس کے بجلی گرے
واسطہ مرتضیٰ علیؓ کا تجھے — جلد لاکر ملایئے ہم سے
(کذا)

اب علی گڑھ میں ان پر کیا گزری یہ ملاحظہ ہو اور جن چیزوں کی انھوں نے گھر والوں سے بھیجنے کی فرمائش کی ہے وہ بھی:

یاں کے لڑکوں کا حال ہی ہے جُدا — ایسا دیکھا کبھی ، کبھی نہ سُنا
جنس ہر اک نئی ، دکان نئی — اور تو اور ، ہے زبان نئی
... گر ہو اچھا لباس "ٹھاٹ" کہیں — اور گنواروں کو "راج گھاٹ" کہیں
بوٗ تنعم کی ہو ذرا سی بھی — اس کو کہتے ہیں یاں پہ "عیّاشی"
... کورنش ، مجُرا ، بندگی ، آداب — سب کی یاں ہوگئی ہے مٹی خراب
اس کے بدلے ہے بس سلام علیک — گویا لے ڈھیلا کھینچ مارا ایک
... یاں کی آزادی ہے بہت محدود — شہر جانا بھی ہوگیا مسدود
اس لیے عرض ہے کہ یہ چیزیں — لکھنؤ سے روانہ آپ کریں
ایک ڈبیہ دیا سلائی کی — پُڑیا ایک نیلی روشنائی کی
اک برش جوتا صاف کرنے کا — اور برامکو بھی ساتھ تھوڑا سا
... دو گھڑے ، اک صراحی ، پیالے چار — اور ممکن ہو گر تو تھوڑا اچار

یلدرم نے کچھ غزلیں بھی کہی ہیں۔ ایک دو اردو اور فارسی شعر

ملاحظہ ہوں :

کڑک کی چمک نہ تو اے برق، اس سے کیا حاصل
شرارہ ایک تھا کافی اس آشیاں کے لیے

داشتم سینہ و دل پر ز ہزاراں ارماں
کس نہ گوید کہ تہی کیسہ و داماں رفتم
چوں نہ دیدم ز عزیزاں کرم و لطف و وفا
بہ در خانۂ اغیار غزل خواں رفتم

یلدرم کے موضوعات اور ان کے انداز و اسلوب کے اس تعارف سے مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ یلدرم اُس مشرقی ذہن کی نمائندگی کرتے ہیں جس نے مشرقی ممالک کے سیر و سفر کے درمیان اپنے مشاہدات کو اپنی فنی شخصیت کا جزو بنانے اور فکری اعتبار سے مغربی تہذیب سے اپنے آپ کو سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ وہ سماجی صورت حال سے بے نیاز نہیں ہے، نہ ہی وہ حسن کے تمام تر روایتی ٹھس اور جامد بیان پر قانع رہ سکتا ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے لیے جس مقصد سے یلدرم نے ترکی ادب پاروں کو اردو کا جامہ پہنانے کا عزم کیا تھا وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہیں؟ زیادہ تفصیل کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ترکی ادب سے واقفیت کی بھی کیونکہ ان کے انتخاب کردہ ترکی ادب پاروں میں رومانی قصے بھی ہیں جن میں بیان کی لطافت دوسرے عناصر پر غالب ہے۔ جلال الدین خوارزم شاہ تاریخی ڈرامہ ہے جسے آسانی سے انیسویں صدی کے اواخر کے نشاۃ اسلام کے رجحان سے متعلق کیا جا سکتا ہے ـــــ وہی رجحان جس کی غماز اردو میں حالی کی مدوجزر اسلام اور شرر کے کچھ ناول ہیں۔ دوسرے ترکی ڈراموں میں سماجی مسائل زیر بحث آئے ہیں جن میں سے کسی کسی میں سماج کی روایتی پابندیوں کو چیلنج کرنے والی قوت ابھرتی نظر آتی ہے اور عورت اپنی فطری لطافت و رعنائی کے باوصف اپنے آزادانہ وجود کے لیے کوشش کرتی ہے اور اپنی فعالیت کا ثبوت دینا بھی چاہتی ہے۔ مگر ترکی معاشرہ بھی حصار بند معاشرہ معلوم ہوتا ہے، سماجی بندھنوں کی گرفت کہیں

ڈھیلی نہیں ہوتی اور یلدرم کے ترجمہ کردہ ترکی ڈرامے کے ایک کردار بہیجہ کے الفاظ میں "عورت پر تجاوز کرنا ان (مردوں) کی بنیادِ عشرت ہے اور ان قوانین کی معاونت سے جو انھوں نے خود ایجاد کیے ہیں نیز فطرت کی ناانصافیوں سے مرد ہی فائدہ اُٹھاتے ہیں" (جنگ وجدال)۔ چنانچہ یلدرم کے ہاں نہ عشق بے قید ہونے پاتا ہے اور نہ حُسن آدابِ معاشرت کے بندھن مکمل طور پر توڑنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔

یلدرم کی بیٹی نامور ادیبہ قرۃ العین حیدر نے یلدرم کی طالب علمی ہی کے زمانے سے اُن کی خوش پوشی اور خوش خُلقی اور ان کی متانت اور انکسار کی جو تصویر پیش کی ہے۔ عام روزمرّہ زندگی میں ان کے رکھ رکھاؤ اور ضابطے کی جو شان دکھائی ہے بالعموم وہی ضبط اور رکھ رکھاؤ ان کے فن میں بھی نمایاں ہے۔ ان کی برہمی نہ انارکی کی طرف لے جاتی ہے نہ دہشت پسندی کی طرف۔ ان کے جو مضامین اور خطبے رسالہ پگڈنڈی کے "یلدرم نمبر" میں شامل ہیں ان سے یلدرم کے خیالات، ان کے خلوص اور اظہار میں ضبط و استدلال سے کام لینے کا نقش دلنشین ہو جاتا ہے۔ احساس کی جس رنگینی سے کام لیکر حسن و عورت کی جو تصویریں یلدرم اپنے افسانوی مضامین میں پیش کرتے ہیں اُن سے اُن کے صحیح ذوق اور وجدان کا پتہ چلتا ہے اور اُن کا پیرایۂ بیان جس جمالیاتی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے وہ ان کی کامیابی اور اردو دنیا میں اُن کے نام کے دیر تک زندہ رہنے کی ضمانت ہے۔

کبیر احمد جائسی (علیگ)

جمہوریہ اسلامی ایران

مسائل اور امکانات

اب سے دو سال قبل ایرانی عوام نے اپنے ڈھائی ہزار سالہ شاہنشاہی نظام کو ختم کر کے ایک ایسے طرز حکومت کو اختیار کیا ہے جس کو انھوں نے اسلامی جمہوریت کا نام دیا ہے۔ اس ڈھائی ہزار سالہ دور سے ظہور اسلام سے قبل کا زمانہ نکال دینے کے بعد تقریباً ڈیڑھ ہزار سالہ دور باقی بچتا ہے جس میں ایران میں مطلق العنان شہنشاہیت رہی ہے۔ سامانیوں کے عہد حکومت سے لے کر پہلویوں کے عہد تک ایران کسی نہ کسی مطلق العنان بادشاہ کے زیر نگیں رہا ہے۔ تاریخ کے اس طول وطویل دور میں اسلام نے کیا رول ادا کیا اور وہ مسائل سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہوئے اپنی انفرادیت اور اصلیت باقی رکھ سکا؟ ان سوالات کے جواب آج کے موضوع بحث سے خارج ہیں۔ البتہ پس منظر کے طور پر اتنا ضرور گوش گذار کر دینا ہے کہ ایران میں جو اسلامی انقلاب آیا ہے اس کی بنیاد پہلوی خاندان کی حکومت قائم ہونے سے پہلے ہی یعنی قاچاریوں کے آخری عہد میں پڑ چکی تھی۔ مغرب کے استحصال کے خلاف سب سے پہلے قاچاریوں کے عہد میں بغاوت ہوئی اور ایک عالم دین محمد حسین شیرازی کے ایک سطری فتوے نے سارے ملک میں آگ لگا دی۔ اس ایک سطری فتوے کے سامنے مطلق العنان بادشاہ، اس کا ولی عہد، حکومت کے

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی، ریڈر، اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر (کشمیر)

سارے کارپرداز سب کے سب بے بس ہوکر رہ گئے۔ حکومت کی اس بے بسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا، مطلق العنان شاہنشاہ کے خلاف علماء کی یہ پہلی جیت تھی جو آگے چل کر ایک بڑی تحریک بنی اور اس نے اپنے ملک سے شاہنشاہی نظام کو بیخ وبُن سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ قاچاریوں کی نکمی بودی اور روبہ زوال حکومت کو ختم کر کے پہلوی خاندان کا پہلا حکمران رضا خاں، رضا شاہ کے نام سے پورے ایران کا بلا شرکت غیرے والی ومالک بنا۔ اس نے بادشاہ بنتے ہی ملک میں جن اصلاحات کو عام کرنا چاہا ان میں پردہ کا خاتمہ بھی تھا، رضا شاہ نے مردوں اور عورتوں کے لئے یوروپی لباس لازمی قرار دیا اور برقع کے استعمال کو ممنوع قرار دے دیا۔ برقع کو ممنوع قرار دینے پر اس کا علماء سے اختلاف ہوا اور دونوں ایک دوسرے کو بیخ دبن سے اکھاڑ پھینکنے کے درپے ہو گئے۔ پہلوی خاندان نے تقریبًا ساٹھ سال تک ایران پر حکمرانی کی۔ یہ ساٹھ سال کا عرصہ بجا طور پر علماء اور حکومت کی خفیہ اور اعلانیہ جنگ کا عرصہ کہا جاسکتا ہے۔ حکومت اپنے بھیس بدل بدل کر علماء پر وار کرتی رہی اور علماء اپنا پہلو بدل بدل کر حکومت کو اپنی تنقیدوں کا نشانہ بناتے رہے۔

پہلوی خاندان کے دوسرے اور آخری بادشاہ محمد رضا شاہ کے عہد حکومت کے شروع میں تو علماء اور حکومت کی آویزش کم رہی مگر جوں جوں وقت گذرتا گیا اور بادشاہ اصلاح کے نام پر تجدد کے راستے پر گامزن ہوتا گیا توں توں علماء اور حکومت کی آویزش بڑھتی گئی۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ دینی مدارس کے طلبہ اور علماء کو قتل کیا جانے لگا، ان کو اذیت خانوں میں بند کر کے مستقل عذاب میں مبتلا کیا جانے لگا اور اس بات کی ہر ممکن کوشش کی جانے لگی کہ علماء صرف مسجدوں تک محدود ومحصور ہو جائیں اور حکومت سے ٹکرانا چھوڑ دیں مگر علماء کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی عالم مرنے لگتا تو وہ اپنی اولاد کو وصیت کرتا کہ پہلوی حکومت کو ختم کرنے کے لئے وہ سر دھڑ کی بازی لگا دے۔ حکومت سے علماء کی اس پیہم آویزش کا نتیجہ

یہ ہوا کہ جب محمد رضا شاہ کی حکومت کے ظلم و ستم بڑھ گئے، ساواک کے اذیت خانوں میں ملک کی ½ آبادی پہونچ گئی تو عوام اس اذیت سے بچنے کے لئے علماء کے دامن عاطفت میں آگئے اور جب شاہ کے خلاف عوام نے اعلان جنگ کیا تو ان کی زبانوں پر دو ہی نعرے تھے، ایک نعرہ "مرگ بر شاہ" اور دوسرا "درود بر خمینی"۔ انہی دو نعروں نے پورے ایران میں آگ لگائی، انہی نعروں کو لگاتے ہوئے لاکھوں جوانوں نے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی۔ انہی نعروں کو لگاتی ہوئی مائیں بہنیں اور بیٹیاں سڑکوں پر نکل آئیں، جب محمد رضا شاہ ایران چھوڑ کر بھاگ رہا تھا تو اس وقت بھی یہی نعرے تھے جو فضا میں گونج رہے تھے۔

جس وقت شاہ نے ایران کو خیرباد کہا اس وقت شاپور بختیار وزیر اعظم کے عہدے پر فائز تھا، شاہ کے فرار ہونے کے بعد پہلی فروری ۱۹۷۹ء کو ایک طویل مدتی جلاوطنی کے بعد آیت اللہ خمینی تہران واپس آئے۔ ان کے واپس آنے کے بعد ایران کے عوام نے ملک کی سربراہی ان پر چھوڑ دی۔ اس موقع پر آیت اللہ خمینی نے کمال ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے ۴ فروری ۱۹۷۹ء کو ایک انقلابی مہدی بازرگان کو وزیر اعظم نامزد کیا اور خود قم کے اس دینی مدرسہ میں گوشہ نشین ہوگئے جہاں ان کی عمر عزیز کا بیشتر حصہ درس و تدریس میں گذرا تھا، مہدی بازرگان کے نامزد ہونے کے بعد چند دنوں تک تو شاپور بختیار کی حکومت اپنی بقا کے لئے جدوجہد کرتی رہی، مگر آخرکار ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء کو اس کو عوامی فیصلہ قبول کرنا پڑا اور اس کا نام و نشان تاریخ کے صفحات میں گم ہو کر رہ گیا۔ مہدی بازرگان کی حکومت قائم ہونے کے تقریباً پچاس دن بعد یکم اپریل ۱۹۷۹ء کو ایران میں ریفرنڈم کرایا گیا جس کے نتیجے میں اس کے اسلامی جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا گیا، اس اعلان کے بعد اسلام کے جو مسائل و امکانات ہیں وہی ہمارا آج کا موضوع بحث ہیں۔

اس دو سال کے عرصے میں ایران میں اسلام کو مسائل کا سامنا زیادہ کرنا پڑا، جہاں تک امکانات کا سوال ہے اس کے سلسلے میں اس وقت جبکہ برادر کشی کا بازار گرم ہے، صدر اور وزیر اعظم قتل ہو رہے ہیں، چیف جسٹس اور پارلیمنٹ کے ممبروں

کے پرخچے اڑائے جا رہے ہیں، بیرونی طاقتیں اس کو ہڑپ کر لینے پر آمادہ نظر آتی ہیں، کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ اس لئے اس مقالے میں امکانات کے مقابلے میں مسائل ہی کا پلڑا بھاری رہے گا۔ اسی سلسلۂ سخن میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس مقالے میں ایران میں اسلام کے مسائل و امکانات کا جائزہ لینا مقصود ہے، ایران کے مسائل و امکانات کا نہیں، اس لئے ہم اپنے آپ کو صرف ایران میں اسلام کے مسائل و امکانات تک ہی محدود رکھیں گے۔

اس وقت ایران میں اسلام کو جو مسائل درپیش ہیں ان میں سر فہرست یہ مسئلہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت کس طرح قائم ہو؟ کسی بھی ملک کو اسلامی جمہوریہ قرار دے دینے کا منطقی اور لازمی نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ وہ ملک واقعی ایک اسلامی ملک یا اسلامی نظام حکومت کا حامل ملک بن جاتے۔ کسی بھی ملک کو اسلامی ملک بنانے کے لئے پہلے افراد کا ایک ایسا گروہ تیار کرنا ہوتا ہے جو ہر لحاظ سے، زندگی کے ہر شعبے میں اسلامی تعلیمات کا مکمل نمونہ ہوں اور جب مدتوں کی سعی و جہد کے بعد ایسے افراد کی تعداد دوسرے طرح کے افراد سے زیادہ ہو جائے تو پھر اقتدار ان کی طرف منتقل کیا جاتا ہے تاکہ وہ ملک کو اسلامی قوانین اور اسلامی اسپرٹ کی روشنی میں چلا سکیں۔ ایران میں جو اسلامی حکومت قائم ہوئی ہے، اس کے پس پشت ان منظم افراد کی کوئی تنظیم نہ تھی جو پہلے سے شعوری طور پر اسلام کو اپنا مقصدِ حیات بنا چکے ہوں اور اس کے حصول کے لئے مدتوں تربیت حاصل کر چکے ہوں۔ ایران میں جو انقلاب آیا ہے اس کے صرف دو ہی دستے تربیت یافتہ تھے: پہلا دستہ تو علماء اور ان کے شاگردوں پر مشتمل تھا اور دوسرا تربیت یافتہ دستہ ان گوریلا لڑاکوؤں پر مشتمل تھا جن کا اصل مقصد شہنشاہیت کو ختم کرنا تو ضرور تھا مگر ملک کو اسلامی حکومت کے تابع بنانا غالباً نہیں تھا۔ یہی دستہ آج "مجاہدین خلق" کے نام سے موسوم ہے اور خفیہ اور اعلانیہ دونوں طرح سے آیت اللہ خمینی کی سربراہی کے خلاف علم بغاوت بلند کئے ہوئے ہے، ان دونوں دستوں کے افراد کی تعداد پورے ملک کی آبادی کو مدنظر رکھتے ہوئے انگشت شمار ہی کہی جا سکتی ہے۔ ان دونوں منظم دستوں کے پس پشت

عوام کی وہ غیر تربیت یافتہ زبردست طاقت تھی جو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑی ہو گئی تھی، ان کو کسی قسم کی کوئی تربیت نہ مل پائی تھی وہ تو صرف شاہ اور اس کی خفیہ پولیس ساواک کے ظلم و ستم دہشت و بربریت اور استحصال و استثمار سے عاجز آکر تربیت یافتہ دستوں کے پس پشت آن کھڑے ہوئے تھے اور ان کا منتہا و مقصود یہ تھا کہ ظالم و جابر اور لوٹ مار کرنے والی حکومت ختم ہو اور ان کو چین کا سانس لینے کا موقع ملے ۔ تربیت یافتہ افراد کی اس کمی ہی کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ابھی اسلامی جمہوریت کو قائم ہوئے صرف دو سال ہی کا عرصہ ہوا ہے مگر اس مختصر سے عرصے میں ایک وزیر اعظم (مہدی بازرگان) اپنے رفقا سے اختلاف کی وجہ سے مستعفی ہو چکا ہے اور دوسرا (باہنر) بم کے دھماکے سے مار ڈالا گیا ہے ۔ ایک صدر مملکت (بنی صدر) کو برطرف کیا گیا اور اس کو اپنی جان بچا کر ملک سے باہر بھاگنا پڑا جبکہ دوسرا صدر (محمد علی رجائی) بم کے دھماکے سے جاں بحق ہوا، اس وقت عالم یہ ہے کہ یہ دونوں عہدے قائم مقام حضرات سے پُر کئے گئے ہیں ۔ اسلامی نظامِ حکومت اور اس کے دائرۂ کار کی توضیح، تشریح اور تعبیر کے سلسلے میں اس وقت ایران کے علماء اور دانشوروں میں جو اختلاف ہے اس کی سب سے بڑی وجہ بھی ہے کہ ان کو اس انقلاب کے لئے پہلے سے تربیت نہیں دی گئی تھی ۔ اس صورتِ حال کے باوجود روشنی کی ایک کرن ضرور دکھائی دیتی ہے ۔ اس وقت کے ایران میں اگر ایک عالمِ دین ہلاک ہو جاتا ہے یا اپنی فطری موت مر جاتا ہے تو اس کی جگہ لینے کے لئے کم از کم دس عالم سامنے آجاتے ہیں اور اس کی جگہ بڑی آسانی سے پُر کر لی جاتی ہے ۔ جب ۲۸ رجون ۱۹۸۱ء کو آیت اللہ بہشتی اور پارلیمنٹ کے ممبران جن کی مجموعی تعداد ۷۲ تھی بم پھٹنے سے جاں بحق ہو گئے تو اس سانحے پر ردِ عمل کے طور پر جو نعرہ بلند ہوا وہ یہ تھا "بکشید مارا ، ملتِ ما بیدار تر می شود ۔" اس امید کی کرن کے باوجود یہ مسئلہ اپنی جگہ پر باقی رہتا ہے کہ ایران کی اسلامی حکومت کی شکل کیسی ہو ؟ اس کے دائرۂ کار میں کیا کیا چیزیں شامل کی جائیں ؟ کن کن چیزوں کو ذاتی یا نجی دائرۂ کار کے سپرد کر دیا جائے ؟

نظامِ حکومت کے مسئلہ سے جڑا ہوا ایک دوسرا مسئلہ اسلامی عدالتوں کا قیام اور ان کے دائرۂ کار کے تعین سے متعلق ہے، اسلامی جمہوریہ کے قیام کے بعد ایران میں سیکڑوں کی تعداد میں شرعی عدالتیں بنائی گئی ہیں جن کی سربراہی علماء کرتے ہیں۔ ان عدالتوں کے قیام نے اگر ایک طرف پرانے عدالتی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے تو دوسری طرف انہی عدالتوں کے قیام کی وجہ سے بعض ایسے مسائل بھی اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں جن کا ابھی تک کوئی اسلامی حل نہیں نکالا جا سکا ہے۔ یہ تو درست ہے کہ انہی عدالتوں کے ذریعے پہلوی خاندان اور دوسرے مفرور سرمایہ داروں کے تقریباً ایک ہزار کارخانے بحق سرکار ضبط کر لیے گئے ہیں، انہی کے ذریعے حکومت نے تمام بڑی بڑی ٹرانسپورٹ کمپنیوں کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے، تمام غیر سرکاری بینکوں کو سرکاری قرار دے دیا گیا ہے، بینکوں سے سودی نظام کا خاتمہ کر دیا گیا ہے ملک کی تمام معدنیات کو قومیا لیا گیا ہے، جن افراد کے پاس جاگیریں تھیں ان سے جاگیروں کا ایک بڑا حصہ لے کر نادار اور مفلوک الحال لوگوں میں ان کو تقسیم کر دیا گیا، مگر جن لوگوں کو اسلام اور انقلاب کا دشمن گردانا جاتا ہے، جن پر ملک، ملت و مذہب سے غداری کا مقدمہ چلایا جاتا ہے ان کا کوئی وکیل، کوئی گواہِ صفائی نہیں ہوتا، ماخوذین خود ہی اپنے مقدمہ کی پیروی کرتے ہیں، عدالت کے سوالات اور جرح کا جواب دیتے ہیں۔ ماخوذین کے انہی جوابات کی روشنی میں مقدمہ فیصل کر دیا جاتا ہے۔

یہ تو درست ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں جو شرعی عدالتیں قائم تھیں ان میں پیشہ ور وکیلوں کا کوئی عمل دخل نہ تھا، صرف مدعی اپنے ساتھ دو گواہ لاتا، شرعی عدالت کا حاکم اس کے دعوے کو سنتا اور قرآن و سنت سے روشنی حاصل کرتے ہوئے اپنی صوابدید کے مطابق مقدمہ فیصل کر دیتا۔ اس وقت ایران میں جو شرعی عدالتیں مقدمات فیصل کر رہی ہیں، جہاں تک ہم کو علم ہو سکا ہے، ان میں ملزمین و ماخوذین کی طرف سے گواہ طلب نہیں کیے جاتے، ملزم خود ہی اپنی بے گناہی کا عدالت کو یقین دلاتا ہے، اگر عدالت اس سے متفق ہوتی ہے تو وہ بچ جاتا ہے ورنہ لقمۂ اجل بنتا ہے۔ ابھی تک

یہ بات واضح نہیں ہوسکی ہے کہ ان شرعی عدالتوں کے دائرۂ کار میں کیا کیا چیزیں شامل ہیں اور وہ کون کون سی چیزیں ہیں جو ان عدالتوں کے دائرۂ کار میں نہیں آتیں ؟

ان عدالتوں کے فیصلوں کے مطابق روزہی بیس پچیس افراد کو یا تو گولی ماری جارہی ہے یا سُولی پر لٹکایا جارہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جن لوگوں کو یہ سزائیں دی جارہی ہیں وہ حکومت کے خاطی ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا ماضی داغ دار ہو اوران کا سابق شاہ کی حکومت سے کسی نہ کسی طرح کا کوئی تعلق ہو لیکن جس پیمانے پر جس اندھا دھند طریقے سے یہ سزائیں دی جارہی ہیں اس میں بہرحال اسلامی اسپرٹ کا فقدان نظر آتا ہے اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایران کے لوگ انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں اسی لئے ایران میں اسلام کو یہ مسئلہ درپیش ہے کہ اس کے نام پر جو عدالتیں بنائی گئی ہیں وہ کس طرح اس کے اصل مفہوم و منشا کے مطابق کام کریں ؟

ان مسائل سے قطع نظر کرتے ہوئے جب ہم ذرائع پیداوار اور ذرائع تقسیم کی ملکیت کے مسئلہ کی طرف آتے ہیں تو یہاں بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ ایران میں اسلام اس مسئلہ سے بھی دوچار ہے۔ انقلاب سے پہلے ایران میں ذرائع پیداوار اور ذرائع تقسیم کی ملکیت اجارہ داروں کے پاس تھی۔ شاہی خاندان کے علاوہ معدودے چند بڑے بڑے اجارہ دار ذرائع پیداوار اور ذرائع تقسیم کی ملکیت پر قابض تھے۔ انقلاب کے بعد اگر ایران اسلامی جمہوریہ نہ بھی بنتا کسی دوسری طرح کا طرز حکومت اختیار کرتا تب بھی اس صورت حال کو ختم ہونا ہی تھا، کیونکہ اب سوائے سرمایہ دار ملکوں کے کسی بھی ملک میں اجارہ داری کے باقی رہنے کا کوئی عقلی اور منطقی جواز باقی نہیں رہ گیا، گذشتہ سطور میں اجارہ داروں کے کارخانوں کو ضبط کرنے، تمام بڑی بڑی ٹرانسپورٹ کمپنیوں کا حکومت کی تحویل میں آنے، بینکوں اور بیمہ کمپنیوں کو قومیانے، معدنیات کے ذخائر کو سرکاری تحویل میں لے لینے کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ یہ کام تو وہ حکومتیں بھی کرتی ہیں جو اسلامی بنیادوں پر قائم نہیں ہوتیں۔ جمہوری اور سوشلسٹ ممالک بھی بہت سی صنعتوں، ذرائع پیداوار اور ذرائع تقسیم کو اپنی ملکیت میں لے لیتے ہیں۔ اگر ایران نے اس سلسلے میں

کوئی پیش رفت کی ہے تو یہ خالص اسلامی بات نہیں ہے۔ یہ کام تو وہ حکومت بھی کرتی ہے جو اسلامی نہ ہوتی۔ ایران میں اسلام کا تیسرا بڑا سنگین مسئلہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار اور ذرائع تقسیم کی ملکیت کا مسئلہ کس طرح حل کیا جائے؟ پبلک سکٹر اور پرائیویٹ سکٹر کے درمیان حد فاصل کیا ہو؟ کن کن چیزوں کو سرکاری تحویل میں لیا جائے اور کن کن چیزوں کو آزادانہ مقابلے کے لئے چھوڑ دیا جائے؟

اب ہم ایک دوسرے سنگین مسئلہ کی طرف آتے ہیں جس سے ایران میں اسلام دوچار ہے اور ابھی تک اس کا کوئی حل تلاش نہیں کیا جا سکا ہے۔ یہ سنگین مسئلہ داخلی استحکام کا ہے جو سیاسی ہونے کے باوجود ایران کے اسلام کا بھی مسئلہ ہے۔ ایک اسلامی حکومت کا یہ فرض ہوتا ہے کہ اس کی مملکت میں امن و امان قائم ہو، تمام لوگ عزت، سکون اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کریں، ہر شخص کی نجی ملکیت اس کے اپنے تصرف میں ہو اور اس پر کوئی بھی شخص یا حکومت زور زبردستی سے قابض نہ ہو سکے، انسانی جان کا احترام کیا جائے اور بلاوجہ کشت و خون کا بازار گرم کر کے خدا کی زمین پر فتنہ و فساد کا بیج نہ بویا جائے، ایران کے موجودہ داخلی انتشار کو سمجھنے کے لئے ہم کو ایک بار پھر انقلاب کے پس منظر پر نظر ڈالنی ہوگی۔ پہلوی حکومت سے اختلاف کرتے ہوئے علماء نے جو تحریک چلائی تھی، شروع شروع میں تو اس کی لے بڑی مدھم رہی اور علماء کے اس طبقہ کو جو حکومت کا مخالف تھا دیوانہ سمجھا جاتا تھا لیکن دھیرے دھیرے علماء کی اس تحریک نے ایران کے دانش وروں کو بھی متاثر کرنا شروع کیا اور وہ بھی حکومت مخالف تحریک کے حامی بنتے گئے۔ ایران کی دو بڑی مذہبی اقلیتوں، عیسائیوں اور زرتشتیوں نے بھی شاہ مخالف تحریکات کا ساتھ دیا، البتہ ایک دوسری اقلیت جو بہائیوں پر مشتمل تھی غیر جانبدار رہی یعنی نہ تو وہ شاہ مخالف تحریکات میں شامل ہوئی اور نہ ہی اس نے کھل کر شاہ پرستوں کا ساتھ دیا۔ بعض تاریخی اسباب کی وجہ سے کمیونسٹ تحریک ایران میں کبھی مقبول نہیں رہی۔ روس نواز کمیونسٹ پارٹی جو ایران میں تودہ پارٹی کے نام سے موسوم ہے نہ تو شاہ کے زمانے میں اور نہ ہی شاہ

کے زوال کے بعد عوام کو اپنی جانب راغب کرسکی مارکسسٹ لیننسٹ پارٹی جو "پیکار" کے نام سے موسوم ہے اس کا دائرۂ اثر اور بھی محدود ہے۔ موخر الذکر پارٹی کسی زمانے میں اس پارٹی میں شامل رہ چکی ہے جس کی تاسیس آیت اللہ طالقانی، ڈاکٹر ید اللہ سحابی اور مہدی بازرگان نے کی تھی، یہ تمام کی تمام پارٹیاں، شاہ مخالف تحریکات میں تو شامل تھیں مگر انقلاب کے مکمل ہونے کے بعد حزب اقتدار سے کٹتی چلی گئیں اور اب اقتدار مخالف پارٹیوں کا رول انجام دے رہی ہیں۔ اس سلسلے میں مجاہدین خلق نامی پارٹی کا تذکرہ خاص طور سے ضروری ہے جو آج کل آیت اللہ خمینی کی سب سے بڑی حریف اور مدمقابل بنی ہوئی ہے یہ تنظیم اصل میں اُن چھاپہ ماردستوں پر مشتمل ہے جن کی تربیت فلسطینی چھاپہ مار کیمپوں میں ہوئی تھی۔ شاہ کے زمانے میں اس پارٹی کے ممبروں پر بہت ظلم کیا گیا اور نہ جانے کتنے لوگوں کو اذیت خانوں میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس تنظیم کے افراد شاہ مخالف تحریکات میں پیش پیش رہے اور شاہ کی حکومت کے خاتمے کے لئے علماء کے دوش بدوش ہر محاذ پر لڑے۔ انقلاب کے بعد اس تنظیم کے موجودہ سربراہ مسعود رجوی خود صدارتی انتخاب میں کھڑے ہونا چاہتے تھے مگر ان کے بیان کے مطابق آیت اللہ خمینی نے ان کو انتخاب میں حصّہ لینے کی اجازت نہیں دی۔ اس کے بعد ان کی پارٹی کے بنی صدر کی مدد کی جو بھاری اکثریت سے ایران کی اسلامی جمہوریہ کے پہلے صدر چنے گئے، مسعود رجوی نے مسٹر فرڈ ہیلی ڈے (FRED HALLIDAY) کو انٹرویو دیتے ہوئے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ ان کے اور آیت اللہ خمینی کے درمیان دو بڑے مسائل پر اختلاف ہے۔ پہلا مسئلہ تو ملک کے نظام حکومت کا ہے اور دوسرا کردوں کا۔ فرڈ ہیلی ڈے کے قول کے مطابق مسعود رجوی، کردوں کو داخلی آزادی دینے کے حق میں ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس لسانی اور مذہبی اقلیت کو داخلی آزادی دے دی جائے تاکہ یہ اقلیت اپنی منشا اور خواہش کے مطابق پیش رفت کی راہوں پر گامزن ہو۔ اس وقت جو داخلی انتشار ایران میں ہے وہ مجاہدین خلق اور حزبِ اقتدار کے افکار و نظریات کے باہمی ٹکراؤ کا نتیجہ ہے

اور کوئی دن ایسا نہیں جاتا جبکہ مجاہدین خلق کے دس بیس ممبروں کو موت کے گھاٹ نہ اُتار دیا جاتا ہو۔ مجاہدین خلق کے ممبران بھی اب جنگ و جدل کے راستے پر گامزن ہو چکے ہیں۔ حزب اقتدار کے اب تک جتنے افراد جاں بحق ہو چکے ہیں، قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی ہلاکت کی ذمہ داری مجاہدین خلق پر ہی ہے اگرچہ مجاہدین خلق نے اس سلسلے میں نہ کوئی دعویٰ کیا ہے اور نہ ہی ان ہلاکتوں کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ ادھر چند دنوں سے مجاہدین خلق اور حزب اقتدار کی آویزش نے بڑی خطرناک صورت اختیار کر لی ہے اب مجاہدین خلق اور حزب اقتدار کی پولیس "پاسداران خلق" میں دست بہ دست، رو بہ رو جنگ ہو رہی ہے اور دونوں گروہوں کے افراد تہران کی سڑکوں پر یہ جنگ لڑ رہے ہیں۔ اسلامی حکومت کا سب سے بڑا فریضہ داخلی امن و استحکام قائم کرنا ہوتا ہے۔ ایران میں اسلام اس سنگین مسئلہ سے دوچار ہے کہ وہاں کس طرح، کن بنیادوں پر، کس طریقے سے داخلی امن و استحکام پیدا کیا جائے تاکہ خلق خدا کا جانی و مالی اتلاف نہ ہو۔

آخر میں ایک اور سنگین مسئلہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے یہ مسئلہ اگرچہ براہ راست ملک کی سیاست سے تعلق رکھتا ہے مگر بالواسطہ اس کا تعلق اسلام سے بھی ہے۔ یہ مسئلہ لسانی اور مذہبی اقلیتوں کا مسئلہ ہے۔ پہلے ہم لسانی اقلیت کے مسئلہ کو لیتے ہیں۔ ایران میں دو بڑی لسانی اقلیتیں آباد ہیں۔ ایک اقلیت کی زبان کردی ہے اور دوسرے کی ترکی آذربائجانی۔ آذربائجان کے باشندوں کی مجموعی تعداد ایران کی کل آبادی کے $\frac{1}{5}$ کے برابر ہے اور یہاں کے بیشتر افراد فقہ جعفری پر عمل کرنے والے ہیں۔ زبان کے مسئلہ پر اس صوبے کے لوگوں کا سب سے پہلے رضا خاں سے اختلاف شروع ہوا تھا جب اس نے اس صوبے میں بھی فارسی زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت سے نافذ کیا تھا۔ حکومت کے زور و قوت کے آگے جب یہاں کے عوام بے بس ہو گئے اور ان کے بچوں کو نوشت و خواند کے لئے لازمی طور پر فارسی زبان کو پڑھنا پڑا تو انھوں نے اپنے ایسے اسکول قائم کر لئے جو ترکی آذربائجانی کی بھی تعلیم دیتے

مگر رضا خاں کے معزول ہونے کے بعد جب محمد رضا شاہ ایران کے تاج و تخت کا مالک بنا تو استحکام حاصل کرنے کے چند برسوں کے بعد ہی اس نے تمام ایسے اسکولوں کو بند کرنے کا حکم دے دیا جہاں ترکی آذربائجانی پڑھائی جاتی تھی۔ اس کے بعد سے یہ زبان صرف گھروں میں بچوں کو پڑھائی جاتی رہی اور حکومت کی طرف سے اس بات کی برابر کوشش ہوتی رہی کہ کسی نہ کسی طرح یہ زبان صفحۂ ہستی سے مٹ جائے مگر رضا شاہ کی حکومت کو اس میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ صوبۂ آذربائجان کے بیشتر افراد اُن ترکوں کی اولادیں جو وقتاً فوقتاً ترکِ وطن کر کے ایران آتے رہے، ظہورِ اسلام کے بعد جب عربوں نے ایران پر حملہ کیا تو ایران کے دوسرے علاقے تو بہت جلد ان کے زیرنگیں آ گئے مگر آذربائجان کا علاقہ ایک مدت کے بعد فتح کیا جا سکا۔ آذربائجان کے لوگ ہر تحریک آزادی میں پیش پیش رہے ہیں اور شاہ مخالف تحریکوں کا تو آذربائجان کو گڑھ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایران کے دوسرے علاقوں میں جو مقبولیت آیت اللہ خمینی کو حاصل ہے بالکل ویسی ہی مقبولیت آذربائجان میں آیت اللہ شریعت مداری کو حاصل ہے۔ ایران کے اسلامی انقلاب کے بعد اس صوبے کے لوگ پھر سے ترکی آذربائجانی کو اپنے صوبے کی سرکاری زبان بنانا چاہتے ہیں۔ آج کل اخبارات میں آیت اللہ شریعت مداری کا ذکر بہت کم آتا ہے۔ اسلامی انقلاب کے دو تین ماہ بعد کے اخبارات کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا تھا کہ آیت اللہ شریعت مداری اور آیت اللہ خمینی میں اسلامی نظام حکومت کی تشریح، توضیح اور تعبیر کے سلسلے میں اختلاف ہو گیا ہے لیکن آیت اللہ مطہری، آیت اللہ طالقانی، آیت اللہ بہشتی، آیت اللہ منتظری اور آیت اللہ خامنہ ای وغیرہ کی وجہ سے آیت اللہ خمینی کے تصور اسلام کو ایران میں قبولیت عام کی سند ملی اور آیت اللہ شریعت مداری اپنے صوبے کے حدود تک محدود ہو کر رہ گئے۔ ابھی پچھلے ماہ (ستمبر ۱۹۸۱ء) ہی جو بم کا دھماکہ ہوا تھا اس میں شہر تبریز کے امام جمعہ اور آیت اللہ خمینی کے معتمد خاص جاں بحق ہو چکے ہیں۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اب آذربائجان میں بھی بے چینی اور بے اطمینانی کا مظاہرہ ہونے لگا ہے اور کچھ نہیں

کہا جا سکتا کہ اس صوبے میں کوئی دوسری تحریک ابھر کر سامنے آتی ہے تو وہ بھی بہرحال مذہبی تحریک ہی ہوگی جس کی سربراہی آیت اللہ شریعت مداری کر رہے ہوں گے۔ یہ تحریک دو بنیادوں پر قائم کی جا سکتی ہے ایک تو یہ کہ ترکی آذر بائجانی کو اس صوبے کی زبان قرار دیا جائے دوسری یہ کہ اُس تصور اسلام کو صحیح تصور اسلام سمجھا جائے جو آیت اللہ شریعت مداری کا تصور اسلام ہے۔ اس حقیقت کے باوجود ابھی آذر بائجان کا مسئلہ ایک زیر زمین مسئلہ کی سی حیثیت رکھتا ہے جو پھوٹ پڑنے کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں ہے۔

کردوں کا مسئلہ آذر بائجانیوں کے مسئلہ کے بالکل برعکس ہے اور اس وقت ایران کا ایک سنگین مسئلہ بنا ہوا ہے۔ کرد لسانی اقلیت بھی ہیں اور مذہبی اقلیت بھی۔ ان کی بیشتر آبادی عراق، ایران سرحد پر بسی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کو غیر ملکی بالخصوص عراقی امداد بھی ملا کرتی ہے تاکہ وہ ایران کے لیے نت نئے مسائل پیدا کرتے رہیں حقیقت حال کچھ بھی ہو اتنا تو مسلّم ہے کہ کردوں کی زبان عام ایرانیوں کی زبان سے بالکل مختلف اور الگ زبان ہے اور ان کا فقہی مسلک بھی ایران کی عام آبادی کے فقہی مسلک سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ کردستان کی دو پارٹیاں، ڈیموکریٹک پارٹی اور "کوملہ" ایران سے الگ ہو کر اپنا ایک جداگانہ وجود قائم کرنا چاہتی ہیں۔ ابھی جولائی (۱۹۸۱ء) کے مہینے میں کردستان کے بعض علماء نے آیت اللہ خمینی سے ملاقات کی اور ان کو اپنی اور اپنے متبعین کی حمایت کا یقین دلایا۔ ان علماء کو جواب دیتے ہوئے آیت اللہ خمینی نے کہا کہ "وہ لوگ جو یہ چاہتے ہیں کہ شیعہ اور سُنّی کا فرق ایجاد کریں وہ نہ سُنّی ہیں اور نہ شیعہ"۔ انھوں نے الزام لگایا کہ اس فتنہ کا نقشہ طائف کی کانفرنس میں کھینچا گیا ہے۔ کردوں کے مسئلہ کو خواہ کسی نے بھی ابھارا ہو، بہرحال یہ حقیقت ہے کہ کردوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ایران سے الگ ہونا چاہتی ہے۔ جو لوگ اس انتہا پر نہیں پہونچے ہیں وہ کم از کم داخلی آزادی کے خواہاں تو ضرور ہی ہیں مگر ان کے اس حق کو نہ تو سابقہ حکومت نے تسلیم کیا تھا اور نہ ہی موجودہ حکومت تسلیم کرتی ہے۔ اب

سے ایک سال قبل ایران اور عراق کے درمیان جنگ شروع ہوئی تھی ، اخبارات میں اب اس کا تذکرہ بالکل نہیں ہوتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگ آج بھی جاری ہے اور طرفین کے کشتوں کے پشتے لگتے چلے جا رہے ہیں ۔ اس جنگ کی وجہ سے دونوں ملکوں کی اقتصادیات بھی متاثر ہو رہی ہے اور کروڑوں روپے کا سرمایہ اس جنگ کی آگ کی نذر ہو رہا ہے ۔ ایسے وقت میں کروڑوں کا نا مطمئن ہونا خطرے کی گھنٹی سے کم نہیں ہے ۔ ایران کی اسلامی حکومت یا یوں کہیئے کہ ایران میں اسلام ان مسائل کو کس طرح حل کرتا ہے ؟ یہ ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جس کا جواب ابھی تک ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے ۔

ان مسائل کے بعد اب امکانات کی طرف آئیے ، جہاں تک ایران میں اسلام کے امکانات کا سوال ہے اس کے بارے میں صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایران کے علماء اپنی جہانگیری و جہانداری کو برقرار رکھ سکے اور عصر حاضر کے مقتضیات کے مطابق ایک "جدید ریاست" کی سربراہی کے فریضے سے عہدہ برآ ہو سکے تو یہ بیسویں صدی کے آخری زمانے کا ایک تاریخی واقعہ ہوگا ، جس کو تاریخ کے صفحات میں زریں حروف سے لکھا جائے گا اور آنے والی نسلیں یاد رکھیں گی کہ مسلمان علماء نے ایک ایسی ریاست کی بنیاد ڈالی تھی جو جدید ریاست ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاست بھی تھی ۔

محمد قاسم صدیقی

سیّد محمود کی تعلیمی خدمات

سید محمود ایک ممتاز ماہر قانون تھے، ایک جج کی حیثیت سے انھوں نے جو شہرت حاصل کی وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ تعلیم کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے وہ بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جن بنیادوں پر قائم ہے اس کا خواب سرسید کے ساتھ ساتھ سید محمود نے بھی دیکھا تھا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان غلامی کا طوق گلے میں ڈال چکا تھا اور اس کا اثر پورے ملک اور تمام قوموں پر پڑا تھا، مگر مسلمانوں کو چونکہ حکمران کی حیثیت حاصل تھی، اس لیے اس انقلاب سے قدرتی طور پر وہ سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ نہ صرف اقتصادی طور پر بلکہ ذہنی طور پر بھی وہ انحطاط کا شکار ہورہے تھے۔ یہ صورت حال بہت ہی مایوس کن تھی، اس کی روک تھام کے لیے، رہبران قوم نے جہاں اور بہت سے علاج سوچے اور تجویز کئے وہاں ایک یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے لیے اعلیٰ اور جدید تعلیم کا انتظام کیا جائے، چنانچہ سرسید کی کوششوں سے علی گڑھ کالج قائم ہوا اور مسلمانوں میں جدید تعلیم رائج کرنے اور مقبول بنانے کے لیے جدّوجہد شروع کی گئی۔ اس جدوجہد کے اصل قائد سرسید مرحوم تھے، مگر ان کی مدد کرنے والوں اور اس تحریک کو کامیاب بنانے والوں میں منجملہ اور لوگوں کے، ان کے

جناب محمد قاسم صدیقی لکچرر شعبۂ تعلیم، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

لائق فرزند سید محمود بھی تھے۔ انھیں مسلمانوں کی تعلیم سے کتنی دلچسپی تھی، اس کا کسی حد تک اندازہ ان کے اس لکچر سے کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے ۲۸ر دسمبر ۱۸۹۳ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ہشتم میں دیا تھا۔ انھوں نے بڑے دکھ کے ساتھ فرمایا تھا:

"اے صاحبو ایمان کی بات یہ ہے کہ ہماری قوم کے دل و دماغ میں فی الحقیقت یہ امر ممکن ہی نہیں ہے کہ زمانہ اپنی رفتار کو کسی کی خاطر روکتا نہیں ہے نہ اس کو کسی خاص قوم یا فرقہ سے مطلب ہے اور نہ اس کو اس بات کی پروا ہے کہ جو قوم و ملت انقلاب روزگار اقتضائے زمانہ سے ناآگاہ یا بے پرواہ رہتی ہے اس پر کیا مصیبتیں آویں گی۔ اب عرض سنئے کہ یہاں تو انگریزی تعلیم کی طرف سے مسلمانوں کا یہ حال کہ اس سے ہر اعتبار سے متنفر اور خود بھی اپنے قومی علوم و فنون سے بے بہرہ .....

جو طریقہ تعلیم زبان انگریزی لارڈ مکالے کے زمانہ میں ۱۸۳۵ء میں منعقد ہوا تھا اس کی کامیابی پر نظر ڈالئے کہ اس کے ذریعہ سے صدہا ہندوستانی زبان انگریزی سے واقف اور ماہر ہوگئے مگر اس زمانہ میں بھی مسلمانوں کی خاص پس ماندہ حالت تعلیم انگریزی پر نگاہ بھی نہ پڑی۔" (لکچر سید محمود صفحہ ۳۶)

سید محمود کو مسلمانوں کی تعلیم سے اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی خود سر سید کو تھی اور انھوں نے ہر ہر قدم پر سر سید کا ہاتھ بٹایا۔ انھیں دکھ تھا تو اسی بات کا کہ مسلمان خود اپنی حالت سے ناواقف ہے اور وہ نہیں جانتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ انھوں نے اسی لئے ایجوکیشنل کانفرنس کے آٹھویں اجلاس ۱۸۹۳ء اور پھر نویں اجلاس ۱۸۹۴ء میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو تاریخ کی روشنی میں پیش کیا اور جدید تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو ان کے دل و دماغ میں جاگزیں کرنے کی کوشش کی۔ ملاحظہ ہو:

"جس قوم کی حالت کا موازنہ کرنا چاہو تو اس قوم کی متوسط الحال اشرافوں کی حالت پر قیاس کرنا چاہیئے کہ یہی طبقہ ہر قوم کا بمنزلہ اس کی ریڑھ کی ہڈی کے

ہے کہ جس کی وجہ سے جسم انسانی کا قیام اور استحکام ہوتا ہے اور جس قوم کو پاؤ کہ اس کے متوسط الحال اشراف فرخندہ حال نہیں ہیں تو جان لو کہ وہ قوم بھی خمیدہ پشت ہے اور فرخندہ حال نہیں ہے۔ پس اے صاحبو جبکہ ممالک بنگال اور مدراس اور بمبئی میں ہندوؤں کے شرفاء اپنی اولاد کو انگریزی علوم و فنون میں تعلیم دینے کے لئے گرمجوشی سے سعی کر رہے تھے اور اس بارہ میں گورنمنٹ کو عرضداشتیں پیش کر رہے تھے اور سرکار اعلیٰ سے اعلیٰ کالج اور اسکول بنا رہی تھی اور اعلیٰ درجہ کی یونیورسٹیاں قائم کر رہی تھی، پوچھنا چاہیئے کہ ہم مسلمان بھائی کس سوچ بچار میں تھے، غور فرمائیے اور حقیقی واقعات کو یاد کیجئے کہ ہماری قوم کے متوسط الحال شرفاء اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کے لئے کیا سامان مہیا کر رہے تھے۔ کیا یہ حق نہیں کہ مستثنیٰ چند اشخاص کو علیحدہ کرکے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہماری قوم کے پس ماندہ نواب زادوں اور امیر زادوں کی یہ حالت تھی کہ تحصیل علوم دینی دنیوی کو روٹی مانگنے والے طالب علموں کا کام سمجھتے تھے اور اپنی شان سے یہ بات نہایت بعید سمجھتے تھے کہ کسی قسم کی سعی اعلیٰ درجہ کے علوم حاصل کرنے میں کریں۔"

(نواں اجلاس، ۱۸۹۴ء)

مندرجہ بالا عبارت سے اس کرب کا اندازہ لگانا مشکل نہیں جس سے یہ دردمند انسان فکرمند اور بے چین رہتا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان کے مسلمان تعلیم کے میدان میں دوسرے ہندوستانیوں سے پیچھے نہ رہیں، انھوں نے مسلمانوں کو اس غفلت سے جھنجھوڑنے کے لئے مضامین کا سلسلہ بھی شروع کیا اور تعلیم سے متعلق تقریریں بھی کیں۔ "تہذیب الاخلاق" کی چوتھی جلد میں ان کے کچھ مضامین شامل ہیں جن سے مسلمانوں کی تعلیم سے ان کی غیر معمولی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔

سرسید احمد خاں نے جب یورپ کا سفر کیا تو اس کا خاص مقصد وہاں کی تعلیمی زندگی کا جائزہ لینا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیم و تربیت کے ان طریقوں سے واقفیت حاصل

کی جائے جن سے مغرب نے اتنی ترقی کی ہے، پھر ان طریقوں کو یہاں رائج کیا جائے۔ وہ مغربی تعلیم وتربیت سے کس قدر متاثر تھے اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو سرسید نے لندن سے محسن الملک کو لکھا تھا:

"افسوس کہ مسلمان ہندستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کو نکالنے والا نہیں ہے۔ ہائے افسوس امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں، ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں.... اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے اور علم کیونکر آتا ہے اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔" (خطوط سرسید صفحہ ۵۸)

سرسید احمد خاں نے کیمبرج یونیورسٹی میں جاکر وہاں کے طریقۂ تعلیم کا تفصیلی مطالعہ کیا لیکن اس مطالعہ میں سرسید کے ساتھ اگر سید محمود نہ ہوتے تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکتے، اس لئے کہ سرسید انگریزی سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ دراصل تعلیم اور تعلیمی نظام کی اس پورے خاکے کے پیچھے سرسید کے اعلیٰ دماغ کے ساتھ ساتھ سید محمود کی دوررس نگاہ بھی شامل ہے۔ ۱۸۸۹ء کی ایجوکیشنل کانفرنس میں خود سرسید نے اس کا اعتراف کیا، ملاحظہ ہو:

"میں بدنصیبی سے انگریزی سے ناواقف تھا، سید محمود کا نہایت شکرگذار ہوں کہ تمام واقفیت اور اطلاعیں جو مجھ کو حاصل ہوئیں اس میں سید محمود نے میری مدد کی مجھ کو اس اقرار سے نہایت خوشی ہے کہ اگر ان کی مدد نہ ہوتی تو جس مقصد سے میں لندن گیا ہوا تھا فضول تھا۔"

"مدرسہ کے بورڈنگ ہاؤس کی اور تعلیم کے طریقہ کی جس پر اس وقت مدرسہ چل رہا ہے اور جس پر آئندہ چلے گا ان کی نسبت یہ کہنا کہ میں ان کا تجویز کرنے والا اور قرار دینے والا تھا ایک ناانصافی ہوگی بلکہ صاف کہنا چاہئے کہ اس کو سید محمود نے تجویز کیا تھا جو انھوں نے اپنے نہایت لائق دوستوں سے صلاح و گفتگو کرنے کے بعد قرار دیا تھا۔"

سرسید کے اس اعتراف کے بعد یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ اس خاکے میں سید محمود نے رنگ بھرا تھا۔ انھیں تعلیم سے اور خاص طور سے مسلمانوں کی تعلیم سے دلچسپی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے۔ وہ مسلمانوں کے سچے بہی خواہ اور تعلیم کے دلدادہ تھے۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کو ایک ایسی تعلیم گاہ کی ضرورت تھی جو ان کی کل ضروریات کو پورا کرے۔ تعلیم کے سلسلے میں ان کی خدمات جلیلہ کسی سے کم نہیں۔ علی گڈھ تحریک کے وہ روح رواں تھے اور دل وجان سے اس کی حمایت کے لئے کام کرتے رہے۔ وہ اس بات کو سمجھ چکے تھے کہ پرانے طرز تعلیم اور طریقۂ تعلیم نہ نئے زمانے کا ساتھ دے سکتے ہیں اور نہ نئے تقاضوں کو پورا کرسکتے ہیں اسی لئے ایک نئے طرز فکر کو لانے کی کوشش کی۔

سید محمود کو مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے کاموں اور تعلیمی ترقی سے جو غیرمعمولی دلچسپی تھی۔ اس کی بنا پر ۱۸۸۷ء میں وہ ایم اے۔ او کالج کے جوائنٹ سکریٹری اور دسمبر ۱۸۸۹ء میں کالج کے ٹرسٹی منتخب ہوئے اور سرسید نے انھیں معتمد اعزازی نامزد کیا۔ انھوں نے ان حیثیتوں میں اپنے فرائض کو بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا اور باوجود مخالفتوں کے سرسید کے کام اور پیغام کو آگے بڑھایا، اسی کے ساتھ ساتھ ہندوستان بھر میں تعلیمی تحریک کو نئے خیالات سے روشناس کرانے کی مہم شروع کی۔

۱۸۸۲ء میں سرسید احمد خاں نے حکومت ہند کے تعلیمی کمیشن کے چیرمین سے اختلاف کی بنا پر تعلیمی کمیشن کی ممبری سے استعفیٰ دیا تو سید محمود کو تعلیمی کمیشن کا ممبر نامزد کیا گیا۔ اس وقت انھیں ہندستانی تعلیمی ڈھانچہ کو سمجھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے کمیشن کے سامنے بڑی جامع تجاویز رکھیں۔ وہ الہ آباد اور کلکتہ یونیورسٹی کے فیلو بھی رہے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے انگریزی تعلیم کا جائزہ لیا اور ۱۷۸۱ء سے لیکر ۱۸۹۳ء تک انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کا تجزیہ کیا۔ اس کتاب سے قبل ایسی کوئی کتاب نہیں تھی جس میں تعلیمی پالیسی اور تعلیمی طریقوں پر بے لاگ تبصرہ

کیا گیا ہو۔ سید محمود چاہتے تھے کہ ملک کے تعلیمی اور سیاسی حالات کا جائزہ لیکر ایسے اقدامات کئے جائیں کہ مسلمان موجودہ پستی سے نکل سکیں۔ مرحوم نے اس کتاب میں اعداد و شمار کی روشنی میں وضاحت کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ مسلمان تعلیم کے میدان میں دوسری قوموں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں۔ انھوں نے ۱۸۷۰ء کی تعلیمی کمیٹی کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ کس طرح حکومت ہند نے ۷ اگست ۱۸۷۱ء کو ایک تجویز کا اعلان کیا جس میں ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کی اہمیت کو واضح کیا گیا۔ اس تجویز کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کی حالت پر حکومت ہند نے کئی مرتبہ توجہ فرمائی ہے تو نفنٹنٹ حال جناب نواب گورنر جنرل کے حضور میں پیش ہوا اس سے ظاہر ہے کہ سوائے ممالک مغربی اور شمالی اضلاع پنجاب کے کہیں اور مسلمان کافی طور پر یا اور لوگوں کی بہ نسبت اپنی تعداد کے انداز پر سرکاری تعلیم سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ کمال افسوس کی بات ہے کہ ایسا فرقہ جس کے ہاں قدیم علم انتشار اور اعلیٰ درجہ کے علوم کی کتابیں موجود ہوں اور جس میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بالتخصیص علم کے تحصیل کرنے اور رواج دینے کے عادی ہیں سرکاری سلسلہ تعلیم سے علیحدہ ہیں اور ان خاص وعام فائدوں سے محروم رہتا ہے جن کو اور لوگ حاصل کرتے ہیں۔" (تہذیب الاخلاق، ۱۸۷۳ء صفحہ ۳۱)

آج ملک اور مسلمانوں کے حالات یکسر بدل گئے، مگر مسلمانوں کی تعلیمی پستی کا رونا اب بھی اسی طرح رویا جاتا ہے جس طرح سرسید اور محمود کے زمانے میں رویا جاتا تھا۔ سرسید اور ان کے رفقاء کے بعد، ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھیوں نے تعلیمی میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں اور مسلمانوں کی تعلیمی خدمت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، مگر اب میدان صاف نظر آتا ہے۔

احسن علی خاں

موت

جناب احسن علی خاں احسن، ابھی حال میں اسلام آباد (پاکستان) سے اپنے سابق وطن بھوپال تشریف لائے تھے، واپسی میں شعبۂ اردو کی دعوت پر جامعہ بھی تشریف لائے اور از راہِ کرم ایک نظم (موت) اور ایک غزل سنائیں، جنھیں قارئین جامعہ کی دلچسپی کے لیے شائع کیا جاتا ہے۔

موت!
کب آؤ گی؟
میری خواہش ہے
مرنے سے پہلے میں دیکھوں تمھیں
یہ بتاؤ کہ کس روپ میں آؤ گی؟
خوف بن کر نہ آنا
کہ میں تم سے ڈرتا نہیں
رحم بن کر نہ آنا
کہ مجھ کو یہ احسان گوارا نہیں
درد بن کر نہ آنا
کہ تم زندگی سے زیادہ اذیت نہ پہنچا سکو گی
زہر بن کر نہ آنا

کہ ہے میری رگ رگ میں
انسانی سانپوں کے کاٹے کا بِس
اور اپنا بھی زہر
موت !
اک رات چپ چاپ آ جاؤ تم
پیارن کر مرا
میری بالیں پہ زلفوں کو لہراؤ تم
میرے ہونٹوں پہ رکھ کر تم اپنا دہن
مجھ میں جو زہر ہے
چوس لو
اور پھر
پیار سے
اپنی باہوں میں لے لو مجھے
اپنی آغوش میں جذب کر لو مجھے
پریم ساگر میں اپنے سمو لو مجھے
میں کہ پیاسا رہا عمر بھر پیار کا

احسن علی خاں

غزل

یہ ہست و بودِ نقوش طفلِ ہوا کا اک مشغلہ ہو جیسے
ہماری ہستی بھی ریگِ صحرا پہ نقشِ دستِ صبا ہو جیسے
ابھی کہیں کچھ مٹا ہو جیسے ، ابھی کہیں کچھ بنا ہو جیسے
ہم اہلِ دنیا کی موت ہی کیا حیات بھی حادثہ ہو جیسے
رہِ وفا میں اب ایسی منزل پہ آ گئے ہیں کہ لگ رہا ہے
ہمارا آغازِ سرکشی ہی مآلِ رسمِ وفا ہو جیسے
اکیلے اپنے ہی دل سے کرتے تھے اس کی باتیں مگر اچانک
ہم ایسے محتاط ہو گئے ہیں کوئی ہمیں سُن رہا ہو جیسے
نہ کوئی پیغام نے اشارہ مگر یہ عالم ہے اپنے دل کا
کہ اَن کہی بات کا بھی اس نے جواب ہم کو دیا ہو جیسے
نگاہ والے کہیں گے حُسنِ ستم کہ حُسنِ شہادت اس کو
یوں دستِ قاتل پہ منجمد ہے لہو کہ رنگِ حنا ہو جیسے
خدا سے مجبوریوں کا شکوہ بجا سہی پر جناب انساں
جہاں بھی مختار آپ ہیں واں لگے ہے قہرِ خدا ہو جیسے
چمن کو تاراج کرنے والوں پہ کون انگلی اٹھائے احسنؔ
کھڑے ہیں لوگ ایسے سر جھکائے کہ ان کی اپنی خطا ہو جیسے

عبداللطیف اعظمی

تعارف و تبصرہ

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہیں)

غالب اور صفیر بلگرامی

مشفق خواجہ

سائز $\frac{22 \times 18}{8}$، حجم ۲۰۳ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت: ۲۵ روپے،

طبع اول: ۱۹۸۱ء، ناشر: عصری مطبوعات۔ ا ے / ۳۲۲، بلاک ڈی۔ نارتھ

ناظم آباد۔ کراچی۔ ۳۳ (پاکستان)

پیش نظر کتاب کے فاضل مؤلف جناب مشفق خواجہ صاحب کا پاکستان کے اہم محققین میں شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے کئی اہم کتابیں لکھی اور مرتب کی ہیں اور یہ سب کی سب اردو ادب میں اہم اور ممتاز حیثیت کی حامل ہیں، زیر تبصرہ کتاب بھی معیار اور تحقیق کے لحاظ سے غالبیات میں مفید اور قیمتی اضافہ ہے۔

صفیر بلگرامی غالب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ان کا پورا نام سید فرزند احمد صفیر بلگرامی ہے، ۷/ اپریل ۱۸۳۴ء کو پیدا ہوئے اور تقریباً ۵۶ سال کی عمر میں، ۱۲/ مئی ۱۸۹۰ء کو عظیم آباد میں انتقال کیا اور آرہ میں تدفین ہوئی۔ صفیر کے بارے میں فاضل مولف نے لکھا ہے: "صفیر کا شمار غالب کے نامور تلامذہ میں ہوتا ہے، انھیں اپنے استاد پر بے حد فخر و ناز تھا۔ اپنی تصانیف میں انھوں نے غالب کا ذکر نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ صفیر اور غالب کے تعلقات کا آغاز ۱۲۸۰ھ سے ہوتا ہے، جب صفیر نے غالب سے شاگردی کی درخواست کی تھی۔ ۱۲۸۱ء تک صفیر و غالب میں خط و کتابت رہی، ۱۲۸۲ھ کے شروع میں صفیر دہلی گئے اور وہاں دو ڈھائی مہینے قیام کیا، اس مدت میں انھیں غالب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔" (صفحہ ۴۸)

بقول ناشر: "زیر نظر کتاب میں غالب و صفیر کے تعلقات کی تفصیل پیش کی گئی ہے، دونوں

کی مراسلت اور ملاقاتوں کی روداد کے ساتھ وہ تمام تحریریں بھی یک جا کردی گئی ہیں جو صفیر نے غالب کے بارے میں لکھی تھیں اور شائع نہیں ہوئی تھیں یا شائع ہوئی تھیں تو اب عام طور پر دستیاب نہیں ہوتیں۔ مصنف نے بہت سی قلمی اور نادر مطبوعہ کتابوں سے استفادہ کرکے بہت سا ایسا مواد جمع کیا ہے جو پہلی مرتبہ منظر عام پر آرہا ہے، اس میں غالب و صفیر کے بارے میں بہت سی نئی باتیں ہیں اور دونوں کے ایک دوسرے کے نام خط پہلی مرتبہ صحیح اور مکمل صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔"

اس کتاب میں کل ۱۳ خط ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :

۱۔ مکتوب صفیر بنام غالب : ۵ عدد

۲۔ مکتوب غالب بنام صفیر : ۶ عدد

۳۔ مکتوب صاحب عالم مارہروی بنام غالب : ۱ عدد

۴۔ مکتوب شاہ عالم مارہروی بنام غالب : ۱ عدد

غالب کے نام صفیر کا پہلا خط، جو بہت ہی مختصر ہے، نمونے کے طور پر ذیل میں درج کیا جاتا ہے، ملاحظہ ہو :

"جناب معلی القاب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب نظام جنگ مدظلہ،

سید فرزند احمد صفیر بلگرامی نبیرۂ حضرت سید صاحب عالم صاحب و قبلہ مدظلہ کہ نادیدہ اشتیاق حضوری اور آرزوئے قدم بوسی رکھتا ہے، بوسیلۂ تحریر پُرتاثیر جناب نانا صاحب و قبلہ مدظلہ سلکِ شاگردانِ خاص میں منسلک ہوا چاہتا ہے۔ مجھے زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں کہ میرا وسیلہ بڑا ہے۔ ایک مخمس غزل قدسی کا نعت میں جو بالفعل کہا ہے، ملفوف ہے۔ والتسلیم۔" (صفحہ ۴۹)

مذکورہ بالا خط پر تاریخ نہیں ہے اور خیال ہے کہ یہ خط غالب کو بھیجا نہیں گیا اور اس کے بجائے فارسی میں دوسرا خط لکھ کر بھیجا گیا۔ فاضل مصنف اس خط کے بارے میں لکھتے ہیں: "... کہیں ایسا تو نہیں کہ صفیر نے غالب کے نام پہلے اردو میں خط لکھا ہو، پھر اسے مسترد کرکے فارسی میں تحریر کیا ہو

اردو خط کا مسودہ ان کے کاغذات میں پڑا رہا ہوگا جسے بعد میں "انشائے سید گل" میں شامل کر لیا گیا۔"
["انشائے سید گل"، خطوط کا مجموعہ ہے جسے صفیر کے ایک شاگرد سید محمد ہاشم نے مرتب کیا تھا۔]
غالب نے صفیر بلگرامی کو جو پہلا خط لکھا ہے اس کا پہلا پیرا ذیل میں درج کیا جاتا ہے ملاحظہ ہو:

"مخدوم مکرم سید فرزند احمد صاحب کو سلام پہنچے۔ مجھ کو حضرت برجیس فطرت جناب حضرت صاحب عالم صاحب سے نسبت اویسی ہے۔ غائبانِ حاضر کی فہرست میں پہلے میرا نام مرقوم ہے۔ آپ کی طرزِ نگارش نظماً او نثراً درخشندگی جوہر طبع سے خبر دیتی ہے۔ اگر آپ کی طرف سے استصلاح کا کلمہ درمیان نہ آتا تو میں فضولی نہ کرتا، باوجود خواہش خدمت کیوں نہ بجالاؤں؟ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری معلومات آپ پر مجہول نہ رہیں مجموع ایک ورق میں کیونکر گنجائش پائیں۔ ناگزیر جو اس نظم و نثر میں ہے، اس کو عرض کرتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔"
(صفحہ ۵۵)

چشتی تعلیمات اور عصر حاضر میں ان کی معنویت مولفہ: ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۸۰ صفحات، غیر مجلد، قیمت: ۹ روپے پچاس پیسے
طبع اول: جنوری ۱۹۸۱ء۔ ناشر: اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صاحب اردو کے معروف ادیب اور مصنف ہیں اور اس کتاب کے مقدمہ نگار جناب خواجہ حسن ثانی نظامی (جامعی) کے الفاظ میں: "تصوف کی دنیا میں بھی ان کا بڑا مقام ہے، موصوف شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کی اولاد میں اور چشتیہ صابریہ سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت شاہ سلیمان احمد امروہویؒ (سجادہ نشین درگاہ حضرت شاہ عبدالہادی چشتی علیہ الرحمۃ) کے نواسے ہی نہیں، ان سے فیض یافتہ بھی ہیں، اس لئے عہد حاضر میں چشتی تعلیمات کی معنویت کو سمجھنے اور سمجھانے کا حق ان سے زیادہ اور کون ادا کر سکتا ہے۔" (صفحہ ۱۱)

زیرِ تبصرہ مختصر کتاب حرفِ ابتدا (از مصنف)، مقدمہ (از جناب خواجہ حسن ثانی نظامی) اور پیش لفظ (از کرنل سید بشیر حسین زیدی) کے علاوہ حسبِ ذیل پانچ ابواب پر مشتمل ہے:

(۱) چشتی تعلیمات (۲) خانقاہی تربیت کا نصاب: نفس کشی، ترکِ دنیا، روحِ عبادات، خدمتِ خلق (۳) خانقاہی تربیت کا ماحصل: توبہ و استقامت، صدق و اخلاص، اطعام، توکل، انفاق (۴) عہدِ حاضر میں چشتی تعلیمات کی معنویت (۵) صوفیا کا تصورِ عشق: عقل اور عشق، ذکر کی حکمت، کثرتِ ذکر کا فلسفہ، ذکر کا جواز، مراقبہ کا جواز، مراقبہ اور اس کی ماہیت۔

اسلامی تصوف کیا ہے اور اس پر دوسرے مذاہب، تعلیمات اور نظریات و رسم و رواج کے کیا اثرات پڑے ہیں، اس کی تفصیلات میں بڑا اختلاف ہے، لیکن آج کل اسلامی تصوف کے نام سے جو تصوف رائج اور مقبول ہے اور خانقاہوں اور درگاہوں کی جو حالت ہے اس کے بارے میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ غیر اسلامی ہے۔ اس کتاب کے فاضل مصنف کی نظر چونکہ اسلامی تصوف پر بھی ہے اور خانقاہوں اور درگاہوں کے اندرونی حالات سے بھی بخوبی واقف ہیں، اس لیے اس سلسلے میں ان کی رائے کی بڑی اہمیت ہے۔ "حرفِ ابتدا" میں وہ لکھتے ہیں: "اسلامی تصوف روحانی بلندی اور اخلاقی پاکیزگی کا "حال" تھا یعنی علم کا عملی نمونہ لیکن اس پر سیاسی زوال اور اخلاقی انحطاط کا سایہ پڑا تو یہ محض "برا حال" بن کر رہ گیا۔ تصوف کا اولین مقصد احتسابِ نفس تھا لیکن یہ اکتساب کا ذریعہ بنا لیا گیا۔ صوفیا اپنے مقاماتِ روحانی اور مریدوں کی اخلاقی بیماریوں کی پردہ پوشی کرتے تھے لیکن آج کے صوفی، تصوف اور کرامات کا اشتہار بن گئے ہیں۔ تصوف سراسر ادب اور تہذیب تھا لیکن اب خودسری و بے عملی کا دوسرا نام رہ گیا ہے۔ اس میں عجز و انکسار، فقر و فنا اور بذل و ایثار کی تعلیم دی جاتی تھی اب تصوف کے نام پر زیادہ تر خودبینی، خودنمائی، خودغرضی، خودفریبی اور خدا فریبی، دنیا پرستی، جاہ طلبی اور غرور و نخوت کے نمونے سامنے آتے ہیں" (صفحہ ۹)

کتاب کے نام اور مقصد کے لحاظ سے سب سے اہم باب چوتھا ہے جس کا عنوان ہے: "عہدِ حاضر میں چشتی تعلیمات کی معنویت"، اس کا آغاز اس زمانے سے ہوتا ہے جب مسلم حکومت قائم تھی اور چشتی مشائخ نے اپنا نظامِ تربیت جاری کیا تھا۔ اس کے بعد موجودہ حالات اور کیفیات کا

جائزہ لیا گیا ہے، اس سلسلے میں فاضل مصنف نے لکھا ہے: "اُس وقت بدی اور اکل حرام اپنی اصلی شکل میں سامنے آجاتے تھے اور آج اُن کے چہرے پر ستر نقابیں ہوتی ہیں"، مزید لکھتے ہیں: "آج کا معاشرہ یہ ہے کہ انسان کے ضمیر کی آواز مشینوں کی گڑگڑاہٹ میں گم ہوگئی ہے، ایمان کا خداوندی نور، بجلی کی آنکھیں خیرہ کردینے والی روشنی میں دب رہا ہے، روپے کی افراط، تعیشات اور تنعمات کی فراوانی، مشینوں کی حکمرانی، مہلک ہتھیاروں کا پھیلاؤ، مختلف فلسفوں اور عقیدوں کا ٹکراؤ، اصطلاحوں کی بھرمار، لفظوں کی یلغار، معانی کی موت —— اخلاق اب ایک تصور پارینہ ہے، انسانیت ایک اسم بے مسمیٰ اور روحانیت ایک لفظِ بے مدلول"۔ اس جائزے کا اختتام اس پر ہوتا ہے: "آج یورپ اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملکوں میں اس روحانی پیاس کا یہ حال ہے کہ جن عقائد اور فلسفوں پر مذہب کے تمسخر کا شبہ ہوتا ہے انھیں بھی وہاں شوکت اور طاقت حاصل ہورہی ہے، روحانیت کی دوکانیں کھلی ہوئی ہیں، روحانی غذا کے نام سے مسموم اور مہلک چیزیں نہایت خوبصورت پیکنگ میں آرہی ہیں۔۔" (صفحات ۵۰-۵۱) اس کے بعد فاضل مصنف ان "امراض" یا خرابیوں کا علاج تجویز کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "آج وہ وقت تھا کہ چشتی خانقاہوں کا جال ہندستان سے نکل کر یورپ اور امریکہ کی سرزمین تک پھیلا یا گیا ہوتا، [صوفیائے کرام] کی تعلیمات کو "عملی" شکل میں ان روحانیت کے پیاسوں کے سامنے پیش کیا جاتا، لیکن کیسا افسوس ہے کہ اب وہ خانقاہیں سونی پڑی ہیں اور وہ چراغ بجھ چکے ہیں۔۔۔ حالانکہ آج کے تاریخی سیاق میں درگاہوں سے وابستہ حضرات ایسی حالت میں ہیں کہ وہ ایک طرف خود مسلمانوں کی روحانی جلا اور اخلاقی سدھار میں معاون ہوسکتے ہیں اور ان کی رہنمائی کرسکتے ہیں، دوسری طرف وہ غیر مسلم برادرانِ وطن سے بہتر تعلقات استوار کرنے میں بڑا رول ادا کرسکتے ہیں۔۔۔" (صفحات ۵۱-۵۲)

کسی زمانے میں صوفیائے کرام نے سماج کے بگاڑ کی اصلاح کے لئے اور مختلف فرقوں اور مذاہب میں قومی یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کامیاب کوششیں کی تھیں، اگر اسی انداز اور اسی خلوص کے ساتھ آج بھی کوششیں کی جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی نہ ہو۔

سوسائٹی کے نائب صدر جناب کرنل بشیر حسین زیدی صاحب نے پیش لفظ میں لکھا ہے:

"اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی نے ایک ایسے سلسلۂ مطبوعات کا آغاز کیا جس میں اسلام،

ہندومت، بدھمت، عیسائیت وغیرہ کی تعلیمات پر اسی مذہب کے ممتاز علماء سے کتابیں آسان اور عام فہم اسلوب میں لکھوائی جائیں۔ ... " یہ ارادہ بہت ہی نیک اور مفید ہے، خدا کرے کہ یہ سلسلہ جلد شروع کیا جائے اور خاطر خواہ اس میں کامیابی ہو۔

علم حدیث اور چند اہم محدثین

سالم قدوائی

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۲۰۰ صفحات، مجلد، قیمت : ۱۵ روپے۔ طبع اول: جون ۱۹۸۱ء
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

زیر تبصرہ کتاب کے مصنف ڈاکٹر محمد سالم قدوائی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ ہیں اور تصنیف و تالیف کا ذوق اور اسلامی علوم سے علم و واقفیت کا جذبہ انھیں اپنے والد مرحوم مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی سے ترکے میں ملا ہے، اس وقت مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز میں استاد ہیں۔

کتاب کے شروع میں فاضل مولف کا مختصر پیش لفظ ہے، اس کے بعد مولانا محمد تقی امینی (ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی) کے قلم سے مقدمہ ہے جس میں موصوف نے کتاب اور اس کے مباحث کے بارے میں اظہار خیال فرمایا ہے، مولانا کی قرآن، حدیث اور فقہ پر گہری اور وسیع نظر ہے اور اسی کے ساتھ مقتضیات زمانہ سے بھی پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ پیش لفظ اور مقدمے کے علاوہ کتاب حسب ذیل ابواب پر مشتمل ہے: (۱) تاریخ تدوین حدیث (۲) اصول حدیث (۳) اصطلاحات حدیث (۴) امام ابوحنیفہؒ (۵) امام مالکؒ (۶) امام شافعیؒ (۷) امام احمد بن حنبلؒ (۸) امام بخاریؒ (۹) امام مسلمؒ (۱۰) امام ابوداؤدؒ (۱۱) امام ترمذیؒ (۱۲) امام نسائیؒ اور (۱۳) امام ابن ماجہؒ۔

کتاب لکھتے وقت یونیورسٹی کے طالب علموں کے ذہن اور معیار اور ان کے نصاب تعلیم کو پیش نظر رکھا گیا ہے، مگر اسلام اور اسلامی علوم و مسائل سے عام دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بھی بہت مفید اور کارآمد ہے، البتہ یہ کتاب صرف فقہائے اربعہ تک محدود ہے، میرے خیال میں اگر اثنا عشری فقہاء کو بھی شامل کر لیا جاتا تو اس کی افادیت میں بہت اضافہ ہو جاتا۔

آجکل مختلف مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا رواج بہت مقبول ہو رہا ہے اور ملک کی قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے لئے اسے بہت مفید اور ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ مسلمانوں کے دو بڑے فرقے ــــ سنی اور شیعہ، کی ہم آہنگی کی طرف اب تک کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ عربی مدارس اور یونیورسٹیوں کے شعبۂ دینیات میں دونوں فرقوں کے الگ الگ نصاب تعلیم رائج ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے کے علوم اور مذہبی خیالات وافکار سے گہری واقفیت بالکل نہیں ہوتی۔ بہت سی غلط فہمیاں محض ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر یونیورسٹیوں اور عربی مدارس میں، کسی وجہ سے، مشترک تعلیم کا انتظام نہیں ہوسکتا تو کم از کم مذہبی کتابوں میں تو دونوں فرقوں کے بنیادی عقائد اور خیالات کو معروضی انداز سے پیش کرنا چاہیے۔

بہرحال جو لوگ علم حدیث اور مشہور محدثین وفقہا کے متعلق اختصار کے ساتھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے اور عام مطالعہ کے لئے اسے ہر کتب خانے میں ہونا چاہیے۔

یادِ وطن (ایک طویل مثنوی) عبدالمجید شمس عظیم آبادی

سائز $\frac{22 \times 18}{8}$ ۔ حجم ۱۱۱ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت: دس روپے۔ طبع اول: ۱۹۸۰ء

ناشر: سائنٹیفک پبلیشرز۔ مجید ویلا ۔ پٹنہ ۔ ۸۰۰۰۰۶

کسی زمانے میں اردو میں بڑی شاندار مثنویاں کہی گئی ہیں اور ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ان میں سے بہت سی اب بھی اردو زبان و ادب کی جان سمجھی جاتی ہیں، مگر اب اس صنف شاعری کا بڑی حد تک رواج ختم ہوگیا ہے، مگر زیر تبصرہ کتاب کے مصنف "ڈاکٹر عبدالمجید شمس عظیم آبادی" کو اس صنف سے خصوصی دلچسپی ہے۔ اس سے قبل موصوف کی دو طویل مثنویاں "حیات وکائنات" اور "جلوۂ صد رنگ" شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہیں اور اب یہ تیسری طویل مثنوی: "یادِ وطن" شائع ہوئی ہے۔ اس مثنوی میں "وطن" کا لفظ محدود معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، یعنی اس سے مراد ملک نہیں ہے بلکہ شاعر کا گاؤں ہے، جہاں وہ پیدا ہوئے اور پلے بڑھے، اگرچہ اب اس گاؤں کو چھوڑ کر مستقل طور پر پٹنہ میں بس گئے ہیں، مگر اس سے جذباتی اور قلبی تعلق اب بھی باقی ہے۔ خود فاضل مصنف

لکھتے ہیں: "یہ ناچیز اسی خاک سے ابھرا، یہیں کی آب و ہوا میں نشو و نما پاتا رہا اور اپنی عمر کے تقریباً چالیس ابتدائی سال تک یہیں کے ماحول سے فیض یاب ہوتا رہا، اس طرح یہاں کی قدرتی اور معاشرتی فضا سے میرا گہرا رابطہ قائم ہو گیا اور اس گاؤں اور اس کے قرب و جوار کی کھلی، پرسکون اور رنگین فضاؤں، یہاں کے باشندوں، یہاں کی یک جہتی، بے غرض محبت اور ایثار کے جذبات نے میری زندگی کی کچی مٹی پر گہرے نقوش ڈالے۔ اب ۲۵ سال کی علیحدگی کے بعد بھی اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، اسے یاد کرتا ہوں۔" (صفحات ۷-۸)

ریاست بہار کے مشہور شاعر اور تنقید نگار پروفیسر سید شاہ محمد عطا الرحمٰن عطاؔ کاکوی نے اس مثنوی کے بارے میں نظم کی صورت میں اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں:

شمسؔ نے کیا خوب لکھی مثنوی "یادِ وطن" ۔۔۔ اس کا ہر ہر شعر ہے گویا چمن اندر چمن
یہ تسلسل، یہ روانی اور یہ اسلوبِ بیان ۔۔۔ اس کے ہیں اشعار یوں پیوستہ جیسے جان و تن
تذکرہ اہلِ وطن کا ایسی دلسوزی کے ساتھ ۔۔۔ مثنوی کی صنف میں کہیے اسے ردِ سخن
"جلوۂ صد رنگ" ہو یا ہو "حیات و کائنات" ۔۔۔ ان میں فرسودہ مضامیں ہیں نہ اسلوبِ کہن
جدتِ مضموں ہے اس "یادِ وطن" میں بھی وہی ۔۔۔ اس کے ہر ہر شعر سے تازہ ہوئی "یادِ وطن"

آخر میں جناب عطاؔ نے دعا فرمائی ہے اور یہی دعا اور خواہش اس خاکسار تبصرہ نگار کی بھی ہے:

ہے عطاؔ کی یہ دعا، مقبول ہو یہ مثنوی
شمسؔ کی تنویر قائم رکھے ربِّ ذوالمنن

تعلیم و تدریس — فاطمہ انیس

سائز ۲۲×۱۸/۸ ـ حجم ۱۷۵ صفحات، غیر مجلد، کاغذ و طباعت معمولی۔ قیمت: ۱۰ روپے
تاریخ اشاعت: ستمبر ۱۹۷۹ء۔ ناشر: خیابان پبلی کیشنز۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۲۳۹ بمبئی۔ ۴۰۰۰۰۹

زیرِ تبصرہ کتاب کی مصنفہ، محترمہ فاطمہ انیس، شولاپور (مہاراشٹر) کی رہنے والی ہیں اور ایک طویل عرصہ سے بمبئی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں، نیز انجمن خیر الاسلام گرلز ہائی اسکول مدن پورہ بمبئی کی پرنسپل ہیں۔ موصوفہ مئی ۱۹۷۷ء سے بمبئی کے مشہور روزنامہ "انقلاب"

کے مخصوص کالم "تعلیم و تدریس" کے لئے ہر ہفتہ تعلیمی مسائل پر مختصر مضمون لکھتی ہیں۔ پیش نظر کتاب کی اشاعت تک، جو غالباً محترمہ کی پہلی کتاب ہے، فاضل مصنفہ نے تعلیم کے مختلف مسائل پر تقریباً ۷۰ مضامین لکھے تھے، جن میں سے ۳۲ مضامین کا انتخاب اس کتاب میں شامل ہے، انتخاب کے بارے میں محترمہ نے پیش لفظ میں لکھا ہے: "میں نے ان مضامین کا انتخاب کیا ہے جو خالص تعلیمی نوعیت کے ہیں، ان مضامین کو شامل نہیں کیا جو وقتی مسائل پر لکھے گئے ہیں" مگر چونکہ یہ مضامین بمبئی کے ایک اخبار میں شائع ہوئے ہیں اور فاضل مضمون نگار کا تعلق مہاراشٹر کے ایک اسکول سے ہے، اس لئے بعض مضامین میں ایسے مسائل اور طریقوں کا ذکر ہے، جن کا تعلق صرف مہاراشٹر کے اسکولوں سے ہے، لیکن بحیثیت مجموعی ایسے تعلیمی اور تدریسی مسائل پر بحث و گفتگو کی گئی ہے جو کم و بیش ملک کے سبھی اسکولوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ملک کے مشہور سیاست داں اور دانشور جناب رفیق زکریا نے اس کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے: "مضامین میں ماہرین تعلیم خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر ذاکر حسین، برٹرنڈ رسل، ڈیوی اور مہاتما گاندھی کے خیالات کی بڑے صحیح انداز میں، بروقت، برموقع ترجمانی کی گئی ہے"۔

فاضل مضمون نگار نے زیادہ تر عام تعلیمی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے، مگر چند مضامین میں مسلمانوں کے خصوصی تعلیمی مسائل پر بھی توجہ کی ہے، مثلاً: مسلم تعلیمی ادارے اور چند اہم مسائل، مسلم تعلیمی ادارے اور اساتذہ، مسلم معاشرہ اور تعلیمی مسائل ــ ایک جائزہ اور مسلم طلبہ کے لئے پیشہ ورانہ تعلیم کی ضرورت و اہمیت ــ ان مضامین میں موصوفہ نے اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کیا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ تعلیمی حلقوں میں یہ یہ کتاب پسند کی جائے گی اور مقبول ہوگی۔

دید و دریافت (حصہ اول) — شمس بدایونی

سائز $\frac{20\times30}{16}$، حجم ۲۳۲ صفحات، غیر مجلد، قیمت: ۱۲ روپے، طبع اول: اگست ۱۹۸۰ء
ناشر: روشن پبلیکیشنز۔ روشن محل۔ سوتھ۔ بدایوں (یوپی)

جناب شمس بدایونی رسالہ "روشن" کے ایڈیٹر اور ایک نوجوان ادیب ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ان کے مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ہیں، چونکہ ان تمام مضامین کا تعلق سرزمین بدایوں سے ہے، اس لئے شروع میں ایک مضمون بدایوں کے بارے میں ہے جس میں تفصیل سے اس کی

علمی و ادبی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے بعد جو مضمون شامل ہے اس کا عنوان ہے: "غالب بدایوں میں"۔ یہ مضمون چونکانے والا ہے اور ممکن ہے یہ عنوان اسی خیال سے رکھا گیا ہو، کیونکہ ماہرین غالبیات کے لیے یہ بالکل نئی بات ہوگی کہ غالب کبھی بدایوں بھی گئے تھے۔ اگرچہ اس مضمون میں ایک جگہ یہ بھی درج ہے کہ: "کچھ روایتیں ایسی بھی ہیں کہ غالب نے اپنی زندگی کے کچھ ایام بدایوں میں گزارے۔ یہ روایتیں بدایوں کی چند پرانی شخصیات سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں، اس روایت کو کچھ تقویت صباح الدین عمر کے مرتب کردہ رسالہ اتر پردیش سے بھی ملتی ہے جس میں تحریر ہے کہ غالب نے اپنی زندگی کے کچھ ایام بدایوں میں گزارے۔" لیکن خدا کا شکر ہے کہ فوراً ہی اس کی تردید بھی کردی گئی۔ لکھتے ہیں: "صباح الدین صاحب نے کوئی سند پیش نہیں کی، جس کے سبب یہ تحریر بھی محض قیاس ثابت کردی گئی" (صفحہ ۳۸)، مگر اصل میں اس مضمون میں یہ دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بدایوں کے اہل نظر نے غالب پر بہت کچھ لکھا ہے اور غالب کے شاگردوں میں بدایوں کے لوگ بھی کافی تعداد میں ہیں۔ اس سلسلے میں صفحہ ۴۰ سے صفحہ ۴۶ تک تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، اس مضمون کے آخر میں فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں: "غالب کا بدایوں سے یا بدایوں کا غالب سے جو تعلق رہا ہے اس کو میں بڑی حد تک روشنی میں لے آیا ہوں۔ تاہم ابھی متعدد گوشے تاریکی میں ہیں، تحقیق و جستجو کا سلسلہ جاری ہے، امید ہے کہ جلد ہی اپنی تحقیق کاوشوں کو ایک الگ مبسوط اور جامع کتاب کی شکل میں پیش کروں گا" (صفحہ ۶۲)

اس کے علاوہ حسب ذیل مضامین اس کتاب میں شامل ہیں:

دیبی پرشاد سحر، بیخود بدایونی۔ فانی اور تسنیم (منشی من موہن لال ماتھر بریلوی) تولا بدایونی، علی حاتم بدایونی، ذوق سبزواری، قمر الدین احمد قمر، وحید احمد، شکیل بدایونی، دلاور فگار، دیبی پرشاد ملسبینہ، خالد بدایونی، آخر میں فانی بدایونی کی منتخب کتابیات ہے۔

بدایوں کی علمی و ادبی خدمات پر اور بدایوں کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں یہ کتاب بہت مفید ہے اور فاضل مصنف اپنی پیش کش میں خاصے کامیاب ہیں۔ امید ہے کہ ان کی محنت کی قدر کی جائے گی۔

نومبر کے شمارے میں تاخیر

ماہنامہ جامعہ ہر ماہ کی چار یا پانچ تاریخ کو شائع ہوتا ہے اور ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ رسالہ وقت پر پوسٹ کیا جائے، مگر چونکہ آجکل پریس میں کچھ نئے انتظامات کیے جا رہے ہیں، اس لیے نومبر کا شمارہ کسی قدر تاخیر سے شائع ہوگا، جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ (ادارہ)

ڈاکٹر انصاری نمبر

ماہنامہ جامعہ کے جون اور جولائی ۱۹۸۱ کا مشترک شمارہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کی یاد میں، شائع کیا گیا ہے جس میں کئی مضامین ایسے لوگوں کے ہیں جنھوں نے مرحوم کو قریب سے دیکھا تھا اور ان کے ساتھ ایک رفیق کی حیثیت سے برسوں کام کیا تھا۔ قیمت تین روپے۔ ڈاک سے منگوانے کی صورت میں ساڑھے پانچ روپے۔ جو حضرات ایک سال کی خریداری قبول فرمائیں گے، انھیں دو شماروں کے بدلے مفت بھیجا جائے گا۔

ماہنامہ جامعہ کی سالانہ قیمت

۱۔ ہندوستان کے لیے	۹ روپے
۲۔ پاکستان کے لیے	۳۰ روپے
دوسرے بیرونی ممالک کے لیے	دو پونڈ یا پانچ امریکی ڈالر

جامعہ

سالانہ قیمت
۹ روپے

قیمت فی پرچہ
۷۵ پیسے

جلد ۷۸ | بابت ماہ دسمبر ۱۹۸۱ء | شمارہ ۱۲

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: جمال پریس دہلی ۶ • ٹائیٹل: فائن پریس دہلی ۶

شذرات

علمی حلقوں میں آصف علی اصغر فیضی مرحوم کی وفات کی خبر رنج اور انسوس کے ساتھ سنی گئی۔ ایک طویل علالت کے بعد ۲۳ اکتوبر ۸۱ء کو بمبئی کے ایک اسپتال میں اُن کا انتقال ہوا، ان کی عمر بیاسی ۸۲ سال کی تھی۔ ماہرین قانون اور مسلمان دانشوروں اور عالموں کے طبقے میں وہ مشہور و معروف تھے۔ انھوں نے بمبئی کے سینٹ زیویر کالج اور کیمبرج یونیورسٹی کے سینٹ جون کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ کیمبرج میں انھیں فارسی، عربی اور تاریخ اسلام کے ٹرپیوز میں فرسٹ کلاس ملی تھی جو اس وقت کے تعلیمی معیار کے لحاظ سے بڑی امتیازی بات تھی۔ کیمبرج میں ایک ممتاز طالب علم کی حیثیت سے انھوں نے دوسرے امتیازات بھی حاصل کئے۔ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے بیرسٹری پاس کی اور بمبئی آکر ۱۹۲۵ء سے ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کر دی۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک وہ پیری پروفیسر آف جوریسپروڈنیس اور بمبئی کے گورنمنٹ لا کالج کے پرنسپل رہے۔ وہ بمبئی کے پبلک سروس کمیشن اور یونین پبلک سروس کمیشن کے ممبر بھی تھے۔ قاہرہ میں ہندوستان کے سفیر اور کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے بھی انھوں نے ملک و قوم کی خدمت کی اور قاہرہ اور دمشق کی علمی مجالس کے بھی ممبر رہے۔ اُن کی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۶۲ء میں انھیں حکومت ہند نے پدم بھوشن کے اعزاز سے بھی نوازا۔ ہندوستان میں انڈو پرشین اور انڈو عربک اسٹڈیز کی ترقی سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ ان کے مضامین اور تحقیقی نگارشات دنیا کے ممتاز رسالوں میں چھپتی رہتی تھیں۔ فیضی صاحب مرحوم کوشش کرتے تھے کہ اپنے مضامین اور مقالوں میں کوئی نئی اور چونکانے والی بات ضرور کہیں، وہ اکثر انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل کے مستشرقین اور ان کی نگارشات کی سراہنا بھی کرتے تھے، اس سے مسلمانوں کے ایک خاص طبقے میں ان سے متعلق، کچھ صحیح اور کچھ غلط، بہت سی باتیں مشہور ہو گئی تھیں، ان کی کتاب آؤٹ لائنز آف محمڈن لاء درسی کتاب کی حیثیت سے بہت مقبول ہوئی، لیکن ہمارا خیال ہے کہ مذاہب اربعہ کے اصول فقہ کے موضوع پر اُن کا مطالعہ سرسری اور محدود تھا۔ اُن

کی کتاب A Modern Approach to Islam مجموعی اعتبار سے ان کی ذہنی مرعوبیت کی آئینہ دار ہے۔ فیضی صاحب مذہبی انسان تھے، اپنے خیالات میں لبرل تھے، گفتگو بہت اچھی کرتے تھے جس میں علمی گہرائی بھی ہوتی تھی اور دلکشی بھی۔ ان سے مل کر طبیعت خوش ہوتی تھی، اُن میں تصنّع اور دکھاوا بالکل نہ تھا، طبیعت میں سادگی تھی اس لئے ان سے ملنے کو جی چاہتا تھا، وہ ملتے تھے تو بہت کھل کر ملتے تھے، ہمارے نزدیک ان کا بڑا علمی کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے قاضی نعمان کی دعائم الاسلام کو اپنی گہری مذہبی عقیدت مندی کے ساتھ ایڈٹ کر کے ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ دو جلدوں میں شائع کیا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی کمزوریوں کو معاف فرمائے، انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ آمین

گذشتہ شمارے میں ہم نے مشرقِ وسطیٰ میں امن وسلامتی کے امکانات کے سلسلے میں سعودی عرب کے شاہزادہ فہد کی تجاویز کا ذکر کیا تھا۔ یہ تجاویز اگست ۱۹۸۱ء میں پیش کی گئی تھیں، اس وقت مصر کے صدر انور السادات زندہ تھے، اسرائیل نے تو ان تجاویز کو ماننے سے انکار کر دیا تھا اور امریکہ کا رویہ سرد مہری کا تھا۔ لیکن اب امریکہ نے صدر سادات کی موت کے بعد، کسی حد تک تائید کا اظہار کیا ہے، اور اس بات سے اسرائیل میں ناراضگی اور پریشانی کی ایک فضا پیدا ہو گئی ہے۔ شہزادہ فہد کی تجویزیں حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ اسرائیل عرب یروشلم کو خالی کر دے اور ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اس نے عربوں کے جن علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا، وہاں سے ہٹ جائے۔

۲۔ ان عرب علاقوں میں اسرائیلیوں کی نئی بستیاں ختم کر دی جائیں۔

۳۔ تمام مذاہب کے ماننے والوں کو عبادت کی آزادی ہو اور اس کی ضمانت دی جائے۔

۴۔ فلسطینیوں کو اپنے وطن واپس جانے اور بسنے کا حق ہو اور جو واپس نہ جانا چاہیں انھیں ان کی املاک کا معاوضہ دیا جائے۔

۵۔ چند مہینوں کی عبوری مدّت میں اُردن کے مغربی کنارے اور غزہ پٹی کے علاقے میں اقوامِ متحدہ کا کنٹرول ہو۔

۶۔ اس کے بعد وہاں ایک آزاد فلسطینی حکومت قائم ہو جس کی راجدھانی یروشلم ہو۔
۷۔ مشرق وسطیٰ کے علاقہ میں جو مملکتیں ہیں وہ امن و امان کے ساتھ رہ سکیں۔
۸۔ اقوام متحدہ ان تجاویز پر عمل درآمد کی ذمہ داری لے۔

ہمارا خیال تھا کہ اِن تجاویز کو سبھی عرب ملکوں کی تائید حاصل ہوگی، لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ ۲۲ نومبر کو مراکش کے شہر فیز میں مصر کو چھوڑ کر تقریباً تمام عرب ملکوں کے وزرائے خارجہ کی جو میٹنگ ہوئی اس میں ان تجاویز پر اتفاق نہیں ہو سکا۔ معتدل رویے والی عرب ریاستوں نے اِن کی تائید کی لیکن لیبیا، شام، جنوبی یمن، الجزائر، عراق اور پی۔ ایل۔ او نے اس کی مخالفت کی۔ پہلے یہ خبر آئی تھی کہ یاسر عرفات مذکورہ تجاویز کی بنیاد پر اسرائیل سے گفت و شنید کے لئے تیار ہو گئے ہیں، اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پی۔ ایل۔ او میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے عناصر کے دباؤ سے یاسر عرفات نے اپنی رائے پر نظر ثانی کی ہے ورنہ فیز میں پی۔ ایل۔ او کے نمایندے نے شاہزادہ فہد کی تجاویز کی مخالفت نہ کی ہوتی۔ خاص طور پر ساتویں تجویز کہ مشرق وسطیٰ کی تمام مملکتیں امن و سلامتی کے ساتھ رہ سکیں، تنقید کا نشانہ تھی، سخت رویے والی عرب ریاستوں کا موقف یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عرب اسرائیل کو ایک قانونی مملکت تسلیم کرلیں اور وہ اس کے لئے تیار نہیں۔ پی۔ ایل۔ او کے نمایندہ نے یہ کہا کہ اسرائیل امریکہ سے اپنے حالیہ فوجی و دفاعی معاہدے کی وجہ سے، عربوں کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور ہے اور وہ فہد تجاویز پر گفت و شنید کے نتیجے میں عربوں سے زیادہ مراعات حاصل کرلے گا جبکہ عرب گھاٹے میں رہیں گے۔

اُدھر اسرائیل میں خوفزدگی اور مایوسی کی لہر دوڑ گئی ہے اور باوجود اس کے کہ امریکہ کے سکریٹری آف سٹیٹ مسٹر ہیگ نے اسرائیل کو یقین دلایا ہے کہ صدر ریگن کیمپ ڈیوڈ معاہدے سے کسی قیمت پر نہیں ہٹیں گے، مسٹر بیگن مطمئن نہیں ہیں۔ اس بے اطمینانی اور بے چینی کی خاص وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ صدر سادات کی موت کے بعد ریگن سعودی عرب کو اپنی مشرق وسطیٰ کی پالیسی میں خاصی ترجیحی حیثیت دے رہے ہیں۔ اسرائیل سعودی عرب کو اپنا دشمن سمجھتا ہے، اور اب اسے یہ خدشہ پیدا ہو گیا ہے کہ صدر ریگن کی سرپرستی میں مصر اور سعودی عرب ایک ہو جائیں گے اور اس کا اثر مصر اور اسرائیل کے تعلقات

پر پڑے گا۔ مصر کے نئے صدر حسنی مبارک نے مبہم طور پر فہد تجاویز کی تائید کی ہے اگرچہ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اسرائیل سے مصر کا امن وصلح کا جو معاہدہ ہے وہ اس کے پوری طرح پابند ہیں، لیکن بیگن کو محسوس ہوتا ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں مصر پر مکمل اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید اب ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق مصر، عراق، پی۔ ایل۔او، اور غالباً شام بھی، سعودی قیادت کے تحت متحد ہو جائیں گے، اور لیبیا اور جنوبی یمن کو الگ رکھا جائے گا، ان کے نزدیک اس منصوبے کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ ہے، ایسی صورت میں اسرائیل کہاں جائے گا؟ بیگن کے سامنے یہ ایک اہم سوال ہے؟

اِس صورت حال اور ان خدشات کے پیش نظر، جو ہمارے نزدیک بڑی حد تک بے بنیاد ہیں، اسرائیل میں یہ بحث چل پڑی ہے کہ کیوں نہ ایک قومی حکومت کی تشکیل کی جائے اور سیاسی جماعتیں سردست اپنے اختلافات بھول جائیں۔ بنی اسرائیل کا مزاج یہ رہا ہے کہ وہ خدا کو صرف اپنا خدا اور اپنے آپ کو خدا کی برگزیدہ اور چہیتی قوم سمجھتے ہیں، یہ بات اُن کی گھُٹّی میں پڑی ہے۔ اسی طرح سیاسی میدان میں وہ یہ چاہتے ہیں کہ امریکہ صرف انھیں کا ہوکر رہے، یہاں تک کہ وہ دوسروں پر ایک نگاہ غلط انداز بھی نہ ڈالے۔ ہم نے یہ بات اس لئے کہی ہے کہ عرب نہ تو متحد ہوں گے اور نہ امریکہ اسرائیل سے بے وفائی کرے گا، لیکن کیا کیا جائے کہ بنی اسرائیل کی نفسیات ہی کچھ ایسی ہی ہے کہ وہ ساری دنیا کو اپنا رقیب سمجھتے ہیں۔ ڈر ہے کہ اپنی نفسیاتی الجھنوں کے سبب اسرائیل کہیں پھر لبنان میں اپنی جارحیت کا آغاز نہ کر دے۔ اس کے وزیر دفاع کے بیانات کچھ اسی طرح کے ہیں، اسرائیل کے وزیر دفاع نے یہ بھی کہا ہے کہ امریکہ سعودی عرب اور اُردن کے ذریعہ عراق کو اسلحے بھیج رہا ہے اور یہ بات اسرائیل کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اب اسرائیل کی کوشش یہ ہوگی کہ جب تک اُسے اپنے تحفظ کا پورا یقین نہ ہو جائے، وہ اپریل ۸۲ء میں سینائی کا بقیہ علاقہ خالی نہ کرنے کے بہانے تلاش کرے گا۔

امیر حسن نورانی ندوی

مولانا سیّد امیر علیؒ ملیح آبادی

بلند پایہ عالم، باکمال مترجم

انیسویں صدی میں، اسلامی علوم کی ترویج اور درس و تدریس میں ہندوستان کے جن باکمال علماء نے گرانقدر خدمات انجام دیں، ان میں مولانا امیر علی کی حیثیت بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ جامع الکمالات شخصیت کے حامل تھے۔ لیکن ان کو وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی، جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ نہ تو ان کے علمی کارناموں کا جائزہ لیا گیا اور نہ دینی اور فنی شاہکاروں پر تحقیقی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ جس طرح خود انھوں نے زندگی میں گمنام رہنا پسند کیا، اسی طرح اب بھی ان کے حالات اور خدمات پر عدم توجہ کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اس دور میں بعض معمولی شخصیتوں پر تحقیقی کام ہو رہے ہیں۔

مولانا امیر علی اسلامی علوم پر گہری نظر رکھتے تھے۔ خاص طور پر تفسیر، حدیث اور فقہ میں ان کو مہارت حاصل تھی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ:

> "حدیث و علم رجال اور تفسیر میں کم لوگ ان کے پایہ کے اور ان جیسے صاحبِ نظر قرب و جوار میں تھے۔[1]"

جناب امیر حسن نورانی ندوی، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، سوانح مولانا عبدالحئی، مکتبہ برہان، دہلی، صفحہ ۷۵

عربی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اردو زبان و ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ اپنی تحریروں میں آسان اور شگفتہ زبان استعمال کرتے تھے۔ بحیثیت مترجم انھوں نے جو کارنامے انجام دیئے وہ حیرت انگیز ہیں۔ عام معمولات کے ساتھ ساتھ اپنی مختصر زندگی میں تنِ تنہا جو کام کیا وہ مترجمین و مصنفین کا ایک ادارہ بھی مشکل سے کر سکتا ہے۔

مولانا امیر علی اودھ کے مشہور قصبہ ملیح آباد میں ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۸ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد سید معظم علی کا تعلق سادات کے ایک غریب خاندان سے تھا۔ مولانا نے ابتدائی تعلیم قصبہ کے کسی مکتب میں حاصل کی، ملیح آباد پٹھان رؤسا کا اہم مرکز اور نہایت بارونق مقام تھا۔ مدارس و مکاتب کے علاوہ جدید تعلیم کے اسکول بھی قائم ہو چکے تھے۔ بہت سے علماء و فضلاء بھی موجود تھے۔ لیکن مولانا امیر علی نے اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم پرانے طرز کے مطابق مکتب و مدرسہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد سرکاری اسکول میں داخلہ لیا جہاں حکومت کے مقررہ نصاب کی کتابیں پڑھیں اور ورناکیولر مڈل کا امتحان پاس کر لیا۔ مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ مل سکا، ایک تو تعلیمی اخراجات زیادہ تھے دوسرے گھر کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ یکسوئی سے تعلیم میں مصروف رہتے۔

مولانا عبدالحئی نے نزہۃ الخواطر جلد ہشتم میں مولانا موصوف کے حالات میں تحریر فرمایا ہے کہ جب وہ پندرہ سال کے ہوئے تو انھوں نے علوم عربیہ کی طرف توجہ کی اور انھوں نے مولانا عبداللہ آروی، مولانا حیدر علی المہاجر، قاضی بشیر الدین عثمانی قنوجی اور مولانا نذیر حسین محدث دہلوی سے مختلف علوم و فنون کی تکمیل کی۔[1]

لیکن مولانا کے شاگرد رشید اور ان کے خاندان سے قریبی تعلق رکھنے والے

۱۔ مولانا سید عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، جلد ہشتم، مطبع دائرۃ المعارف، حیدر آباد (دکن)، ۱۹۷۰ء، صفحہ ۷۵۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنے ماہنامہ صبح سعادت میں ان کے حالات پر جو ایک تفصیلی مضمون لکھا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری اسکول سے مڈل پاس کرنے کے بعد، غربت کے باعث وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے اور گھریلو حالات سے مجبور ہو کر ملازمت کے متلاشی ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ، انیس سال کے لگ بھگ تھی۔ ان کو بہرائچ کے ایک سب پوسٹ آفس میں پوسٹ ماسٹر کی جگہ مل گئی۔ ملازمت کی ضرورت کے پیش نظر انھوں نے تھوڑی انگریزی زبان بھی سیکھ لی اور بہت جلد ڈاک خانہ کے فرائض منصبی خوش اسلوبی سے انجام دینے لگے۔ افسران متعلقہ ان کی کارگزاری سے مطمئن اور خوش تھے۔ مولانا بچپن ہی سے صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ کبھی بالقصد نماز ترک نہیں کرتے تھے۔ اتفاق سے ایک دن جمعہ کی نماز پڑھنے مسجد چلے گئے، ان کی غیر موجودگی میں کوئی سرکاری افسر بغرض معائنہ پہونچ گیا، اور پوسٹ ماسٹر کو غیر حاضر پا کر بہت چراغ پا ہوا۔ کسی شخص نے مسجد میں جا کر مولانا کو اطلاع دی، اس وقت وہ وضو کر رہے تھے۔ انھوں نے اس خبر کا کوئی اثر نہ لیا اور اطمینان سے نماز ادا کر کے واپس آئے۔ افسر مذکورہ نے اعتراض کیا تو مولانا نے اس کو جواب ہی نہ دیا اور نہ معذرت کی، بلکہ فوراً استعفا لکھ کر پیش کر دیا اور ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ حالانکہ ان کے لئے کوئی اور ذریعۂ معاش نہ تھا اور گھر کی حالت بھی اچھی نہ تھی[1]۔

اس واقعہ کا ان کی زندگی پر انقلاب انگیز اثر پڑا۔ انھوں نے اپنے شاگرد مولانا ملیح آبادی سے کہا کہ "میرا خاندان اگرچہ غربت میں مبتلا تھا، لیکن مجھے ترکِ ملازمت پر کوئی افسوس نہیں ہوا۔ مجھے اس خیال سے بہت دکھ تھا کہ جس دین کے احکام پر عمل کرنے کے باعث مجھے ملازمت سے محروم ہونا پڑا ہے، خود میں اس دین کے علم سے واقف نہیں ہوں، نماز تو پڑھ لیتا ہوں لیکن اس کے معانی و

۱۔ ماہنامہ صبح سعادت، ماہ اپریل ۱۹۳۸ء، (مضمون مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی)

مطالب اور حقیقت سے نابلد ہوں، قرآن فہمی سے بھی محروم ہوں ۔" ان خیالات نے ان کو دینی علوم کی تحصیل پر آمادہ کیا۔ نزہتہ الخواطر میں ان کے جن اساتذہ کا ذکر ہے مولانا ملیح آبادی نے ان کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے مولانا امیر علی دینی علوم کی تحصیل کے سلسلے میں مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

مولانا فاروق ملک کے ممتاز ترین علمار کے استاد تھے، جن میں علامہ شبلی نعمانی جیسی شخصیت بھی شامل ہے۔ جب مولانا امیر علی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا فاروق ہفتوں طلبار کو درس نہیں دیتے تھے، طلبار بیٹھے ان کے پاؤں دابا کرتے تھے، اور مولانا ایک خاص کیف کے عالم میں لیٹے رہتے تھے۔ مولانا کا شوقِ تحصیلِ علم بڑھا ہوا تھا، ان کے لئے یہ وقت بڑا صبر آزما تھا اس لئے وہاں سے لاہور چلے گئے جو اسلامی علوم وفنون اور علمار وصلحار کا ممتاز مرکز تھا، مگر حالات کو نامساعد پاکر وہ آگرہ چلے گئے اور وہاں چند دن قیام کرکے دلی پہونچے، جہاں اس زمانہ میں مولانا نذیر حسین محدّث کا چشمۂ فیض جاری تھا۔ مولانا امیر علی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لیکن عربی زبان و قواعد سے بخوبی واقف نہ ہونے کے باعث، درسِ حدیث میں شمولیت ممکن نہ تھی۔ اس لئے پہلے عربی زبان و قواعد صرف ونحو کی تحصیل شروع کردی اور اپنی غیر معمولی محنت اور شوق کی بدولت مہینے میں اس قابل ہوگئے کہ درسِ حدیث میں شرکت کی اجازت مل گئی۔ اس زمانہ میں مولانا عبدالحلیم شرر بھی ان کے ہم سبق تھے۔ نزہتہ الخواطر میں جن اساتذہ کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے متعلق نہیں کہا جاسکتا کہ مولانا نے ان سے کس زمانہ میں تعلیم حاصل کی، ملازمت سے قبل اس کا امکان نہیں ہوسکتا کہ دلی جانے سے قبل ان اساتذہ سے استفادہ کیا ہو۔ دلی کے دورانِ قیام میں انھوں نے حکیم عبدالمجید ابن حکیم محمود خاں دہلوی سے علم طب کی بھی تحصیل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد لکھنؤ گئے، اس زمانہ میں منشی نولکشور کے مطبع کو بڑی شہرت حاصل تھی، جو اسلامی علوم کی کتابیں بکثرت

شائع کر رہا تھا، اتفاق سے مولانا کی ملاقات منشی نولکشور سے ہوگئی، جو بڑے مردم شناس اور اہلِ علم کے قدر دان تھے، انھوں نے مولانا سے درخواست کی کہ ان کے مطبع میں تصنیف وتالیف اور ترجمہ کا کام انجام دیں، جسے مولانا امیر علی نے منظور کر لیا، پچاس روپیہ ماہوار مشاہرہ مقرر ہوا جو اس زمانہ کے اعتبار سے معقول کہا جا سکتا ہے۔

مطبع نولکشور میں ایک قلیل مدت کے اندر انھوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ ابتدا میں مولانا مطبع کی عمارت میں بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ عربی کی زیر طبع کتب کی صحت اور ان پر حواشی لکھنے کا کام ان کے سپرد تھا۔ اس کے بعد تصنیف وتراجم کی خدمت پر مامور ہوتے۔ اس وقت منشی نولکشور نے محسوس کیا کہ گھر سے مطبع تک آنے جانے میں مولانا کا وقت بہت صرف ہوجاتا ہے، اس لئے ان سے درخواست کی کہ آپ اپنے مکان پر ہی بیٹھ کر کام کریں۔ مولانا نے منظور کر لیا اور گھر میں بہت زیادہ وقت صرف کرنے لگے، جس سے ان کی صحت پر اثر پڑا۔ مولانا عبد الرزاق نے اپنے محولۂ بالا مضمون میں لکھا ہے کہ ایک دن میں نے پوچھا کہ آپ کی عمر کتنی ہے؟ یہ وفات سے ایک سال قبل کی بات ہے۔ فرمانے لگے کہ میری عمر پچاس یا اکیاون سال ہے، مگر نولکشور نے مجھے بوڑھا کر دیا، کیونکہ انھوں نے مجھے گھر پر کام کرنے کے لئے کہا، اور میں اس خیال سے کہ کہیں وہ کام کو کم نہ خیال کریں، بہت محنت کی اور زیادہ سے زیادہ کام کیا جس سے صحت بگڑ گئی اور اب یہ حال ہے جو تم دیکھ رہے ہو۔

مولانا کو حقہ نوشی کا بہت شوق تھا۔ منشی نولکشور ان کے لئے پینے کا تمباکو روزانہ بھیج دیتے تھے، کبھی کبھی خود بھی ان کے مکان پر حاضر ہوتے۔ جتنا کام مولانا روز کرتے تھے وہ منگوا لیتے اور دوسرا کام بھیج دیتے تھے۔ مطبع نولکشور میں مولانا امیر علی نے جو کارنامے انجام دیئے وہ حیرت انگیز ہیں۔ بہت سی عربی و فارسی کتابوں کی صحت واصلاح اور اضافہ حواشی سے قطع نظر انھوں نے فتاویٰ عالمگیری کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا، ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ ہے۔ یہ ترجمہ دس ضخیم جلدوں میں شائع ہوا۔ پہلی جلد میں

مولانا نے فقہا کے حالات اور اصول فقہ پر مشتمل ایک طویل مقدمہ کا اضافہ کیا۔ دوسرا شاہکار عین الہدایہ ہے۔ فقہ حنفی کی اس معروف کتاب کی چاروں جلدوں کا اردو ترجمہ کیا اور شرح بھی لکھی جو چار ضخیم جلدوں میں کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہے جس سے ہزاروں علماء وطلباء آج تک استفادہ کر رہے ہیں اور موجودہ دور میں اس کی افادیت کو زیادہ محسوس کیا جا رہا ہے۔ یہ بہت بڑا کام تھا جو انھوں نے تن تنہا انجام دیا۔ ان کی سب سے بڑی تالیف تفسیر مواہب الرحمٰن ہے، جس کی نظیر فارسی اور عربی زبانوں میں بھی مشکل سے ملتی ہے۔ یہ اردو تفسیر تیس ضخیم جلدوں میں ہے۔ گویا ہر پارہ کی تفسیر ایک جلد میں، بعض جلدیں آٹھ سو سے زیادہ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اس میں انھوں نے مستند عربی تفاسیر کے طویل اقتباسات کو اردو میں پیش کر دیا ہے، خاص طور پر تفسیر ابن کثیر، مدارک التنزیل، تفسیر کبیر وغیرہ۔ ساتھ ہی فقہی مسائل کی تشریحات، تصوّف و اخلاق کے رموز و نکات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اردو میں قرآن کی یہ سب سے بڑی تفسیر ہے۔ کئی بار مطبع نولکشور نے اس کو شائع کیا۔ اب ایک مدت سے کمیاب تھی لیکن پاکستان کے ایک ناشر نے نہایت اہتمام سے شائع کر دی ہے۔

اس کے بعد مولانا نے دوسرا عظیم الشان کام یہ کیا کہ صحیح بخاری کا اردو ترجمہ کیا اور شرح لکھی۔ یہ کام بڑی محنت و جانفشانی سے انجام دیا۔ یہ ترجمہ اور شرح تیس جلدوں پر مشتمل ہے، لیکن یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ منشی نولکشور کی وفات کے باعث یہ شائع نہ ہو سکی۔ ان کے ورثاء کو دوسری کتب کی طباعت و اشاعت سے فرصت نہ ملی اور مسودہ لیت ولعل میں پڑا رہا جو ابھی تک اچھی حالت میں مطبع کے محافظ خانہ میں محفوظ ہے جس کو راقم الحروف نے ۱۹۵۸ء میں پہلی بار دیکھا تھا اور صدق جدید میں ایک مضمون بھی اس کے متعلق لکھا تھا۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادی رحؒ نے بھی اس کی اشاعت کے سلسلہ میں اہل علم کو توجہ دلائی تھی کہ وہ مطبع کے ارباب حل وعقد کو توجہ دلائیں یا کوئی ادارہ ناشر اُن سے حاصل کر کے شائع کر دے۔

مولانا نے فیضی کی مشہور بے نقطہ تفسیر سواطع الالہام کی طباعت سے قبل مسودہ کی صحت کی اور اس پر بے نقطہ مقدمہ تحریر کیا جو ان کی عربی زبان میں مہارت کا ثبوت ہے۔ اردو زبان میں ترجمہ کا اتنا بڑا کام کسی اور نے تنہا کیا ہو ایسا کوئی نام نظر نہیں آتا۔ وہ ترجمہ کے فن سے بھی خوب واقف تھے۔ ان بڑے کاموں کے ساتھ ساتھ تقریباً بارہ چھوٹی بڑی عربی و فارسی کتابوں کو اردو کا جامہ پہنایا جن میں فقہ اکبر، اصول الشاشی اور طب کی ایک دو کتب بھی شامل ہیں۔ درسی کتب کے علاوہ بعض بڑی کتب حدیث، فقہ، منطق و فلسفہ پر بھی ان کے حواشی ہیں۔ تفسیر عرائس البیان، احیاء العلوم امام غزالی، قسطلانی جیسی بڑی کتب کی صحت بھی دوران طباعت ان کے ذمّے تھی۔ منشی نولکشور نے امام رازی کی تفسیر کبیر کا اردو ترجمہ بھی مولانا سے کرانے کا ارادہ کیا تھا اور اس کا آغاز بھی ہوگیا تھا مگر صحت کی خرابی کے علاوہ ملک کے عام حالات سے بھی ان کی طبیعت مکدر تھی، اس لئے انھوں نے ہندوستان سے ہجرت کرکے حجاز مقدس میں قیام کا قصد کرلیا۔ رخصت ہوتے وقت منشی نولکشور نے ایک معقول رقم بطور شکرانہ پیش کی جو انھوں نے قبول کرلی۔ حجاز سے مولانا نے منشی نولکشور کے نام جو خطوط لکھے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ منشی جی کے حُسنِ سلوک اور خوش اخلاقی سے بہت متاثر تھے۔ مولانا نے مکّہ معظمہ میں سکونت اختیار کی لیکن وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی، بیمار ہوگئے، ان کے بڑے صاحبزادے کچھ دن علیل رہ کر وہیں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مجبوراً مولانا کو ہندوستان آنا پڑا۔ اس سلسلے میں واپسی کے سفر خرچ کے لئے بھی منشی نولکشور نے ان کو معقول رقم ارسال کی۔ ہندوستان واپس آکر کچھ عرصہ اور مطبع نولکشور میں کام کیا۔ ۱۸۹۵ء میں منشی نولکشور نے وفات پائی، ان کے بعد بھی مولانا کام کرتے رہے۔ سبکدوشی کے بعد مطبع کی طرف سے ان کی پنشن مقرر ہوگئی تھی

۱۹۱۵ء میں مولانا مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ کئی سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملنے لگی۔ ایک بڑے کنبہ والے غریب آدمی کے لئے بڑھاپے میں یہ رقم

نعمتِ غیر مترقبہ تھی، لیکن مولانا کے نزدیک درس و تدریس کی بڑی اہمیت تھی۔ روپیہ کی کمی یا بیشی کا ان پر کوئی خاص اثر نہ تھا۔ یہی سبب تھا کہ چند ماہ کے بعد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ (والد ماجد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ناظم ندوۃ العلماء نے مولانا کو خط لکھا کہ آپ ندوۃ العلماء میں آکر حدیث پڑھائیے۔ خاندان کے با اثر عزیزوں نے ہر چند منع کیا کہ اتنی بڑی تنخواہ کی ملازمت چھوڑ کر ندوہ نہ جائیے مگر مولانا فوراً تیار ہو گئے اور فرمایا کہ زندگی حدیث کے شوق میں گزر رہی ہے اور اب اس کی خدمت کا موقع ملا تو کیوں نہ جاؤں۔ حالانکہ ندوہ میں ان کی تنخواہ ترقی کے بعد بھی ایک سو پچاس روپیہ ماہوار تک پہونچی تھی۔ مولانا عبدالحیٔ (ناظم ندوۃ العلماء) خود مولانا کے شاگرد تھے لیکن اب مولانا امیر علی مقابلتاً ایک چھوٹے عہدے پر کام کر رہے تھے۔ آپ کے حلقۂ درس میں شامل ہونے والے اکثر طلباء بعد میں نامور علماء میں شمار کیے گئے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا بیان ہے کہ جب وہ مصر سے واپس آئے تو جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ حکومت ان کو مشتبہ نظر سے دیکھتی تھی، اس لئے وہ کسی مدرسہ میں داخل ہونا چاہتے تھے اور یہ بھی چاہتے تھے کہ علم حدیث کی تحصیل کریں۔ انھوں نے مولانا عین القضاۃؒ بانی مدرسہ عالیہ فرقانیہ (لکھنؤ) سے اپنی خواہش ظاہر کی اور پوچھا کہ فن حدیث کس سے اور کہاں حاصل کریں۔ ان کے پاس ایک بڑے عالم تشریف فرما تھے، انھوں نے برجستہ فرمایا کہ مولوی امیر علی ملیح آبادی کے علاوہ اس وقت فن حدیث میں کوئی عالم نظر میں نہیں جچتا ہے۔ "میں ندوۃ العلماء میں داخل ہو گیا، اس وقت مولانا امیر علی مہتمم تھے۔ ان سے ملنے کے بعد میں بے حد متاثر ہوا اور جیسے جیسے ان سے قربت بڑھتی گئی، ان کی عظمت کے نقوش دل پر گہرے ہوتے گئے۔" (ماخوذ از صبح سعادت، اپریل ۱۹۲۸ء)

اخلاق، عادات اور عام حالات

مولانا سید امیر علیؒ نہایت خوش اخلاق اور با مروّت تھے۔ ان کی ذات سے کبھی کسی کو اذیت نہیں پہونچی، نہ کسی کی غیبت پسند کرتے تھے۔ مولانا عبدالحلیم شررؔ

دہلی میں ان کے ہم سبق تھے۔ ایک بار کسی محفل میں ان کے اس رویہ پر اظہار افسوس کیا کہ انھوں نے مولانا نذیر حسین محدث دہلوی سے حدیث کی تعلیم حاصل کی اور اب ناول نگاری میں وقت صرف کرتے ہیں۔ خدا انھیں معاف کرے۔ حدیث کی تکمیل کر کے دین کی خدمت کرتے تو بھلا ہوتا۔ یہ فرمانے کے بعد ان کو احساس ہوا کہ وہ غیبت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ خاموش ہو گئے اور اپنی کہی ہوئی بات پر اظہار افسوس کیا۔

مولانا کو فن تفسیر، حدیث، فقہ اور معقولات میں مہارت حاصل تھی، اسی کے ساتھ ساتھ تاریخ، جغرافیہ اور ریاضی سے بھی واقف تھے، اس کے باوجود ان میں غرور اور خودنمائی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ شہرت سے نفرت تھی، طبیعت میں بے حد انکسار تھا۔ ہر چھوٹے بڑے سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اس زمانہ میں ندوۃ العلماء کے حالات اچھے نہ تھے۔ مسلسل ہڑتالوں اور شورشوں نے طلباء میں سرکشی کا جذبہ ابھار دیا تھا، مگر مولانا کے اخلاق اور نرم برتاؤ نے نہایت سرکش طلباء کو درست کر دیا۔ ان کے زمانہ میں دارالعلوم کا انتظام اچھا تھا۔ کبھی کسی طالب علم کو سزا نہیں دی، خطا کار طلباء کو بلا کر سمجھاتے تھے اور ان کے ساتھ نہایت شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ مریض طلباء کی عیادت کے لئے ان کے کمروں میں جاتے۔ اکثر روپیہ سے بھی ان کی مدد کرتے تھے۔ بعض طلباء ان سے قرض بھی مانگ لیتے تھے، جس کے دینے میں مولانا کو کوئی عذر نہ ہوتا، اور یہ رقم عموماً واپس نہیں ملتی تھی۔

جس زمانہ میں مولانا مطبع نولکشور میں کام کرتے تھے، وہاں کے تمام ملازمین ان کے اخلاق سے متاثر تھے۔ وہ مطبع کی عمارت کے احاطہ میں جامن کے ایک پرانے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے اور گھنٹوں کام کرتے تھے، جبکہ دوسرے کارکن نہایت آرام دہ نشستوں پر بیٹھا کرتے تھے۔ مطبع کے ایک معمر ترین ملازم منشی شیونرائن نے مجھے مولانا کے بہت سے حالات بتائے۔ منشی شیونرائن نے ۱۹۵۱ء میں بعمر ۹۵ سال لکھنؤ میں وفات پائی اور وفات سے چند دن قبل تک فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔ ان کا بیان تھا کہ مولانا اپنے کام میں اس قدر محو رہتے تھے کہ ان کو اپنے گرد و پیش کی

خبر نہ ہوتی تھی۔ جسمانی اعتبار سے دُبلے پتلے اور دراز قد تھے۔ چہرہ پتلا اور رنگ گندمی تھا۔ داڑھی گول اور بہت بڑی نہ تھی۔ لباس صاف ستھرا پہنتے تھے۔ عموماً غرارے دار پائجامہ اور لمبے دامن کی اچکن، سر پر مراد آبادی وضع کی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ ان کی شخصیت پرکشش تھی، چہرہ سے معصومیت ٹپکتی تھی۔ منشی نولکشور اکثر ان سے گھر ملنے جایا کرتے تھے اور ان کے لئے حقّہ کی تمباکو پابندی سے پہونچاتے تھے جس کا مولانا کو بہت شوق تھا۔ نولکشور نے مولانا کی محنت کی بدولت بہت روپیہ کمایا، وہ ان کو صرف پچاس روپے ماہوار دیتے رہے۔ لیکن مولانا خود نولکشور کے مدّاح اور ممنونِ کرم تھے۔ کہتے تھے کہ اِس شخص نے مجھے ایسے وقت میں سہارا دیا جب میرا کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا۔

مولانا امیر علی ندوۃ العلماء میں زیادہ عرصہ نہیں رہے، مگر جتنا زمانہ گزارا، زیادہ سے زیادہ درس وتدریس کی خدمت انجام دی۔ ان کے حُسنِ اخلاق کا یہ عالم تھا کہ ایک بار عربی مدارس کے سرکاری انسپکٹر معائنہ کے لئے دار العلوم میں آئے۔ وہ ندوہ کے سابق طالب علم تھے۔ مولانا نے اپنی کرسی ان کے لئے خالی کردی اور وہ صاحب بلا تکلف اس پر بیٹھ گئے۔ مولانا دوسری کرسی آنے تک کھڑے رہے۔ انسپکٹر کا یہ برتاؤ تو مولانا نے گوارا کرلیا لیکن جب انسپکٹر نے بعض اساتذہ سے تحکمانہ لہجے میں "تم" سے خطاب کیا تو مولانا کو بہت ناگوار ہوا، مصلحتاً خاموش رہے اور وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ اس واقعہ کا بعد میں ذکر کرکے آبدیدہ ہوگئے اور فرمایا علماء کی یہ ذلّت مجھے گوارا نہیں اس لئے اب استعفا دے کر گوشہ نشینی اختیار کرلوں گا۔ لیکن متعدد اساتذہ اور طلباء کے اصرار پر استعفے کا ارادہ ترک کردیا۔

مولانا اپنے مکان سے جو محلہ محمود نگر میں تھا، ندوہ تک ایک تانگے میں آیا کرتے تھے اور تانگے والے کو سولہ روپے ماہوار دیا کرتے تھے۔ تانگے والا اکثر ناغے کرتا تھا، کبھی کبھی پندرہ دن تک غائب ہوجاتا۔ مگر مولانا اس کی تنخواہ نہیں کاٹتے تھے۔ حالانکہ ان کا خاندان بڑا تھا جس کی کفالت ان کے ذمّہ تھی۔ اس لئے آرام وآسائش کی زندگی

کبھی بسر نہ کر سکے۔ صبر و قناعت ان کی طبیعت ثانیہ تھی۔ کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے۔ جب تک زندہ رہے اپنی ذاتی محنت سے روزی حاصل کی۔ یہ سلسلہ آخری دم تک جاری رہا۔ خود تکلیف اٹھا لیتے لیکن گھر والوں کو پریشان نہ ہونے دیتے تھے۔

مولانا کا علمی مرتبہ

ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون میں مہارت رکھنے والے علماء کی تعداد بہت زیادہ ہے اور یہ سلسلہ قرون وسطیٰ سے جاری ہے۔ مختلف علوم میں خصوصی مہارت رکھنے والے بلند پایہ علماء کے حالات، تاریخ و سیر کی کتابوں میں محفوظ ہیں، ایسی مثالیں کم ملیں گی کہ کسی شخص نے سن بلوغ کو پہونچ کر ہزاروں صفحات پر مشتمل کتابیں تالیف کی ہوں، بڑی بڑی کتابوں کے تراجم مکمل کئے ہوں اور کسی دار العلوم میں درس و تدریس کی مسند گرم کی ہو اور اس کے ساتھ انتظام اور اہتمام کی ذمہ داری بھی قبول کی ہو۔ یہ ساری خوبیاں مولانا سید امیر علی میں جمع ہو گئی تھیں لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ اپنے وطن ہی میں گمنام رہے۔ آج کے دور میں جبکہ علمی تحقیقات کی گرم بازاری ہے بہت کم لوگ ان کے حالات اور علمی کارناموں سے واقف ہیں۔ مولانا عبد الحئی ناظم ندوۃ العلماء جو ان کے شاگرد تھے غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے مولانا امیر علی کی ذہانت و ذکاوت، متانت و دیانت، شریف النفسی و حسن اخلاق، قوت حافظہ اور تبحر علمی کا بڑے اچھے لفظوں میں تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے نزہتہ الخواطر میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اپنے زمانے میں اعلم العلماء تھے، ان کا مطالعہ گہرا اور وسیع تھا اور قرآن، حدیث اور علم الرجال کے ماہر تھے[1]۔

مولانا کو علم حدیث میں مہارت حاصل تھی، سینکڑوں حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ احادیث کے مطالب بڑے دل نشیں انداز میں بیان کرتے تھے۔ اختلافات کی وضاحت کے علاوہ عربی زبان کے الفاظ کی تشریح میں، عرب شعراء کے کلام سے استشہاد کرتے تھے

۱۔ مولانا سید عبد الحئی، بحوالہ سابق، صفحہ ۷۶

اور فقہی مسائل پر روشنی ڈالتے تھے۔ فن اسماء الرجال میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔ اکثر راویانِ احادیث کے حالات اور سنہ ولادت و وفات بھی حفظ تھے۔ تفسیر کا مطالعہ اس درجہ وسیع تھا کہ مواہب الرحمٰن جیسی عظیم الشان تفسیر مرتب کر دی، اور فقہ میں فتاویٰ عالمگیری جیسی ضخیم کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ہدایہ کی اردو شرح ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے، ترجمہ میں ان جیسی مہارت کی مثال مشکل سے ملے گی۔ بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اردو کے سب سے بڑے مترجم تھے۔ وہ خود مسلکِ اہل حدیث کے پیرو تھے، لیکن ان کے تراجم و تالیفات میں اس کی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔

مولانا کو اردو زبان و ادب سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ مشاہیر شعراء کے اچھے اشعار زبانی یاد کر لیتے تھے۔ اردو زبان میں ان کی قابلیت کا اندازہ ان کے تراجم سے بخوبی ہوتا ہے۔ اسی طرح عربی اور فارسی کے ہزاروں اشعار حفظ تھے۔ وہ بحث و مباحثہ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ فرائض منصبی انجام دینے کے بعد زیادہ وقت عبادت و ریاضت میں صرف کرتے۔ اتباعِ سنّت کا بہت خیال رکھتے۔ نہایت کم گو تھے، تاہم کبھی کبھی اپنے ہم عصر علماء کی بے تکلف محفلوں میں مزاحیہ انداز سے بھی گفتگو کرتے تھے۔ شیخ محمد عرب بن شیخ محسن یمنیؒ اس دور کے ممتاز عالم تھے اور وہ مولانا امیر علی کے سمدھی تھے، نہایت ظریف الطبع اور خوش مذاق تھے، ان کی مادری زبان عربی تھی اور اردو سے ناواقف تھے۔ بھوپال میں نواب صدیق حسن خاں کے محل میں رہتے تھے۔ اردو کی گالیاں بہت یاد تھیں۔ ہر ایک کے سامنے بے دھڑک گالیاں بکتے تھے۔ مولانا امیر علی ان سے مذاق کرتے تھے مگر وہ کبھی ان کو گالیاں نہیں دیتے تھے بلکہ بہت احترام کرتے تھے۔ انھیں شیخ محمد عرب کے صاحبزادے مولانا خلیل عرب عرصہ تک لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے۔ راقم الحروف کے ہم محلّہ تھے، کچھ دن ان سے ابتدائی عربی پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ نہایت خوش الحانی سے قرآن پڑھتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی مولانا عبید بن محمد عرب حمیدیہ کالج بھوپال میں عربی کے پروفیسر تھے۔ اس خاندان کی بدولت ہندوستان میں عربی زبان کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی اور متعدد دوسرے علماء نے بھی

خلیل عرب صاحب سے عربی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کی۔

مولانا امیر علی کو اپنے وطن اور قوم سے بہت محبت تھی۔ وہ ہندوستان پر انگر تسلط کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس زمانہ میں سیلف گورنمنٹ کی تحریک چل ر تھی۔ مولانا اس کے مخالف اور کامل آزادی کے حامی تھے۔ فرماتے تھے کہ "آزاد کے معاملہ میں معتدل رویہ نہیں اختیار کرنا چاہئے"۔ بقول امام غزالیؒ "پورے پور یہودی بنو ورنہ توراۃ سے کھیلنا چھوڑ دو"۔ مسلم ممالک سے بھی ان کو حد درجہ محبت تھی۔ ممالک اسلامیہ کی بربادی کا حال سن کر تڑپ جاتے تھے اور ان کی فلاح کے لئے دعائیں مانگتے تھے۔ بقول عبدالرزاق ملیح آبادی " ان کی جان بھی اسلامی ہمدردی پر گئی۔ انھوں نے مولانا کی وفات کے سلسلے میں لکھا ہے کہ "ایک دن وہ ندوۃ العلما ء کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی درس کا وقت نہیں ہوا تھا۔ اسی وقت اطلاع آئی کہ دمشق پر اتحادیوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ میں نے مولانا کو یہ خبر سنائی تو وہ سناٹے میں آگئے اور ایک دم خاموش ہوگئے۔ ان کا تمام جسم کانپنے لگا۔ میں نے حال پوچھ تو کوئی جواب نہ دیا۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تو بخار ہو گیا تھا۔ نقاہت بڑھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ فوراً سواری منگوا کر ان کے مکان پہونچایا۔ راستہ میں دھیمی آواز سے فرمایا: "خاتمہ ہو گیا! دمشق، حدیث میں مسلمانوں کا آخری قلعہ بتایا گیا ہے۔ کفار نے اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب زندگی بیکار ہے[1]"۔ —— اس واقعہ کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ علالت نے طوالت اختیار کر لی، اور دو ہفتہ کے بعد ماہ رجب المرجب ۱۳۳۷ھ (۱۹۲۱ء) میں بمقام لکھنؤ وفات پائی۔

۱۔ ماہنامہ صبح سعادت ماہ اپریل ۱۹۲۸ء (مضمون مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی)

عماد الحسن آزاد فاروقی

ہندی مسلمان
اور
ہندوستانی مذاہب

اگرچہ مسلمانوں کے تمدن میں ہندوستانی کتابوں کے ترجمے کی تاریخ عباسی خلیفہ منصور کے عہد تک پہنچ جاتی ہے جب کہ ہندوستانی ہیئت وریاضی کی مشہور کتاب سدھانت کا سندھند اور گوتم بدھ کی سوانح عمری پر مشتمل کتاب کا بوذاسف وبلوہر کے نام سے عربی میں ترجمہ ہوا تھا لیکن ہندوستانی مذاہب پر سب سے پہلی مفصل کتاب البیرونی کی کتاب الہند ہی قرار پائے گی۔ ۱۱۹۴ء میں شہاب الدین غوری کی دہلی اور اجمیر کے راجہ پرتھوی راج پر فتح کے بعد دہلی سلطنت کے قیام نے ہندوستان میں مسلمان آبادی کو یہاں کا لازمی جز بنا دیا۔ اسلام اور ہندوستانی مذاہب نیز ان کے نام لیواؤں یعنی مسلمانوں اور ہندوستان کے مقامی باشندوں کے تمدن ومعاشرت میں زمین آسمان کا فرق تھا اور اگر شروع میں وہ ایک دوسرے کے لئے عرصہ تک بالکل اجنبی رہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، لیکن سیاسی، معاشی، انتظامی، معاشرتی اور تمدنی ضروریات نیز ماحول اور انسانی فطرت کے تقاضوں نے بہت جلد باہر سے آنے والے مسلمانوں اور مقامی باشندوں میں گہرے روابط استوار کر دیئے۔

ڈاکٹر عماد الحسن آزاد فاروقی، ریڈر اسلامیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

مسلمان ایک قلیل تعداد میں باہر سے آئے تھے اور وہ بھی زیادہ تر فوجی پیشہ سے تعلق رکھتے تھے اور اگرچہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام کے بعد دوسرے پیشوں اور علوم و فنون سے متعلق ترکی، عربی، ایرانی اور افغان مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا لیکن ان کی تعداد ہندوستان کی کثیر آبادی کے مقابلے میں آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ ملکی انتظام نیز معاشرتی اور تمدنی ضروریات کے لئے مسلمانوں کے واسطے مقامی باشندوں کا تعاون ناگزیر تھا۔ بہت جلد علماء اور صوفیاء کی کوششوں نیز اسلامی سلطنت کے اثرات کی وجہ سے مقامی باشندوں کے قبول اسلام کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس طرح ملک میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوتا جارہا تھا جو مذہباً مسلمان تھا لیکن جس کی جڑیں ہندوستانی معاشرہ اور ماحول میں پیوست تھیں۔ اس نومسلم طبقہ نے جو ایک طرف اپنے کو اسلامی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتا تھا اور دوسری طرف ہندوستانی ماحول کا بھی رمز آشنا تھا۔ باہر سے آنے والے مسلمانوں کے ہندوستان میں جمنے میں بڑی مدد کی۔ اس نومسلم طبقہ نے باہری مسلمانوں اور مقامی غیرمسلم باشندوں کے درمیان ایک تمدنی اور معاشرتی پل کا بھی کام دیا۔ زبان کا مسئلہ ہو یا رسوم و رواج کا، رہن سہن کے طریقے ہوں یا لباس و خوراک کے انداز، حویلیوں اور محلوں کی تعمیر ہو یا باغ و چمن کی آرائش، غرض تمدن و معاشرت کے ہر میدان میں اسلامی اور ہندوستانی عناصر کی پیوندکاری بڑی حد تک نومسلم ہندوستانیوں کی مرہون منت رہی۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ نومسلم ہندوستانی، باہری اسلامی تہذیب کے علمبرداروں اور ہندوستان کے مقامی باشندوں کے درمیان اجنبیت کو دور کرنے اور ان میں باہمی تعاون اور رواداری کے تعلق کے پیدا ہونے کا ایک اہم سبب بنے۔

اسلامی معاشرہ کے ہندوستان میں جم جانے اور مقامی باشندوں کے ساتھ روادارانہ تعلقات پیدا ہو جانے کے بعد ہی ہندوستانی مسلمانوں نے مقامی مذاہب و تمدن کی طرف اپنی توجہ مبذول کی چنانچہ فیروز تغلق اور سکندر لودھی کے دوران حکومت شاہی ایماء پر ہندو مذہب سے متعلق بعض کتابوں کے ترجمے سنسکرت سے فارسی زبان

میں ہوئے۔ بہر حال یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں اسلامی تہذیب اور ہندوستانی تمدن کا حقیقی سنگم مغل دورِ حکومت میں حاصل ہوا وہاں اکبر اعظم کے دورِ حکومت سے ہی ہندوستانی مذاہب میں ہندی مسلمانوں کی دلچسپی کے واضح نقوش ملتے ہیں۔ اکبر اپنی شخصیت اور رہن سہن کے لحاظ سے خود ہندی اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا آئینہ دار تھا۔ اس کی پالیسیوں اور طرزِ فکر سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی تمدن و معاشرت کے ساتھ ایک حقیقی اور پائدار گٹھ جوڑ کا خواہاں تھا۔ چنانچہ جہاں اکبر نے ہندوستانی طرزِ معاشرت کی بہت سی چیزوں کی قدردانی کی وہاں اس نے مسلمانوں کے ہندوستانی مذاہب کے مطالعے کی بھی بہت ہمت افزائی کی۔ اکبر کے ایماء پر کئی ایسے عالموں کی ایک ٹیم بنائی گئی جو سنسکرت سے ہندو مذاہب کی کتابوں کے فارسی میں ترجمہ کرنے پر قدرت رکھتے تھے۔ ان علماء میں جو اکبر کے دربار میں سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرنے پر مقرر کئے گئے علاوہ ابوالفضل اور فیضی کے، جو کہ اس ٹیم کے سربراہ کی حیثیت رکھتے تھے، ملا شیری، نقیب خاں، سلطان حاجی، بدایونی، ابراہیم سرہندی، نصراللہ مستوفی اور مولانا واعظ کے علاوہ بہت سے عالم شامل تھے۔ اکبر کے حکم سے ملا شیری، نقیب خاں، سلطان حاجی اور بدایونی نے مل کر ہندوستان کے عظیم رزمیہ اور مذہبی کتاب مہابھارت کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ اس پر ابوالفضل نے ایک مقدمہ لکھا اور اس کا نام رزم نامہ رکھا گیا۔ درباری مصوروں کی مدد سے اس کو نادر و نایاب تصویروں سے مزین کیا گیا۔ ان سرکاری مترجمین کو شاہی خزانے سے جو معاوضہ ملتا تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آئین اکبری کے مطابق بدایونی کو ۲۴ ہزار اشلوک ترجمہ کرنے کے بدلے ۱۲۰ اشرفیاں اور دس ہزار ٹنکہ عطا ہوا تھا۔ اسی زمانے میں رامائن کا بھی فارسی میں ترجمہ ہوا۔ اس کے ترجمے میں چار سال لگے تھے اور نقیب خاں، شیخ سلطان نے اس کام کو سرانجام دیا۔ ملا شیری نے سری کرشن کی سوانح حیات سے متعلق کتاب ہری ونش کا فارسی ترجمہ کیا۔ ملا شیری اور بدایونی نے مل کر اتھروید کا بھی ترجمہ کیا تھا۔ اسی طرح کشمیر کی چار ہزار سالہ تاریخ و تہذیب سے متعلق ایک نادر کتاب راج ترنگنی کا بھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ اسی دور میں ہوا۔ اگرچہ

ایک دوسری روایت کے مطابق یہ ترجمہ جہانگیر کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ بھگوت پران ہندو مذہب میں کرشن بھگتی کی تحریک کے لئے ایک اساسی حیثیت رکھتا ہے، اس کا ترجمہ فارسی میں اگرچہ راجہ ٹوڈرمل نے کیا لیکن وہ بھی اکبر کے دورِ حکومت میں ہندو مذہب کی کتابوں کے فارسی میں ترجمہ کی تحریک کا ایک حصہ ہے۔ ان تراجم کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ فارسی داں ہندو مسلمان جو سنسکرت نہیں جانتے ان مذہبی کتابوں سے واقف ہوسکیں۔

فیروز تغلق کے عہد سے اکبر کے دورِ حکومت تک ہندو مذہب کی بنیادی کتابوں کے فارسی میں منتقل کرنے کا جو کام ہوا تھا اس کی وجہ سے مسلم معاشرہ میں ایسے بہت سے افراد پیدا ہوگئے جو ہندو مذہب کے فلسفہ وعقائد اور رسوم ورواج کے متعلق خاصی معلومات رکھتے تھے۔ کچھ روشن خیال اور سریع الفکر افراد ایسے بھی ہوئے جو ہندو مذہب اور اسلام کی مشترک سچائیوں میں دلچسپی لینے لگے اور اس سلسلے میں انھیں ہندو مذہب کے مزید مطالعے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مغل دورِ حکومت میں ایسے روشن خیال دانشوروں کا سرخیل بلاشبہ شاہجہاں کے بڑے لڑکے دارا شکوہ کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ دارا شکوہ کی تصنیف مجمع البحرین ہندو مذہب اور صوفیانہ اسلامی تصورات کی ایک دوسرے سے انطباق کی عمدہ کوشش ہے۔ یہ تصنیف اگرچہ مختصر ہے اور کتاب کے بجائے اسے رسالہ کہنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے، لیکن اپنے ایجاز اور حشو وزوائد سے پاک ہونے کے لحاظ سے ایک وقیع تصنیف کا درجہ رکھتی ہے۔ دارا شکوہ کی ہندو مذہب کے متعلق معلومات نہایت ٹھوس ہیں۔ لیکن اسلام کے متصوفانہ تصورات سے ان کا انطباق اکثر آورد معلوم ہوتا ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ تصنیف موجودہ دور کے قاری کے لئے مذاہب کے سنجیدہ مطالعہ سے زیادہ اپنی تاویلات کی بنا پر دلچسپی کا باعث ہوگی لیکن بہرصورت شہزادہ دارا شکوہ کے تیز ذہن اور وسیع معلومات کی داد دئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔

دارا شکوہ کا ہندو مذہب کے مطالعے کے سلسلے میں اس سے بھی بڑا کارنامہ

فارسی میں سرِّ اکبر کے نام سے باون[52] اُپنشدوں کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ اس نے بنارس کے کئی پنڈتوں کی مدد سے خود کیا ہے اور اپنے قول کے مطابق اس میں اس نے مکمل غیر جانبداری اور حتی الامکان علمی دیانتداری سے کام لیا ہے۔

اُپنشد چھوٹے بڑے مختلف حجم کے رسائل ہیں جو ویدک عہد کے آخری دور سے متعلق ہیں اور ویدک دور کے فکری ارتقاء کا درجۂ کمال مانے جاتے ہیں۔ اپنے دور رس مابعد الطبیعاتی تصورات، خیالات کی بلند پروازی اور فکر کی باریکی کے لحاظ سے بجا طور پر اُپنشد ہندوستان کے فلسفیانہ و مذہبی فکر کی معراج سمجھے جاتے ہیں۔ اُپنشد کے مطالعہ کے بغیر ہندو مذہبی فلسفہ کے صحیح مقام کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ داراشکوہ کے چنیدہ اُپنشدوں کے فارسی ترجمے نے مسلمانوں میں فلسفہ وعلم کے شائقین کے لئے نئے دروازے کھول دئے اور مسلمان دانشوروں کے لئے ہندو مذہب کے اعلیٰ ترین سرمائے تک رسائی ممکن کر دی۔

داراشکوہ نے اُپنشد کے علاوہ ہندوستان کی مقبول ترین مذہبی کتاب بھگوت گیتا کا بھی ہندو علماء کی مدد سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ مذہبی اہمیت اور اپنے اثرات کے لحاظ سے بھگوت گیتا کا ترجمہ اُپنشد کے ترجمے سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اُپنشد ہندو مذہب کے فکری ارتقاء کا نقطۂ عروج ہیں لیکن ان کا افادہ فلسفیانہ ذوق رکھنے والے پڑھے لکھے خواص تک محدود رہ سکتا ہے۔ بھگوت گیتا ایک ہمہ گیر اور وسیع المشرب تصنیف ہے۔ اس میں اُپنشد کی بلند پروازی کے ساتھ ساتھ عوام اور کم پڑھے لکھوں کی مذہبی ضرورت کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ اس لئے بھگوت گیتا جہاں خواص کی فکری تسلی کا مواد رکھتی ہے وہاں عوام کی روحانی تشنگی بجھانے کا سامان بھی اس میں موجود ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے پورے دورِ حکومت میں ہندوستان کے غیر اسلامی معاشرہ میں جو مذہبی تحریک سب سے زیادہ چھائی ہوئی تھی اور جس مذہبی رجحان کا اس پورے دور میں بول بالا رہا وہ بھکتی کی تحریک تھی۔ بھگوت گیتا اگرچہ اپنے وقت تک ہندوستان میں ترقی پذیر مختلف مذہبی رجحانات کا نچوڑ ہے لیکن اس میں سب سے زیادہ بھکتی پر ہی زور

دیا گیا ہے۔ درحقیقت بھگوت گیتا بھکتی کے مذہبی رجحان سے متعلق سب سے پہلی باقاعدہ اور منظم تصنیف ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ داراشکوہ کے ذریعہ بھگوت گیتا کے فارسی ترجمے نے مسلمانوں کے لئے رائج الوقت ہندو مذہب کی بنیادوں کے مطالعہ کا سامان مہیّا کر دیا۔ ان تراجم کے علاوہ داراشکوہ کی ایماء پر اور زیر نگرانی کتی اور ہندو مذہب کی اہم کتابوں کے فارسی میں ترجمے ہوئے جن کے مترجمین میں بعض ہندو علماء بھی شامل ہیں۔ مثال کے طور سے یوگ وشِشٹ اور آتما وِلاس کا ترجمہ داراشکوہ نے اپنی نگرانی میں ہی کرایا۔ موخر الذکر کا مترجم چندر بھان برہمن ہے جس نے ہندو مذہب سے متعلق داراشکوہ کا ایک ہندو عالم سے مکالمہ بھی سوال وجواب لال داس و داراشکوہ کے نام سے مرتب کیا ہے۔

شاہجہاں اور داراشکوہ کے عہد کی ایک اور مشہور تصنیف جو ہندو مذاہب کے مطالعہ کے سلسلے میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے دبستان مذاہب ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا مصنف کشمیر کا باشندہ ایک معروف صوفی المشرب شاعر محسن فانی ہے۔ لکشمی نارائن کی تصنیف گل رعنا میں محسن فانی کے متعلق جو تفصیلات دی ہوئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شاہجہانی عہد کی ایک اہم شخصیت تھا۔ اور بادشاہ کی طرف سے الہ آباد میں "صدر" کے عہدے پر بھی مامور رہا تھا جہاں کے مشہور صوفی بزرگ شیخ محب اللہ الہ آبادی کا وہ مرید بھی تھا۔ شیخ محب اللہ الہ آبادی چشتیہ سلسلے کے بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں اور وہ خود بھی ہندو مذہب کی معلومات سے دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ سنسکرت کے عالم بھی تھے اور ان کی اس سلسلے میں کچھ تصانیف بھی موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ محسن فانی کو مختلف مذاہب کے مطالعہ کا ذوق انھیں سے حاصل ہوا ہو۔ بہرحال یہ محض دبستان مذاہب کے انگریز مترجمین کا قیاس ہے کہ اس کا مصنف محسن فانی تھا ورنہ گل رعنا میں بھی محسن فانی کی تصانیف میں دبستان مذاہب کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ دبستان مذاہب میں خود کسی مصنف کا نام نہیں مذکور ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر مصنف کو گمنام رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے

کہ کتاب کا مصنف صوفی المشرب ہے، وحدت الوجود کا قائل ہے اور مذہبی اختلافات کو ظاہری رسوم ورواج کے فرق پر مبنی سمجھتا ہے۔ کتاب میں مذکور چند حوالوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کا سنہ پیدائش ۱۶۱۵ء تھا۔

دبستانِ مذاہب میں پانچ بڑے مذاہب زرتشتیت، ہندومت، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا مطالعہ شامل ہے، اس کے علاوہ سکھ مت اور کئی اسلامی فرقوں اور مکاتیب فکر مثلاً وحیدیہ، روشنیہ، اسماعیلیہ، الٰہیہ، فلاسفہ اور صوفیاء وغیرہ سے اس میں بحث کی گئی ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ زرتشتیت سے متعلق ہے اور اس پر مصنف نے خاصی توجہ صرف کی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ دلچسپ، مفید اور پُر از معلومات حصہ ہندومت سے متعلق ہے جس کو مصنف نے بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مصنف کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے ہندوستان میں کافی سفر کیا ہے۔ اور ہندومت کے عقائد اور معلومات براہ راست ہندو عالموں سے گفتگو اور ذاتی مشاہدے کے ذریعہ حاصل کی ہیں۔ اس سلسلے میں مصنف نے ہندو مذہب کی مقدس کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا اور ان کے ذریعہ اس نے اپنے مخصوص نظریات قائم کر لئے تھے جن میں (وہ اس حصہ کے شروع میں ہی اعتراف کر لیتا ہے) اس کو اپنی سیاحت اور ہندو عالموں سے ملاقات کے بعد تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ ہندو مذہب کے ایک عمومی مطالعے کے علاوہ مصنف نے ہندو مذہب کے مشہور فرقوں اور مکاتب فکر مثلاً بدھ میمنسا، ویدانت، سانکھیا، یوگا، شکتا، وشنو مت، ویراگی، چارواک اور ترک سے الگ الگ ابواب میں بحث کی ہے اور اس لحاظ سے یہ تصنیف عہد وسطیٰ میں رائج ہندو مذہب اور اس کے مشہور فرقوں سے متعلق ایک اہم دستاویز ہے۔ اس کتاب میں ایک باب بدھ مت سے متعلق ہے لیکن اس میں بدھ مت سے متعلق چند سرسری معلومات کے علاوہ ہندومت کے دوسرے فرقوں کا بیان مذکور ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس تصنیف کے وقت تک بدھ مت ہندوستان سے تقریباً معدوم ہو چکا تھا۔

دبستان مذاہب کا مصنف اپنے دور کو مدنظر رکھتے ہوئے انتہائی غیرجانبدار آدمی ہے اور اس کا مقصد بحدِ امکان یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کو ان کے اپنے ماننے والوں کے عقائد اور رسومات کی روشنی میں پیش کردے۔ اس سلسلے میں اس نے ذاتی تعصّبات اور تبصروں سے حتی الامکان پرہیز کیا ہے، پھر بھی کہیں کہیں اس کے اپنے طرزِ فکر اور ذاتی آرار کی جھلکیاں ہم کو مل جاتی ہیں۔ بہرحال مجموعی اعتبار سے اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث یہ کتاب ہندوستان کے مطالعۂ مذاہب کے ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہے جس کا اعتراف مشرق و مغرب سبھی جگہ کے دانشوروں نے کیا ہے۔ اس کے پہلے باب کا انگریزی ترجمہ ۱۷۸۷ء کے قریب شائع ہوا تھا اور مکمل کتاب کا ترجمہ پہلی بار ۱۸۴۳ء میں چھپا جس کو ڈیوڈ شی اور اینتھونی ٹروائر نے مل کر کیا تھا۔

جدید دور میں مسلمانوں نے اردو میں ہندوستانی مذاہب سے متعلق کام کیا ہے۔ لیکن اس کا احاطہ ایک الگ مضمون کا طالب ہے، لیکن اتنا ضرور عرض کیا جا سکتا ہے کہ جدید دور میں ہندی مسلمانوں نے ہندوستانی مذاہب کے مطالعہ کی طرف اب تک کما حقّہٗ توجہ نہیں کی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان عالم اور دانشور پھر اپنی توجہ اس ضروری اور اہم کام کی طرف مبذول کریں۔ ساتھ ہی اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہندوؤں کے مذہبی اور دانشور طبقے میں اسلام اور مسلمانوں کے تمدّن کے مطالعے کی طرف توجہ دی جائے، تاکہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے مذہب اور تمدن سے واقف ہوں اور ان دونوں میں جو اجنبیت حائل ہو گئی ہے، وہ دور ہو اور دونوں مل کر ملک و قوم کی تعمیر میں حصہ لیں۔

وریندر پرشاد سکسینہ

چودھری جگت موہن لال رواں

(۱۸۸۹ ——— ۱۹۳۴)

رواں ۱۴ جنوری ۱۸۸۹ء کو اناؤ کے ایک معزز سریواستو کائستھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام منشی گنگا پرشاد تھا۔ ابھی نو برس کے تھے کہ باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ والد کے انتقال کے بعد رواں کی تعلیم و تربیت ان کے بڑے بھائی منشی کنہیا لال کے زیر نگرانی ہوئی۔ انھوں نے ۱۹۰۷ء میں انٹرنس پاس کیا۔ ۱۹۰۹ء میں ایف اے اور ۱۹۱۱ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی اے پاس کیا اور ۱۹۱۴ء[1] میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی پھر ۱۹۱۶ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کر کے اناؤ ہی میں وکالت شروع کر دی اور چند ہی سال میں وہاں کے سربرآوردہ وکلاء میں شمار ہونے لگے۔ شاعری کا مذاق بچپن سے تھا جس کا اظہار عزیز لکھنوی نے "روحِ رواں" کے مقدمے میں کیا ہے۔

شاعری میں رواں کو عزیز لکھنوی سے تلمذ تھا۔ وہ اپنے استاد کا بے حد احترام کرتے تھے۔ پنڈت کشن پرشاد کول نے رسالہ "نرنجھی نظر" میں ان کو صفی لکھنوی کا شاگرد لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ غلط فہمی کیسے پیدا ہوئی لیکن یہ حقیقت

جناب وریندر پرشاد سکسینہ۔ بدایوں کے رہنے والے ہیں اور وہیں کسی سرکاری محکمے میں کام کرتے ہیں۔

[1] "خم خانۂ جاوید" میں لکھا ہے کہ "۱۹۱۳ء میں ایم اے اور ۱۹۱۴ء میں اول سال ایل ایل بی پاس کیا۔" (جلد سوم صفحہ ۵۳۶) مدیر معاون

ہے کہ رواں نے سوائے عزیز لکھنوی کے کسی اور سے مشورۂ سخن نہیں کیا۔ رواں کا انتقال تقریباً ۴۸ سال کی عمر میں ۲۶ ستمبر ۱۹۳۴ء دن کے گیارہ بجے حرکتِ قلب رُک جانے کی وجہ سے ہوا۔ اُناؤ میں کون سا دل تھا جو اُن کے غم میں بے حال نہ ہوا ہو اور کون سی آنکھ تھی جو اشک بار نہ ہوئی ہو۔ رواں ایک مرنجاں مرنج خوش طبع اور خوش خلق انسان تھے، یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کے لئے، کیا ہندو کیا مسلمان، ان کی موت ذاتی غم اور نجی سانحہ بن گئی تھی۔

جلیل قدوائی نے جو رواں کے گہرے دوست تھے، دسمبر ۱۹۳۴ء کے "الناظر" میں اپنے تاثرات اور ان کی موت کے مختصر حالات لکھے ہیں، حسب ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

"اکثر ان کی زبان پر ع "شکار کرنے کو آئے شکار ہو کے چلے" رہتا تھا مگر یہ خبر نہ تھی کہ یہ مصرعہ انھیں پر صادق آئے گا۔ رات کو نکھری ہوئی چاندنی میں اپنے عالی شان مکان کی اوپری منزل کی چھت پر رات کو دو بجے تک اپنی زیر تالیف مثنوی گوتم بدھ کے اشعار کہتے رہے پھر وہیں شبنم میں سو گئے، صبح اٹھے تو کسل تھا اور حرارت بھی تھی۔ اسی حالت میں کچہری میں اپنے مقدمات کی پیروی کی۔ تین بجے واپس ہوئے تو حالت بہت خراب تھی۔ رات کو سرسام ہو گیا کسی کو پہچانتے نہ تھے، تیسرے دن صبح آٹھ بجے زبان بند ہو گئی۔ گیارہ بجے دن کو سخت اضطراب کی حالت میں دم توڑا۔ ہوش کی حالت میں دل پر بار بار ہاتھ رکھتے تھے اور شدید درد بتاتے تھے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ حرکتِ قلب رُک گئی۔ حکیم کہتے ہیں کہ خون میں زہر چھٹک گیا اس لئے اور بھی کہ مرنے کے بعد ناخن اور باہیں اور گلے کے نیچے تک جسم سیاہ پڑ گیا تھا۔ غرض مرض الموت سے مفر نہیں۔۔۔ چھوٹے بچے کو بار بار گود میں لیتے تھے۔ مرنے سے پہلے بستر مرگ کے چاروں طرف اپنے اعزا کو حسرت و یاس سے دیکھتے تھے، خصوصاً بیوی بچوں اور بھائیوں کو اور اپنے مکان اور سارے سامان کو دیکھتے تھے، معلوم نہیں اس آخری ساعت میں دل پر رنج و غم کا کیا غلبہ ہوگا مگر افسوس زبان سے کچھ نہ کہہ سکے، کہا تو صرف اتنا کہ اب ہم جاتے ہیں وہ بھی کس تکلیف سے کہ بس سننے والوں کے جگر شق ہو گئے ۵

ایسے اے دوست تم ہوئے ہم سے جدا
باقی نہ رہا کچھ بھی زندہ رہنے کا مزا
تم کہہ سکے ہم سے کچھ، نہ ہم کچھ تم سے
معلوم نہیں دلوں پر گزری کیا کیا"

اسی دن جس دن موصوف کا انتقال ہوا تھا اُن کے مکان سے ارتھی اٹھی، ہزاروں کی تعداد میں ہندو اور مسلمان ارتھی کے ساتھ تھے سارے اُناؤ میں ایک کہرام مچ گیا۔ ہندوستان کے تقریباً تمام مشاہیر نے نوحے، نظمیں اور قطعات تاریخ لکھ کر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کیا۔ رواں کے استاد بھائی جوش ملیح آبادی نے "ماتمِ رواں" کے نام سے نظم اور ایک رباعی لکھی تھی، رباعی ملاحظہ ہو:

کیا موت نے تصویر مٹائی افسوس — اک آن میں ہو گئی جدائی افسوس
ایامِ شباب اور پیغامِ فنا — اے عمرِ رواں یہ بیوفائی افسوس

نظم کے کچھ شعر سنئے:

اک ایسا صدمۂ جانکاہ پہنچا ہے کہ رہ رہ کر
خود اپنی زندگی کی تلخیوں کو بھول جاتا ہوں
نہ پوچھ اس عزتِ غم کو کہ ہو جاتا ہوں شرمندہ
اگر بھولے سے بھی میں تیرہ قسمت مسکراتا ہوں
کبھی سازِ خرد کی خامشی پر آہ بھرتا ہوں
کبھی زلفِ جنوں کی برہمی پر سر جھکاتا ہوں
نہ جانے کون مطرب اُٹھ گیا ہے بزمِ عالم سے
کہ اپنے دل کے اندر ایک سناٹا پاتا ہوں
فضا تاریک ہو جاتی ہے تارے کانپ اٹھتے ہیں
رواں کی موت پر راتوں کو جب آنسو بہاتا ہوں

رواں شاعری کا بڑا ستھرا اور سلجھا مذاق رکھتے تھے۔ اُن کی پُرگوئی اور شاعرانہ

صلاحیتوں نے بہت جلد اپنا سکّہ منوالیا۔ عزیز لکھنوی نے انھیں "بلبل چمنستان شاعری" اپنا شاگرد ہونے کی وجہ سے نہیں کہا تھا بلکہ یہ رواں کی شاعرانہ صلاحیتوں کا حقیقی اعتراف تھا۔ قومی احساسات و خیالات کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں جذبات و کیفیات کے اظہار کے بڑے دلکش نمونے ملتے ہیں۔ انھوں نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) "روحِ رواں" یہ رواں کے کلام کا مجموعہ ہے اسے مارچ ۱۹۲۸ء میں نامی پریس لکھنؤ سے خود انھوں نے عمدہ طباعت و کتابت کے ساتھ سفید کاغذ پر مجلد شائع کیا تھا۔ شروع میں عزیز لکھنوی کا لکھا ہوا ۵۵ صفحات کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔ اس کے بعد رواں کے قلم سے دو صفحے کا عرض حال ہے، کل ضخامت ۲۱۲ صفحات ہے۔ اس مجموعے کے چار حصّے ہیں، پہلے حصے میں نظمیں ہیں، دوسرے میں غزلیں، تیسرے میں قطعات اور چوتھے میں رباعیات۔ جگر بریلوی نے "یادِ رفتگاں" میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

> "آپ کا مجموعہ ترقی یافتہ دور کا نہایت کامیاب اور قابل قدر نمونہ ہے اس میں قدرتی مظاہر و مناظر بھی ہیں۔ جذباتی کیفیات بھی ہیں، قومی خیالات و احساسات بھی ہیں فلسفہ اخلاقیات عرفانیت اور کچھ واقعات بھی ہیں۔"

(۲) "رباعیاتِ رواں" رباعیوں کا یہ مختصر مجموعہ جس میں ۱۴۱ رباعیاں شامل ہیں ۱۹۲۶ء میں کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور سے شائع ہوا ہے۔ گوپی ناتھ امن نے "دورِ جدید" دہلی کے اردو نمبر میں رواں کے رباعیات کے مجموعہ کا نام "روحِ رواں" لکھا ہے جو محلِ نظر ہے۔ میرے کتب خانے میں "رباعیاتِ رواں" کے نام سے ایک مجموعہ موجود ہے، اس کے علاوہ مجھے رواں کے کسی دوسرے مجموعہ کا علم نہیں۔ رواں کا اصلی شعری جوہر اُن کی رباعیوں میں کھلتا ہے۔ اُن کی جدت آفرینی اور مذاق سلیم نے نہ صرف رباعیوں کو لطافت و رنگینی بخشی بلکہ انھیں فارسی رباعیات کے ہم پلّہ کر دیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رباعیات کا یہ مجموعہ اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اصغر گونڈوی مرحوم نے "رباعیات رواں" کے مقدمے میں

لکھا ہے :

"اگر رواں کے کل ادبی وشاعرانہ جذبات کو نظر انداز کر دیا جائے جب بھی یہ مختصر مجموعۂ رباعیات ان کی شاعرانہ عظمتوں اور اُن کی ادبی خدمات کے ثبوت کے لئے بالکل کافی ہے اُن کے جدت آفریں دماغ اور ان کے سلجھے ہوئے مذاق نے اردو شاعری کی ایک مخصوص صنف رباعی کو کس حد تک لطافت اور رنگینیوں سے فارسی رباعیوں کے دوش بدوش کر دیا ہے ۔"

(۳) "فریب عمل": گالزورذی کے ڈرامے اِسکن گیم (SKIN GAME) (مطبوعہ: ۱۹۲۰ء) کا ترجمہ رواں نے "فریب عمل" کے نام سے کیا تھا جسے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے شائع کیا ہے ۔ رواں کا یہ ترجمہ ادب میں کوئی درجہ حاصل نہ کر سکا ۔ ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں زبان وبیان کے لطف کے ساتھ اصل تصنیف کی روح باقی رہے اور پڑھنے والے کو یہ محسوس نہ ہو کہ یہ ترجمہ ہے ۔ مرحوم کی یہ کوشش اس لحاظ سے کامیاب نہ ہو سکی ۔ چنانچہ بعض نقادوں نے اس پر اعتراضات بھی کئے ہیں ۔

(۴) "نقدرواں" گوتم بدھ کی سوانح حیات اور اُن کی تعلیمات کو مرحوم نے مولانا روم کی مثنوی کی بحر میں نظم کرنا شروع کیا تھا مگر پوری نہ کر سکے ۔ اُن کی وفات کے بعد وحشی کانپوری مرحوم نے اُس مثنوی کو مکمل کیا اور رواں کے صاحبزادے پربھان شنکر سروش نے ۱۹۵۱ء میں اُسے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کیا ۔ یہ مثنوی اگرچہ "گلزار نسیم"، "سحر البیان"، "پیام ساوتری" اور "زہر عشق" کی طرح قبول عام کا درجہ نہ پا سکی لیکن اس کی ادبی حیثیت "دافع عذاب"، "شکنتلا" اور "ترانۂ شوق" جیسی مثنویوں سے کسی طرح کم نہیں ہے ۔ "نقدرواں" کے سلسلے میں سید رفیق مارہروی نے "ہندوئں میں اردو" میں لکھا ہے کہ: "آپ کی ایک مثنوی ہے جس میں مہاتما بدھ کے سوانح حیات اور اس کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے ، یہ مثنوی اب تک طبع نہیں ہو سکی ۔" یہ خیال صحیح نہیں ہے ، ان کی یہ کتاب ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی ہے اور مثنوی "نقدرواں" اس کتاب سے چھ سال پہلے شائع ہو چکی تھی ۔ وحشی کانپوری نے "نقدرواں" کے بارے میں اپنی

تقریظ میں لکھا ہے :

"اس کتاب کی شان سب سے نرالی ہے اور ادب اُردو میں یہ ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ صنائع بدائع یا ضلع جگت میں یہ دیگر مثنویات پر سبقت نہ لے جا سکے لیکن واقعات درس آموز حیات اور ان کے لطیف تاثرات کے اعتبار سے یہ اردو میں پہلی مثنوی ہوگی جو بقائے دوام حاصل کرے گی اس سے آیندہ نسلیں درس حیات لیں گی اور خوابیدہ روحیں بیدار ہوتی رہیں گی۔ اس کے مطالعہ سے ناظرین پر روشن ہو جائے گا کہ رواں مرحوم نے اردو کے ساتھ کتنا احسان کیا ہے۔ اس مثنوی میں مہاتما گوتم بدھ کی پیدائش، بلوغیت، شادی اور ترک دنیا کے واقعات اور علی الخصوص ان کا فلسفۂ تعلیم اس قدر دلچسپ [illegible] میں نظم کیا گیا ہے کہ اس کو پڑھ کر انسان کی چشم [illegible] تی ہے۔"

رواں کا شمار صف اوّل کے شعرا میں کیا جاتا ہے۔ وہ غزل، نظم اور رباعی پر پوری قدرت رکھتے تھے لیکن ان کا اصلی جوہر رباعی میں کھلتا ہے۔ ان کی نظموں میں پختگی بھی ہے اور شگفتگی بھی، اپنی رنگین بیانی اور بلند خیالی سے جو لطف وہ نظموں میں پیدا کر دیتے ہیں وہ اکثر شاعروں کو نصیب نہیں۔ ہندوستانی فضا اور ہندی ماحول سے بھی ان کی نظمیں بھرپور ہیں۔ "روحِ رواں" میں کُل تیئس ۲۳ نظمیں ہیں۔ ان میں چند کے سوا باقی نظمیں روانی، برجستگی، تخیل کی بلند پروازی، اچھوتی تشبیہوں اور نادر استعاروں کے باعث اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ مثال کے طور پر "سرودِ عشق"، "معمائے فطرت"، "تتلی"، "لاوارث بچہ"، "معجزۂ انتظار"، "چتر کوٹ"، "شاعری"، "دو آئینے" اور "غبارہ" وہ نظمیں ہیں جو اُردو ادب میں زندہ رہنے والی ہیں۔ "غبارہ" رواں کی بہترین نظم کہی جا سکتی ہے۔ یہ نظم تخیل کی بلندی اور اچھوتی تشبیہات کا بہترین نمونہ ہے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں :

زمیں سے جانبِ بامِ فلک رواں ہے تو
مسافرِ رہِ بے جادہ و نشاں ہے تو

ہوا یہ اک فرسِ شعلہ جست کر کے چلا
کہ کوئی طائرِ زریں اُڑان بھر کے چلا
بلندیوں کی طرف مثلِ برق طور چلا
کمالِ شوق سے دامن میں بھر کے نور چلا
پڑا ہے یا کسی میکش کا صبرِ رندانہ
اُلٹ گیا ہے مئے آتشیں کا پیمانہ
فنا کے دوش پہ کچھ اس طرح سوار ہے تو
کہ بیکسوں کا چراغِ سرِ مزار ہے تو

نظم "شاعری" کی مقبولیت اور ادبی حیثیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اکثر نقادوں اور ادیبوں نے اسے بہترین نظموں میں شمار کیا ہے اور اس کے مندرجہ ذیل بند کو نقل کیا ہے :

اللہ اللہ یہ ہے وسعتِ دامانِ غزل — ختم پنہائے دو عالم پہ ہے پایانِ غزل
بُلبل و گُل ہی پہ موقوف نہیں شانِ غزل — پوچھئے حافظِ شیراز سے امکانِ غزل
ضبط ہے آئینۂ رازِ حقیقت اس میں
یہ وہ کوزہ ہے کہ دریا کی ہے وسعت اس میں

اس میں شاعری کی حقیقت اور اس کی وسعت کو بڑے دل نشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ "تتلی" پر اردو اور ہندی میں بیسیوں نظمیں لکھی گئی ہیں مگر رواں کی یہ نظم کئی اعتبار سے ممتاز اور منفرد ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ان کی روانی اور برجستگی کے ساتھ ساتھ ندرتِ تشبیہ قابلِ دید ہے :

حُسن صدقے ہے ترے رنگِ پرِ پرواز پر
لوٹی جاتی ہیں ادائیں تیرے ہر انداز پر
بن کے یوسف حُسن خود آیا ہے یا بازار میں
پڑ گئی ہے جانِ تازہ یا گلِ گلزار میں

جسم ہلکا سا تیرا بازو سُبک اور پر سُبک
آتشِ گلشن کے ہیں شعلے سُبک اخگر سُبک

ذیل کے اشعار بھی کس قدر پُر لطف ہیں:

اُڑتے پھرتے دیکھتے تجھ کو ہوا میں شاد شاد
اک عجب حسرت سے بچپن کی ہمیں آتی ہے یاد
سخت کوشش پر ہماری بھی نہ ہاتھ آتی تھی تو
تجھ تلک چٹکی پہنچتی تھی کہ اُڑ جاتی تھی تو
معترف ہوتے تھے چالاکی کے تیری دم بہ دم
اور ہوا پر تجھ کو پہروں تاکتے رہتے تھے ہم

"معجزۂ انتظار" میں کیفیت انتظار کو بڑے دل کش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وقت غروب آفتاب حالتِ انتظار میں
بیٹھی ہے ایک مہ جبیں محو خیالِ یار میں
اُلجھے ہوئے ہیں سر کے بال جامہ تمام پُرشکن
چہرہ پر ایک سادگی جس میں ہزار بانکپن
قاعدۂ شمار سے ختم ہے اب فراق دوست
اس لئے اور تیز ہے آتشِ اشتیاق دوست
اتنے میں اک کنیز نے مژدۂ جانفزا دیا
دل کو مراد مل گئی نامہ لیا، صلہ دیا
آئینہ محو حُسن تھا خلعت خاص تھی مگر
صورت یار آتی تھی دیدۂ شوق کو نظر

رامائن اور مہابھارت پر اردو شاعروں نے اتنا منظوم لٹریچر اُردو زبان کو دیا ہے کہ وہ ہندوستان کی بعض علاقائی زبانوں میں بھی نہیں مل سکتا۔ رواں نے بھی رامائن

اور بھارت کے کئی سین نظم کئے ہیں۔ اس سلسلے میں "رحلت بال"، "چترکوٹ"، "شکتی بان" اور "پیام رخصتی" اُن کی قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔ شری رام چندر جی، لچھمن جی اور جانکی جی کے ساتھ جنگل کو روانہ ہوتے ہیں اور چترکوٹ پہنچ کر ایک جگہ مقیم ہو جاتے ہیں۔ دور سے کچھ غبار اٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔ لچھمن جی رام چندر جی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

گرد و غبار دیکھ رہے ہیں حضور کچھ — نزدیک آ گئی نہیں اب فوج دور کچھ
شک ہے مجھے کہ آج خطر ہے ضرور کچھ — نیت میں آ گیا ہے بھرت کی فتور کچھ
اس کا سوائے جنگ کے انجام کچھ نہیں
اس قافلہ کا ورنہ یہاں کام کچھ نہیں

شری رام چندر جی لچھمن جی کو جواب دیتے ہیں کہ آپ کا خیال غلط ہے، میرے بھائی ایسے نہیں ہیں جو اس طرح بدل جائیں:

جگنو سے جیسے آگ کا جلنا محال ہے — اہلِ وفا کے قول کا ٹلنا محال ہے
مغرب سے آفتاب نکلنا محال ہے — لچھمن! یونہی بھرت کا بدلنا محال ہے
بھائی کہاں جہان میں ایسے وفا شعار
یوں ہو کے بدگماں نہ بنو تم گناہگار

بھرت جی کا سفر جب ختم ہو جاتا ہے اور وہ چترکوٹ میں اپنے بھائیوں کے قریب آتے ہیں اور انھیں بن باسیوں کے روپ میں دیکھتے ہیں تو بے چین ہو جاتے ہیں۔ بھائی کو بھائی سے کیسی محبت و اُلفت ہوتی ہے اسے کتنے موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ اس موقع کے دو بند ملاحظہ ہوں:

یہ دیکھ کر بھرت کو ہوا اس قدر ملال — چلّا اٹھے کہ جانِ برادر یہ کیا ہے حال
دیکھے وہ آ کے جو ہے طلبگارِ ملک و مال — اور ہو غریق لجّۂ تحقیر و انفعال
اللہ رے حرص ذوقِ تمنّا کے واسطے
عقبیٰ پہ خاک ڈالی ہے دنیا کے واسطے

رام اُٹھ کھڑے ہوئے جو بھرت پر پڑی نظر — لپٹا لیا گلے سے برادر کو دوڑ کر

منظر وہ تھا فرشتے بھی حیراں تھے چرخ پر نقشِ الم اِدھر یہ ، وہ تصویرِ غم اُدھر
کلفت جو تھی دلوں میں وہ اشکوں سے دھو گئی
اتنا بھر آئے دل کہ زباں بند ہو گئی

رواںؔ اعلیٰ درجہ کے غزل گو بھی تھے۔ اُن کی غزلوں میں فلسفہ وحکمت اور اخلاقی مضامین کثرت سے نظم ہوئے ہیں بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کی غزلوں کا عام رنگ یہی ہے۔ بہرحال اخلاقی اور حکیمانہ نکتہ ہو یا کوئی اور بلند مضمون وہ نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔ ان کے اشعار میں ترنم بھی ہے اور سوز و گداز بھی جو غزل کی جان ہے۔ جگرؔ بریلوی نے "یادِ رفتگاں" میں ان کی غزلیہ شاعری کے سلسلے میں لکھا ہے کہ: "رواںؔ کی غزلیات پر اُن کا یہ شعر بالکل صادق آتا ہے۔"

رواںؔ ذوقِ سخن تیرا تجھے خود داد دیتا ہے
ترا انداز ہے انداز مرغانِ خوش الحاں کا

اور یہ واقعہ ہے کہ وہ مشکل الفاظ اور نامانوس ترکیبوں سے اشعار کو گرانبار نہیں کرتے بلکہ سیدھے سادے نرم مانوس اور شُستہ اور سلیس ترکیبوں کے پردے میں اس طرح ادائے مطلب کر جاتے ہیں اور بڑے بڑے نکات بیان کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا جھوم اُٹھتا ہے۔ چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

وہ مجھ کو مٹاتے ہیں احسان نہیں کرتے
میں بادِلِ خوں گشتہ مٹنے ہی کے قابل تھا

بس تھم گیا سفیرِ عمل کہہ کے یا نصیب
جس جا پہ ختم منزل تدبیر ہو گئی

سہل سی اک بات ہے مرنا مگر اُف قیدِ زیست
روح کے آزاد ہونے کو زمانہ چاہیئے

گل و لالہ پہ آخر کر رہا ہے غور کیا گلچیں
وہی خوں ہے جو ٹپکا تھا کبھی چشمِ عنادل سے

یہ کس نے آخرِ شب پردہ ہائے نور سے جھانکا
کہ لَو دینے لگا ہر ایک ذرہ بزمِ امکاں کا

تڑپتی پھرتی ہے اک برقِ عرفاں میکدے بھر میں
کبھی مینا میں خم سے اور کبھی مینا سے ساغر میں

بہر تقدیر کچھ دن کاٹنا تھے قید ہستی کے
قفس برباد کر کے آشیاں برباد کیا کرتے

کسی طرح نہ مرے دل کو جب قرار آئے
مری بلا سے خزاں آئے یا بہار آئے

کہاں سے کہاں لائی قسمت مری
کس آفت میں میں مبتلا ہو گیا

ہنسے بھی روئے بھی لیکن نہ سمجھے
خوشی کیا چیز ہے دنیا میں غم کیا

ہزاروں پھول مٹ کر اک کلی صورت دکھاتی ہے
یہی قانونِ فطرت آپ عالمگیر دیکھیں گے

نزع میں آکر کھُلا ہے عالم فانی کا راز
اے مری جاتی ہوئی دنیا بڑا دھوکا ہوا

نہ گل ہوئی ہے نہ شمعِ حیات گُل ہوگی
ہزار بار یونہی انجمن میں آئی ہے

رؔواں کا اصل جوہر رباعیوں میں کھُلتا ہے اور چیزوں سے قطع نظر اُن کی رباعیوں ہی کو لے لیا جائے یہ ان کی شاعرانہ عظمت اور ان کی ادبی خدمت کے لئے کافی ہیں۔ اُن کی رباعیوں کو بلا تامل فارسی رباعیات کے برابر رکھا جاسکتا ہے۔ اس میں اُن کی جدّت آفرینی اور اُن کے ستھرے مذاق کو بڑا دخل تھا۔ رؔواں نے اس صنف شاعری کو اتنی وسعت دی اور اُسے ایسی رنگینی اور لطافت بخشی کہ اُن کی رباعیاں اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ بن گئیں۔ فلسفیانہ خیالات کے علاوہ انھوں نے اخلاق اور عظمت انسانی کے سے مضامین اور مناظر قدرت کو بھی اپنی رباعیوں میں جگہ دی ہے لیکن یہاں بھی انھوں نے سلاست اور رنگینی و لطافت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ جعفر علی خاں اثؔر لکھنوی "نقد رواں" کے مقدمہ میں رؔواں کی رباعیوں کے متعلق لکھتے ہیں:

> "یہ کہنا حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ رؔواں پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو میں رباعی کو دیگر اصنافِ سخن میں ایک ممتاز جگہ دی۔ اُن سے پیشتر اردو میں کسی نے اتنی متنوع اور ایسی اچھی رباعیاں نہیں کہی تھیں۔ جؔوش نے اس طرف رؔواں کے بعد توجہ کی۔"

مولانا ضیاء احمد نے لکھا ہے کہ

> "رؔواں کی رباعیاں اردو ادب میں ایک گراں بہا اضافہ ہیں۔"

فؔراق گورکھپوری اپنے مضمون "اُردو شاعری کے گزشتہ پچاس برس" مطبوعہ "نیا دور" لکھنؤ نومبر ۱۹۶۳ء میں لکھتے ہیں:

> "موجودہ دور میں جس صنف سخن نے سر بہ فلک بلندیوں کو طے

کیا ہے وہ صنفِ سخن رباعی ہے۔ چودھری جگت موہن لال رؔواں
کی رباعیاں تمام گزشتہ ادوار کی رباعیوں سے کہیں اونچی ہیں۔"

نمونہ کے طور پر چند رباعیاں پیش کی جاتی ہیں :

کیا تم سے بتائیں عمرِ فانی کیا تھی
بچپن کیا چیز تھی جوانی کیا تھی
یہ گل کی مہک تھی یا ہوا کا جھونکا
اک موج فنا تھی زندگانی کیا تھی

کل صبح نے مسکرا کے تاروں سے کہا
ہو جائیں گے اب تمہارے انوار فنا
تاروں نے کہا کہ ہم رہیں گے یوں ہی
تو آئے گی اور ختم ہو جائے گی آ

نوروز ہے غرق بادہ دنیا کر دے
میرا ارمان آج پورا کر دے
پیالوں میں شراب بھر کے اس میں ساقی
تو کاسۂ آسمان کو سیدھا کر دے

یہ کیا کہ حیاتِ جاودانی کیا ہے
پہلے دیکھو جہانِ فانی کیا ہے
اس فکر میں ہو کہ موت کیا شے ہے رؔواں
یہ بھی سمجھے کہ زندگانی کیا ہے ؟

عبداللطیف اعظمی

مہاراشٹر میں اُردو

ایک سفر، ایک رپورتاژ

آجکل اردو کے حق میں، عام طور پر، فضا بہت سازگار ہے اور یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ اُسے اس کا جائز حق انشاءاللہ جلد ملے گا۔ بہار میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جاچکا ہے اور یوپی میں اس سال (۱۹۸۱ء) کے آخر تک سرکاری درجہ دینے کا پختہ وعدہ کیا گیا ہے، اس بدلی ہوئی صورت حال کا اردو بولنے والوں پر خوشگوار اثر پڑا ہے اور ان کے مایوس دلوں کو بڑی ڈھارس ملی ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ مہاراشٹر کے اردو بولنے والوں میں بھی یہ خواہش اور جذبہ پیدا ہوا کہ ان کی ریاست میں بھی اردو کو سرکاری درجہ دیا جائے، اسی سلسلے میں ضلع ناگپور کے ایک اہم قصبہ کامٹی میں ۳۱ر اکتوبر اور یکم نومبر (۱۹۸۱ء) کو "بزم غالب" کے اہتمام میں ایک دو روزہ سیمینار منعقد ہوا جس میں مہاراشٹر کے علاوہ دوسری ریاستوں کے مشہور ادیبوں نے بھی شرکت کی۔

کامٹی کی تاریخی اور تعلیمی اہمیت

کامٹی ضلع ناگپور کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، مگر فوجی چھاونی اور موٹے کپڑے کی صنعت کی وجہ سے، نیز قدامت اور علمی و تعلیمی لحاظ سے بھی اس کی بڑی اہمیت ہے۔ یہاں زیادہ تر باہر کے لوگ ہیں جو ایک طویل عرصے سے آباد ہیں اور اب یہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں، پہلا قافلہ مدراس سے آیا اور دوسرا مشرقی یوپی سے جس میں زیادہ تر اعظم گڈھ اور غازی پور کے لوگ شامل

تھے۔ اس قصبے کی موجودہ اہم شخصیتوں میں ایک محمد ظہیر وارثی صاحب ہیں، جنھوں نے کامٹی کی مختصر تاریخ اور کامٹی کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے بارے میں ایک مفصل مضمون لکھا ہے، ان کی تحقیق کے مطابق کامٹی کی بنیاد ۱۸۱۷ء میں، ناگپور کے بھونسلہ راج کے زوال اور انگریزوں کی عملداری کے آغاز میں پڑی اور ۱۸۲۱ء میں فوجی چھاؤنی کا قیام عمل میں آیا، جس کی وجہ سے اس علاقے کی ترقی میں تیزی شروع ہوئی، اسی زمانے میں جنوبی ہند کے باشندے یہاں آئے جن میں مسلمانوں کی تعداد اچھی خاصی تھی، ۱۸۵۸ء تک ان کے قدم مضبوطی کے ساتھ جم گئے، ۱۸۵۷ء کے پُرآشوب دور میں مشرقی یوپی سے مومن برادری کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں آئے اور اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے، اس علاقے کی ترقی میں بھرپور حصہ لیا۔ مشرقی یوپی سے جو لوگ آئے تھے، ان میں غازی پور کے مولانا حافظ محمد شکر اللہ اور مؤناتھ بھنجن (اعظم گڈھ) کے حافظ قاری محمد عبداللہ بھی تھے جو عربی و فارسی کے جید عالم تھے۔ ان کی کوششوں سے مذہبی تعلیم کی بنیاد پڑی اور ان دونوں بزرگوں کے فیض سے دینی علوم کی ترویج و اشاعت میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ اسی طرح مدراسی مسلمانوں میں ایک بزرگ حکیم قاضی قادر نواز خاں تھے، جو بقول ظہیر وارثی صاحب: "سلف صالحین کی زندگی کا اس عہد میں ایک پاکیزہ نمونہ تھے"۔ ان کی برگزیدہ شخصیت کی وجہ سے اس علاقے کے مسلمانوں میں اسلامی زندگی کو فروغ حاصل ہوا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں جب سرسید مرحوم کی تعلیمی تحریک ملک کے دور دراز علاقوں میں پھیلی تو اس سے ناگپور اور اس کے اطراف و جوانب کے علاقے بھی متاثر ہوئے اور یہاں جدید تعلیم کے اسکول اور کالج قائم ہوئے، اسی تحریک کی برکت ہے کہ ان علاقوں میں تعلیم کا رواج بہت زیادہ ہے اور اردو ذریعہ تعلیم کے جس قدر اسکول اور کالج اس علاقے میں مجھے نظر آئے کسی اور ریاست میں بہ مشکل ملیں گے۔ کامٹی جیسے چھوٹے قصبے میں اردو کے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی جس قدر تعداد مجھے ملی اتنی میری اپنی ریاست یوپی کے بعض اضلاع میں نہ ہوگی۔

سیمینار کا مقصد اور مقالات کی تفصیل

اس دو روزہ سیمینار کا واحد مقصد یہ جائزہ لینا تھا کہ مہاراشٹر میں اردو کی حالت کیا،

اور اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے لئے کس قدر گنجائش ہے؟ چنانچہ اسی نقطۂ نظر سے سیمینار کے مندوبین سے حسب ذیل عنوانات پر مقالات لکھنے کی فرمائش کی گئی تھی :

۱۔ ودربھ میں اردو

۲۔ اردو اور مراٹھی کے لسانی اور تہذیبی رشتے

۳۔ اردو ـــ مہاراشٹر کی دوسری علاقائی زبان کی حیثیت سے

ان عنوانات پر مقالات پڑھنے کے لیے، افتتاحی اور اختتامی اجلاس کے علاوہ دو نشستیں منعقد ہوئیں۔ اس موقع پر خوش نویسی کی ایک نمائش کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ "بزمِ غالب" جس نے اس سیمینار کا انتظام کیا تھا، مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے مالی تعاون سے، ایک دارالکتابت چلا رہی ہے، جس میں کچھ طالب علم کتابت سیکھتے ہیں اور ان کی مشق کے لیے "ترسیل" کے نام سے ایک رسالہ بھی نکلتا ہے۔ اس نمائش کا افتتاح جامعۂ ملیہ اسلامیہ کے سابق استاد اور رکن مولوی محمد حفیظ الدین ندوی صاحب نے کیا جو کامٹی کے رہنے والے ہیں اور جن کے آباؤ اجداد مدراس سے آئے تھے۔

نمائش کے افتتاح کے بعد سیمینار کا افتتاحی اجلاس شروع ہوا، جس کی صدارت کامٹی کے بزرگ اور ممتاز خادمِ تعلیم جناب محمد عبدالحفیظ انصاری صاحب (سابق پرنسپل ایم ایم ربانی جونیر کالج کامٹی) نے کی اور اپنی گرانی محکمۂ آثار قدیمہ ناگپور کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی صاحب نے افتتاح فرمایا۔ صدر جلسہ نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے، سیمینار کے نوجوان منتظمین کے جذبۂ خدمت اور ادبی و تعلیمی ذوق و شوق کی تعریف کی۔ جناب ڈیسائی نے اپنی افتتاحی تقریر میں سیمینار کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اس پر زور دیا کہ اردو کے موجودہ مسائل پر بحث و گفتگو کرتے وقت جذبات کے بجائے مثبت اور تعمیری نقطۂ نظر اختیار کرنا چاہیے۔ "بزمِ غالب" کے صدر سید قمر الزماں صاحب نے مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے سیمینار کی ضرورت اور مقصد پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد "ودربھ میں اردو" کے موضوع پر حسب ذیل مندوبین نے مقالے پڑھے، جن پر حاضرینِ جلسہ نے کھل کر بحث و گفتگو کی :

(۱) جناب شرافت علی (صدر شعبۂ اردو چندر شیکھر کالج۔ گیا، بہار) (۲) ڈاکٹر (مسز)

زرینہ ثانی (صدر شعبۂ اردو ایل۔ اے۔ ڈی کالج۔ ناگپور) (۳) ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل (ناگپور) (۴) جناب محمد عبدالحلیم (ناگپور) (۵) جناب یحییٰ نشیط (ڈگرس) (۶) ڈاکٹر ایم۔ آئی ساجد (ممبر مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی، کھامگاؤں) (۷) جناب غیاث الرحمٰن (ناگپور)

ودربھ مہاراشٹر کا ایک ایسا علاقہ ہے جس میں ۸ اضلاع شامل ہیں، ۴ اضلاع ـــ امراؤتی، اکولہ، بلڈانہ اور ایوت محل۔ سابق برار سے تعلق رکھتے ہیں اور ۴ اضلاع ـــ بھنڈارہ، ناگپور، وردھا اور چاندہ۔ سابق صوبجات متوسطہ (سی پی) سے۔ اس علاقے کے اردو ادب کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر زرینہ ثانی صاحبہ نے فرمایا کہ: "ودربھ میں اردو ادب کی روایت بڑی قدیم ہے، اس کے مغربی علاقے میں جو برار کہلاتا تھا، عادل شاہی زمانے سے ہی اردو کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔ مغلیہ سلطنت کی سرپرستی نے جہاں شمالی ہند میں اردو کو فیض بخشا وہاں ودربھ میں بھی ان کی توجہ اور عنایت سے اردو کو فروغ حاصل ہوا، نظام سلطنت کے زمانے میں اسے مزید توانائی حاصل ہوئی۔" موجودہ صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے، موصوفہ نے فرمایا: "جب ہم ودربھ میں اردو ادب کی ترویج و ترقی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں نثر و نظم دونوں کے ارتقا کی شاندار اور مضبوط روایت ملتی ہے۔ اس نے اردو ادب کی تمام اصناف کی، خواہ تحقیق و تنقید ہو یا تخلیقی ادب، اردو صحافت ہو یا درسی کتابوں کی تصنیف و تالیف، بڑی کامیاب اور قابل فخر خدمت کی ہے۔" تعلیمی حالت کا ذکر کرتے ہوئے محترمہ نے فرمایا: "ودربھ میں بعض پرائمری اور عربی مدارس کا ترقی کر کے جونیر کالج کا درجہ حاصل کر لینا، جگہ جگہ بچوں اور بچیوں کے لیے ہائی اسکول تک اردو ذریعۂ تعلیم کا انتظام اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ یہاں کے سماجی کارکن اور خادمانِ ملّت اردو کے فروغ کے لیے دل و جان سے کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔" ڈاکٹر ایم۔ آئی ساجد صاحب نے ودربھ میں اردو شاعری کا تفصیل سے جائزہ لینے کے بعد، موجودہ صورت حال کے بارے میں فرمایا: "آزادی کے بعد کا دور ودربھ میں اردو شاعری کے عروج کا دور ہے، اس میں اردو شاعری نے بڑی تیزی سے ترقی کی، روایتی انداز اور قدامت پرستی میں کمی واقع ہوئی اور

جدید خیالات و رجحانات سے اس علاقے کے شعرا بھی پوری طرح متاثر ہوئے۔"

اسی دن سہ پہر میں دوسرا اجلاس شروع ہوا، جس کی صدارت کی عزت راقم الحروف کو حاصل ہوئی۔ اس نشست کا موضوع تھا: "اردو اور مراٹھی کے لسانی اور تہذیبی رشتے۔" اس اجلاس میں حسب ذیل مقالے پڑھے گئے:

(۱) جناب یحییٰ نشیط (ایوت محل) (۲) جناب فرید تنویر (محکمۂ آثار قدیمہ، ناگپور) (۳) ڈاکٹر منشار الرحمٰن منشا (ممبر مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی، ناگپور) (۴) ڈاکٹر ایس۔ پی کلکرنی (صدر شعبۂ لسانیات، ناگپور یونیورسٹی)۔ ان مقالات میں اردو اور مراٹھی کی لسانی خصوصیات کی وضاحت کرتے ہوئے، ان دونوں زبانوں کے باہمی خوشگوار تعلقات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔ کلکرنی صاحب کا مقالہ انگریزی میں تھا اور بہت ہی معتدل اور عالمانہ تھا، اس لیے اسے خاص طور پر بہت پسند کیا گیا، ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب (صدر انجمن ترقی اردو بہار) نے جو پٹنہ سے تشریف لائے تھے اس کے بارے میں تفصیل سے اپنے خیالات اور تاثرات کا، انگریزی ہی میں، اظہار کیا۔ افسوس کہ ان مقالات میں سے کسی کی سائیکلو اسٹائل کاپی تقسیم نہیں کی گئی تھی، اس لیے یہاں اقتباسات پیش کرنا ممکن نہیں۔

چونکہ راقم الحروف مراٹھی سے واقف نہیں ہے، اس لیے شروع ہی میں ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی صاحب (ڈائرکٹر محکمۂ آثار قدیمہ، ناگپور) سے، جو مراٹھی سے بخوبی واقف ہیں اور گجراتی ان کی مادری زبان ہے، نیز اردو زبان و ادب پر ان کی اچھی نظر ہے، اس لئے میں نے درخواست کی تھی کہ وہ مقالوں کے ضروری نوٹ لے لیں اور آخر میں ان پر تبصرہ فرمائیں، چنانچہ آخر میں انھوں نے ان مقالات پر بے لاگ تبصرہ کرنے کے ساتھ ساتھ زیر بحث موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا، اس کے بعد خاکسار نے اپنی صدارتی تقریر میں بعض مقالات کے ان کمزور پہلوؤں کی طرف اشارے کئے، جن میں غالباً غیر شعوری طور پر اپنی مادری زبان کی خوبیوں کو زیادہ نمایاں کیا گیا تھا۔

تیسرا اجلاس دوسرے روز صبح کو ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب (پٹنہ) کی صدارت میں

شروع ہوا۔ اس کا موضوع تھا: "اردو، مہاراشٹر کی دوسری علاقائی زبان کی حیثیت سے۔" اس میں حسب ذیل مقالے پڑھے گئے:

(۱) جناب سید صفدر (ورود) (۲) جناب عبدالسمیع بوبیرے (مدیر ماہنامہ "صبح امید" بمبئی) (۳) جناب شاہد ندیم (بمبئی) (۴) جناب شمیم طارق (میونسپل کونسلر بمبئی اور ریسرچ اسکالر) (۵) محترمہ مسز فاطمہ انیس (پرنسپل انجمن خیرالاسلام گرلز ہائی اسکول، بمبئی) (۶) عبداللطیف اعظمی (راقم الحروف) (۷) ڈاکٹر عبدالمغنی (صدر شعبۂ انگریزی پٹنہ یونیورسٹی) ان مقالات میں بہت تفصیل کے ساتھ مہاراشٹر میں اردو زبان و ادب کا جائزہ لیا گیا تھا۔

آخر میں وقت کم تھا، اس لیے میں نے مقالہ پڑھنے کے بجائے، جو کسی قدر مبسوط اور طویل تھا، زبانی تقریر کی، میں نے عرض کیا کہ بمبئی ایک صنعتی اور تجارتی مرکز تھا، مگر فلم کی ترقی خصوصاً آزادی کے بعد وہ اردو کا بھی مرکز ہو گیا اور یہاں اردو کے چوٹی کے شاعر اور افسانہ نگار اتنی بڑی تعداد میں جمع ہو گئے جس کی مثال شمالی ہند کے کسی ایک شہر میں مشکل سے ملے گی۔ اس کے علاوہ مہاراشٹر میں اردو کے ممتاز محققوں، تنقید نگاروں اور صحافت نگاروں کی تعداد بھی کسی ریاست کے مقابلے میں کم نہیں ہے اور جو چیز مہاراشٹر کو دوسری ریاستوں سے ممتاز کرتی ہے وہ اردو ذریعۂ تعلیم کے اسکولوں اور کالجوں کی کثرت ہے۔ آزادی کے بعد، جب اردو پر مشکل وقت آیا تو بہت سی ریاستوں میں اردو کی تعلیم کا سلسلہ بڑی حد تک منقطع ہو گیا، مگر مہاراشٹر ایک ایسی ریاست ہے جہاں نہ صرف یہ کہ یہ سلسلہ جاری ہے، بلکہ اردو کی تعلیم میں قابل لحاظ ترقی ہوئی ہے۔ مقالے کے آخر میں مہاراشٹر کے اردو دوستوں کو مبارکباد دیتے ہوئے میں نے عرض کیا کہ آپ خوش قسمت ہیں کہ میری اپنی ریاست یوپی کی طرح اور صدر جلسہ ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب کی ریاست بہار کی طرح آپ کی ریاست مہاراشٹر کی سرکاری زبان مراٹھی اور اردو میں کوئی رقابت اور اختلاف نہیں ہے، اس صورت حال سے آپ کو بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میری طرح ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب نے بھی وقت کی تنگی کی وجہ سے، اپنا مقالہ نہیں پڑھا اور چونکہ ان کے مقالے کی سائیکلو

اسٹائل کاپی تقسیم کردی گئی تھی، اس لیے اس کا خلاصہ بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ موصوف نے اپنے مقالے میں مہاراشٹر کے اردو دوستوں کو مفید مشورے دیئے تھے کہ اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے منظور کرانے کے لئے انھیں کیا کرنا چاہئے۔ مقالے کے آخری حصے میں انھوں نے لکھا تھا کہ "اگر اردو کی سرکاری حیثیت کے علم بردار اپنے موقف پر مضبوطی سے جم جائیں اور وسیع پیمانے پر تمام جمہوری و آئینی ذرائع سے اس کی تبلیغ و اشاعت یکسوئی، سلیقے، تنظیم اور تدبر نیز دلیری کے ساتھ کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ مستقبل قریب میں منزل مقصود ان کے قدموں سے نہ آلگے۔"

محترمہ فاطمہ انیس صاحبہ کا مقالہ کافی طویل تھا اور وہ اپنے خرچ پر چھپوا کر لائی تھیں۔ مہاراشٹر میں اردو کی حالت اور حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک موقع پر انھوں نے فرمایا: "جہاں تک مہاراشٹر کا تعلق ہے، میں نے ابھی یہ عرض کیا ہے کہ جب اردو وادیِ گنگ وجمن سے نکالی گئی تو اس کو پناہ ملی کو وہ سہادری کے دامن میں۔ ویسے یہ مہاراشٹر میں نووارد نہیں تھی بلکہ یہ اسی سرزمین کی مٹی اور تہذیب میں پلی بڑھی قدیم علاقائی زبان تھی، میرے کہنے کا مطلب ہے کہ آزادی کے بعد مہاراشٹر وہ واحد ریاست تھی جہاں اردو کو بڑی دیانت داری اور ایمانداری کے ساتھ ذریعۂ تعلیم کی زبان تسلیم کیا گیا، اس کی دو خاص وجہیں تھیں، پہلی یہ کہ مرہٹی داں طبقے نے اردو کو کبھی بھی مرہٹی کا رقیب تصور نہیں کیا، دوسری یہ کہ مرہٹی ادب علاقائی ہونے کے باوجود بین قومی اثرات سے متاثر ہو رہا تھا اور مرہٹی زبان بذاتِ خود مہاراشٹر کے تمام علاقوں میں نئے ادبی تجربات سے دوچار ہو رہی تھی اور ادب کے بعض اصناف میں یہ زبان دوسری زبانوں کے مقابلے میں اونچا مقام رکھتی تھی۔" موصوفہ نے مزید فرمایا: "اگر بیجا خوشنودی یا تعریف نہ سمجھی جائے تو میں یہ عرض کروں گی کہ مہاراشٹر میں اردو داں طبقے کو حاصل شدہ سہولتیں ہندوستان کی کسی بھی ریاست کے مقابلے میں زیادہ اور بدرجہا بہتر ہیں۔" عبدالسمیع بوبیرے صاحب نے اپنے طویل مقالے میں ایک جگہ فرمایا کہ: "مہاراشٹر کا بڑا حصہ ودربھ، مرٹھواڑہ، کوکن اور دیگر علاقوں پر مشتمل ہے۔ ودربھ اور مرٹھواڑا میں اردو والوں اور اردو داروں

کا کام ایک طویل عرصے سے جاری ہے ، پہلے نظام دکن کے زیر اثر، بعد میں مہاراشٹر کے تحت ان علاقوں نے اس زبان کو بہت کچھ دیا، کوکن کی سنگلاخ زمین پر بھی اس زبان نے اپنا علم لہرایا، سیہادری کے پھیلے ہوئے سلسلے میں بیشتر علاقے اردو کے ہیں ، یہاں کے لوگ اپنی مادری زبان پر اردو کو ترجیح دیتے ہیں۔"

آخر میں ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں بہت تفصیل کے ساتھ بتلایا کہ بہار میں اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لئے کتنی طویل جدو جہد کرنی پڑی اور اس راہ میں کیا کیا مشکلات اور رکاوٹیں پیش آئیں۔ بہار کے تجربے کی روشنی میں سیمینار کے منتظمین اور مہاراشٹر کے مندوبین کو مشورہ دیا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ مہاراشٹر میں اردو کو سرکاری درجہ حاصل ہو تو انھیں کیا کرنا چاہیئے ۔ حاضرین جلسہ میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے، جنھیں بہار میں اردو کی سرکاری حیثیت کے بارے میں کچھ شکوک اور غلط فہمیاں تھیں، انھوں نے متعدد سوالات کیئے جن کے مغنی صاحب نے تسلی بخش جوابات دیئے ۔

صدارتی تقریر کے بعد، مقالات اور تقریروں کی روشنی میں، تجاویز مرتب کرنے کے لئے حسب ذیل اشخاص پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی گئی :

ڈاکٹر عبدالمغنی، عبداللطیف اعظمی، مسز فاطمہ انیس، عبدالسمیع بوبیرے، منشاء الرحمٰن خاں منشا، محمد حفظ الرحمٰن ، ڈاکٹر مدحت الاختر، محمد ظہیر الحسن اور ڈاکٹر محمد نظیر رشیدی (کنوینر)

اختتامی اجلاس اور پالیسی ریزولیوشن کی منظوری

اختتامی اجلاس ۷ بجے شام کو ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں کرسیِ صدارت سے حسب ذیل تجویز پیش کی گئی جس کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔

"اردو دستور ہند کی شیڈول نمبر ۸ میں ایک قومی زبان ہے ، لیکن کشمیر اور بہار کے سوا کسی بھی ریاست میں اردو کو سرکاری حیثیت نہیں دی گئی ہے ، حالانکہ ہندوستان کی تمام ریاستوں کے اردو بولنے والوں کا یہ متفقہ عوامی مطالبہ ہے کہ کم از کم ان ریاستوں

میں جہاں چند فی صد لوگ بھی اردو کو اپنی مادری زبان یا تہذیبی زبان قرار دیتے ہیں، اردو کو بھی ان ریاستوں کی پہلی سرکاری زبان کے ساتھ دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے قانوناً تسلیم کیا جائے، تاکہ ہندوستان کی سب سے بڑی لسانی اقلیت کی زبان کو اس کا صحیح مقام باضابطہ ملے اور اس طرح حقیقی معنوں میں قومی یکجہتی کو فروغ حاصل ہو۔

مہاراشٹر کی معتدبہ آبادی اردو کو اپنی مادری یا تہذیبی زبان کی حیثیت سے نہ صرف تسلیم کرتی ہے بلکہ عام طور پر اپنی اجتماعی سرگرمیوں میں استعمال کرتی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ مہاراشٹر بھی اردو کا ایک اہم مرکز ہے، اس لیے کہ اس نے اردو زبان و ادب کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا ہے اور آج بھی لے رہا ہے۔

لہٰذا "بزمِ غالب" کامٹی کے تحت منعقد ہونے والا یہ دو روزہ سیمینار، حکومت مہاراشٹر سے پُر زور مطالبہ کرتا ہے کہ دستورِ ہند کی متعلقہ دفعات مثلاً ۳۴۵، ۳۴۶ کے تحت باضابطہ اسمبلی میں ایک ترمیمی بل کے ذریعہ مہاراشٹر آفیشیل لینگویجز ایکٹ میں سرکاری زبان کے طور پر مراٹھی کے بعد اردو کا بھی اضافہ کرے اور اس طرح ریاست میں اردو کی سرکاری حیثیت کا قانون منظور کرکے ایک دیرینہ عوامی مطالبے کی تکمیل کرے۔"

اس تجویز کی منظوری کے بعد شکریے کی رسمی کارروائی شروع ہوئی۔ بزم کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد نظیر رشیدی صاحب نے مختصر رپورٹ پڑھکر سنائی اور مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا، اس کے بعد میزبان ادارے، ربّانی جونیر کالج کے سابق پرنسپل اور موجودہ صدر جناب محمد عبدالحفیظ انصاری نے منتظمین جلسہ، مندوبین سیمینار اور بالخصوص دور دراز سے آنے والے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں مہمانوں کی طرف سے راقم الحروف نے میزبانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جناب محمد عبدالحفیظ انصاری صاحب کی طویل اور مخلصانہ خدمات کا ذکر کیا، جن کی کوششوں سے اس قصبے میں علم اور تعلیم کی روشنی پھیلی، اس سیمینار کے جملہ منتظمین اور کامٹی کے تقریباً سبھی تعلیم یافتہ موصوف کے شاگرد ہیں، ان کی تعلیمی خدمات کی تفصیلات معلوم کرکے، مجھے جامعہ ملیہ کی یاد تازہ ہوگئی۔ اس کے بعد میں نے سیمینار کے نوجوان

منتظمین اور سرگرم کارکنوں ــ سید قمرالزماں، ڈاکٹر محمد نظیر رشیدی، مقتول حسین وارثی، محمد حفظ الرحمٰن، مقبول علی وارثی اور جمیل حمیدی وغیرہ ــ کو سیمینار کی کامیابی اور حسن انتظام پر مبارکباد دی۔ آخر میں قصبے کے بزرگ اور اپنے خصوصی میزبان جناب محمد ظہیر وارثی صاحب کا ذکر کیا جن کے پاس قدیم اخبارات ورسائل اور نادر کتابوں کا بہترین ذخیرہ ہے، جس سے راقم الحروف دہلی میں رہ کر بھی استفادہ کرتا رہتا ہے اور یہاں کے چند روزہ قیام میں بھی بھرپور فائدہ اٹھایا اور موصوف کو کافی تکلیف دی۔ جامعہ ملیہ کے سابق کارکن جناب محمد حفیظ الدین صاحب بھی اس قصبے کے بزرگوں میں سے ہیں جن کا یہاں کے لوگ بڑا احترام کرتے ہیں، وہ اپنی صحت کی خرابی کے باوجود نمائش کے افتتاح کے لیے زحمت کرکے ناگپور سے تشریف لائے اور انھوں نے پابندی سے سیمینار میں شرکت کی، ان سے طویل عرصے کے بعد ملاقات ہوئی تھی اس لیے قدرتی طور پر جانبین کو بڑی خوشی ہوئی، موصوف جامعہ اور ارباب جامعہ کے متعلق دیر تک بات کرتے رہے۔

علمی و ادبی ملاقاتیں

سیمینار کے زمانے میں کامٹی کے اسکول بند تھے، مگر سیمینار کے ختم ہونے کے بعد جناب محمد عبدالحفیظ انصاری صاحب نے ازراہ کرم حجیّانی خنیجہ بائی گرلز ہائی اسکول دکھلانے کا انتظام کیا اور مسز فاطمہ انیس صاحبہ، پرنسپل خیرالاسلام ہائی اسکول بمبئی اور راقم الحروف کو دیکھنے کی دعوت دی۔ اسکول کی کشادہ عمارت اور کلاسیں دیکھنے کے بعد مقامی معلمات اور طالبات کے ایک مختصر جلسے کو خطاب کرنے کی عزت حاصل ہوئی۔ محترمہ فاطمہ انیس صاحبہ نے طالبات کو مفید مشورے دئے اور نصیحتیں کیں اور راقم الحروف نے جامعہ کے حالات بیان کئے اور اس کی تعلیمی خصوصیات اور خدمات پر روشنی ڈالی۔

کامٹی سے رخصت ہونے کے بعد دو روز ناگپور میں قیام کیا۔ میرے میزبان ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے جو ماشاء اللہ مصنف بھی ہیں اور شاعر بھی اور ماہنامہ جامعہ کے

مضمون نگار بھی، تکلیف کر کے چند اسکول دکھلائے اور متعدد شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات کرائی۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی صاحبہ سے، جو متعدد کتابوں کی مصنف ہیں، دو روزہ سیمینار میں کافی ربط ضبط پیدا ہو گیا تھا، وہ اور ان کے شوہر عبدالحلیم ثانی صاحب میری قیام گاہ پر ملنے آئے اور دوسرے روز اپنے یہاں آنے کی دعوت دی چنانچہ دوسرے دن ساحل صاحب کے ساتھ ان کے یہاں گیا اور علمی و ادبی موضوعات پر اور جامعہ ملیہ کی تعلیمی خدمات اور خصوصیات، ماہنامہ جامعہ اور جامعہ کے ممتاز اساتذہ اور مشہور مصنفین کے بارے میں تفصیل سے باتیں ہوئیں۔ ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشا ناگپور کے خوش گو شعراء میں سے ہیں، ان سے پہلے سے ملاقات تھی، سیمینار میں اور اس کے بعد ناگپور میں تفصیل سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا، وہ دوسرے روز ناگپور کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں سے مجھے ملانا چاہتے تھے مگر اسی روز مجھے واپس آنا تھا اس لیے اس ادبی ملاقات سے محروم رہا۔ کامٹی میں جامعہ کے ایک قدیم طالب علم قاضی زین العابدین صاحب سے اتفاقیہ ملاقات ہوئی، جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو وہ مدرسہ ثانوی میں تھے، وہ آجکل اسی علاقے کے کسی کالج کے پرنسپل ہیں اور جلد ہی ریٹائر ہونے والے ہیں، ان کی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم سے خط و کتابت بھی رہی ہے، ان سے سیمینار کے علاوہ ناگپور میں بھی ملاقاتیں رہیں، ان کا بڑا اصرار تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وردھا اور امراؤتی بھی دیکھ لوں، وردھا کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ اسے گاندھی جی کے مستقل قیام کی عزت حاصل تھی، دوسری یہ کہ قومی بیسک تعلیمی اسکیم، جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب تھے وہیں تیار کی گئی تھی، آجکل وہاں جامعہ کے ایک قدیم طالب علم جناب عزیز الدین بیگ صاحب ہیں جو مجھ سے کافی سینیر ہیں اور امراؤتی میں جامعہ کی قدیم طالبہ اور جامعہ کے جیالے رکن اور ٹیچرس کالج جامعہ کے سابق پرنسپل جناب سعید انصاری صاحب کی صاحبزادی ذکیہ جمیل رہتی ہیں، میں ان لوگوں سے ملنا چاہتا تھا مگر زیادہ ٹھہرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا، اس لیے اسے مجبوراً کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھا۔ ناگپور میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں محمد غلام رسول اشرف صاحب بھی ہیں جو

کسی اسکول میں ٹیچر ہیں اور محض اردو کی خدمت کے لیے ایک نیوز ایجنسی بھی چلا رہے ہیں، کچھ عرصے سے جامعہ بھی منگوا رہے ہیں اور اب سہ ماہی "اسلام اور عصر جدید" بھی منگوانے کا وعدہ کیا ہے، امید ہے کہ ان کی کوشش سے ناگپور میں ان دونوں رسالوں کی اشاعت میں قابل ذکر اضافہ ہوگا۔

رپورتاژ کے آخر میں میں نے محمد ظہیر وارثی صاحب کے نادر ذخیرۂ کتب کا ذکر کیا ہے۔ اپنے اس مختصر قیام میں میں نے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ مولانا محمد علی اور سنٹرل خلافت کمیٹی کے قیام کی تاریخ کے بارے میں ایک عرصے سے میرے ذہن میں کچھ شبہات اور سوالات ہیں، وارثی صاحب کے پاس کانگریس، مسلم لیگ، خلافت کانفرنس اور جمعیۃ علمائے ہند کے ایسے خطبۂ صدارت، خطبۂ استقبالیہ اور بعض قدیم اخبارات ہیں جو آسانی سے کسی کتب خانے میں دستیاب نہیں ہوتے، میں نے ان سے اپنے شبہات دور کرنے اور سوالات حل کرنے کی کوشش کی مگر کامٹی کے محدود قیام میں کامیابی نہیں ہوئی، اس لیے وارثی صاحب تکلیف کر کے چند کتابیں اور بعض اخبارات کی فائلیں ناگپور بھی لائے اور مطالعہ اور تحقیق کا یہ سلسلہ یہاں بھی جاری رہا مگر پھر بھی ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔

برادرم شرف الدین ساحل نے چودھویں صدی ہجری کے سلسلے میں "ملت اسلامیہ کا سفر" کے نام سے ایک مختصر کتاب لکھی ہے جس میں اس صدی کے اہم واقعات تاریخ وار لکھے ہیں۔ یہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری تھی، اس قیام میں اس کے مطالعے کا بھی موقع ملا۔

غرض یہ مختصر سفر، بحیثیت مجموعی بہت کامیاب اور مفید رہا اور ایک عرصے تک یاد رہے گا۔

ماہنامہ جامعہ کی سالانہ قیمت

۱۔ ہندوستان کے لیے	۹ روپے
۲۔ پاکستان کے لیے	۲۰ روپے
دوسرے بیرونی ملکوں کے لیے	دو پونڈ یا پانچ امریکی ڈالر

کوائف جامعہ

جلسۂ یومِ تاسیس اور تعلیمی میلا

۲۹ راکتوبر، جامعۂ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس وقیام کی تاریخ ہے اور ہر سال اس دن اساتذہ اور طلباء کا جلسہ منعقد ہوتا ہے جس میں جامعہ کے کاموں کا جائزہ لیا جاتا ہے اس کی تعلیمی خدمات اور خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے اور بانیان جامعہ کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ حسب معمول امسال بھی یہ جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب نے فرمائی اور جس میں مختلف اداروں کے طلباء نے مضامین پڑھے اور نظمیں سنائیں۔ اس سے پہلے این سی سی کے کیڈٹس نے شیخ الجامعہ کو سلامی دی، اس کے بعد شیخ الجامعہ صاحب نے جامعہ کا جھنڈا لہرایا اور مدرسہ ثانوی کی طالبات نے جامعہ کا ترانہ پیش کیا۔

ایک طویل عرصے سے جامعہ میں ہر سال تعلیمی میلا ہوا کرتا تھا جس میں اساتذہ اور طلبہ مل کر رنگا رنگ پروگرام پیش کرتے تھے، اس موقع پر ایک نمائش بھی ہوتی تھی جس میں چارٹ اور مضامین کے ذریعہ جامعہ کے تعلیمی کاموں پر روشنی ڈالی جاتی۔ کچھ عرصے سے بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر، یہ تعلیمی میلا نہیں ہو رہا تھا، اس سال مڈل اسکول کے ذمے جلسۂ یوم تاسیس کے انتظام کی ذمہ داری سپرد کی گئی تو اس کے نگراں جناب خالد سیف اللہ صاحب نے جو جامعہ کے قدیم طالب علم ہیں، جامعہ کے دوسرے تعلیمی اداروں کے تعاون سے تعلیمی میلے کا بھی انتظام کیا۔ جس میں حسب ذیل پروگرام

پیش کیا گیا :

۲۹ر اکتوبر :

طلبائے مڈل اسکول کی طرف سے، کہانیاں سنانے کا مقابلہ۔ کہانی لکھنے کا مقابلہ۔ بیت بازی کا مقابلہ اور بچوں کی حکومت کا اجلاس۔

۳۰ر اکتوبر :

طلبائے مڈل اسکول کی طرف سے، نہرو ٹرافی کا مقابلہ۔ پینٹنگ ۔ کلچرل پروگرام۔ جامعہ کے تمام اداروں کی طرف سے : تمثیلی مشاعرہ۔

۳۱ر اکتوبر :

طلبائے مدرسہ ثانوی کی طرف سے، گاندھی ٹرافی کا مقابلہ۔ پینٹنگ ۔ کلچرل پروگرام۔ ڈبیٹ ۔ این سی سی کیڈٹس کی طرف سے ایک شام۔

نمائش : مڈل اسکول کی طرف سے، ماضی کی ایک جھلک۔ پیپر کرافٹ۔ باغبانی پروجکٹ ۔ نہرو پروجکٹ۔

ان پروگراموں میں سے بیت بازی کا مقابلہ اور تمثیلی مشاعرہ خاص طور پر بہت پسند کیے گئے۔

شعبۂ اردو کی ادبی سرگرمیاں

پاکستان کی مشہور خوش فکر شاعرہ، محترمہ فہمیدہ ریاض صاحبہ کا امسال جامعہ میں "پوئیٹ اِن ریزیڈنس" کی حیثیت سے تقرر ہوا ہے، ۰ار ستمبر کو پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کی صدارت میں شعبۂ اردو کے اساتذہ اور طلبا کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں جامعہ کی دوسری فیکلٹی کے صدر اور اساتذہ نے بھی شرکت کی، اس جلسے میں فہمیدہ ریاض صاحبہ کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور صدر جلسہ کے تعارف کے بعد محترمہ نے چند غزلیں سنائیں جنھیں بہت پسند کیا گیا۔ پروفیسر نارنگ صاحب صدر شعبۂ اردو اور ڈین فیکلٹی آف لینگویجز اینڈ ہیومنیٹیز، کچھ ہی دنوں پہلے یورپ اور امریکا کے سفر سے واپس آتے تھے، جلسے کے اصرار پر موصوف نے اپنے سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے یورپ امریکا

میں اردو کی مقبولیت پر سیر حاصل تقریر فرمائی۔

۱۹ر ستمبر کو شعبۂ اردو میں، پاکستان کی مشہور افسانہ نگار مسز اختر جمال صاحبہ کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا، صدر شعبہ پروفیسر نارنگ صاحب کے تعارف کے بعد محترمہ نے اپنا ایک افسانہ سنایا جسے بیحد پسند کیا گیا۔ اختر جمال صاحبہ کے شوہر جناب احسن علی خاں احسن بھی تشریف لائے تھے جو پاکستان کے خوش گو شعرا میں سے ہیں، صدر جلسہ کے ارشاد پر انھوں نے ایک نظم اور ایک غزل سنائی اور از راہ کرم یہ دونوں رسالہ جامعہ کے لیے عنایت فرمائیں جو پچھلے شمارے میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان دونوں مہمانوں کے میزبان اور پاکستانی سفارت خانے کے پریس اٹیچی جناب منیر احمد شیخ بھی تشریف لائے تھے، موصوف بھی ایک سلجھے ہوئے ادیب ہیں اور جب سے دلّی کے سفارت خانے میں تشریف لائے ہیں یہاں کے ادبی حلقوں میں بہت مقبول اور ہر دلعزیز ہیں اور اب چونکہ دلّی سے ان کا تبادلہ ہو گیا ہے اس لیے پروفیسر نارنگ صاحب نے انھیں خراج تحسین ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ در اصل اردو ادب کے سفیر ہیں، وہ جہاں بھی جائیں گے اس فرض کو ادا کرتے رہیں گے، موصوف نے اپنی جوابی تقریر میں ہندوستان کی ادبی فضا اور اردو کی خدمات کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ انھیں یہاں بڑی محبت اور عزت حاصل ہوئی جسے وہ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

۷ر اکتوبر کو بین اقوامی اردو سنٹر، تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن لندن کے سکریٹری جناب افتخار عارف صاحب کا خیر مقدم کیا گیا۔ شعبے کے صدر پروفیسر نارنگ صاحب نے معزز مہمان کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا: "افتخار صاحب لکھنؤ کے رہنے والے ہیں، پھر کراچی کے باسی ہو گئے اور اب لندن کے باشندے ہیں، وہ ایک تازہ گو اور خوش فکر شاعر ہیں اور خوش سلیقگی اور دردمندی کی دولت سے مالا مال ہیں، وہ پاکستانی ٹیلی ویژن سے بھی متعلق رہے ہیں اور کسوٹی کے نام سے ایک مقبول پروگرام پیش کرتے تھے۔" معزز مہمان نے اردو مرکز کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ اردو مرکز کے زیر اہتمام لندن کے وسطی حصے میں ایک دارالمطالعہ قائم کیا گیا ہے اور خاص موضوعات پر سیمینار اور سمپوزیم منعقد کیے جاتے ہیں، تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن کے اہتمام میں "ساؤتھ" کے نام سے ایک ماہنامہ بھی شائع ہوتا ہے اور اخبار "گارجین" کے

کے تعاون سے ہر ہفتے تیسری دنیا کے ممالک کے بارے میں ایک ضمیمہ شائع کیا جاتا ہے جس میں ان ملکوں کی ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کے بارے میں خبریں شائع کی جاتی ہیں اور معاشی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ تقریر کے بعد معزز مہمان نے اپنے تازہ کلام سے حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ آخر میں جلسے کے صدر جناب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب (سابق ڈائرکٹر ترقی اردو بورڈ) نے اپنی تقریر میں اردو کی کتابوں اور رسالوں کی موجودہ حالت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ترقی یافتہ ملکوں کے اردو ادب سے دلچسپی اور محبت رکھنے والے حضرات کو چاہیئے کہ وہ اردو کی معیاری کتابوں اور رسالوں کو زیادہ سے زیادہ خرید کر ان کی اشاعت میں قابل قدر مدد کریں۔

اس جلسے میں دہلی کے ادیبوں نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کی، حیدرآباد کے دو معزز مہمان جناب سری نیواس لاہوٹی اور جناب عبدالصمد خاں صاحب (جامعہ کے قدیم طالب علم اور اردو ریسرچ سنٹر حیدرآباد کے معتمد عمومی) نے بھی جلسے کو عزت بخشی۔

شعبۂ اردو کی دعوت پر ۲۰ اکتوبر کو مشہور جرمن اسکالر پروفیسر انا میری شمل جامعہ تشریف لائیں اور شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں معزز مہمان نے "ہندوستانی اور پاکستانی لسانیات میں جرمنی کا حصہ" کے عنوان سے ایک فکر انگیز تقریر کی۔ تقریر سے قبل صدر شعبہ پروفیسر نارنگ نے معزز مہمان کی علمی خدمات کا ذکر کیا اور آخر میں شیخ الجامعہ صاحب نے معزز مہمان کی علمی خدمات پر خراج تحسین ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ یورپ کی زبانوں میں اردو کے ہم عصر ادب کی اشاعت کی بھی ضرورت ہے۔ شعبے کے ریڈر ڈاکٹر عنوان چشتی صاحب نے فاضل مقرر اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

(کوائف نگار)